دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۶۲ ویں جلد

از جولائی ۱۹۴۸ء تا دسمبر ۱۹۴۸ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبع معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۶۲

جولائی ۱۹۴۸ء تا دسمبر ۱۹۴۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین

جلد ٦٢

جولائی ۱۹۴۸ء تا دسمبر ۱۹۴۸ء

(بترتیب حروف تہجی)

دارالمصنفین کی نئی کتاب

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اُترا تھا، اور اُن کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان حکمران رہے، آج بھی سندھ کے درو دیوار سے اُن کے آثار نمایان ہین، لیکن اس کے باوجود اُردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہان ایک نئی حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے،

قیمت :- پانچ روپیے،

جلد ۶۲ ماہ شعبان المعظم ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۴۸ء عیسوی عدد ۱

مضامین

مقالات

استفسار وجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس دفعہ دار المصنفین ایک مدت کے بعد میرا آنا ہوا، جس کی وجہ سفر کی زحمتوں اور مشکلوں کا وہ سلسلہ ہے جس نے کمال اتصال کے باوجود ہندوستان کے ایک شہر کو دوسرے شہر سے پہلے سے بہت زیادہ دور بنا دیا ہے، بہرحال دار المصنفین کو آکر میں نے دیکھا اور خوش ہوا کہ اگرچہ ملک کے اندر جہاں اکثر علمی ادارے بند ہوگئے، یا بند ہونے کے قریب ہوگئے، دار المصنفین زندہ ہے، اور اپنے کاروبار میں بدستور مصروف ہے، رفقاء مطالعہ و تحقیق و تصنیف و تحریر میں اور اہل مطبع طبع و اشاعت کے کاموں میں مشغول ہیں، صرف ایک چیز کام میں تعویق کا سبب بن رہی ہے، اور وہ کاغذ کی کمیابی ہے تاہم حکومت کے ذمہ داران نظم و نسق کے ذریعہ کارروائی جاری ہے، امید ہے کہ یہ مشکل بھی حل ہو جائے گی،

بالفعل سیرت نبوی، تاریخ اسلام اور سیر الصحابہ کی متعدد جلدیں زیر طبع ہیں، اور نئی کتابوں میں سید صباح الدین عبد الرحمان کی کتاب بزم تیموریہ یعنی آل تیمور کا علمی و ادبی تذکرہ چھپ رہا ہے، اس کے چھپ جانے سے اردو کی دلچسپ کتابوں میں ایک نئی کتاب کا اضافہ ہوگا،

ابھی سفر کی دقتوں کا تذکرہ تھا، حالانکہ ایک پہلو سے دیکھا جائے تو ہوائی راہوں نے سفر کی مشکلوں کو کم کرنے میں بڑی مدد دی ہے، ہوائی ڈاک کا انتظام اور ہوائی سفر کا اہتمام اب شہر بشہر ہے لیکن با ایں ہمہ، جس طرح غذا اور کپڑا شہر بشہر موجود ہونے کے باوجود خلق خدا کھانے اور پہننے کی مشکلوں میں گرفتار رہے، اسی طرح شہر بشہر ہوائی جہازوں کی پرواز کے باوجود ڈاک کا سلسلہ درہم اور سفر کی ترتیب برہم ہے، اور کسی اگلے شاعر کا یہ شعر ہر پہلو سے صادق ہے، ع

این طرفہ تماشا بین تشنہ است و آب اندر

جس طرح ریلوں نے مہینوں کے سفر کو دنوں کا بنا دیا ہے، ان ہوائی جہازوں نے دنوں کے سفر کو گھنٹوں کا بنا دیا ہے، اور "علیٰ جناح استعجال" سفر کا طریق اب فنستروں اور لیڈروں کے حلقہ سے نکل کر عوام تک پہنچ چکا ہے، چنانچہ اسی سلسلہ میں ان ہوائی بساطوں پر نماز کا سوال بھی پیدا ہوگیا ہے، ہمعصر صدق نے کسی

منادی صادق البیان کا خیال ہے کہ بعض علماء نے ان ہوائی جہازوں پر نماز نہ پڑھے جا سکنے کا فتویٰ دیا ہے، کیونکہ خود ہوائی جہازوں کے سفر نے مسلمانوں کو پرہیز کا مشورہ دیا ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ قبل اس کے کہ اس طرح کے سفر پر علماء کو دسترس حاصل ہو، اس صدی کے سب سے بڑے عالم فقیہ مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس وقت کو پہلے ہی حل فرما چکے ہیں، اُن کا فتویٰ حکم نماز در ہوائی جہاز اُن کی آخری تالیف بوادر النوادر (ص ۴۳) میں موجود ہے جس میں بضرورت جواز کا حکم دیا گیا ہے، باقی جو لوگ زمین ہی پر نماز نہیں پڑھتے، ان کے کانوں میں تو اس پرواز کے وقت ملاء اعلیٰ سے یہ آواز سنائی دیتی ہے، "تو کہ در زمین را نکو ساختی کہ با آسمان نیز پرداختی"

ابھی اوپر کی سطریں لکھ کر قلم اپنی عبارت آرائی کے خیال خام پر رقص کر رہا تھا کہ طاؤس کی نظر اپنے پاؤں پر پڑ گئی،

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق تحسین کنند و او خجل از پائے زشت خویش

وہ طاؤس کا پاؤں کیا تھا؟ یہ خیال تھا کہ آج جو اردو اس فصاحت و بلاغت کے دعووں کے ساتھ لکھی جا رہی ہے کل کیا ہماری اولاد پڑھ اور سمجھ بھی سکے گی؟ خصوصیت کے ساتھ جب حکومت وقت کے افراد کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوتے ہیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ واقعی کیا یہ ان ہی بزرگوں کے الفاظ ہیں جو قومیت واحدہ کے مدعی اور قومیت متحدہ کے داعی ہیں، قاصد سے بار بار پوچھنا پڑتا ہے ع سچ سچ بتا یہ لفظ انہی کی زبان کے ہیں،

ٹنڈن جی کی قومیت واحدہ کے فلسفہ سے تو مدتوں سے آگاہی ہے، مگر نیک صفات پنت جی کی زبان سے وہ تقریر سن کر جو فیض آباد کے الیکشن میں فرمائی، بڑی حیرت ہوئی، اور پرانی عقیدت کے شیشہ کو بڑی ٹھیس لگی، جب دولت و اقبال کی بدمستی کا یہ عالم ہو کہ بڑوں بڑوں کو اپنی زبان پر قابو نہ ہو تو چھوٹوں کا کیا ذکر ہے، پنت جی سے ذاتی واقفیت کی بنا پر اب بھی وہی حسن عقیدت قائم ہے، اور خیال کرتا ہوں کہ سوشیلسٹوں کے مقابلہ میں کامیابی کے سہل نسخہ کا یہ بھی اسی طرح بضرورت استعمال ہے جس طرح مسلم لیگی اور مہا سبھائی مذہبی و قومی تباہی کو کانگریس کی طرز سیاست کا نتیجہ بتا کر کل کانگریس کی مخالفت کرتے تھے، اور آج اسی کو سوشیلسٹوں کے مقابلہ میں کانگریسی رہنما استعمال کر رہے ہیں، اور فریق مخالف کا یہ طعن سہہ رہے ہیں،

ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

پنت جی تو صرف ہندی زبان ہی کے قبول کو قومیت متحدہ کی شرط قرار دے کر رہ جاتے ہیں، لیکن ٹنڈن جی اس کے لئے ہندو کلچر کے قبول کو بھی ضروری سمجھتے ہیں، مگر اس حکم سے پہلے ان کو یہ بھی بتانا چاہئے کہ کس عہد کے اور کس صوبہ کے ہندو کلچر کے اختیار کرنے پر وہ مسلمانوں کو مجبور کرنا چاہتے ہیں اور کیا

مدراس و بنگال سے لے کر پنجاب تک کے ہندوؤں میں کوئی متحدہ ہندو کلچر کا نقشہ ان کے سامنے ہو تو کیا پگڑی باندھی جائے یا ننگے سر رہا جائے، پھر پگڑی بھی کیسی پنجابی یا راجپوتی، یا گجراتی یا مرہٹی، یا مارواڑی یا میواڑی یا بنگالی سر برہنگی اختیار کی جائے، کس دیس کا کھانا کھایا جائے، اور کس دیس کی ہندی بولی جائے،

میرے خیال میں ٹنڈن جی جلدی کر رہے ہیں، ان کو چاہئے کہ پہلے اپنے ہم خیالوں کو تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیں اور ہندی کو علوم و فنون سے معمور زبان بنا لیں، پھر تو ہندوستان کا ہر باشندہ غالب قوم کی ہمنوائی، ہم رنگی، اور ہم لباسی کو بضرورت زمانہ اور بغرض حصول اعزاز از خود قبول کر لیگا، اور اس وقت نہ دعوتوں کی ضرورت ہوگی، اور نہ دعووں کی، اور نہ وعیدوں کی، حسن کو استعمار کے بغیر عشق کا پیام عبودیت پہنچتا رہتا ہے، انگریزوں نے اپنی تہذیب و تمدن اور زبان اور کلچر کو جن اصولوں سے پھیلایا، وہی اصول اب دوسرے بھی اختیار کر سکتے ہیں، جن میں نہ زور ہے نہ ظلم ہے، اور مقصد بہمہ وجوہ حاصل ہے،

لیکن ٹنڈن جی کو مسلمانوں سے پہلے خود اپنی حکومت کو مشورہ دینا چاہئے کہ وہ نئی دلی کی یورپین کلچر کی عمارتوں کو، بھیسوں، فرنیچروں، دفتروں، قاعدوں، قانونوں، طریقوں، سکریٹریوں، کلرکوں، چپراسیوں، موٹروں اور سواریوں کو چھوڑ کر بنارس کی گلیوں میں چلی آئے، موٹروں کے بجائے ہمارے منتری رتھوں پر نکلیں اور بجائے سینما نوٹنکی لڑائیں،

ٹنڈن جی کو جاننا چاہئے کہ کسی قوم کا کلچر نہ اس آسانی سے بنتا، اور نہ اس آسانی سے بگڑتا ہے، پھر وہ کانگریس جس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہندو مسلمان یہودی عیسائی پارسی سب کی نمائندہ ہے، اس کے کسی لیڈر کا یہ کہنا کہ مسلمان، یہودی پارسی سب مل کر ہندو کلچر اختیار کر لیں اپنے دعوے کی آپ تردید ہے، کلچر ایک ترقی پذیر تحریک ہے، وہ کوئی جامد اور ساکن چیز نہیں، ٹنڈن جی کی اس دعوت کے یہ معنی ہیں کہ آج بیسویں صدی عیسوی سے بہت کم بکرمی سمت کی ابتدائی صدیوں میں ہم پہنچ جائیں، اور زمانہ کی ہر ترقی کا ساتھ چھوڑ کر ہم عہد تاریک کی خاموش تصویریں بن جائیں، اس دعوت کو نہ مسلمان ہی قبول کر سکتے ہیں نہ سمجھدار ہندو،

ہندو کلچر کی بنیاد تو ہندو دھرم شاستر پر ہے، جس کی بنا پر ذاتوں کی تقسیم، چھوت اچھوت کی تمیز اور اونچ، اور ہنر اور پیشہ اور مزدوری کی طبقاتی تقسیم ہے، مجھے ڈر ہے کہ اس شاستر کے زور اور ٹنڈن جی کی تجویز پر اچھوت دلی اور صوبوں کے دار الحکومتوں کا قبضہ چاہیں گے اور پنڈتوں کو سیاست سے نکال کر پوجا پاٹ اور سنکھشا کے پرانے دھندوں میں اور کائستھوں کو اُن کے اپنے کاموں پر لگا دیں گے اور اپنے تمام سفیروں کو سمندر پار سے بلوا لیں گے، اور اچھوت ادھار اور گاؤں سدھار اور ہریجن کی تعلیم و ترقی کی ہر تجویز کو مٹا دیں گے، کیا اس سے بھی زیادہ کوئی احمقانہ بات ہو سکتی ہے،

مقالات

تجدید تعلیم

از

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

(۵)

اصلاح تعلیمِ نسوان

وقت کی رائج و مقبول بولی اگر بولی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظام تہذیب و تمدن مین عورت کو چونکہ اصلاً و اصولاً کسبِ معاش کی فکر و ذمہ داری سے آزاد رکھا گیا ہے، اس لئے خالص معاشی و دنیوی تعلیم کی تو بجز استثنائی حالتون کے اس کو حاجت ہی نہین۔ زیادہ سے زیادہ کچھ گھریلو" ہلکی قسم کی ایسی دستکاریون کی تعلیم کافی ہے، جو اتفاقی صورتون مین عزت و آبرو کی حفاظت کے ساتھ گذارہ و قناعت میں معین ہون، اسی طرح دینی تعلیم مین بھی عام وعظ و تبلیغ یا مدارس مین درس و تدریس وغیرہ کی متعدی خدماتِ دین بھی عورت کے فرائض مین داخل نہین، اس لئے قدرۃً اس کی تعلیم کا معیار و معاملہ خود اپنے دین کی فکر و درستی، اپنے بچون کی تربیت و نگرانی یا خاص شرطون کے ساتھ خود اپنی ہم جنسون کی دینی تعلیم و خدمت تک محدود رہ جاتا ہے،

اس محدود خدمت کی تمام اطراف و جوانب کی جامعیت کے ساتھ خود حضرت جامع المجددین علیہ

نے بڑی حد تک بہشتی زیور کے ذریعہ تکمیل فرمادی ہے، جس کی تفصیل بہشتی زیور پر گفتگو کے سلسلہ میں گذر چکی۔
لیکن عورتوں کی تعلیم کی یہ محدودیت مردوں کے مقابلہ میں اس کی اہمیت میں کمی کو ہرگز مستلزم نہیں بلکہ
ابتدائی تربیت کے ذریعہ بچوں میں دین کو راسخ کرنے کے لئے یہ زیادہ اہم والزم ہے، اسی لئے حضرت نے
مختلف مواعظ و مضامین وغیرہ میں اس کی مستقلاً اور جابجا تفصیل و تاکید فرمائی ہے، ایک طویل
مضمون "اصلاح تعلیم نسوان" کے عنوان سے رسالہ القاسم میں شائع فرمایا تھا، پھر کچھ رد و بدل کے ساتھ
بطور ضمیمہ بہشتی زیور میں شامل فرمادیا، اس مضمون میں افراط و تفریط کی ان کوتاہیوں کی اصلاح فرمائی
گئی ہے، جو بالعموم عورتوں کی تعلیم کے معاملہ میں لوگ کرتے ہیں،

مختلف خیالات تین خیال کے لوگ ہیں، ایک وہ جو تعلیم نسوان کے مخالف ہیں نہ حامی، مگر تعلیم کا
اہتمام نہیں، دوسرے جو مخالف ہیں، اور تیسرے حامی، ان سب مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں،

طبقہ اول کی سب سے اشد و اغلظ کوتاہی یہ ہے کہ ایسے خیال کے مردوں اور خود عورتوں
کے نزدیک عورتوں کو تعلیم دینے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں، دلیل یہ ہے کہ کیا عورتوں کو نوکری
کرنا ہے، ان لوگوں نے نہ تعلیم کی غرض سمجھی، اور نہ نصوص و روایات میں غور کیا، جو مردوں اور عورتوں
دونوں کے لئے تحصیل علم کو ایک درجہ میں فرض و واجب قرار دے رہی ہیں،

ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ علم سے غرض نوکری نہیں، کیونکہ جس علم کا حاصل کرنا ہر شخص پر واجب ہے
وہ علم معاش نہیں علم دین ہے جس سے انسان کے عقائد، اعمال، معاملات، معاشرت اور اخلاق
درست ہوں، جس کا ثمرہ دنیا میں اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ہے، کہ یہی لوگ اپنے رب
کی راہ پر ہیں، اور آخرت میں اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کی بشارت کہ انہی کے لئے کامیابی ہے
لہذا اس تعلیم کا وجوب نقلاً و عقلاً ظاہر ہے، نقلاً تو طلب العلم واجب علی کل مسلم
طلب العلم فريضة علی کل مسلم، یا ایها الناس علیکم بالعلم الخ

لیتفقہ فی الدین وغیرہ روایات ہیں،

جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس علم کے وجوب و فرضیت کی بنیاد نفس اسلام کیلئے ہے، نہ کہ عورت یا مرد کی خاص جنس و صنف کے لئے، اس لئے کہ اسلام کی حقیقت ہی خاص عقائد و اعمال کے علم و عمل کے سوا کیا ہے، اور عمل بلا علم کے کیسے ممکن ہو، اس لئے عقلاً بھی ثابت ہے، کہ جب اصلاح عقائد و اعمال فرض ہے، اور وہ موقوف ہے ان کا علم حاصل کرنے پر، اور فرض جس پر موقوف ہو، اس کا فرض ہونا بدیہی ہوا، البتہ اس کے لئے عربی یا کتابی علم فی نفسہ واجب نہیں، صحیح اعمال و عقائد کا کسی نہ کسی طرح سُن سُنا کر بھی جان لینا کافی ہے،

"لیکن یہاں تین باتیں قابل غور ہیں، اول یہ کہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے، جیسے جو شخص پیدل سفر حج کرنے پر قادر نہ ہو، اور ریل و جہاز وغیرہ کی استطاعت رکھتا ہو، تو اس پر واجب ہوگا کہ سفر کا عزم کرے، اور ریل و جہاز کا ٹکٹ لے کر اس پر سوار ہو، سو ریل یا جہاز کا ٹکٹ خریدنا اور اس پر سوار ہونا فی نفسہ شرعاً واجب نہیں، لیکن ایک فرض کا ذریعہ ہے، اس لئے یہ بھی فرض ہوگا، مگر بالغیر، دوسرے تجربہ سے معلوم ہوا، کہ اب علم کا محفوظ رہنا کتابوں ہی کے پڑھنے پڑھانے پر موقوف ہے، جو تعلیم کا متعارف طریق ہے، اور علم دین کا محفوظ رکھنا واجب ہے، لہذا بطریق متعارف تعلیم کا جاری رکھنا بھی واجب ہے، البتہ یہ واجب علی الکفایہ ہے، یعنی ہر مقام پر اتنے آدمی دینیات پڑھے ہونے چاہئیں، کہ اہل حاجت کے دینی سوالوں کا جواب دے سکیں"

تیسری بات بھی تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ مرد علما، مستورات کی دینی ضروریات کے لئے کافی و وافی نہیں، اولاً پردہ کے سبب سب عورتوں کا علما، تک پہنچنا قریباً ناممکن، دوسرے اگر گھر کے مردوں کو واسطہ بنایا جائے، تو بعض گھروں میں تو ایسے مرد میسّر ہی نہیں اور بعض

مردوں کو خود اپنے ہی دین کی فکر نہیں ہوتی تو عورتوں کے لئے کیا اہتمام کریں گے، پھر گھر
میں باپ بیٹا بھائی کوئی عالم ہو بھی تب بھی عورتیں بعض مسائل اُن سے پوچھ نہیں سکتیں اور
سب شوہروں کا عادۃً عالم ہونا ناممکن، لہٰذا عورتوں کی عام احتیاج رفع ہونے کی صورت
اس کے سوا نہیں کہ اگر سب نہیں تو کچھ عورتیں پڑھی ہوں تاکہ عام مستورات ان سے دین کی
ہر قسم کی تحقیقات کر لیا کریں' اس لئے لکھے پڑھے مردوں کی طرح عورتوں میں بھی ایسی تعلیم
ہونا واجب و ضروری ہے،

دوسرا طبقہ | وہ ہے جو تعلیم نسواں کا بالکل مخالف اور اس کو نہایت مضر جانتا ہے خصوصاً
لکھنے کی تعلیم کو کہ جس کو چاہا خط لکھ دیا، یا دوسروں نے اپنے نفسانی جذبات ان تک پہنچا دیئے
...... تو اس راہ سے شیطان کا جال پھیل جانا زیادہ عجب نہیں،...... اور جب تعلیم زیادہ ہو تو
یہ مفسدہ بھی اس صورت میں زیادہ ہوگا جب کہ کسی عورت کے مضامین نثر و نظم اخبار میں
چھپنے لگیں جن کو دیکھ کر سخن شناس شیاطین کاتبہ کے رنگ اور جذبات و خیالات کا اندازہ کرتے
اور شرارت کے شرارے زیادہ پھیلتے ہیں، اور غضب یہ کہ فخر کے لئے صاحبۂ مضمون کا نام و پتہ
تک صاف لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں کی بیوی' فلاں کی بیٹی اور فلاں مقام،

"ایک خرابی ان تعلیم یافتہ عورتوں میں یہ ہوتی ہے کہ ہر طرح کی کتابیں منگا کر پڑھتی ہیں'
عشق بازی کے قصے، سازش اور لگاوٹ کے ناول، شوق انگیز غزلیں، پھر ان سے طبیعت
بگڑتی ہے، وغیرہ وغیرہ، ان واقعات سے انکار نہیں لیکن ان کی حقیقت کے سمجھنے میں
کوتاہ نظری سے کام لیا گیا ہے،

"اصل یہ ہے کہ ان سب خرابیوں کی ذمہ دار تعلیم نہیں بلکہ نصاب تعلیم، طرز تعلیم، طرز عمل، یا
سوء تدبیر ہے یعنی یا تو ایسی کتابیں نہیں پڑھائی گئیں، جن سے حلال و حرام کے احکام'

ثواب وعذاب کی تفصیل اور تہذیب اخلاق کا طریقہ معلوم ہو، اور جن سے دل میں خوف و خشیت اور حق کی معرفت وعظمت پیدا ہو، یا یہ ہو کہ باوجود نصاب تعلیم کے مفید وکافی ہونے کے، مضامین کو قلب میں جمانے کی کوشش اور ان پر عمل کی نگرانی نہیں کی گئی، مثلاً جس وقت لڑکی یہ پڑھے کہ غیبت گناہ ہے، اس کے بعد جب غیبت کرے تو فوراً اس کو ٹوکا اور یاد دلایا جائے کہ دیکھو تم نے کیا پڑھا ہے، اور اس کے خلاف کرتی ہو، ...... اس طرح اگر ان کو برابر تنبیہ کیا جاتا رہے، تو امید ہے کہ اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کا ان میں ملکہ پیدا ہو جائے گا، ہاں اگر طینت ہی میں خرابی ہے، تو

ع ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

"غرض مفاسد کے اسباب یہ ہیں، تو اس میں عورتوں کی کیا تخصیص یہی اسباب مفاسد مردوں کو پیش آئیں تو وہ بھی ویسے ہوں گے، البتہ عرفاً ان قبائح کا عورتوں سے صدور یا ان کی نسبت رسوائی وذلت کا زیادہ موجب خیال کی جاتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس باب میں مرد و عورت یکساں ہیں، اور عرف کو شرع پر اس طرح ترجیح دینا بہت بڑا شعبہ ہے جاہلیت کا ...... جس کے معنی صاف یہ ہیں، کہ مردوں کے لئے ایک معصیت کو خفیف سمجھتے ہیں، اور عورتوں کے لئے شدید، جس پر استخفاف دین کے فتوے کا اندیشہ اور سخت اندیشہ ہے؛

تیسرا طبقہ | "باقی جو تعلیم نسواں کے حامی ہیں، ان سے اس تعلیم کی تعیین اور اس کے طریقہ کی تجویز میں غلطی ہوتی ہے، ان کی بعض غلطیوں کا بیان، اور طبقہ ثانیہ کی اصلاح کے ضمن میں گذر چکا، مثلاً ان کو صرف پڑھا کر چھوڑ دینا کہ جس قسم کی واہیات خرافات کتابوں اور رسالوں کا چاہیں آزادی سے مطالعہ کرتی رہیں، یا تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت اور تعلیم کی

نگرانی کا خیال نہ رکھنا۔

ان کے علاوہ بعض یہ ہیں کہ مستورات کو بجائے علوم دینیہ پڑھانے کے تاریخ جغرافیہ یا اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انگریزی پڑھاتے ہیں، جس کی وجہ صرف یورپ کی تقلید ہے حالانکہ ہم میں ان کے رسوم وعادات وغیرہ کے علاوہ سب سے بڑا فرق مذہب کا ہے، وہ یا تو کوئی مذہب نہیں رکھتے، اور زیادہ ایسے ہی ہیں، اور یا ان کا مذہب ہمارے مذہب سے الگ ہے، اس لئے ان کو یا تو مذہبی تعلیم سے سروکار ہی نہیں یا اپنے مذہب کی تعلیم ہوگی، یا صرف دنیوی معلومات اور زبان کی،

لہذا جب ان کی غرض تعلیم اور ہے، اور ہماری اور جس کا اوپر طبقہ اولی کی اصلاح خیال میں ذکر ہوا، یعنی ہماری غرض تعلیم اسلامی عقائد واعمال معاملات معاشرت، اور اخلاق کا علم، اور ان کی اصلاح ہے، تو ظاہر ہے، کہ ان کی تقلید کرنا ہمارے لئے بالکل بے جوڑ ہے،

بعضے لوگ اپنی لڑکیوں کو آزاد و بیباک عورتوں سے تعلیم دلاتے ہیں، اور صحبت کا اخلاق و جذبات پر ضرور اثر پڑتا ہے، خاص کر جب ہم صحبت بڑا اور ایسا ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو، اور ظاہر ہے، کہ استاد کی عظمت و اطاعت دونوں ہوتی ہے،.........اگر استانی آزاد و بیباک نہ ہو، لیکن ہم سبق لڑکیاں ایسی ہوں، تب بھی اسی کے قریب قریب مضرتیں واقع ہوں گی،

اس تقریر سے تعلیم کی دو خاص صورتوں کا حال بھی معلوم ہوگیا، جن کا اس وقت بے تکلف رواج ہے، ایک لڑکیوں کے لئے عام زنانہ اسکول بنانا، اور عام مدرسوں کی طرح اس میں مختلف قوم اور مختلف طبقات و خیالات کی لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا گو استانی مسلمان ہی ہو، اور پردہ کا بھی اہتمام ہو، تاہم واقعات و تجربہ نے دکھلا دیا کہ یہاں بھی

ایسے اسباب جمع ہوجاتے ہین جن کا اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے، اور اگر استانی بھی کوئی آزاد اور مکار مل گئی، تو کریلا نیم چڑھا،

"دوسری صورت یہ کہ اگر کسی مشن کی میم صاحبہ سے بھی روزانہ یا ہفتہ وار تعلیم کی نگرانی یا صنعت سکھانے کے بہانہ سے اختلاط ہونے لگا تب تو نہ آبرو کی خیر ہے نہ ایمان کی، مگر افسوس صد افسوس کہ بعض لوگ ان آفات کو مایۂ افتخار سمجھ کر خود اپنے گھرون مین بلاتے ہین،

"اسلم طریقہ لڑکیون کے لئے یہی ہے جو زمانہ دراز سے چلا آتا ہے، کہ دو دو چار چار لڑکیان اپنے تعلقات کی جگہ آوین اور پڑھین، اگر ایسی استانی مل جاوے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے یہ تعلیم زیادہ بابرکت و باثر ثابت ہوتی ہے؛ ورنہ بدرجۂ مجبوری تنخواہ کا بھی مضائقہ نہین، اور جہان کوئی استانی بھی ایسی نہ ملے، گھر کے مرد پڑھا دیا کرین نصاب تعلیم یہ ہو کہ اوّل کلام مجید حتی الامکان صحیح پڑھا جائے، پھر سہل زبان کی دینی کتابین جن مین تمام اجزاے دین کی مکمل تعلیم ہو (اس وقت بہشتی زیور کے دسون حصے ضرورت کے لئے کافی ہین) اور اگر گھر کا مرد تعلیم دے تو جو مسائل شرم کے ہون ان کو چھوڑ دے اور اپنی بیوی کے ذریعہ سمجھوادے، اور یہ انتظام بھی نہ ہو سکے تو ان پر نشان کرادے، کہ وہ سیانی ہو کر خود سمجھ لین، یا عالم شوہر میسر ہو تو اس سے پوچھ لین گی، یا شوہر کے ذریعہ عالم سے تحقیق کرا لین گی،

"بہشتی زیور کے آخر مین کچھ اور مفید رسالون کے نام بھی لکھ دیے ہین، جن کا پڑھنا اور مطالعہ عورتون کے لئے مفید ہے، اگر سب نہ پڑھے تو ضروری مقدار پڑھ کر باقی کو مطالعہ مین ہمیشہ رکھین، نیز تعلیم کے ساتھ عمل کی بھی نگرانی رکھین، اور اس کا اہتمام بھی رکھین، کہ ان کو پڑھنے پڑھانے کا شوق پیدا ہو تاکہ عمر بھر علمی شغل رہے تو آئے

علم وعمل کی تجدید وتحریک ہوتی رہتی ہے،

"اور ضروری نصاب کے بعد اگر طبیعت مین قابلیت دیکھین تو عربی کی طرف متوجہ کرین

تاکہ قرآن وحدیث وفقہ اصلی زبان مین سمجھنے کے قابل ہو جائین، البتہ قرآن کا خالی

ترجمہ جو بعض لڑکیان پڑھتی ہین، میرے خیال مین سمجھنے مین زیادہ غلطیان کرتی ہین'

اس لئے اکثر کے لئے مناسب نہین

"یہ تو سب پڑھنے کے متعلق بحث تھی، رہا لکھنا تو اگر قرائن سے طبیعت مین بیباکی

معلوم نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہین، کیونکہ خانگی ضرورتون کے لئے اس کی بھی حاجت ہوتی

ہے، اور اگر خرابی کا اندیشہ ہو تو مفاسد سے بچنا، غیر واجب مصالح کے حاصل کرنے

سے اہم ہے، ایسی حالت مین لکھنا نہ سکھلا دین،

تحقیقِ تعلیمِ انگریزی

یہ تو تفصیل تمامتر دینی تعلیم سے متعلق اصلاح وتجدید کی تھی، جو تعلیم دین کے تمام اطراف وجوانب

کو محیط ہے، دینی مدارس، اُن کے اساتذہ وطلبہ، ان کے نصاب تعلیم وطرز تعلیم، علما، وعوام کا باہمی

افادہ واستفادہ، وعظ وافتا، تالیف وتصنیف، عورتون کا مسئلہ تعلیم، غرض تعلیم دین کے جس گوشہ

مین جو خلل وفساد نظر آیا، اس کی تنبیہ اور اس کے انسداد کی تدبیر فرمائی گئی، اور مجددین کو اصلاً وقصداً

تعلیم دینی ہی کی تجدید سے سروکار تھا، جو گویا اصلاح کا ایجابی پہلو تھا،

لیکن اس ایجاب کا ایک سلب بہت تحقیق طلب تھا، پرہیز کے بغیر کوئی علاج کارگر نہین

ہو سکتا، لادینی حکومت وسیاست کے غلبہ وتسلط کی بدولت ساری دنیا پر ایک ایسا نظام تعلیم مسلط

ہو گیا ہے، جو اپنی فطرت وساخت اپنے آثار ونتائج کے اعتبار سے بالکلیہ دنیا پرستی کا علم اور دین کی

بالکلیہ ضد اور نفی واقع ہوا ہے، یہ وہ جدید یا ہمارے ملک مین انگریزی تعلیم ہے، جو دین کے مقابلہ سے

گویا کمیون کا پکا ہوا سامان ہے، یا طاعونی جراثیم میں لپٹا ہوا جو ، جس کو جلا دینے یا جس سے بھاگ کھڑے ہونے ہی میں جان کی سلامتی ہے، اسی طرح ایمان کی سلامتی بھی، جس کو ایمان عزیز ہو اس جدید یا انگریزی تعلیم سے بعد و فرار ہی میں ہے، یہی خلاصہ ہے اُس مختصر و محققانہ مضمون کا جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ نے تحقیق تعلیم انگریزی کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے، اور جو لفظ معنیً ہی محققانہ نہیں، صورۃً بھی چند مسلّم و بدیہی مقدمات پیش فرما کر اُن کے منطقی نتائج کو واضح فرما دیا گیا ہے، اس طرح کہ پہلے دس مقدمات پھر ایک ایک مقدمہ کے حوالہ سے ان کے لازمی نتائج بیان فرمائے گئے ہیں،

لیکن چونکہ آج کل کے خطابت پسند دماغ بالعموم اتنی منطق کے متحمل نہیں رہے ہیں، اس لئے ذیل میں خفیف لفظی ردّ و بدل کے ساتھ اس کو پیش کیا جاتا ہے خصوصًا نتائج کو سب مقدمات کے بعد نہیں بلکہ ساتھ ساتھ پیش کر دیا گیا ہے تاکہ ذہن کو ہر نتیجہ کی گرفت اور مقدمہ سے اس کے ربط میں دشواری نہ ہو۔

پہلا مقدمہ۔ کسی شے کا قبیح ہونا یا تو ذاتی ہوتا ہے، یا عارضی، جیسے زنا و سرقہ کہ قباحت ان کی ذات ہی میں داخل ہے، کسی عارضی چیز کی وجہ سے نہیں آتی، اس لئے یہ کبھی کسی حالت میں جائز و مباح نہیں ہو سکتے، اور عارضی چیز کی مثال جیسے اذان جمعہ کے بعد خرید و فروخت ہے، کہ یہاں نفس بیع میں کوئی خرابی نہیں، بلکہ ایک عارضی سبب یعنی فاسعوا الی ذکر اللہ کے حکم کی وجہ سے جمعہ کی اذان کے بعد بیع ناجائز و ممنوع ہو گی،

تو اب ظاہر ہے کہ انگریزی اپنی ذات میں محض ایک زبان ہے، اور اس کی تعلیم متعارف نصاب کے اعتبار سے چند علوم و فنون کا نام ہے، اور کسی زبان یا علم و فن کا سیکھنا اپنی ذات میں ممنوع نہیں ہو سکتا،

دوسرا مقدمہ۔ البتہ جو چیز کسی عارضی و خارجی سبب سے مفاسد کا ذریعہ بن جائے، تو بذاتِ خود مباح ہونے کے باوجود ان مفاسد کی وجہ سے عارضی طور پر حرام ہو جا سکتی ہے،

جیسے ہتھیار فروخت کرنا بذات خود جائز ہے لیکن دشمن یا غداروں کے ساتھ بوجہ غدر و دشمنی کے فساد کے حرام ہے،

لہذا اگر انگریزی تعلیم پر بھی مفاسد مرتب ہونے لگیں، تو فی نفسہ جائز و مباح ہونے کے باوجود ان مفاسد کی وجہ سے حرام و ممنوع قرار پائے گی،

تیسرا مقدمہ۔ دین نماز روزہ حج و زکوۃ وغیرہ صرف چند ظاہری اعمال ہی کا نام نہیں، بلکہ سب سے بڑھ کر عقائد کا جز ہے جس پر نجات کا مدار ہے، اور ایک جز صبر و شکر اخلاص و تواضع وغیرہ اخلاق حمیدہ کا ہے: وہ بھی محققین کے نزدیک نماز روزہ ہی کی طرح فرض ہو، اگر کوئی صرف چند اعمال ظاہری کو پورا کرلے نہ عقائد ٹھیک ہوں نہ اخلاق تو اس کو پورا مسلمان ظاہر ہے کہ نہ کہا جائے گا،

اب انگریزی تعلیم کے جو آثار روزانہ مشاہد ہیں۔ وہ ملاحظہ ہوں کہ نماز روزہ میں کاہلی بلکہ اعراض، عقائد میں ضعف بلکہ تشویش و انکار، اخلاق میں تکبر و نمایش و تصنع اور کافروں کی تقلید بلکہ دینداروں کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھنا،

چوتھا مقدمہ۔ جس دنیا کی قرآن و حدیث میں ممانعت ہے، اس کا خلاصہ دو چیزیں ہیں حب مال، اور حب جاہ یعنی مال و جاہ کا ایسا محبوب ہونا کہ ان کے مقابلہ میں دین کے ضائع ہونے کا صدمہ نہ ہو، یعنی جس چیز سے مال و جاہ کی ترقی لیکن دین کا تنزل ہو تو مال و جاہ کو ترجیح دینا اور دین کی پروا نہ کرنا قرآن و حدیث پر جن کی نظر ہے، ان کے نزدیک یہ مقدمہ اجلیٰ بدیہیات میں ہے،

انگریزی تعلیم یافتہ دماغ کا کام دن رات مالی ترقی اور جاہ و منصب کے حصول کی ہوس پکانا، ان کی تحصیل کے پیچھے شرعی احکام کی ذرہ برابر بھی نظر میں وقعت نہ رہنا ہے، یہی وہ دنیا ہے

جو اللہ و رسول کے نزدیک مبغوض و ملعون ہے،

پانچوان مقدمہ۔ شریعت کے احکام کا دار و مدار حقیقت پر ہے، نہ کہ نام پر، پس اگر شراب کو شربت یا زنا کو نکاح کا نام دیدیا جائے، تو اس سے ان کا حکم نہ بدل جائے گا دونون بدستور حرام ہی رہین گی،

لوگو اس وقت ہوسناکون نے اسی ملعون و مبغوض دنیا کا نام اولعزمی و ترقی رکھدیا ہو لیکن نام یا عنوان بدل جانے سے حقیقت یا معنون تو نہین بدل جاتا،

چھٹا مقدمہ کسی شے پر جو حکم لگایا جاتا ہے، وہ غلبہ و اکثریت کی بنا پر ایک آدھ استثنا اس حکم کو غلط نہ ٹھرائے گا، مثلاً سنکھیا کی ایک خاص مقدار عام طور سے مہلک ہوتی ہے، لیکن اگر اتفاق سے کوئی شخص ہلاک نہ ہو، تو اس سے سنکھیا کے مہلک یا زہر قاتل ہونے کے حکم مین فرق نہ آئے گا،

اسی طرح اگر بعض لوگون مین انگریزی تعلیم کے مذکورہ بالا آثار نہین پیدا ہوتے ہین، تو اس کا اعتبار نہ ہوگا،

ساتوان مقدمہ کسی چیز پر کسی خاص اثر کے مرتب ہونے کا اگر حکم لگایا جائے، تو اس کے اسباب کا معلوم ہونا ضروری نہین، مشاہدہ و تجربہ بالکل کافی ہے، مقناطیس کی کشش کی علت و سبب نہ بھی معلوم ہو، تو بھی اس کے اثر کا حکم لگانے کے لئے کشش کا مشاہدہ و تجربہ کافی ہے،

لہذا صحت حکم کے لئے اس سے بحث ضروری نہین کہ انگریزی تعلیم کے اثرات ملاحدہ کی صحبت مصنفین کے خیالات، سائنس وغیرہ کسی خاص فن کی تعلیم، یا تعلیم دین کے عدم اہتمام وغیرہ کسی سبب سے پیدا ہوتے ہین، جب تک یہ آثار پیدا ہوتے رہین گے، عدم جواز

کا حکم بہ ضرورت قائم رہے گا،

ہاں اس کی اصلاح کے لئے ان اسباب پر بحث ہوگی، جس کا ذکر راقم ہذا آگے کریگا،

آٹھواں مقدمہ جس شے کو حاصل کیا جاتا ہے، وہ یا تو خود مقصود ہوتی ہے، یا مقصو کا ذریعہ ہوتی ہے، ذریعہ تو بقدر ضرورت ہی حاصل کیا جاتا ہے، مثلا غذا خود مقصود ہے تو وہ ہمیشہ حاصل کرنے کی چیز ہے، بخلاف اس کے دوا تو وہ دفع مرض کا ذریعہ ہے جب مرض نہ رہے گا، دوا سے روک دیا جائے گا،

اس لئے جو شخص دنیا کی ایسی ضرورت سے انگریزی پڑھنا چاہے، جو شریعت کی نگاہ میں بھی ضرورت ہو (اور بڑے بڑے عہدوں کے لئے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنا جس میں شریعت کی طرح طرح کی مخالفت کرنا پڑتی ہے وہ ضرورت سے خارج ہیں) یا کسی دینی ضرورت سے پڑھے مثلاً مخالفوں کو اسلام کی دعوت دینے یا ان کے اعتراضوں کو رفع کرنے کے لئے تو اس کے لئے بقدر ضرورت اجازت ہوگی،

نواں مقدمہ جن میں اہل رائے کا اختلاف ہو تو وہ دراصل دلیل کے کسی مقدمہ میں ہوگا یہ نہیں ہو سکتا، کہ دلیل تو مسلم ہو اور پھر نتیجہ میں مخالفت رہے، مثلاً زید آدمی ہے، اور جو آدمی ہو وہ لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے، اس لئے زید لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے، اب اگر کوئی شخص زید کسی گدہے کا نام رکھدے، اور کہے کہ زید چونکہ گدہا ہے اور گدہا لکھ نہیں سکتا، اس لئے زید لکھ نہیں سکتا، تو یہ اختلاف نتیجہ میں نہیں، مقدمہ یا دلیل میں ہے، جو ذرا سے غور کے بعد اٹھ جا سکتا ہے کہ اگر زید آدمی کا نام ہے تو پہلا نتیجہ صحیح اور دوسرا غلط ہے اور اگر زید گدہے کا نام ہے تو دوسرا صحیح اور پہلا غلط ہے،

لہذا اگر کسی مستند عالم کا قول یا فتوی انگریزی تعلیم کے نتیجہ یا جواز کے خلاف

پایا جائے تو حقیقت میں یہ اختلاف کسی مقدمہ میں ہوگا، نہ کہ نتیجہ میں، سو یہاں دو مقدمے ہیں ایک یہ کہ انگریزی کی مروجہ تعلیم سے فلاں فلاں خراب یا بے دینی کے اثرات پیدا ہوتے ہیں، دوسرا یہ کہ جس تعلیم سے ایسے خراب اثرات پیدا ہوں، وہ قبیح یا ناجائز ہے؛ سو پہلا مقدمہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں، بلکہ ایک واقعہ کی تحقیق ہے جس میں مشاہدہ و تجربہ میں اختلاف کی بنا پر اختلاف ہو سکتا ہے، اور اسی کی تحقیق سے ایک رائے کی صحت اور دوسری کی غلطی کا فیصلہ ہو سکتا ہے،

لیکن دوسرا مقدمہ شرعی مسئلہ اور کلی ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف کوئی مستند عالم یہ بھی تسلیم کرے کہ انگریزی تعلیم سے الحاد و بے دینی پیدا ہوتی ہے، اور پھر بھی اس کے جواز کا فتویٰ دے،

آخری دسواں مقدمہ یہ ہے کہ جو حکم یا فتویٰ کسی عارضی سبب سے ہوتا ہے وہ قدرۃً اس عارض کے بدل جانے سے بدل جاتا ہے، اس لئے اگر کسی طرح انگریزی تعلیم کے ان خراب اور مخالفِ دین آثار کا انسداد ہو جائے جن کی اوپر تفصیل گذری، اور اس تعلیم کی عام و اکثری مضرت کا دفعیہ ہو جائے، تو اس کے قبح یا عدم جواز کا حکم بھی اٹھ جاوے گا، گو موجودہ حالت میں اس کی امید بہت کم ہے،

کم کیا بس منطقی امکان سے زیادہ نہیں، راقم ہذا چوتھائی صدی سے زیادہ انگریزی کی نئی تعلیم گاہوں کالج اور یونیورسٹیوں ہی میں خدمت کرتا رہا، خصوصاً عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) میں اس تعلیم کی دینی مضرتوں کے انسداد کا ہندوستان بھر سے زیادہ ظاہری سامان فراہم ہے، اسکول ہی سے دینیات کی تعلیم لازم جس کا سلسلہ برابر بی اے تک قائم، باقاعدہ امتحانات جن میں کامیابی کے بغیر سند نہیں مل سکتی، پھر اسکول سے لیکر کالج اور میٹرک پہنچ سے لے کر ایم اے تک بلکہ پی ایچ ڈی تک علوم جدیدہ کے پہلو بہ پہلو

تفسیر و حدیث وغیرہ علوم دینیہ کا مستقل انتظام، اور پورا شعبہ موجود، اساتذہ کی تنخواہیں بھی بیش قرار اور قریب قریب وہی جو مغربی علوم و فنون کے اساتذہ کی، طلبہ کے لئے حکومت کے محکموں اور نوکریوں میں بھی وہی حقوق جو مغربیات کے طلبہ کے، وظائف کا دروازہ بھی یورپ تک کے لئے دینیات والوں کے حق میں بھی کھلا ہوا شعبۂ دینیات کے اساتذہ بھی خصوصًا دورِ اوّل کے ماشاء اللہ ایسے کہ اپنے لائق سے لائق مغربی تعلیم کے ہم چشموں یا اپنے شاگردوں کے سامنے کسی طرح شرمندہ نہیں، تعطیل اتوار کی نہیں جمعہ کی، رمضان شریف میں روزہ داروں کی رعایت میں اوقات صبح کے، بلکہ گرمیوں کے رمضان میں سرے سے تعطیل، پھر حکمران کے متعلق سب کو معلوم کہ "حامی دین" اور دینی علوم و روایات کے برقرار رکھنے پر مصر،

غرض مغربی علوم اور مغربیت کے دینی اثرات کے مقابلہ میں علومِ دین کے لزوم و اہتمام اور اہلِ دین کی وقعت و عظمت وغیرہ کے بہت کچھ ظاہری اسباب مہیا ہونے پر بھی غلبہ طلبہ و اساتذہ سب پر مغربیت اور لادینی اثرات ہی کا، وہ بھی مغربی علوم و فنون ہی کی حد تک نہیں، شعبۂ دینیات کے تفسیر و حدیث و فقہ و کلام، خالص دینی علوم و فنون کے پڑھنے والے جن کے لئے انگریزی محض زبان کی حد تک لازم ہے، ان کے عادات و اطوار افکار و خیالات صورت و سیرت ظاہر و باطن سب پر رنگ اپنے مغربی رفقاء ہی کا غالب ہے، (الا ماشاء اللہ) طلبہ تو طلبہ اساتذہ میں بھی چند قدیم دینی درسگاہوں کی صورتیں رہ گئی ہیں، جن کے رخصت ہونے پر دینی علوم کے اساتذہ کو صورۃً بھی لادینی علوم کے اساتذہ سے الگ کرنا دشوار ہو گا، رہا استثناء سو وہ استثناء ہی ہے،

یہی حال کم و بیش جامعہ ملیہ دہلی کا ہے، جو ملیہ سے زیادہ اپنی تعلیم و تربیت میں اسلامیہ ہونے کی مدعی ہے، اور اس سے بڑھ چڑھ کر حال نام نہاد مسلم یونیورسٹی (علی گڈھ) کا ہے، ان تجربات سے بہر حال حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کی اس رائے کی توثیق ہوتی ہے، کہ اس قسم کی انسدادی تدابیر کے باوجود "موجودہ حالات میں اس کی امید بہت کم ہے، کہ انگریزی تعلیم کی ان عام و اکثری مضرتوں کا دفعیہ ہو سکے"

جن کی تفصیل اوپر گذری، خصوصاً لادینی کے ساتھ ساتھ محض دینی تعلیم کا پیوند لگا دینا، یہ تو تجربہ نے ثابت کر دیا کہ بالکل ہی ناکام ہے، بلکہ اس پیوند کاری کا خود دینی تعلیم والوں پر الٹا ہی اثر پڑتا ہے کہ،

وہی نماز روزہ میں کاہلی بلکہ اعراض وہی عقائد میں ضعف وتشویش وہی اخلاق میں تکبر وتصنع وہی کفار کی تقلید کا ذوق وشوق وہی مال وجاہ کی محبت کہ ان کی طلب میں وقت کے ضائع ہونے کا صدمہ نہ ہو، اور دن رات دماغ میں بس مالی ترقی اور جاہ ومنصب کی ہوس پکاتے رہنا، جس چیز سے مال وجاہ کی ترقی ہو لیکن دین کا تنزل ہو تو مال وجاہ کو ترجیح دینا اور دین کی پروا نہ کرنا[۱]

جس کو دین کی کچھ بھی پروا ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ دین کا مغلوب دنیا نہیں، دنیا صرف راستہ ہے منزل نہیں، لہذا اگر ایسی صورت ہو کہ راستہ میں چند گھنٹوں یا ایک آدھ دن کی کھانے پینے کی بھی تکلیف ہو، سفر بھی تھرڈ کلاس میں، بلکہ آج کل کی طرح ریل کے پائدان پر لٹک کر ہی، (جس میں جان تک کا خطرہ ہے) طے کر لینا پڑے، اور منزل پر پہنچ کر مستقل سکونت کے لئے باغ وبنگلہ نوکر چاکر عیش وراحت کے سارے لوازم مہیا ہوں، تو اس سے بڑھ کر کون احمق ہوگا، جو اس عیش وراحت کو قربان کرکے چند گھنٹوں کے سفر میں فسٹ یا سیلون واسٹیشن کے پیچھے جان دیتا پھرے، اور منزل پر پہنچکر جھونپڑا بھی نصیب نہ ہو، بلکہ دن رات تپتی ہوئی صحرائے افریقہ کی ریت کا بستر ہو، اور اوپر دماغ کھولانے والے خط استوا کے سورج کا سائبان! ہاں اگر منزل کے کامل ودائم عیش وآرام میں کچھ بھی خلل آئے، بغیر سفر میں کچھ کچھ اس سکنڈ کی راحت میسر آجائے تو مضائقہ نہیں، نہ خواہ مخواہ سفر میں مصیبت اٹھانا فرض ہے، غرض جس شخص کو کچھ احساس ہے کہ مسلمان ہونے کے معنی اس دنیا میں

---

[۱] بزرگان نے نیک نیتی سے، اور لادینی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا نہیں، بلکہ دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کا ذرا سا پیوند لگا دیا تھا، اس نے بھی بعض اور اسباب کے ساتھ مل کر دینی واخلاقی اعتبار سے کچھ ایسی حالت

ایمان لاسکتے ہیں، کہ اس دنیا کی ساٹھ ستر سال کی عارضی زندگی (وہ بھی ایسی غیر یقینی کہ یقین ایک سانس کا بھی نہیں) کے سفر کے بعد ایک ابدی کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی ہماری اصلی منزل ہے جہاں کے روحانی انعامات ودرجات کا تو تصور ہی کون کر سکتا ہے، لباس وطعام تزک واحتشام عیش و آرام جس کے لئے ہم اس دنیا میں مرتے ہیں، وہ بھی یہاں سے ہزارہا ہزار درجہ بہتر ہوگا، اور یہ تمامتر احکام شریعت کی متابعت اور خدا و رسول کی رضا واطاعت پر موقوف ہے تو وہاں کی جنت کے مقابلہ میں بھلا یہاں کی ہفت اقلیم کی سلطنت کو بھی کون ترجیح دے گا؟ غالباً حضرت ابراہیم ادہم کی حکایت ہے، کہ اُن سے کسی نے بہت تعجب سے کہا کہ آپ نے بھی فرمایا کہ بادشاہی پر لات ماردی' فرمایا میں نے کیا کمال کیا، کمال اُن کا ہے جنھوں نے جنت پر لات ماردی،

جب تک دین ودنیا کے تعلق کا یہ دینی تصور دل ودماغ پر غالب نہ ہو اُس وقت تک دنیوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا خالی پیوند لگا دینے سے ہرگز دل ودماغ میں دنیا پر دین کی ترجیح وتفوق کا رنگ ورجحان پیدا نہیں ہوسکتا، یہ رنگ پورا تو جب ہی چڑھ سکتا ہے، کہ موجودہ لادینی تعلیم وتہذیب جس کا نصب العین سرتاسر "حیات دنیا کی زینت" ہے، اور اس نصب العین کی پشت پناہی کرنیوالے نظام حکومت وسیاست کا سرے سے تختہ اُلٹ دیا جائے، اور اس کی جگہ تعلیم وتمدن حکومت وسیاست سارے ماحول پر عملاً دینی تصورات کی حکومت ہوجائے،

باقی خالص دنیا پرستی کے موجودہ تعلیمی وتمدنی نظامات کے رہتے اُن کے لادینی اثرات کے انسداد کی تھوڑی بہت اگر کوئی صورت ہے تو باہمت اہل دین کے لئے تو یہ کہ اس تعلیم کے مقابلہ میں اپنی اولاد کو

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹) کے آثار ورجحانات پیدا کئے، جو حضرت مجدد نے ان ہی چار سطروں میں خالص انگریزی تعلیم کے جمع فرما دیئے ہیں، الحمد للہ کہ اب نسبتہً کچھ اصلاح ہے، مگر نسبتہً ہی اگر علامات مرض کے ساتھ اسباب مرض کی طرف بھی توجہ فرمائی جاسکے، تو انشاء اللہ پوری اصلاح کی امید ہے،

ضرورت سے زیادہ مشکل اور دشوار نہیں ہے، جو کچھ اگریزی بھی خالص دینی تعلیم دلا سکیں دلائیں، خواہ اس کی بدولت دنیا میں اولاد کو کسی معاش کا مزدور ہی بننا پڑے، لیکن اس مزدور کا اگر عمل نہیں تو انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ایمان سلامت رہ جائے گا، یا پھر دوسرے درجہ پر جن کو اتنی ہمت نہیں وہ اس موجودہ انگریزی تعلیم سے پہلے بقدر ضرورت دینی تعلیم اور اس کے ساتھ لیکن اس سے بڑھ کر دینی تربیت کا اہتمام کریں، اور یہ اہتمام بالخصوص تربیت کا انگریزی تعلیم کے اختتام تک جاری رہے، اور "ولایت تاب" (یورپ ریٹرن) بنانے کا نام تو کسی حال میں نہ لیں، کیونکہ وہاں سے اپنے دین کو بس کوئی پیدائشی واقعی سچا "ولایت تاب" ہی بچا لا سکتا ہے،

انگریزی سے پہلے بقدر ضرورت دینی تعلیم و تربیت کی عام صورت یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم اور ختم قرآن (ترجمۃً یا قطعاً ورنہ ناظرہ) کے بعد حضرت علیہ الرحمہ کا سہ سالہ تعلیمات عشرہ والا دینی تعلیم نصاب اس دینی تربیت کے اہتمام کے ساتھ پورا کرایا جائے، جس کا نمونہ ہردوئی کا اشرف المدارس[1] ہے، اور اس نمونہ پر جہاں جہاں اور جتنے زائد سے زائد مدارس قائم کئے جا سکیں کئے جائیں،

اس لازمی دینی تعلیم اور تربیت کے معتد بہ رسوخ کے بعد انگریزی اسکول و کالج میں اس شرط کے ساتھ داخل کیا جا سکتا ہے، کہ قیام ہاسٹل میں ہرگز نہ ہو، گھر ہی پر ہو، اور سرپرست اس تربیت کی پوری حفاظت کریں جو اشرف المدارس یا اس کے ہم رنگ مدارس میں بچوں نے حاصل کی ہو، یا ایسے ہی اسلامی اقامت خانے (ہاسٹل) قائم کئے جائیں جن میں اشرف المدارس کے رنگ کی دینی تربیت کا پورا انتظام ہو، اور انگریزی تعلیم کے اسی دوران میں حضرت علیہ الرحمۃ کی کتابوں خصوصاً ملفوظات و مواعظ کا مطالعہ لازماً بلا ناغہ روزانہ کچھ نہ کچھ جاری رہے، یا ایسے اقامت خانوں کا نگران روزانہ آدھ گھنٹہ لڑکوں کو جمع کر کے لازماً سنا دیا کرے، باوجود اس کے پھر بھی اگر انگریزی اسکول یا کالج میں کسی لڑکے کا رنگ بگڑتا دیکھے تو اس کو فوراً ہٹا لے اور اس کے لئے انگریزی تعلیم کا خیال بالکل ہی ترک کر کے کسی اور معاشی راہ پر ڈال دے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ

---

[1] جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور جس کا اصل امتیاز خالص دینی تربیت ہے۔

ہے گا، انشاء اللہ وہ بھی دنیا مین محتاج و مضطر نہ ہوگا، گو کلکٹر و کمشنر نہ ہو مگر خدا اور رسول کے حضور مین مسلمان کی حیثیت سے تو حاضر ہو گا، باقی جن قلوب مین دین کی اتنی بھی قیمت و وقعت نہین ہے ان سے خطاب ہی نہ ان کی خدمت مین عرض کرنے کا کچھ حاصل سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ دُنیا کی آنکھ بند ہوتے ہی دین کی آنکھ خود کھل جائے گی، مگر اُس وقت اس حسرت کے سوا کیا حاصل کہ

یَا لَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ،

ہائے کیا اچھا ہو کہ ہم پھر دنیا مین واپس بھیج دیے جائین اور اگر ایسا ہو تو ہم اپنے رب کی آیات کی پھر تکذیب نہ کرین، اور ایمان والون مین ہو جائین

اردو کی اہمیت آخر مین چند سطرین اردو کے متعلق بھی لائق توجہ ہین، اور تعلیم سے متعلق جن تجدیدات و اصلاحات کو پیش کیا گیا وہ تو کم و بیش سب ہی ایسی ہین کہ ساری دنیا کے مسلمانون کو ان کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، لیکن اردو زبان کا معاملہ صرف ہندوستان کے مسلمانون سے تعلق رکھتا ہے، اور یہی نہین کہ یہان کے مسلمانون مین سب سے زیادہ اس زبان کو عموم و قبول حاصل ہے، بلکہ اس نے اپنے اندر اسلامی و دینی علوم و فنون کا اتنا سرمایہ پیدا و منتقل کر لیا ہے، جو نہ صرف مسلمانون کی عام ضروری دینی تعلیم کے لئے کافی ہے، بلکہ اسلامی تعلیمات کے وسیع تر مطالعہ کا شوق رکھنے والون کی تشفی کے لئے بھی عقلی و نقلی دونون اعتبار سے بہت کچھ ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے، اور راقم احقر کے نزدیک تو اردو کی اہمیت و فضیلت کے لئے یہی کافی ہو کہ مجدد وقت کی تجدیدات کے قریب قریب سارے خزانون کی کنجی یہی ہے

غالباً اردو ہی سے متعلق کسی کانفرنس مین عام اشتہار اور خاص خط کے ذریعہ حضرت سے شرکت کی درخواست کی گئی تھی، جواب مین تحریر فرمایا کہ

"اس خط و اشتہار کو پڑھ کر قلب مین ایک حرکت پیدا ہوئی، کہ اس خدمت مین کسی قسم کا حصہ لیا جاوے، چونکہ متعارف خدمتون کی نہ صلاحیت، نہ قوت، اور غالباً ایک

خاص خدمت کی طرف کسی نے توجہ بھی نہیں کی"

ظاہر ہے دینی اعتبار سے ہر چھوٹی بڑی چیز کی طرف توجہ تو وقت کے مجدد اور جامع المجددین ہی کی ہو سکتی ہے، بہرحال وہ خاص خدمت

"اس کی تحقیق ہے کہ اس تحریک کا شرعی درجہ کیا ہے، اس کی ضرورت بھی اس لئے محسوس ہوئی کہ اس وقت اس مسئلہ نے تمدن و قومیت سے آگے بڑھ کر مذہبیت کی صورت اختیار کر لی ہے، اس لئے خیال ہوا کہ اس کے متعلق ایک مختصر تحریر منضبط کر کے بھیج دی جائے،

اس تحریر میں پہلے چند آیات اور حدیث و فقہ کی روایات نقل فرمائی گئی ہیں، اور پھر ان سے اردو کی دینی و شرعی حیثیت و درجہ کے متعلق نتائج اخذ فرمائے گئے ہیں، جو تلخیص و تسہیل کے ساتھ درج ذیل ہیں:۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ زبانوں کے اختلاف و تنوع اور قدرت بیان کو خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی آیات و دلائل میں شمار فرمایا گیا ہے، "وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خلق السّمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم الآیۃ" اور قدرت بیان کی تعلیم کو بطور احسان و انعام جتلایا گیا کہ "عَلَّمَ القرآن خلق الانسان عَلَّمَہُ البیان" اس سے معلوم ہوا کہ تمام زبانوں کا استعمال بجائے خود جائز و مباح ہے لیکن اسباب و خصوصیات عادیہ کی بنا پر جو بمنزلہ لوازم کے ہو گئی ہیں، بعض زبانوں کو بعض پر فوقیت و فضیلت بھی حاصل ہے، چنانچہ عربی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کو تین وجہ سے محبوب رکھو، ایک تو میں عربی ہوں، دوسرے قرآن عربی ہے، اور تیسرے اہل جنت کی گفتگو عربی ہوگی، "احبوا العربیۃ لثلاث لانی عربی والقرآن عربی وکلام اہل الجنۃ عربی" اسی طرح مثلاً اعراب (دیہاتیوں) کے بعض محاوروں کے استعمال سے

منع فرمایا گیا ہے، (لا تقبلنکم الاعراب علی اشد صلاتکم تا نجا فی کتاب اللہ انشاء ... و انھم لیقیمون بجلاب الآیہ)

"ان دونوں واقعوں میں غور کرنے سے صاف معلوم و مفہوم ہوتا ہے کہ کسی زبان کی فضیلت یا مذمت یا مدح و قدح کی بنیاد اس زبان کا کسی فضیلت یا مذمت کی چیز سے تعلق و تلبس ہے، خواہ وہ چیز کوئی عین ہو، یا معنی"

عربی کے بعد فارسی کو اسی تعلق و تلبس کی بنا پر چند وجوہ سے فضیلت حاصل ہے ایک تو اس کا مقبولین کی جماعت سے تعلق، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، کہ سورۂ جمعہ اور اس میں یہ آیت نازل ہوئی وَ آخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوا بِهِمْ لوگوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ اس آیت میں کون لوگ مراد ہیں؟ اس وقت سلمانؓ فارسی بھی حاضر تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے اوپر رکھا اور فرمایا کہ اگر ایمان ثریا میں ہوتا تو یہ لوگ اس کو ضرور حاصل کر لیتے،

"اس کی شرح لمعات میں ہے کہ مراد لَمَّا یَلْحَقُوا بِهِمْ سے عجمی یا فارسی حضرات تابعین رضی اللہ عنہم ہیں کیونکہ وہ صحابہ سے لاحق تھے، اور اکثر تابعی اہل عجم میں سے ہی ہوئے ہیں، اور علم و اجتہاد جس درجہ کا ان عجمی تابعین میں ظاہر ہوا، دوسروں میں نہیں ہوا"

بعض محققین نے لکھا ہے کہ فارسی کی اس فضیلت کی بنا پر امام صاحب نے ایک وقت میں فارسی میں نماز کی قرأت کو جائز فرما دیا تھا، گو بعد میں رجوع فرمالیا، لیکن رجوع فرمانے سے اصل بنا کا معدوم ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ یہ رجوع کسی اور قوی تر معارض

کہ سبب ہے ذکر اصل زبان کے نسبت کے سبب

اسی طرح بخاری وغیرہ کی بعض روایات نقل فرمائی ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا فارسی الفاظ استعمال فرمانا ثابت ہے، اور بعض روایات میں فارسی کے استعمال کی جو کراہت آئی ہے، اس کی سند کو خود امام بخاری نے واہی یا پوچ قرار دیا ہے، اس کے علاوہ یہ کراہت جب ہے کہ کوئی فارسی کو عربی پر ترجیح دے،

اسی طرح درمختار وغیرہ فقہ کی بعض کتابوں میں فارسی کو عربی سے اقرب اور دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اس کی فصاحت کی بنا پر اشرف قرار دیا ہے، بخلاف بعض دوسری زبانوں کے جن میں ثقل و تنافر بکثرت ہے،

ان تمہیدی مقدمات سے حضرت علیہ الرحمۃ نے اردو کے متعلق جو تفریع اخذ فرمائی ہے، وہ کم و بیش بالفاظہ ملاحظہ ہو،

"جس طرح فارسی کو عربی سے مناسبت ہونے کی بنا پر فضیلت حاصل ہے، اور چونکہ اس فضیلت کا اثر احکام دینیہ میں بھی ہے، اس لئے وہ فضیلت دینیہ ہے، اس طرح بلا شبہہ عربی و فارسی کے ساتھ ایسی ہی قوی مناسبت ہونے سے اردو کو بھی دینی فضیلت حاصل ہے، بلکہ فارسی کو تو عربی سے صرف مشابہت ہی کی مناسبت ہے، اور اردو کو فارسی و عربی سے جزئیت کی مناسبت ہے، فارسی و عربی کے جس کثرت سے مفرد الفاظ اردو میں ہیں کسی زبان میں بھی نہیں، مفرد الفاظ ہی کیا بہت سے جملے ایسے ہوتے ہیں کہ بجز کاف وغیرہ روابط کے پورا مادہ فارسی و عربی میں ہوتا ہے، یہ تو فضیلت والی زبانوں سے اردو کا تعلق و تلبس ہوا،

دوسری فضیلت اردو کی یہ ہے کہ دینی علوم خصوصاً علم و معقول تصوف کا اتنا

غیر محدود و غیر محصور ذخیرہ ہے جس کو علماء و مشائخ نے صدیوں کی مشقت اور اہتمام سے جمع فرمایا ہے، خدانخواستہ اگر یہ زبان ضائع ہو گئی، تو یہ تمام ذخیرہ ضائع ہو جائے گا، بالخصوص عام مسلمانوں کے لئے تو علم دین کا کوئی ذریعہ ہی نہ رہے گا، کیونکہ عربی نہ جاننے کی وجہ سے ان کا استفادہ اردو ہی پر موقوف ہے، اور کیا اس طرح ضائع ہوتے دیکھنا اور انسداد نہ کرنا شرعاً جائز ہے؟"

ایک اور خصوصیت اردو کی اس کا سلیس و آسان ہونا ہے، یہ بھی بڑی فضیلت ہے کیونکہ حصول دین کے لئے زبان کی آسانی اور تیسیر کو اللہ تعالیٰ نے بطور احسان کے ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِہِ الْمُتَّقِیْنَ، وقال تعالیٰ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ وغیرہ آیات سے ظاہر ہے،

"غرض اس وقت اردو زبان کی حفاظت دین کی حفاظت ہے، اس بنا پر یہ حفاظت حسب استطاعت واجب و طاعت ہے، اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت کرنا معصیت و موجب مواخذۂ آخرت ہوگا، واللہ اعلم (النور رمضان ۱۳۵۵ھ)

آخر میں بلکہ اول و آخر زیادہ یاد رکھنے کی باتیں دو ہیں، ایک یہ کہ جن علوم و فنون کا تعلق انسان کی خالص دنیاوی، مادی و حیوانی زندگی کی حاجات سے ہو، وہ دین کی نگاہ میں سرے سے علم ہی نہیں، علم وہی ہے جو انسان کے انسانی مقصد وجود اور اس کی تکمیل کی راہ دکھلائے، ثانیاً اس زمانہ میں پتھر کے بتوں سے بڑھ کر جو نئے نئے بت تراش لئے گئے ہیں، اُن میں سے ایک "علم برائے علم" ہے یعنی علم و فن کو بذاتِ خود ایک صنم اعظم بنا لیا گیا ہے، غیر ضروری سے غیر ضروری شے کی تحقیقاتِ عالیہ (ریسرچ) بھی فی نفسہٖ مطلوب و معبود بن گئی ہے، اگر فردوسی کی قبر کا پتہ لگا کر اس پر بھی کوئی ایک مقالہ لکھ ڈالے تو وہ بھی ڈاکٹر یعنی علم کا مستند محقق و ماہر بن جا سکتا ہے!

سو خوب معلوم رہنا چاہئے، کہ توحید کامل کے دین (اسلام) میں خدا یا خدا کی رضا جوئی کے سوا کسی شئے کو بھی مطلوب و مقصود بالذات بنانا اگر جلی نہیں تو خفی شرک یقیناً ہے، حتٰی کہ خود علم دین بھی محض خدا شناسی اور خدا کی رضا طلبی ہی کے لئے مطلوب ہے نفس دینی معلومات کا جان لینا یا مسائل و اصطلاحات کا یاد کر لینا قطعاً مقصود بالذات نہیں، بالفاظ دیگر "علم علم کے لئے نہیں" بلکہ "علم عمل کے لئے مطلوب ہے" خواہ یہ عمل قلب کا ہو، یا قالب کا، ایمانیات و اعتقادیات تک کا فقط جان لینا مطلق نافع نہیں، ان کا بھی اصل مطلوب ماننا یعنی قبول و یقین کرنا ہے، جو قلب کا عمل ہے، علم بلا عمل یا علم غیر نافع سے تو صراحۃً پناہ مانگی گئی ہے،

ماننے کا بھی ایک تو اعتقادی درجہ ہوتا ہے، جیسا کہ عام مسلمانوں کا، اور ایک حالی درجہ ہے، جس میں قلب کا قبول و یقین پوری زندگی کا حال بنجاتا ہے، اور زندگی کے سارے اعمال و افعال، حرکات و سکنات میں ابھرآتا ہے، کامل یا پورا علم بھی پوری طرح کا ماننا ہے یعنی خدا کا تعلق یا اس کی رضا و ناراضی، محبت و خشیت قلب کا ایسا حال بنجائے کہ نہ اختیار بھر طاعت میں کمی ہو، اور نہ دیدہ و دانستہ معصیت پر جرأت، العلم والخشیۃ نام کے وعظ میں ارشاد ہے کہ

"علم کی دو قسمیں ہیں اور یہی دو قسمیں خشیت میں بھی جاری ہیں، ایک عقلی اور ایک حالی، عقلی کو کبھی اعتقادی اور حالی کبھی کہدیتے ہیں، پس جہاں علم اعتقادی ہے وہاں خشیت بھی اعتقادی ہے، اور جہاں علم حالی ہے، جس کو کہا ہے، کہ

ع علم گر بر دل زنی یارے بود

وہاں خشیت بھی حالی ہوگی،

مگر کمالِ ایمان کے لئے خشیت اعتقادی کافی نہیں، بلکہ خشیت حالی کی ضرورت ہے،

اور اسی درجہ کمال کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، کہ لا یزنی الزانی حین

یزنی وھو مومن، یہاں محض ایمان یا علم و تصدیق اعتقادی مراد نہیں بلکہ ایمان کامل مراد ہے، جس کے ساتھ خشیت عملی ہوتی ہے، اب یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا کہ ہم بہت مسلمانوں کو زنا کار دیکھتے ہیں، جواب یہ ہے کہ یہاں مراد مومن اعتقادی نہیں" مومن حالی ہے،"

"ایسا علم جو خشیت سے خالی ہو علم ہی نہیں، صاحبو! علم کو میراث انبیا کہا جاتا ہے تو اب دیکھ لو کہ انبیاء کی میراث کونسا علم ہے، کہ انبیاء کا علم ہی نعوذ باللہ ایسا ہی تھا جس میں محض مسائل و اصطلاحات کا لفظ ہو، اور خشیت کا نام نہ ہو، ہرگز نہیں وہاں تو یہ حالت تھی کہ جتنا علم بڑھتا تھا، اتنی ہی خشیت بڑھتی تھی، حدیث میں ہے کہ انا اَعلمکم باللہ واخشاکم للہ،

اب ہماری حالت یہ ہے کہ علم حاصل کرتے ہیں، پھر پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں، اور اسی کو مقصود سمجھتے ہیں تحصیل خشیت کا اہتمام نہیں کرتے، حالانکہ غیر مقصود کو مقصود بنا لینا مکروہ ہے فقہا نے اس راز کو خوب سمجھا، فرماتے ہیں، کہ ایک وضو سے جب تک نماز نہ پڑھ لی جائے، دوسرا وضو کرنا مکروہ ہے، ظاہر میں تو شبہ ہوتا ہے، کہ فقہاء نے ایک عبادت کو منع کیا، مگر یہ لوگ حکماء امت ہیں، واقعی خوب سمجھے کہ جب اس غیر مقصود کو اداے مقصود سے پہلے مکرر کیا تو غیر مقصود کو مقصود بنا لیا، اور یہ حد سے تجاوز ہے، اسی طرح تعلیم و تعلم کو مقصود بالذات سمجھ لینا بھی حد سے تجاوز ہے'

غرض دین کی نگاہ میں حقیقی و کامل علم وہی ہے، جو عمل و اثر سے خالی نہ ہو یعنی جو اطاعت کا باعث و موجب اور معصیت سے حائل و حاجب ہو، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ

اَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنِيْ وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ " اس سے معلوم ہوا کہ خشیت مطلوبہ وہی ہے، جو گناہ سے حائل (مانع) ہوجائے، پس جس کو یہ حیلولت حاصل نہیں، اس کو خشیت مطلوبہ ہی حاصل نہیں" اور جب خشیت نہیں تو علم حاصل ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں، گو کتابی علم حاصل ہو، مگر شریعت میں جو علم مطلوب ہے، وہ محض کتابی نہیں، بلکہ وہ علم مطلوب ہے، جو دل میں اتر جائے،

غرض مطلوب شرعی وہی علم ہے، جو اپنے اثر کے ساتھ ہو جیسے تلوار وہی مطلوب ہو جس میں کاٹ بھی ہو، ورنہ براے نام تلوار ہوگی، لہذا جو علم اثر سے خالی ہو وہ مطلوب ہی نہ ہوگا، خوب سمجھ لو اسی کو کہتے ہیں کہ

علم چہ بود آنکہ رہ بنماید ت | زنگ گمراہی زدل بزداید ت
این ہوسہا از سرت بیرون کند | خوف وخشیت دردلت افزون کند
تو ندانی جز یجوز ولا یجوز | خود ندانی تو کہ حوری یا عجوز

اور جب تمھارے علم کی یہ حالت ہے کہ سواے یجوز ولا یجوز کے کچھ خبر نہیں "اور دل پر اسکا کچھ اثر نہیں، تو پھر اس پر بے تکلف اس خطاب کو مرتب کرسکتے ہیں کہ

اَیُّہَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَہ | کُلُّ مَا حَصَّلْتُمُوْہُ وَسْوَسَہ
علم نبود غیر علم عاشقی | مابقی تلبیس ابلیس شقی

مگر ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ "علم عاشقی" سے کیا مراد ہے،

علم دین فقہ است وقرآن وحدیث
ہر کہ خواند غیر ازین گردد خبیث

یہ اس واسطے کہدیا تھا کہ معلوم ہوجائے کہ علم عاشقی سے مراد علم دین ہے، کیونکہ ایمان کی

عشق ہے، وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ اور جب ایمان عشق ہے، تو اسی کا علم علم عاشق ہے[1]؛

دین کے مدرسون کا بھی ایسا علم جو عشق و اثر سے خالی، اور صرف مسائل و اصطلاحات کا خفظ ہو، جب وہ "تک وسوسہ اور تلبیس ابلیس" کے سوا کچھ نہیں تو دنیا کے کالجون اور یونیورسٹیون کے علوم و فنون اور تحقیقات عالیہ (ریسرچ) کو علم کا نام دینا حقیقی علم والون کی نظر مین زندگی کو کافور کا نام دینے کے سوا کیا ہو سکتا ہے،

---

[1] یہ سب اقتباسات العلم والخشیۃ ہی سے ملخصاً ماخوذ ہین،

رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم)

مدرسون اور اسکولون کے طالب علمون کے لئے عام فہم اور سادہ زبان مین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت مجلد ۱۲؍، غیر مجلد ۱۰؍ (طبع چہارم)

سیر انصار حصہ اول

اس مین انصار کرام کے حالات و سوانح اور اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور سیاسی کارنامون کی پوری تفصیل کی گئی ہے، اس سے پہلے ایک بسیط مقدمہ مین انصار قبل از اسلام کی مفصل تاریخ، ان کے نسب نامے آداب و تمدن اور معاشرت و اخلاق کو نمایان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ حصہ انصار کی تاریخ قبل الاسلام اور بعد الاسلام کا ایک بہترین مجموعہ بن گیا ہے، طبع دوم ضخامت ۴۱۲ صفحے، قیمت:۔

"منیجر"

ذوالکفل

از

مولانا ابوالجلال صاحب ندوی

قرآن کریم کی سورۂ انبیاء میں جن پیغمبروں کے نام آئے ہیں، ان میں سے ایک حضرت ذوالکفل ہیں، اُن کی بابت قطعی طور پر چند یوم قبل تک ہم صرف اتنا جانتے تھے، کہ

(۱) ان کے نام یا لقب کا ترجمہ بار اٹھانے والا ہے، انھوں نے کوئی اہم بار اٹھایا تھا، اس لئے اُن کو یہ لقب ملا،

(۲) اللہ نے اُن کا ذکر سورۂ انبیاء میں پیغمبروں اور نبیوں کے زمرہ میں یہ بتانے کے لئے کیا ہے کہ سارے انبیاء بشر تھے، کسی کو حیات جاوید عطا نہیں ہوئی،

(۳) یہ حضرت ادریسؑ اور حضرت اسماعیلؑ جیسے صابروں میں سے تھے،

(۴) صالحین میں سے تھے،

(۵) اللہ نے اُن کو اپنی رحمت میں داخل کر لیا، یعنی اب وہ زندہ نہیں،

اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے تھے، قرآن کریم میں ان کا نام ہی نام ہے کہیں اُن کا قصہ مذکور نہیں ہے کسی حدیث مرفوع متصل میں بھی ان کا تذکرہ نہیں ہے، اس لئے ان کی تشخیص و تعیین میں گفتگو کی گنجائش ہے، جیسی کہ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کو اس بات کا قائل کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالکفل کے لقب سے ہمارے ہندوستانی کپل وستو کے حکیم صالح اور مرشد صابر کا ذکر

کیا ہے، جو حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے اس شعر کے بالکل خلاف ہے،

ومنا نبی اللہ هود وصالح وذوالکفل منا والملوک الاعاظم

ایک قدیم کتبہ..... سے قطعی طور پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ حضرت ذوالکفل کی بابت حضرت نعمان بن بشیر کا یہ دعویٰ کہ وہ ہم عربوں میں سے تھے، بے بنیاد نہیں ہے، وہ ایک ایس عرب یعنی عرب کے مرد تھے، ان کا نام اذ تھا، وہ للا نامی ایک عورت کے اک (شوہر) تھے، وہ خود کو خولان کا ایس الس کہتے تھے، اور بنو خولان اُن کو اپنا ادمن (رضاعی باپ) کہتے تھے، قدیم خولانی عربی کا مرکب توصیفی ایس الس اور حمیری اور عدنانی لفظ ذوالکفل دونوں مترادف لفظ ہیں،

آثار قدیمہ کے فرانسیسی مشن پیرس کا شائع کیا ہوا ایک اٹلس جس میں ایلہ، تیما، اور تبوک کے اطراف کی عمارتوں اور کتبات کے فوٹو ہیں، دار المصنفین کے کتبخانہ میں موجود ہے، اس کی پلیٹ LXXIII پر ایک تحریر کا عکس ہے جس کا نمبر ہے، یہی کتبہ قابلِ قرأت اور صاف اندا ز تحریر میں پلیٹ XCV پر بھی موجود ہے، اس دوسرے پلیٹ کا چربہ ہدیۂ ناظرین ہے یہ کتبہ ایلہ کی ایک چٹان پر ملا ہے،

اتفاق سے ایک روز میں نے اس کو دیکھنا شروع کیا، تو اس میں کئی ایک جانے پہچانے ہوئے نام ملے، اس لئے غور سے پڑھنا شروع کیا، تو ایک نہایت اہم کتبہ ثابت ہوا،

چربہ پر نظر کیجئے اس میں ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے ممتاز کرنے والا کوئی نقش نہیں ہے، ہمدانی نے لکھا ہے، کہ مسند لکھنے والے ہر دو لفظ کے درمیان ایک کھڑی سی لکیر کھینچتے ہیں لیکن یہ بعد کی رسم کا ذکر ہے، اس کتبہ میں بھی ہمارے الف جیسی کھڑی لکیریں ہیں، مگر اس طرح واقع ہیں، کہ اُن کو خطوط فاصلہ باور نہیں کیا جاسکتا، الف نما خطوط کو حرف مدولین پڑھنے سے عبارت عبرانی آمیز عربی بن جاتی ہے،

جب اس عبارت کو پڑھنے کی ہم نے کوشش کی تو سب سے پہلے حروف کے مکرر مجموعوں کو الگ لکھ لیا، مثلاً ? ħ o ɔ ɑ جو کہ دوسری اور نویں سطر میں موجود ہے اس طرح کے تمام الفاظ جمع کرکے عربی اور عبرانی نقشوں سے ان کے معنی نوٹ کئے، اس کے بعد ان مختصر مجموعوں کو لغات میں تلاش کیا، جو ایسے الفاظ کے مابین ہیں، کتبہ کے اسماء اور الفاظ کے ایسے معانی نے جو ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں کتبہ کا مضمون بتادیا، جس سے تمام حروف کو مرکب الفاظ میں ڈھال لینا آسان ہوگیا،

اس کتبہ کے تمام نقوش چند کو چھوڑ کر نشوان کی شمس العلوم کے مندرجہ حروف کے جیسے ہیں اور چند نقوش بدلے ہوئے ہیں ان کو ہم نے اکلیل، فہرست ابن ندیم، تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان، تاریخ الادب حفنی بک، انسائی کلوپیڈیا بریٹانیکا ۱۹۲۶ء سے ملالیا ہے، صرف ایک نقش ‍ ‍ کو ہم نے ان کتابوں میں نہیں پایا، مصری ماعت کی شکل حہ، عہ، عو اور عا میں بدل سکتی ہے، اس لئے اس نقش کو ہم نے ع پڑھا، پورے کتبہ میں یہ نقش ایک ہی بار آتا ہے، کتبہ کی پہلی سطر یہ ہے،

① [illegible]

و هر عن ۳ كان اشتش ۲ هر ست هعلى يا جلاء

پورے کتبہ کو پڑھنے سے پہلے اس سطر کو سمجھ لینا چاہئے، ہم نے بات کی تکمیل کے لئے دوسری سطر کا

پہلا لفظ بابلی سے لیا ہے، اس عبارت کے الفاظ کاآن ،بت ،انخی اور جلا ر کو ہر عربی دان بآسانی سمجھ سکتا ہے، عبرانی زبان میں عربی من کا مطلب دیتا ہے، عن ششش، اور باتشرتح طلب الفاظ ہیں،

عربوں نے غیر معلوم زمانہ سے ۲۸ تارے ایسے مقرر کئے تھے، جن میں سے ہر تارا اپنے طلوع سے ۱۰۳ دنوں کے بعد غروب ہو جاتا ہے، ہر تارے کے دو طلوعوں کے درمیان ۳۶۵ یا ۳۶۶ دن کی مدت ہوتی ہے، ان تاروں میں سے ہر ایک اپنے پیشرو سے ۱۳ یا ۱۴ دنوں کے بعد اس طرح طلوع ہوتا ہے، کہ دو تین دنوں تک صبح کے وقت جس وقت ایک تارا مشرق سے طلوع ہوتا ہے، اس کے مقابل میں عین اسی وقت چودھواں تارا غروب ہوتا رہتا ہے، اس آمنے سامنے کے طلوع و غروب کا نام نوء ہے، عرب کے لوگ اسلام کے ظہور سے قبل کاروباری، موسموں وغیرہ کے لئے انہی انواء کے حساب سے دن شمار کرتے تھے، یہ دستور اتنا قدیم ہے، اسی لفظ نوء کا عکس انو (آن) وقت اور زمانہ پر دلالت کرتا ہے، اسی کا مختصر نو سمیری میں آسمان کا نام تھا، اور بابل میں انو آسمان کو کہتے تھے، عرب بولتے تھے، لا افعل ھذا ما اَنّ فی السّمَاء نجم صاحب صراح نے لکھا ہے، کہ اس فقرہ میں اَنّ دراصل عَنّ (نمودار ہوا) کا بدل ہے، عَنّ سے اسم فاعل عان بنا، جو عربی میں مستعمل نہیں ہے، مگر قاعدہ سے اس کے معنی ہیں "نمودار ہونے والا ستارہ" یہی مطلب اس کتبہ میں عن کا ہے، ۲۸ نجوم انواء میں سے تیسرے کا اس کتبہ میں ذکر ہے، عن کا ترجمہ ہندی میں نچھتر کر سکتے ہیں،

مہینہ کو انگریزی میں منتھ کہتے ہیں، جو اصل میں مونسس تھا، جو دو لفظوں کا مجموعہ ہے، (۱) مون (۲) سیس، یہ دونوں لفظ اس زمانہ کے ہیں، جب آریائی اور سامی زبانیں بولنے والی اقوام دو قومیں نہیں بنی تھیں، بلکہ ایک خاندان تھیں، یہ دونوں لفظ سامی اور آریائی زبانوں میں اتنے قدیم زمانہ سے یکساں مستعمل ہیں کہ ایک کو دوسرے سے عاریت لیا ہوا نہیں بتایا جا سکتا، سیسان عربی میں چاند کے متروک ناموں میں سے ہے، ابن سیدہ نے تیرھویں تاریخ کو لیلۃ السیسان بتایا ہے

چاند کو قرآن نے پہلے سے وقت کا پیمانہ بتایا ہے[1] چاند کا قدیم سامی نام میں خود پیمانہ کا مطلب بھی ادا کرتا ہے، اسیسان کا الف نون زائدتان نکال دینے سے سین ہو جاتا ہے یہی لفظ اس کتبہ میں شمسی ششمی تاریخ کا مطلب ادا کرتا ہے،

باکو عربی میں باء کرو، جس کے معنی ہیں لوٹ آیا، اس کتبہ میں با کا لفظ باء الحاق الاول کا مرادف ہے یعنی ۳۶۵ دن گذر گئے، سال پورا ہو گیا، پہلا تارا پھر نمودار ہو گیا،

اب اس عبارت کا ترجمہ یہ ہوا "اور تیسرے نچھتر کی ساتویں تاریخ تھی، ۶۰۰ سنہ جلا کی یہ ہے کتبہ لکھنے کی تاریخ، چونکہ اس کتبہ میں عرب کا ذکر ہے، اس لئے جلا سے مراد عربوں کی جلاوطنی ہے۔

۷۳۲ سنہ ق م کے قریب اشوریوں نے بنی اسرائیل کی اس حکومت، جس کو حضرت سلیمانؑ کے باغی یربعام نے قائم کیا تھا، فتح کر کے بنی اسرائیل کے دس قبیلوں کو اکناف عالم میں جلا وطن کر دیا (سلاطین ۱۷، ۶ و ۱۸: ۱۰) انہی دنوں .... حضرت یسعیاہ نے بدوؤں کی بابت پیشین گوئی کی، یا یوں کہئے، کہ مشورہ دیا، کہ عرب کے صحرا میں تم راتیں بسر کرو گے، اے ددانیوں کے قافلو! اور اہل تیما کو جو بنی اسماعیل سے تھے، حکم دیا کہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرو، ساتھ ہی یہ پیشینگوئی کی، کہ سال بھر کے بعد قیدار کی شوکت کا خاتمہ ہو جائے گا (یسعیاہ ۲۱: ۱۳ تا ۱۷) اشوری کتبات سے پتہ چلتا ہے، کہ ۷۳۳ سنہ میں پورے سے بعد ۷۱۵ ق م میں اشوریوں نے عربوں پر حملہ کیا تھا اور اربل وغیرہ عربوں نے اطاعت قبول کر لی، عرب کی ملکہ سبا شمسی نے مقابلہ کیا، مگر ۷۱۵ ق م میں جزیہ دے کر وہ بھی مطیع ہو گئی، بنو قیدار نے ۶۴۲ ق م تک مقابلہ کیا، مگر یہ مقابلہ محض باغیانہ نوعیت کا تھا، ۷۱۵ ق م میں بہتیرے آزادی پسند عربوں کو بے دیار ہونا پڑا، اسی ۷۱۵ ق م کو سنہ جلا سمجھنا چاہیے، ۶۰۰ سنہ جلا سے مراد ۱۱۵ ق م ہے۔ اسی سال سے حمیری سنہ شروع ہوتا ہے،

---

[1] بقرہ ۲۲، سکلنڈ ایسد ۱۵ ۳ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ ۲۴۳ ص ۱۰۵، جلد ۲ ص ۱۰۳

اب ذیل میں پورا کتبہ نقل کرکے پڑھتے ہیں،

ث لها این عرب نابت

ادد اکس ماو

یهس این کلاء یماؤ

حب ماو - تمرلا ماو

هر اوث فیصعا احل یا

وزقاحمر ابن کلاء

لیاقن یهئودا خولن

یاب عبرسمن اومن اذ

ذی تاذن امر حونا

انا ایس الس خولن

هناو اث امر حوهام

نقل هام عنا

دلا ایس تاب

ایس اب

عرق اساو تاب اساو

حرما حرما نکو حتاو

اومن اذ ایس عرب اک لله

---

۱ عبرانی علامت مفعولی۔

[illegible]	حل یا اطھس ار للا
[illegible]	منتا فتفنا
[illegible]	وحجرنا شھر
[illegible]	از سمع اذ کبرہ

اس عبارت میں جتنے الفاظ پر خط کھینچ کر گنتی لکھی گئی ہے وہ اشخاص کے اور دوسرے خط کشیدہ الفاظ اقوام یا معبودوں کے نام ہیں، چند لفظ ایسے ہیں جن کو ہر عربی دان سمجھتا ہے کیونکہ الفاظ عبرانی اور بعض تشریح طلب عربی ہیں، عبارت کا ترجمہ کرنے سے پہلے مشکل الفاظ کی شرح کر دینا مناسب ہوگا،

ک - عبرانی میں جب کا مرادف ہے،

لہَا (عبرانی) مرگیا

ایس - (۲۲) عبرانی میں ... ایش کے معنی ہیں مرد، شوہر، امام، رئیس ایس عرب اور ایس ایس میں یہ لفظ یہی معنی دیتا ہے، ... یش کا مطلب عبرانی میں وہی ہے، جو انگریزی میں ... کا مطلب ہے، لسان العرب میں ہے کہ لیس اصل میں لا ایس تھا، یہ کتبہ لسان العرب کی تصدیق کرتا ہے،

اکس - عربی مبین میں کَیِّس عقلمند،

ماو - عربی میں بولتے تھے اماسی بینھم یعنی ان میں فساد ڈالا، یہ اسی کا مجرد معلوم ہوتا ہے،

اِبن - عبرانی میں چٹان کو کہتے ہیں، اس لفظ کو توراۃ میں خدا کی شان میں بھی استعمال کیا گیا ہے، حضرت یوسفؑ کا ایک لقب روعی ابن یسرائیل تھا، (تکوین ۴۹، ۲۴) یعنی چوپان اسرائیل کی چٹان، ابن کا مجازی مطلب غالب توانا ہے،

لیاقن - لیوقن تاکہ ایمان لائے،

یا - خدا کا نام ایلیا (الیاس) عبدیا اور زکریا کے ناموں کا لاحقہ،

سمن = سمن عربی مین روغن اور مسکہ کو کہتے ہین، ثمن کے قیاسی معنی ہین روغن ملا، یہود مین دستور تھا، اور یہ دستور اور قومون مین بھی تھا، کہ جب کسی کو معبد کا سردار کاہن یا بادشاہ مقرر کیا جاتا تھا، تو اس کے سر پر مقدس تیل ملا جاتا تھا، عربی مین مسح کے معنی تر ہاتھ سے چھونا ہین، عبرانی مین مشح کے معنی تیل لگانا ہین، رفتہ رفتہ اس لفظ کے معنی کسی مذہبی اور مقدس عہدہ پر مامور کرنے کے ہوگئے، اسی سے مشیح کا لفظ نکلا، اب تو صرف حضرت عیسی المسیح کہلاتے ہین، اور ان کے نام کی حیثیت سے اس لفظ کو اتنی شہرت ہوئی، کہ تاریخ کے ہر "عبدالمسیح" کو عہد نصرانیت کا آدمی فرض کر لیا جاتا ہے، لیکن بائبل مین یہ لفظ حضرت طالوت اور حضرت داؤد کے علاوہ خورس کی شان مین بھی ملتا ہے، ثمن کا مطلب یہ ہوکہ مقرر فرمایا ابراہیم الماسح نے عبرانی لغت مین سامک سے ثمن کا یہی مطلب لکھا ہے،

اومن (عبرانی) رضاعی باپ

الس ۔ اَلْیَسَ وہ اونٹ جس پر جتنا بار لادا جائے اٹھا لے، "الیس الس" سارا بوجھ اٹھا لینے والا انسان، خولان کے رضاعی باپ یعنی مرشد نے جس کا نام اذ تھا، اپنے آپ کو خولان کا الیس کہا، خولانی لفظ یس الیس کا عدنانی اور حمیری ترجمہ ذوالکفل ہے، رجل الیس کو عدنانی عربی مین لوگون نے برا مفہوم دے رکھا تھا، ایک طرف مرد شجاع کو بھی الیس کہا جاتا تھا، دوسری طرف اس کا مطلب صالح و صابر تھا، مگر جس طرح اہل لکھنو نے ذات شریف کو بدمعاش کا مفہوم دیدیا ہے، اسی طرح بعض عربون نے بھی الیس کو دیوث کا مرادف بنا رکھا تھا، اس لئے قرآن پاک نے اس کتبہ کے مذکور نبی کے لقب کو دہرانے کے بجائے اس لقب کا ترجمہ کر دیا ہے،

ام = اُم، امت، مان، قوم، قوم کا مسلک،

حرم = عبرانی مین پہاڑ، عربی مین ایک خاص پہاڑ کا نام حرا جس کی بابت کہا جاتا تھا کہ ۳ حریم یہوہ پر الٰہی (تکوین ۲۲: ۱۴) حرا سے خدا دکھائی دیگا، حضرت رسول خدا پر پہلی وحی اسی پہاڑ کے ایک غار میں اتری تھی

تآب (تاآب)۔ ایام قدیم مین ہر قوم خدا کو باپ کہتی تھی، اس کتبہ مین اب اور تا اب ایک دوسرے کے مقابل مستعمل ہوئے ہین، اس سے معلوم ہوا کہ تآب اور تاآب دو لفظون کا مجموعہ ہین، جن مین سے ایک تا ہے،

قرشت کے حرف چہارم کا نام عربی مین تا اور عبرانی مین تو ہے، اسی سے توار کا نام نکلا، اونٹ کے بدن پر جو سمات بنائے جاتے تھے، ان مین سے چند کو تو یہ کہتے تھے، جس کا واحد توار ہے[1] اونٹ کی گردن پر نشر کے بیان کے مطابق اس طرح توار بنائی جاتی تھی، کہ ایک لکیر ادھر سے، اور ایک لکیر ادھر سے لاکر نیچے ملا دی جاتی تھی، جیسے[1] ۷ ایسی دو توائین اس طرح × مل کر متعدد تحریرون کی ت کا نقش ہین، اس کو بھی تواد کہتے تھے، نقش دوم کو اوپر تلے دہرانے سے ⋇ کا نقش بنتا ہے، اب اس تحریر مین نز کی آواز دیتا ہے، تو کے وزن پر اسے زو کہہ سکتے ہین، نقش دوم سے ایک خط مٹا دو تو ⋀ کی شکل بن جاتی ہے ⋀ مسند صفوی مین ز ہے، بربری مین ⊥ واو ہے ⋀ عبری مربع مین جیم ہے ⋀⊥⋀ کو زوج پڑھ سکتے ہین، زوج کے معنی جفت کے ہین، عربی زَوٌّ کے معنی بھی یہی ہین، ذہب توٌّا و جمع زَوًّا کے معنی ہین، اکیلا گیا، دو کیلا آیا، ان سمات کی تشریح کا مقصد یہ بتانا ہے کہ زو اور تو ابتدا مین ہم معنی الفاظ تھے، ۷ جو کہ ت کی قدیم شکل ہے، ایک زو ہے جس مین دو تو پائے جاتے ہین، رسی کے دو تو ہوتے ہین، تا اور تو کا قدیم مفہوم جوڑا تھا، باپ اور ماں دونون مل کر ایک زو ہین، ان مین سے ہر ایک گویا رسی کے جدا جدا دو تو یا تا ہین، تا کے معنی ہوئے ساتھی، رفیق، ثانی، جوڑا، تاآب کے معنی ہوئے باپ کا شریک، ساتھی، رفیق اور جوڑا۔ خولان کے رضائی باپ ایس الس اومن اذنے یہ تعلیم دی تھی، کہ باپ ہے، مگر باپ کا شریک نہین ہے،

اساؤ = ساہ (ہبا، معلوم ہوا) کا مقلوب ہے، سأی، عربی مین اس کے معنی بھی یہی ہین کہ

---

[1] لسان العرب توا

بڑا معلوم ہوا، اس تحریر مین اسی کا صیغہ امر بصورت جمع آیا ہے، مگر بڑا جانور کا مطلب دیتا ہے،

حرما حرمنا = کا مطلب عربی لغت کے مطابق حرمنا تحریمًا ہوسکتا ہے یعنی ہم نے حرام قرار دیا، حرام، عبرانی لغت کے مطابق اس کا مطلب ہوا ہم کو ہلاک کردیا، ہلاک، زیر بحث عبارت مین ان دونون مطلبون کی یکسان گنجایش ہے، ہم عبری مفہوم کو زیادہ پسند کرتے ہین، مگر یہ پسند صرف پسند ہے کوئی دوسری وجہ ترجیح ہم کو نظر نہین آتی،

حل اور احل اس کتبہ مین مرادف ہین، عبرانی مین احل کے معنی ہین، اس نے پکارا، آواز دی، نماز پڑھی، توراۃ مین ہے کہ جب شیث کی عمر ۱۰۵ برس کی ہوئی، تو انوش پیدا ہوئے، اور از ہو حل لقرا بشم یہوہ، تب سے اسم الٰہی کی قرأت بالجہر ہونے لگی، اس عبری عبارت مین ہوحل جو کہ احل کا عبرانی باب افعال ہے، آواز بلند کرنے کے معنی دیتا ہے،

فتحنا = فحتنا - فتفتا، ہم نے توڑا،

محرنا = مخرنا ہم نے چیرا،

ھنا د = نای (دور ہوا) کا عبرانی نہج پر متعدی ھنای (دور کیا) ھنا د (دور کرد)

اک = ترکی آکا - آقا، مالک، شوہر،

اس تشریح کے بعد اب عبارت کا ترجمہ یہ ہوگا،

"جب حرب کا زمین نابت مر گیا، خود مند اور فاسد ہوگیا،

کلاء اکلاح، کا غالب توانا بیس فاسد ہونے لگا،

دانہ فاسد ہوگیا، کھجور فاسد ہوگئی، آفت کی وجہ سے قیصا (قضاد) نے خدا کو پکارا،

کلاح کا غالب توانا حمر (حمیر) بچون کی طرح رونے لگا،

سلہ تکوین ۵ ، ۶ ، تکوین ۴ : ۲۶ ،

"اس لئے کہ یہود اخولان ایمان لائے، اللہ نے اذکر جن ہن رضاعی باپ مقرر کیا جنھنے
ہمارے پہاڑ والون سے کہا، مین ہون خولان کا سب بار اٹھانے والا مرد، دور کرو ہام
کے پہاڑ کی روش کو، ہام کی پیروی موجب تکلیف ہے، باپ ہے، مگر باپ کا شریک نہین ہو،
عوتن کو بڑا جانو، باپ کے شریک کو برا جانو، عاد کے منکر نے ہم کو تباہ کر دیا، تباہ، رضاعی
باپ عرب کے رئیس، للا کے شوہر اذ نے خدا پکارا، للا کے اور شہر کو پاک کر دے"
ہم نے مناۃ کو توڑا، شہر (چاند) کو چیرا، اذ نے سنا، اذ نے تکبیر کہی،

یہ کتبہ اپنی شرح آپ ہے، لیکن یہین پر مضمون ختم کر دینے سے ہمارے دل کو تشفی نہین ہوتی،
چونکہ ذو الکفل کا قرآن پاک مین صرف نام ہی آیا ہے، اس لئے مزید شرح ضروری معلوم ہوتی ہے، اس
کتبہ مین چند نام ایسے ہین جن سے انساب عرب پر نظر رکھنے والے اچھی طرح واقف ہین، اس لئے
پہلے ہم ان اشخاص کا نسب نامہ پیش کرتے ہین،

۱۔ الیس عرب نابیت = بنت من اود (ص ۵۶ نشوان)
|
مذحج (ص ۳۷ ")
|
سعد العشیرہ
|
سعد
|
اود (ص ۱۰۲ ")

۲۔ اود اکس

۳۔ بیس ۴۔ قیصحا = قضاعہ

اہان — ۵۔ حمیر = قمر
|
عمرو — عمران مالک

۶۔ خولان علہان زید مناۃ ص ۷۰ ذوالکلیل،

۸۔ عاد ۹۔ لیلی عرف خندف زوجہ الیاس بن مضر (نشوان ص ۳۵)
یعنی للا زوجہ الیاس (اس)

نابت حضرت اسماعیلؑ کے فرزند اکبر کا نام تھا، بنو قیدار میں بھی ایک شخص کا نام نابت تھا، (ابن ہشام)

لیکن اود کی وجہ سے ہم نے کتبہ کے نابت کو نبت بن اود سے تطبیق دی، جس کو نشوان نے اشعریون

کے مورث اعلیٰ اشعر کا نام بتایا ہے، اسی کے بھائی مذحج کا پردادا اود تھا،

اود کا لغوی ترجمہ ٹیڑھا پن ہے، اود کا لقب اس کتبہ کے مطابق کس یعنی خردمند ہے، اود اکس

کے معنی ہوئے، ٹیڑھا خردمند،

اس کتبہ میں اس کی بابت بتایا گیا ہے، کہ وہ فاسد ہو گیا، اس ٹیڑھی خرد والے شخص کے فاسد

ہونے کا مطلب ایک اودی شاعر کی طرف منسوب یہ شعر بتاتا ہے کہ

إنَا بنوا وُدِ الّذی بلوائه صعبت رئام وقد غزاها الاجرع

ہم اُس اود کی اولاد ہیں جس کے جھنڈے کی وجہ سے رئام کو استحکام حاصل ہوا،

جبکہ اوس کے خلاف اجرع نے جہاد کیا تھا،"

رئام یمن کے ایک بتکدہ کا نام ہے، اود اکس اس بت کدہ کا محافظ و پاسبان تھا، اس نے ایس

عرب نابت کے دین کو جو دین توحید ہوگا ترک کر دیا تھا،

یس ابن کلاء کا ذکر انساب عرب میں ہماری نظر سے نہیں گذرا،

قیسعا کو ہم قبیلۂ قضاعہ کے نام کی پرانی شکل خیال کرتے ہیں، کیونکہ اس کے نام کے بعد اس کی

نسل کے معروف اشخاص کے نام ملتے ہیں، قضاعہ کے آبائی نسب میں سخت اختلاف ہے بعض بنو

قضاعہ اور اکثر نسّاب معد ہی بنو معد میں شمار کرتے ہیں، لیکن اکثر نسّاب یمن اور بنو قضاعہ کی ایک بڑی

جماعت قضاعہ کو مالک بن حمیر کی اولاد بتاتی ہے، نشوان وغیرہ کی رائے میں جن بنو قضاعہ نے خود

کو اولاد معد سے بتایا، انھوں نے امیر معاویہ کے زمانہ میں سیاسی اغراض سے ایسا کیا، یہی رائے صاحب اکلیل

کی ہے، جنھوں نے قبر قضاعہ کے دو کتبے نقل کئے ہیں، جن میں سے ایک میں صریحاً قضاعہ بن مالک بن

حمیر کا ہے زیر بحث کتبہ اس سارے اختلاف کی اصلیت ظاہر کر دیتا ہے، بنو قضاعہ حضرت ذوالکفل کو اپنا اومن یعنی رضاعی باپ بالفاظ دیگر منہ بولا باپ اور معلم مانتے تھے، ذوالکفل جیسا کہ آئندہ سطور سے ظاہر ہوگا، حضرت الیاس بن مضر تھے، قضاعہ کے بنو معد میں سے ہونے کا خیال عہد معاویہ کی سیاسی اغراض نے پیدا نہیں کیا، قاعدہ تبنی کے مطابق بنو قضاعہ بنو معد سے تھے، مگر حقیقۃً مالک بن حمیر کی نسل سے تھے،

اکلیل میں منقول ایک کتبہ کے مطابق جو قبر قضاعہ پر تھا، قضاعہ نے ۲۰۰ برس کی عمر پائی، اتنی طویل عمر قرین قیاس نہیں غالباً یہ ترجمہ کی غلطی ہے، کتبہ کا مضمون یہ ہوگا، کہ ۳۰۰ھ (جلاء) تک یعنی ۲۱۵ھ ق م تک قضاعہ زندہ تھا، کتبہ کے مطابق حادو کا زمانہ ۱۱۵ھ ق م قرار پاتا ہے، توراتی حساب کے مطابق ہر قرن کو ۱۰۰ برس دو تو حمرا بن کلاا کا زمانہ ۲۱۵ھ ق م قرار پائیگا ایام قدیم میں فی صدی ایک نام پشت نامہ کا محفوظ رکھنے کی عام عادت نظر آتی ہے،

تیصایا قضاعہ کے بعد اس کتبہ میں ہم کو کلاع کی چٹان یا کلاع کے غالب توانا حمر کا نام ملتا ہے اسے ہم حمیر بن قضاعہ کا نام خیال کریں تو بے جا نہیں، حمیر کے پوتے کا نام زید مناۃ بتاتا ہے، کہ بنو قضاعہ مناۃ کو پوجتے تھے زیر بحث کتبہ میں مذکور ہے، کہ ذوالکفل کے کہنے سے لوگوں نے مناۃ کا بت توڑا تھا، اور چاند کی تصویر پھاڑی تھی،

یہودا خولان کے نام کا پہلا جزء یہودا یہ بتاتا ہے کہ خولان نے دین یہود کو قبول کر لیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تربیت کے لئے ریس الس اذ کو خولان کا اومن (رضاعی باپ) مقرر کر دیا تھا، ان کی تربیت نے ان کو دین یہود یا، دوسرے لفظوں میں دین موسیٰ کا پابند بنا دیا تھا،

یہودا خولان کے بعد اس خاندان کے دو شخصوں کے نام اس کتبہ میں ہم کو ملتے ہیں، ایک نام حاتو کا ہے جسے مشرقین نے بنو خولان کے ایک قبیلہ کا مورث بتایا ہے، دوسرا نام ۱۲۹ کا ہے، جسے عدنانی عربی کے

ہیں ہم پہلے پڑھ چکے ہیں یہ نام بہت اہم ہے، اس نام کی رو سے حضرت ذوالکفل کا تشخص پوری طرح ہو جاتا ہے، اس کتبہ میں ادومن اذکو جن کا لقب الیس تھا، جسے ہم الیس کا قدیم تلفظ بتا چکے ہیں اک للو یعنی لیلے کا شوہر بتایا گیا ہے،

تمام نسابون نے خولان کے چچیرے بھائی حلوان کی بیٹی لیلےٰ عرف خندف کو حضرت الیاس ابن مضر کی بی بی بتایا ہے، حضرت الیاس بن مضر کے نام کی تشریح میں حسب ذیل باتیں لکھی گئی ہیں،

(۱) وہ حضرت الیاس پیغمبر کے ہم نام تھے، (روض الانف بحوالہ ابن الانباری)

(۲) ان کا نام حرف تعریف اور مصدر یاس کا مجموعہ ہے (روض الانف)

(۳) الس (یعنی فریب) سے فعیال کے وزن پر مشتق ہے، (" ")

(۴) نام کی اصلی شکل آلس (ضعیف العقل) تھی (" ")

(۵) اصلی شکل نام کی الیس یعنی مرد شجاع تھی، (" ")

ان توجیہون مین عام فہم توجیہ پہلی ہے، لیکن حضرت الیاسؑ پیغمبر کے نام کی اصلی صورت ایل یا تھی جس کے معنی ہین کہ "یا ہی خدا ہے" یہی اُن کی تعلیم تھی، ایام قدیم مین اکثر اسماء اشخاص کے مذہبی بول ہوتے تھے، یہ امر بجائے . . . خود ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے، اس لئے اس جگہ اس دعوی کو بے دلیل ہی چھوڑنا بہتر ہے، ایل یا کا نام روما اور یونان پہنچ کر الیاس ہو گیا، حضرت الیاس بن مضر کے نام کو روما اور یونان کا سفر کر کے عرب واپس آنے کی ضرورت نہین تھی،

حضرت الیاس بن مضر اس عہد سے قبل کے ہین، جب اہل یورپ نے ۲ء اور ۳ء کے درمیان نصرانیت قبول کر کے موسیٰ، یونا، ایلیا، اور عیسیٰ کے نامون مین اسمائے اشخاص کا لازمی یونانی لاحقہ "س" ملا کر ان نامون کو موسیس، یونس، ایلیس، اور جیسس بنایا، دوسری توجیہ مبتدیان

کو شاید اپسہ ہو گیا اس نام کی شرح یہ کی گئی ہے، کہ حضرت الیاس اس وقت پیدا ہوئے جب اُن کو اولاد سے مایوسی ہو گئی تھی، یہ توجیہ معقول ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت لفظ الیاس کی توجیہ نے پیدا کی، نہ یہ کہ اس روایت کی بنا پر وہ الیاس کہلائے، دوسری اور تیسری توجیہ ان باتوں میں سے ایک ہے جن کی بنا پر جیسا کہ سہیلی نے کہا ہے،

یذکر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تسبوا	نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئی ہو کہ آپ نے
الیاس فانہ کان مومنا	فرمایا الیاس کو برا نہ کہو وہ مومن تھا،

صحیح توجیہ یہ ہے کہ ان کے نام کی اصلی شکل الیس تھی، عہد قرآن سے قریب تر زمانہ میں الیس کا لفظ جب کسی مرد کی صفت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، تو اس کا مطلب کبھی بہادر ہوتا تھا، اور کبھی دیوث، نام کی اصلی شکل الیس ماننے والوں نے بہادر کے مطلب کو عرب کے اصول تسمیہ کے مطابق پایا مگر الیس دراصل سارا بوجھ اٹھا لینے والے اونٹ کی تعریف تھی، ایسا اونٹ نیک اور صابر ہوتا ہے، صابح و صابر ہونا ایام جاہلیت کے عربوں کے نزدیک شرفاء کے لئے محمود صفت نہ تھی، ان کے نزدیک تو سخت توہین کی بات تھی، کہ کسی شخص کے متعلق کہا جاوے کہ

یجزون من ظلم اھل الظلم مغفرۃ	ومن سوء اھل السوء غفر انا
کان ربک لم یخلق لخشیتہ	سوا ھم فی جمیع الناس انسانا

وہ ظلم اصحاب کو معاف کر دیتے ہیں گویا خدا نے اپنی خشیت کے لئے انھیں کو پیدا کیا ہے

اس تصور کے لوگ بد چلن الیس (صابح و صابر مرد) کو دیوث کے برابر سمجھتے تھے، لیکن لیلیٰ کے شوہر لیس الیس (ذوالکفل) کا خاص شرف خدا نے یہی بتایا کہ وہ صابر و صابح تھے،

واسمٰعیل وادریس وذا الکفل	اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو
کل من الصابرین وادخلناھم	(ہم نے وہاں اُن کو بھی) یہ سب صابرین میں سے تھے

فوحعتنا ادخلناهم من الصالحین ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کر لیا،
وہ نیک لوگوں میں سے تھے،

بہرحال حضرت الیاس بن مضر کے نام کی شکل الیس تھی، یہ کتبہ الیس کو ۔۔۔ کا شوہر بتاتا ہے، انساب عرب کی اجماعی روایت حضرت الیاس بن مضر کو لیلی کا شوہر بتاتی ہے، کتبہ کے اندر مذکور الیس یقیناً حضرت ذوالکفل تھے، اس لئے ہم کو الیاس بن مضر کے ذوالکفل ہونے میں شبہ نہیں ہے، لیکن اتنی بات ضرور کھٹکتی ہے، کہ حضرت الیاس بن مضر کی شان میں "نبی" کا لفظ قدما میں سے کسی کی طرف منسوب عبارت میں نہیں ملتا ہے، حالانکہ ذوالکفل پیغمبر تھے، الیاس بن مضر ذوالکفل ہوتے تو کوئی نہ کوئی ضرور ان کو پیغمبر کہتا،

حضرت ذوالکفل کی بابت ابن جریر نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے ایک روایت نقل کی ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے، کہ ذوالکفل نبی نہیں، صرف ایک مرد صالح تھے، اس روایت پر کچھ اعتراض ہے جس پر بحث کا یہ محل نہیں، بہرحال اس روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت ذوالکفل کی نبوت کا معاملہ مختلف فیہ تھا، اس لئے الیاس بن مضر کی شان میں نبی کا لفظ جو نہیں ملتا وہ تعجب انگیز نہیں ہے،

کتبہ کے چند الفاظ ہام، عوقن، اور عبر کی شرح ہم نے ارادۃً اس وقت چھوڑ دی ہے، کیونکہ اسی اطلس میں جس سے ہم نے یہ کتبہ لیا ہے، چند تحریریں اور بھی ہیں، جن میں اذ کا ذکر ہے، انشاء اللہ ان کتبات کو پڑھنے کے بعد ہم حضرت ذوالکفل کی پوری سوانح عمری نذر قارئین کریں گے، اس وقت ان الفاظ کی بھی تشریح کریں گے، اور ذوالکفل کے حالات کا الیاس بن مضر کے حالات سے مقابلہ کریں گے،

اقبال اور تصورِ فقر

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (جامعہ عثمانیہ)

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود — نے ربابِ و مستی و رقص و سرود

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات — بندہ از تاثیرِ او مولیٰ صفات

فقر اقبال کی نگاہ میں رہبانیت نہیں بلکہ خودی کی عریانی ہے" اپنی حقیقت کا جاننا ہے، "کارِ خویش را سنجیدن است"[51] اس کا طریقہ لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم و معنی کا جاننا اور اس کلمہ کی رو سے اپنی خودی کو فاش تر دیکھنا[52] ہے اور اس کی تاثیر سے مولیٰ صفات" بن جانا ہے، "خلیفۃ اللہ فی الارض" کا مقام حاصل کرنا ہے۔ بارِ امانت کا اٹھانا اس کا نتیجہ تسخیرِ جہات[53] ہے، نوامیسِ جہان[54] پر تصرف ہے، دنیا کے تمام سلطان و میر کو حلقہ بگوش کرنا[55] ہے، سلاطینِ عالم کے سامنے لا ملوک کا نعرہ بلند کرنا ہے[56]، مختصر یہ کہ فقر ہی کی دل نوازی کا نام حکمتِ دین ہے۔

---

۵۱ فقر کارِ خویش را سنجیدن است — بر دو حرفِ لا الٰہ پیچیدن است

۵۲ خودی را فاش تر دیدن بیاموز

۵۳ فقرِ مومن چیست، تسخیرِ جہات — بندہ از تاثیرِ او مولیٰ صفات

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست — ما امینیم این متاعِ مصطفیٰ است

۵۴ فقر بر کروبیان شبخون زند — بر نوامیسِ جہان شبخون زند

۵۵ بستۂ فتراکِ او سلطان و میر ۵۶ پیشِ سلطان نعرۂ او لا ملوک

اور فقر ہی کی بے نیازی کا نام قوتِ دین ہے، حکمت دین و قوت دین بغیر فقر کے ممکن نہیں،

حکمتِ دین دل نوازی ہاے فقر   قوتِ دین بے نیازی ہاے فقر!

فقر کی اس دولت کو کھو کر مسلمان کے ہاں نہ "دولت سلیمانی" رہی، اور نہ "دولتِ سلمانی" حکمت ہی رہی نہ دولت و قوت ہی،

یہ فقر مرد مسلمان نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولت سلمانی و سلیمانی

مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ کے لئے جو دولت پاکستان، اور حیدرآباد دکن میں انشاء اللہ تعالیٰ عمل میں آنے والی ہے، فقر کے معنی کا سمجھنا اور اقبال کے دلآویز و دلنشین انداز میں سمجھنا نہایت ضروری ہے، اقبال پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن فقر کے معنی کی وضاحت ابھی تک کسی نے کھول کر نہیں کی، اور فقر کے لا متناہی قوت کے مبدء کی نشاندہی کسی نے صاف صاف طریقہ پر نہیں کی، قوت و توانائی کے اس لا محدود مبدء کو اپنی ذات کے اندر رکھ کر بھی مسلمان حیران و پریشان ہے، خستہ و ناتواں ہے، خوار و زار ہے، عارف روم کے الفاظ میں صورت حال یہ ہے :-

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر   تو ہمی جوئی لب نان در بدر!
تا بزانوے میان قعر آب   وز عطش وز جوع گشتستی خراب (رومی)

آیئے اقبال کے ہدایات و اشارات پر عمل کرتے ہوئے ہم قرآن و خبر[۵۱] میں گم ہو کر فقر کے معنی کی تحقیق کریں۔!

اقبال کے تصور فقر کے قرآنی مقدمات   قرآن حکیم نے انسان کو فقیر کے لفظ سے خطاب کیا ہے، اور حق تعالیٰ کو غنی و حمید قرار دیا ہے،

---

۵۱ اندکے گم شد بقرآن و خبر   باز اے نادان بخویش اندر نگر

یٰاَیُّہَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ۚ وَاللّٰہُ ہُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (پ۲۲ ع ۱۵) — اے لوگو تم خدا کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز خوبیوں والا ہے،

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

اَللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (پ۲۶ ع۸) — اللہ بے نیاز ہے، اور تم محتاج ہو،

ہم فقیر ہیں ملک و حکومت اصالتہً ہمارے لئے نہیں حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے،

لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ — خدا ہی کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین
وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ — میں ہے، اور نہ اس کا کوئی حکومت میں شریک
اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ، — ہے حکم کسی کا نہیں بجز اللہ کے،

افعال کے خالق بھی ہم نہیں اس معاملہ میں بھی ہم فقیر ہیں، محتاج ہیں، حق تعالیٰ ہی افعال کی تخلیق فرماتے ہیں، کیونکہ وہی خالق کل شے ہے،

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (پ۲۳ ع۷) اللہ نے پیدا کیا تمہیں اور جو تم کرتے ہو،

اور ایک جگہ سلبی طریقہ فرمایا گیا ہے،

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ خَلَقُوْا کَخَلْقِہٖ فَتَشَابَہَ الْخَلْقُ قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّہُوَ الْوَاحِدُ الْقَہَّارُ، — کیا انہوں نے اللہ کے لئے شریک قرار دیئے ہیں، کہ انہوں نے کچھ پیدا کیا، جیسے اللہ نے پیدا کیا، پھر مشتبہ ہوگئی، پیدائش اُن کی نظر میں، کہدو اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے، اور وہی واحد و قہار ہے،

(سورۃ الرعد، آیت ۶۰)

بات عقلی طور پر بھی صاف ہے، اگر ہر شے کے خالق اللہ ہیں، تو ہمارے افعال بھی آخر کوئی شے ضرور ہیں، اور اُن کے خالق بھی حق تعالیٰ ہی ہوں گے، "اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" اور "خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ"

سے استناد کر کے سلف صالحین رحمہم اللہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ ہمارے افعال کے خالق حق تعالیٰ ہی ہیں، اور ہمارا فقر بیان بھی عقلاً و نقلاً ظاہر ہو رہا ہے،

صفاتِ وجودیہ ایجابیہ جو انسان میں پائے جاتے ہیں، ان کی اصل سات صفات ہیں، حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع و بصر و کلام، یہ صفات اصالۃً حق تعالیٰ ہی کے لئے ہیں، اور قرآن حصر و قصر کے ساتھ انہیں حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت کر رہا ہے، اور انسان کو اس لحاظ سے بھی فقیر بتلا رہا ہے، ملاحظہ ہو،

حیات حق تعالیٰ ہی کی، هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (۳ع ۹)

علم و قدرت حق تعالیٰ ہی کے لئے، وَهُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ (۲۱ع ۹)

ارادہ یا مشیت ان ہی کے لئے، وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ (۲۹ع ۲۰)

سماعت و بصارت ان ہی کے، وَاِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۱۵ع ۱) اور اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ (۱۱ع ۹)

اب رہا وجود تو وہ بھی حقیقی طور پر حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت ہے، اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (۳ع-۹) سے اس کا ثبوت مل رہا ہے،

وجود کے چار مراتب ہوتے ہیں، اوّلیت، آخریت، ظاہریت، باطنیت، آیہ کریمہ،

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۷ع)

سے وجود کے چاروں مراتب کا حق تعالیٰ ہی کے لئے ہونا حصراً ثابت ہو رہا ہے، اس فقر کا احساس ہوتے ہی عارف کی زبان سے یہ چیخ نکلتی ہے،

میرا مجھ میں کچھ بھی نہیں سب ہے تیرا
تیرا تجھ کو دینے سے کیا جاتا ہے، میرا

عارف رومی نے اس کیفیت کو یوں پیش کیا ہے،

چیست توحید خدا آموختن — خویشتن را پیش واحد سوختن

گر همی خواهی که بفروزی چو روز — هستی همچون شب خود را بسوز

ز آنکه هستی سخت مستی آورد — عقل از سر شرم از دل می برد

هر که از هستی خود مفقود شد — منتهای کار او محمود شد

جاوید نامہ میں اقبال وجود صفات افعال و آثار کی نسبت صرف حق تعالیٰ ہی کی طرف کرتے ہوئے کیا خوب فرماتے ہیں:-

می شناسی طبع ادراک از کجاست — جوہرے اندر نگہ خاک از کجاست؟

طاقت فکر حکیمان از کجاست — قوت ذکر کلیمان از کجاست؟

این دل و این واردات از کیست — این فنون و معجزات از کیست؟

گرمی گفتار داری از تو نیست — شعلہ کردار داری از تو نیست!

این ہمہ فیض از بہار فطرت است — فطرت از پروردگار فطرت است!

دعوتی کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے بھی یہی عرفان فقر حاصل ہوتا ہے "لا" ذوات خلق سے غیراللہ سے الوہیت کی نفی کرتا ہے، ربوبیت کی نفی کرتا ہے، افعال وصفات و وجود کی نفی کرتا ہے، اور "الّا" ان ہی اعتبارات کا ذات اقدس میں اثبات کرتا ہے اس طرح لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے یہی ذات خلق کا فقر اور ذات حق کی غنا حاصل ہوتی ہے، اور اقبال کا یہ قول اسی طرف اشارہ کرتا ہے،

فقر کار خویش را سنجیدن است — بر دو حرف لا الہ پیچیدن است

یہ تفسیر ہے آیت کریمہ کی:-

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ،

فقر کے معنی کا تعین قرآن حکیم سے یہی ہوتا ہے، کہ وجود و صفات و افعال و ملک و حکومت امانتاً ہمارے لئے ہیں، صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے ہیں، فقر کے امتیاز سے خود بخود ہمیں امانت کا امتیاز حاصل ہوجاتا ہے، یعنی ہمیں یہ معلوم ہوجاتا ہے، کہ وجود اور اس کے یہ اعتبارات ہم میں من حیث الامانت پائے جاتے ہیں، ہم حق تعالیٰ کے ان اعتبارات کے امین ہیں، بالفاظ دیگر میں حق تعالیٰ ہی کے وجود سے موجود ہوں، ان ہی کی حیات سے زندہ ہوں، ان ہی کے علم سے جانتا ہوں، اُن ہی کی قدرت و ارادہ سے قدرت و ارادہ رکھتا ہوں، ان ہی کی سماعت سے سنتا، ان ہی کی بصارت سے دیکھتا، اور کلام سے بولتا ہوں، اس کو صوفیہ نے اپنی اصطلاح میں قرب نوافل سے تعبیر کیا ہے، یعنی حق تعالیٰ ہی کے لئے وجود اور صفات وجودیہ اصالۃً اور بطور حصر ثابت ہیں، اور ہماری طرف ان کی نسبت امانۃً ہوتی ہے، بخاری کی اس حدیث کا یہی منشا ہے،

کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ و	ہوتا ہوں میں اس کی شنوائی جس
بصرہ الذی یبصر بہ و یدہ	سے وہ سنتا ہے، اور بینائی جس سے
التی یبطش بہا و رجلہ التی	دیکھتا ہے اور ہاتھ جس سے وہ پکڑتا ہے
یمشی بہا	اور پیر جس سے وہ چلتا ہے،

فقر و امانت کے نتیجہ کے طور پر عبد کو خلافت اور ولایت حاصل ہوتی ہے، جب وہ امانات الٰہیہ وجود و صفات وجودیہ (ایجابیہ) کا استعمال کائنات کے مقابلہ میں کرتا ہے، تو خلیفۃ اللہ فی الارض کہلاتا ہے اور جب حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کرتا ہے، تو "ولی" ہوتا ہے، عبداللہ کے یہی چار اعتبارات ہیں، فقر، امانت، خلافت، ولایت، اللہ کیا شان ہے عبداللہ کی،

تو بقیمت دارائے ہر دو جہانی
چہ کنم قدر خود نمی دانی

قرآن و خبر سے فقر و امانت خلافت، ولایت کے اعتبارات کو اخذ کر کے اقبال نے فقر کی اس طرح توضیح کی ہے۔

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل | یک نگاہ راہ بین یک زندہ دل
فقر کارِ خویش را سنجیدن است | بر دو حرف لا الہ پیچیدن است

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

فقرِ قرآن احتسابِ ہست و بود | نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست تسخیرِ جہات | بندہ از تاثیرِ او مولیٰ صفات

فقر قرآنی نے صفاتِ وجودیہ کی نفی ذاتِ عبد سے کی، اور ذاتِ حق میں اُن کا اثبات کیا، پھر انہی ہی صفاتِ وجودیہ کا اثبات امانتہً ذاتِ عبد میں کیا[1] اور اس طرح فقر کی تاثیر سے بندہ مولیٰ صفات ہو گیا، جب بندۂ مومن کو یہ علمِ قرآن نے عطا کیا، کہ وہ حق تعالیٰ ہی کے وجود سے موجود ہے، اور ان ہی کی حیات سے زندہ ہے، اُن ہی کے علم سے جانتا ہے، اور اُن ہی کے قدرت و ارادے سے قدرت و ارادہ رکھتا ہے، تو اب اس پر حیات نامتناہی، قوت لامحدود اور ارادہ مطلق سے اپنا ربط و تعلق واضح ہو جاتا ہے، وہ جان لیتا ہے کہ اس کی ذات مظہر ہے جس سے حق تعالیٰ ہی کی قوت مطلقہ کا ظہور ہو رہا ہے، اب اس قوت لامحدود کے آگے ماہ و مہر لرزہ براندام ہوتے ہیں، نوامیس جہان سرنگوں ہو جاتے ہیں،

فقر چون عریان شود زیرِ سپہر | از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریان گرمیِ بدر و حنین | فقرِ عریان بانگِ تکبیرِ حسین
فقر خیبر گیر با نانِ شعیر | بستۂ فتراک او سلطان و میر

[1] اس عمل کو صوفیہ کرام اثبات کا اثبات کہتے ہیں۔

فقر بر کرّوبیان شبخون زند   بر نوامیس جہان شبخون زند

بر مقام دیگر اندازد ترا،   از زجاج الماس می سازد ترا

حق تعالیٰ کی لامحدود قوت کو استعمال کرنے والے، فقرا ہین جن کے آگے سلاطین جہان بھی لرز جاتے ہین، انھین اس سے مقابلہ کی تاب کہان،

با سلاطین در فتد مرد فقیر،   از شکوه بوریا لرزد سریر

از جنون می افگند ہوے بہ شہر   وارہاند خلق را از جبر و قہر

قلب او را قوت از جذب و سلوک   پیش سلطان نعرۂ او "لا ملوک"!

اس کا راز یہی ہے کہ فقیر کی صورت سے حق تعالیٰ ہی کی قوت کا ظہور ہوتا ہے، فقیر اس قوت لامحدود کا محض محل ظہور یا جلوہ گاہ بن جاتا ہے،

وہ فانی زخویش باقی بحق ہو جاتا ہے، اس مین حق کی قوت متجلی ہوتی ہے وہ بندہ ہے، لیکن مولیٰ صفات ہے، اس کی قوت کا مقابلہ کائنات کی کوئی محدود و مقید قوت نہین کر سکتی، اقبال کے الفاظ مین "زجاج" یا شیشہ سے الماس کی قوت کا ظہور ہوتا ہے، حق کی اس قوت کا ادراک معیت حق کا یہ شعور اس کو بے خوف مرد مجاہد بنا دیتا ہے، اس کے قلب سے خوف نکل جاتا ہے، وہ سربکف ہو جاتا ہے، کیفیت کے اس انقلاب کی اقبال نے ان الفاظ مین تصویر کھینچی ہے،

مردِ حق محکم ز ورد "لاتخف"   ما بمیدان سر بجیب او سر بکف

مردِ حق از لا الٰہ روشن ضمیر   می نگردد بندۂ سلطان و میر

پاے خود را آنچنان محکم نہد   نبض رہ از سوز او بر می جہد

جان او پایندہ تر گردد ز موت   بانگ تکبیرش برون از حرف و صوت

معیت حق کا یہی ادراک مومن کو فاتح کائنات بنا دیتا ہے، کوئی مشکل اس کو ہراسان

خوف زدہ نہیں کرسکتی، کوئی واقعہ خواہ وہ کتنا ہی خوفناک کیون نہ ہو اس کو پریشان نہیں کرسکتا جس طرح باز اپنے شکار سے نہیں رکتا اور شاہین افلاک کی سیر سے باز نہیں رہتا، اس طرح مرد مومن حق تعالیٰ کو اپنے ساتھ پاکر اُن کو اپنا قوت بازو زمان کر کسی مشکل کی پروا نہیں کرتا، یہ جہان آب و گل اس کا شکار بن جاتا ہے،

صید مومن این جہان آب و گل	باز را گوئی کہ صید خود بہل !
حل نہ شد این معنی مشکل مرا	شاہیں از افلاک بگریزد چرا!

مومن کی نگاہ مین کوئی فانی شے نہیں جچتی، وہ غنی عن الاشیاء ہوتا ہے، حق تعالیٰ کی حول و قوت سے وہ افلاک سے بھی مقابلہ کرنے کو تیار ہوجاتا ہے، اُن کی تسخیر کی قوت وہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مژدہ جان فزا اس کی توانائیون مین لامحدود اضافہ کرتا ہے،

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش	خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اسکی نظر مین	جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

مومن کی اس غیر معمولی فوق فطرت قوت و توانائی کا راز سوا اس کے کچھ نہیں کہ وہ حق کی قوتون کو اپنے اندر موجود پاتا ہے، حق تعالیٰ کی معیت کا قوی ادراک رکھتا ہے، حق تعالیٰ کو ہمیشہ ساتھ پاتا ہے، اُن کے حضور مین اپنی زندگی کا ہر لمحہ گذارتا ہے، اور اس کو اس امر کا پختہ یقین، قوی اذعان ہوتا ہے، کہ حق تعالیٰ اس پر رحیم ہین، اور ان کا فضل ہر لحظہ اس کے شامل حال ہے، اور زندگی اس کے لئے خیر ہے، وہ زندگی کا ہر واقعہ خیر برتر کی طرف اس کی رہنمائی کر رہا ہے، اس کی زبان پر یہ دعا رہتی ہے،

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ضَعِیْفٌ فَقَوِّنِیْ	حق تعالیٰ مین ضعیف ہون، قوت مرحمت

رضاك ضعفی وخذ الی الخیر	آپ کے لیے، میرے ضعف کو قوت
بناصیتی، واجعل الاسلام	میں بدل دیجئے میری ذات سے اپنی قوت
منتہی رضائی	کا اظہار فرمائیے آپ کی خوشنودی کی تکمیل
	و بجا آوری کی خاطر مجھے قوی کر دیجئے اور خیر
	کی طرف مجھے لیجائیے اور میری رضا کا منتہی؟

مومن دعا اجابت کے ایقان کے ساتھ کرتا ہے، ادعوا اللہ وَاَنتم مُوقِنُونَ بالاجابۃ تو اس کا ضعف قوت سے بدل جاتا ہے اس کا فقر غنا سے، اس کی ذلت عزت سے، وہ فقیر ہے، لیکن حق تعالیٰ کا وجود، اور ان کی صفاتِ وجودیہ کو اپنے اندر رکھتا ہے، ان کے ادراک سے وہ قوی، غنی اور عزت والا ہو جاتا ہے، اقبالؔ اس انقلاب کو یوں بیان کرتے ہیں،

ہمچنان از خاک خیزد جان پاک	سوے بے سوئی گریزد جان پاک
در، وادِ مرگ و حشر و مرگ	جز تب و تابے ندارد ساز و برگ
در فضاے صد سپہر نیلگون	غوطہ پیہم خورد و باز آید برون
می کند پرواز در پہناے نور	بلبلش گیرند جبریل و حور!

تا ز ما زاغ البصر گرد نصیب،

بر مقام عبدہٗ گردد رقیب!

معیتِ حق کا ہر لحظہ ادراک مومن کو ہر لحظہ نئی شان نئی شان بخشتا ہے، وہ حق تعالیٰ کی تجلیات کا محل بن جاتا ہے، گفتار و کردار میں وہ حق ہی کی صفات کو ظاہر کرتا ہے، اعدا کے خلاف وہ حق کی صفت قہاری و جبروت کا مظہر ہے، تو آپس میں رحم و غفاری کا مجلّی، اس کی سیرت کی تعمیر حق تعالیٰ اپنی خاص توجہ سے فرماتے رہتے ہیں، اور اس میں اپنی قدوسیت کی تجلی کرتے جاتے ہیں، اور وہ

رفعت و علو بخشتے ہیں، کہ وہ ہمسایہ جبرئیل امین بن جاتا ہے، وہ بظاہر تو قاری قرآن ہے، لیکن صفت کلام حق کا مظہر ہونے کی وجہ سے خود قرآن ہوتا ہے، حق تعالی کے مقاصد کا ظہور اس ہی کے ارادوں کی صورت میں ہوتا ہے، حق تعالی .... کی رحمت و جلالت کی تجلی گاہ اس کا قلب ہوتا ہے، مومن خود تو فقیر ہے لیکن اس فقر کی وجہ سے مغارت ایجابیہ حق کا جلوہ اس کی صورت سے ہر آن ہوتا ہے، وہ فانی زخویش باقی بحق ہے کس خوبی سے اقبال نے اس مفہوم کو ادا کیا ہے،

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایہ جبریل امین بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان

فقر ہی کی وجہ سے مومن حق تعالی کا امین ہے، خلیفہ ہے اور ولی ہے، اسی لئے اقبال صفت فقر کی مسلمانوں کے حق میں دعا کرتے ہیں: ع

اللہ کرے تجھکو عطا فقر کی تلوار

اللھم ارزقنا ھذا المقام

———— • ————

دو کتابیں

از

جناب شیخ فرید ایم اے برہانپور

"چند نادر الوجود مخطوطات" کے عنوان سے معارف نمبر ۴ جلد ۵۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے، فاضل مقالہ نگار کے مختصر اور جامع نقد و تبصرہ کے بعد ان مخطوطات کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، تاہم سطور ذیل میں بدائع الانشاء اور المعتمد فی المعتقد پر کر تبصرہ کو پیش کرنے کی جرات کی گئی ہے،

بدائع الانشار | مغلیہ دور میں انشاء علوم کی اہم شاخ سمجھی جاتی تھی، "مغلوں کے نظام حکومت" میں سر جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ "مغلوں کا راج کاغذی تھا" ایک منظم اور باقاعدہ دفتر انشاء میں امور سلطنت مرکوز تھے، سلاطین اور امراء کے خطوط کے مجموعہ طلبہ کے لئے مفید سمجھے جاتے تھے، بہت سے مجموعے بطور درسی کتب کے متداول تھے، زبان کے نقطہ نگاہ کے علاوہ یہ مجموعے اس لئے بھی بے حد اہم ہیں، کہ ان میں تاریخی مواد ہے،

انشاء کی کتابوں کی عموماً دو صورتیں ہوتی تھیں، (۱) یا کوئی منشی نفس فن پر کوئی کتاب لکھتا تھا، (۲) یا سلاطین اور وزراء کے خطوط طلبہ کے استفادہ کے لئے مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیئے جاتے تھے، ان ہر دو قسموں کی تصانیف کی کافی تعداد ہندوستان میں موجود ہے،

ہندوستان کی قدیم ترین انشاء کی کتابیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) رسائل الاعجاز خسروی (۷۱۹ھ)[1] (۲) مناظر الانشاء خواجہ محمود گاوان ۸۸۶ھ[2]

---

[1] ۷۱۹ھ میں خسرو نے اس ضخیم کتاب کے چار حصے لکھے تھے، ۷۱۹ھ میں ایک اور کا اضافہ کیا [2] قلمی نسخہ،

(۳) ریاض الانشاء[۱] خواجہ محمود گاوان (۸۸۶ھ) (۴) نامۂ نامی[۲] غیاث الدین محمد ۹۲۵ھ (۵) انشاے شاہ طاہر الحسینی ۹۵۲ھ (۶) بدائع الانشاء ۹۴۰ھ

حالاتِ یوسفی

بدائع الانشاء کا مصنف حکیم یوسف بن محمد متخلص بہ یوسفی ہرات کا باشندہ اور شہنشاہ بابر کا طبیب خاص تھا، عہد ہمایون اس کے لئے ہمایون ثابت ہوا، طبابت کے علاوہ دبیری کی خدمت بھی اس کو تفویض ہوئی، طب مین یدِطولیٰ رکھتا تھا، اور فارسی و عربی علم و ادب مین بھی عبور حاصل تھا، انشاء اور طب مین اس کی کئی تصانیف ہین، صحتِ عامہ اور اصولِ حفظانِ صحت کے بیان کے لئے اس نے اصنافِ سخن مین سے قصیدہ کو منتخب کیا، استاذ محترم شمس العلماء عبدالغنی صاحب نے یوسفی کی حسب ذیل اہم تصانیف کا ذکر کیا ہے،[۳]

(۱) ریاض الانشاء،[۴] مفرد و مرکب ادویات، جڑی بوٹیون کے خواص اور نسخہ جات پر مشتمل رسالہ کہ ہمایون کے نام پر معنون ہے، ۹۴۶ھ آغازِ تصنیف ہے،

(۲) جامع الفوائد، اس رسالہ مین عام دواؤن کے استعمال، فوائد اور نقصانات سے بحث کی گئی ہے، اسے ریاض الادویہ کا خلاصہ سمجھنا چاہئے،

(۳) قصیدۂ حفظِ صحت حفظانِ صحت کے خاص اصولون پر ایک مسلسل نظم ہے، ۹۳۰ھ مین شہنشاہ بابر کے نام پر

---

[۱] بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مجموعہ کرزن حصہ دوم عدد نمبر ۱۲۰ [۲] معارف ستمبر ۱۹۳۸ء [۳] تاریخ ادب و زبان فارسی در عہد مغلیہ حصہ دوم ص ۹۰، [۴] انڈین پریس الہ آباد کی غلطی سے اس کا نام ریاض الادویہ کے بجائے ریاض الانشاء چھپ گیا ہے، فہرست نگار بنگال ایشیاٹک سوسائٹی آیوانانے مجموعہ کرزن حصہ دوم مین ریاض الادویہ کے مخطوطہ کی کیفیت یہ بیان کی ہے مفرد و مرکب ادویات پر ایک کتابچہ ہے، ۹۴۶ھ مین ختم ہوا، ہمایون کے نام پر معنون ہے، اس کا ایک نسخہ بذیل عدد ۴۰ ہ برٹش میوزیم مین ہے، ادویہ کے اسماء اور خواص حروف تہجی کی ترتیب سے ہین، کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے، زیر نظر مخطوطہ (عدد ۱۵۹) مین صرف پہلا باب ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے:-

الحمد للہ الذی خلق الخلق داء و دواء و جعل الخ مخطوطہ کرم خوردہ ہے،

معنون کی گئی،

۴۔ بدائع الانشاء ۔ فنِ انشاء پر مبسوط کتاب ہے، جس میں مکتوب الیہ کے رتبہ، پیشہ اور عمر کے مطابق مناسب القاب و آداب کا بیان ہے، مصنف نے اپنے نور نظر رفیع الدین اور دوسرے طلبہ کے استفادہ کے لئے اس کو تصنیف کیا تھا، یہ کتاب لاہور دہلی اور لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوگئی ہے، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ہے، کہ یوسفی ہمایون کا منشی شاید وہی حکیم یوسف بن محمد ہروی ہے، جو بابر کا طبیب خاص بھی رہا ہے، ادبیاتِ فارسی میں بدائع الانشاء کی بدولت اسے خاص قرتبہ حاصل رہا ہے انشاے یوسفی پر مختصر تبصرہ کے بعد لکھتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۴۳ء میں دہلی میں چھپ کر شائع ہوئی، کتابِ مذکور کے نسخے عام طور سے ملتے ہیں، صاحبِ بدائع الانشاء مولانا یوسفی اگر حقیقۃً حکیم یوسف ہی ہیں، تو فنِ طب میں وہ تصانیفِ ذیل کے مالک ہیں ،

(۱) طب یوسفی، (طبع کانپور ۱۸۸۲ء)

(۲) علاج الامراض (طبع ۱۸۶۳ء)

(۳) تحفہ علاج الامراض (طبع ۱۸۶۹ء)

(۴) دلائل النبض (طبع ۱۸۶۶ء)

یوسفی کی تصانیف کے متعلق برتھیلس (Berthels) مشکوک ہے، صاحب بدائع الانشاء[1] اور مذکورہ بالا طب کی کتابوں کا مصنف اصل میں ایک ہی حکیم یوسف بن محمد ہروی ہے،

مخطوطات رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے فہرست نگار آیونانف نے یوسفی کی

---

[1] دین دیال فتح پوری نے جواب محمد اردشیر کا ملازم تھا، نمونہ کے خطوط کا ایک مجموعہ موسوم بہ انشاے بدائع ۱۸۵۱ء میں مرتب کیا ہے، "چہ نسخہ گیا" مادۂ تاریخ ہے،

حسب ذیل تصانیف کا ذکر کیا ہے،

(۱) فوائد الاخیار۔ یہ منظوم رسالہ اصول حفظانِ صحت اور غذائیات پر مشتمل ہے، قطعات میں طبی مشورے دیئے گئے ہیں، ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء کی تصنیف ہے، مادۂ تاریخ "فوائد اخیار" ہے، ذیل کے اشعار افتتاحی ہیں،

بدان چو نکتہ گفتی سپاس و درود — کہ در فنِ طب است این قطعہا

فوائد شدش نام ہر حرف اندو — ز دریائے حکمت درِ بے بہا

بیا یکدم اے بختِ فرخندہ جام — کہ فرخندگی از تو بود و خدا

بلطفم چنان کن از ان پیشتر — کہ از ارجمی سویم آمدندا

با تمام این نسخۂ دل فریب — فوائد رسانم بہ خلقِ خدا

۱۲۱۹ھ۔ ۱۸۰۵ء کی تصنیف ہے، مادۂ تاریخ "فوائد اخیار" ہے

بہ دست یاری کلکم شد این سالتام — کہ آفتے نہ رسد ز انقلاب ایامش

بخواندش، بفوائد رسد چون اخیار — بود فوائد اخیار سال اتمامش

(۲) رسالہ ضروریہ: نثر میں ہے، اس میں اصول و قواعد حفظانِ صحت کا بیان ہے،

ابتدا حسب ذیل ہے:-

الحمد للہ المنعم الحیوۃ النفوس وصحۃ الاجسام والصلوٰۃ علی واضع قانون الشرع ومن یتبعہ الی یوم القیامۃ اما بعد این نسخہ موسوم ایست بہ رسالہ ضروریہ کہ ترجمہ از ضرائد حفظان صحت است" و تا مل در ان از ابیات فضلت است"

---

[1] رسائل پرنٹی مرد ۲۲ ۱۵ / فہرست مخطوطات کتب فارسیہ مجموعۂ کرزن جلد دوم ص ۱۳۵ فوائد الاخیار ۹۰ ۹۰ ۱۱۳ [illegible]

رسالہ ہمایون کے نام معنون ہے،

درزمانِ خسروی ترتیب یافت	کاسمان بار عطایش برنتافت
دادرِ دوران ہمایون شاہ کہست	پیش خاک درگہش افلاک پست
آنکہ ماہ برج تمکین آمدہ	آفتاب ملت و دین آمدہ
آنکہ از اولاد پاک مصطفےٰ است	آنکہ سرتاپاے او نور صفاست
آنکہ چون ماہ ضیا تابندہ شد	آنکہ غوثِ روزگارش بندہ شد
یوسفی نرادم کہ از بخت سعید	آمدہ او را غلام زرخرید
جز دعاے او نگوید روز و شب	جز رضاے او نجوید روز و شب
تا بپاست چرخِ نیلگون	دولتِ اقبال او ہردم فزون

بر دلش ہرگز غبار غم مباد
یک سرمو از مہر او کم مباد

مقدمہ مین تبلایا ہے، کہ طب سے غرض حفظ صحت اور ازالۂ مرض ہے، اور حفظ صحت چھ چیزون سے ممکن ہے،

(۱) ہوا (۲) ماکول و مشروب (۳) حرکت و سکونِ بدنی (۴) حرکت و سکونِ نفسانی (۵) نوم و یقظہ (۶) احتباس و استفراغ، سنہ ۹۴۲ھ کی تصنیف ہے،

یافت درسال نہصد و چل چار	ہست ختم صورت اتمام
این رسالہ کہ باد فائدہ مند	جمہ آفاق را چہ خاص چہ عام

(۳) دلائل النبض :- تشخیص نبض پر مختصر رسالہ ہے، رسالہ کی ابتدا اس طرح کی ہے،

"الحمد للہ رب العالمین النافع الحکیم العلاء والصلوٰۃ علیٰ نبیک الانبیاء

واولادہ الکرام واصحابہ العظام اما بعد پوشیدہ نماند کہ این سطرے چند است از صناعت طب در اوزن نبض برحال بدن کہ بجہت طالبان این فن رقم محمد، و بدلائل نبض موسوم گشتہ،

سال تصنیف ۹۴۲ھ ہے، قطعۂ تاریخ یہ ہے،

زدہ رقم خامۂ ام دلائل نبض — نظرے کن تا لطف فرمائے
تا شود نبض[1] سال تاریخش — دو زصد کم وکن ورد وافزائے

(۴) **دلائل البول**۔ بول کے خواص اور مشاہدہ سے بیماریون کی تشخیص کے بارے مین ایک رسالہ ہے، اس رسالہ کی ابتدا اس طرح کی ہے

"بعد از سپاس حکیم مطلق جل ذکرہٗ پس از درود رسول برحق صلّی اللہ علیہ وسلّم وعلٰی آلہ واصحابہ"۔

سبب تصنیف امیران سلطنت کا اصرار بتلایا ہے :-

"مخفی نماند کہ چون رسالہ دلائل النبض باختتام انجامید بخاطر بعضے از مخادیم واعزا چنان رسید کہ در ادلۂ بول نیز چند کلمہ نوشتہ شود وحرفے چند نگاشتہ گردد، لاجرم این رسالہ کہ بدلائل بول موسوم است در حیز عبارت و قید کتابت آمد،

مادۂ تاریخ "قارورہ وچہار صد و سی فزا بران"[2] ہے،

احکام بول ساند و فکر پو شغی — بہر تو جمع کرد و جمیع برادران

---

[1] نبض + دو زصد کم = ۵۰ + ۲ + ۸۰۰ + ۱۰۰ + ۱۰ = ۹۴۲، نولکشور پریس کے مطبوعہ نسخہ مین آخری مصرعہ یون ہے، سے نبض بگیر و خود بر دا افزا۔ [2] قارورہ چہار صد و سی = ۱۰۰ + ۱ + ۲۰۰ + ۶ + ۲۰۰ + ۵ + ۴۳۰ = ۹۴۲

تاریخ سال تا کہ شود دشنت بگیر   تا دہد و چار صد و سی قرآن تباں

(۵) **جامع الفوائد**:- اس کتاب میں انسانی جسم کے تمام امراض کا بیان ہے، مصنف نے اپنے منظوم علاج الامراض کو اس کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ کتاب ہرات میں ۹۱۷ھ ۱۵۱۱-۱۲ء لکھی گئی، یورپ کے کئی کتب خانوں میں اس کے نسخے ہیں،

آغاز کتاب یوں ہے:-

"حمد نا محدود حکیمے را کہ بقانونِ حکمت کاملۂ صناعۃ ازحنش دافع انواع امراض ودافع انواع اعراض است...... بندۂ ضعیف کثیر تجیف مستشفی بشفاء النافع المجیب یوسف ابن محمد ابن یوسف الطبیب ستر اللہ عیوبہ وغفر ذنوبہ کہ چون بتوفیق حضرت حق رسالہ علاج الامراض کہ ہر مرض و دواے ہر عرض در وے مسطور و مذکور است بصورتِ اتمام ومنتِ نظام یافت بشرفِ مطالعۂ بعضے فضلاے نامدار کہ ایشان را با این ضعیف بے مقدار التفاتے می بود، مشرف گردید، فرمودند کہ کتابے در شرح مشکلاتے و طریق ترتیب مرکباتے کہ در آن رسالہ مبین ومعین است، با زوائد فوائد و فرائد قواعد از علامات امراض و امارات اعراض وغیرہ باید نوشت تا از مطالعۂ آن کافۂ انام از خواص و عام مستفید بہرہ مند گردند لاجرم عنان شب دیز قلم را بصورت این مرقوم کہ جامع الفوائد موسوم است معطوف ساختم۔"

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے قلمی نسخہ تحفۃ المسیحا (عدد ۱۰۹۱) کے تین سے ستائیس صفحات کے حواشی پر جامع الفوائد نقل ہے،

---

۱۰ رمضان ۹۱۷ھ مطابق ۱۹ دسمبر ۱۵۱۱ء تاریخ اختتام تصنیف ہے، علاج الامراض کا قطعہ

[1] انڈیا آفس لائبریری (عدد ۲۳۸۴) باڈلین لائبریری (شمارہ ۱۵۹۱) برٹش میوزیم (عدد ۱۴۸۳)

شروع ہے:۔

اے کہ خواہی تندرستی از درِ حکمت درآ تا بہ علتہائے گوناگون نگردی مبتلا

(۶) رسالہ ماکول ومشروب:۔ اس مختصر اور منظوم رسالہ مین طعام کے آداب و فوائد کا بیان ہے، سنہ ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۵ء کی تصنیف ہے، خوش سے سالِ تاریخ نکلتا ہے، ابتدائی اشعار درج ذیل ہین،

زبان را چہ در اوّلِ این کلام	زحمد و تحیت رساندی بہ کام
بدان اے خردمند روشن ضمیر	کہ گوید چنین یوسفیِ حقیر
کہ این نسخہ بہر تو کردم رقم	ز تدبیر ماکول و مشروب ہم
در آندم کہ این نسخہ منظوم شد	بماکول و مشروب موسوم شد

چو از چہرہ این ماہ برقع کشود
مرا سال تاریخ او خوش نمود

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ مین ایک رسالہ ماکول و مشروب بذیل عدد ۱۰۵ علٰحدہ محفوظ ہے، اس پر آئیوانا وف نے حسب ذیل تبصرہ کیا ہے،

"مفید ماخذ ماکولات و مشروبات پر منظوم رسالہ ہے، نواب میسور ٹیپو کی مدح مین جابجا طویل قصائد داخل کر دیئے گئے ہین، یہ رسالہ ٹیپو کے اس دربار کی عامیانہ اور سوقیانہ اپج ہے جو قدامت پرستی تعصب اور اوہام کا مرکز تھا، سنہ ۱۲۲۲ھ مہدی مولود تاریخ اختتام نظم ہے، مصنف کے نام کا پتہ نہین چلتا، اتھے (Ethe) اور (Pertsch) کے خیال کے مطابق اس کا مصنف یوسفی تھا، شاید اس کا اصلی نام عبدالقادر شاخوان ہوگا،

رسالہ ماکول و مشروب بخط عبدالقادر ثنا خوان تیرھوین صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے، افتتاحی شعر ہے،

زبان را چو در اول این کلام
ز حمد و تحیت رسانذی بہ کام

کاغذ بوسیدہ، خط شکستہ نستعلیق، مخطوطہ خستہ حالت مین ہے، جابجا آب رسیدگی کے نشانات ہین؛"

مندرجۂ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے، کہ سلطان فتح علی والی میسور کی شان مین طویل قصائد دیکھ کر فاضل مستشرق کا دماغ تعصب کا شکار ہو کر تحقیق کی راہ سے دور جا پڑا ایتھے اور پرنسنک اس رسالہ کو تصریح کے ساتھ یوسفی کی تصنیف بتلاتے ہین، مگر فاضل فہرست نگار کو شک ہے کہ مصنف کا اصلی نام عبدالقادر ثنا خوان ہوگا، خاتمہ کی عبارت بتلاتی ہے، کہ عبدالقادر کاتب ہے، نہ کہ مصنف، افتتاحی شعر بھی حرف بہ حرف ملتا ہے کسی نظم (قصیدہ) مین ۱۲۲۳ھ ہجری مولودی سنہ ہوگا، رسالہ ماکول و مشروب کا سنہ تصنیف ۹۰۹ھ ہے، ممکن ہے، بعد کے کسی شخص نے یوسفی کے اس رسالہ مین قصائد شامل کرکے صلہ کی طمع مین سلطان کی خدمت مین پیش کرنے کی نیت کی ہو، مگر مدح گو اس سعی مین ناکام معلوم ہوتا ہے، مخطوطہ پر سلطان کے کتب خانے کی مُہر کے نشان کا ذکر نہین کسی شاعر اور شریف کی مدح کی بنا پر سلطانی دربار کو مطعون کرنا محض تعصب اور کینہ پروری ہے،

نول کشور پریس سے ۱۹۱۳ء مین طب یوسفی معہ رسائل ذیل شائع ہوئی ہے،

۱- رسالہ نبض
۲- رسالہ قارورہ
۳- رسالہ بستہ ضروریہ
۴- مقطعات یوسفی، (فوائد اخیار)
۵- رسالہ ماکول و مشروب
۶- قصیدہ فی حفظ صحت، ۷- رسالہ بحران

قصیدہ فی حفظ صحت بدن | اس کے شروع مین یہ عبارت ہے،

"بعد از حکم دانا و تحیت زبدۃ الرسل والانبیاء صلی اللہ وعلیہ و آلہ وسلم و علی اصحابہ مفوذ می آید کہ این قصیدہ ایست در حفظ صحت بدن قرین زینت مسند (؟) حضرت پادشاہ سکندر حشمت سلیمان جاہ، تاج بخش، عالم آرائے، عدو بند، قلعہ کشائے، طراز کسوت وسلطنت و فرمانروائے نگین خاتم عظمت الخ.....

آن کہ او را رسید سرافرازی شاہ جم قدر بابر غازی

کعبۂ او غیرت سحاب آمد رائے او رشک آفتاب آمد

شاہ کی مدح کے بعد صحت و مرض کی علامات، حفظ صحت و ازالۂ مرض کے ضمن مین مندرجۂ ذیل تدابیر کا ذکر ہے،

۱۔ تدبیر ماکولات ۸۔ تدبیر فصول اربعہ

۲۔ تدبیر مشروبات ۹۔ تدبیر مباشرت

۳۔ تدبیر حرکت و سکون بدنی ۱۰۔ تدبیر قوت باہ

۴۔ تدبیر حرکت و سکون نفسانی ۱۱ تدبیر ضماد قوت باہ

۵۔ تدبیر نوم و یقظہ (خیند و بیداری) ۱۲ تدبیر سہل الولادت

۶۔ تدبیر احتباس واستفراغ ۱۳ تدبیر حفظ صحت،

۷۔ تدبیر ہوائے وبائیہ، ۱۴ تدبیر در منع رستن موے بر بدن،

اشعار کی تعداد ۱۵۰ ہے، خاتمہ کے اشعار یہ ہین،

یوسفی را بکر معنی جلوہ گر آید بفکر تا گر سوئش کشاید پادشاہ چشم رضا

حامی شرع محمد بادشاہ بر کرہت آفتاب و ماہ را از برائے او ضیا

از خدا امید دارم کہ گردد ہر زمان
دشمنش را آنچنان در دیگہ پنز بودہا

(۲) رسالہ مختصر البیان فی ضروریات بحران | رسالہ کے ابتدائی کلمات یہ ہیں :-

الحمد للہ الحکیم الوھاب ونصلی رسولہ محمد صاحب الحکمتہ و فضل''

رسالہ میں کہیں اس بات کی صراحت نہیں کی گئی ہے، کہ یہ یوسفی کی تصنیف ہے،

مذکورہ بالا تصریح سے ظاہر ہوا ہوگا کہ حکیم یوسفی کی گیارہ تصانیف ہیں ان میں سے بدائع الانشاء کے دو قلمی نسخے میرے پیش نظر ہیں ان کی کیفیت یہ ہے نسخہ نمبر ۱[۵] $5\frac{1}{2} \times$ ۷ تقطیع کے ۱۱ سطری مسطر پر ۴۲، ۳ صفحات پر مشتمل ہے، روشنائی سیاہ، عنوانات شنگرفی اور خط نستعلیق اور کاغذ دبیز ہے جابجا آب رسیدگی کے نشانات ہیں، متن اور حواشی پر مشکل لغات کا حل ہے اسید حامد ولد سید احمد نے چاردہم شہر جمادی الآخر ۱۱۳۹ھ مطابق نوسن جلوس محمد شاہ نقل کیا،

نسخہ نمبر ۲ کی تقطیع 8×5 اور ایک صفحہ میں ۱۳ سطریں ہیں، خط باریک اور ۹۰، ۲ صفحات ہیں، روشنائی سیاہ اور عنوانات شنگرفی ہیں، کاغذ کرم خوردہ اور پیوند کار ہے، کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں،

بدائع الانشاء کے دو قلمی نسخے کتب خانہ عالیہ رامپور میں بھی ہیں، مولانا امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ نے اس کے جو حالات راقم کو لکھے ہیں، وہ درج ذیل ہیں،

نسخہ الف بدائع الانشاء ۲ رذی الحجہ سنہ جلوس والا محمد شاہ، روز پنجشنبہ وقت ظہر کا لکھا ہوا ہے اور حضرت میاں محمد امین جیو کے نسخہ سے نقل ہوا ہے، اس کے دوسو پچاس صفحات ہیں، ہر صفحہ میں ۱۵ سطریں ہیں، ناپ $9\frac{1}{2} \times 5\frac{3}{4}$ ہے، کاغذ کشمیری بادامی، اور روشنائی سیاہ ہے، عنوانات شنگرفی ہیں، کاغذ کرم خوردہ

[۵] نسخہ مملوکہ حکیم جگن ناتھ پرشاد برہان پوری،

اور پیوند کار ہے، جدولین سرخ اور لاجوردی ہیں، اور اشی نین تین قطعات خط شکستہ میں ہے، اختتامات نستعلیق ہیں،
کاتب نے اپنا نام تحریر نہیں کیا، مگر آخر مین یہ شعر ملتا ہے،

الٰہی بہ عزت تو داری نگاہ — ہدایت ندارد بجز تو پناہ

ہدایت اس کے کاتب کا نام ہے،

نسخہ ب:۔ بدائع الانشار ناقص الآخر ہے، نسخۂ الف سے چھوٹا ہے، آدھا نقل ہونے سے رہ گیا ہے، اس کا خط معمولی بچکانہ ہے، صفحات کی تعداد ۱۰۶ ہے، اور فی صفحہ ۱۵ سطریں ہیں، ناپ ۵ × ۸ ہے، الفاظ میں بھی تغیر و تبدل ہو گیا ہے، یا کر دیا گیا ہے، کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، کاغذ معمولی بانس کا ہے، جدولین غائب ہیں، روشنائی سیاہ اور عنوانات شنگرفی ہیں، عنوانات میں اختصار کر دیا گیا ہے،
کاغذ کرم خوردہ اور پیوند کار ہے، سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں، پہلے سے پچاس یا ساٹھ برس بعد کا معلوم ہوتا ہے،

راقم مولانا کی اس اعانت کا تہ دل سے ممنون ہے،

بدائع الانشار کے قلمی نسخے ہندوستان اور یورپ کی کتب خانون مین ہین[1]،

سبب تصنیف | یہ کتاب فاضل مصنف نے اپنے نور نظر رفیع الدین حسین اور دوسرے طلبہ کے استفادہ کے لئے تصنیف کی تھی،

"این رسالہ ایست مسمّٰی بہ بدائع الانشار مشتمل بر محاورات خطابی وجوابی کہ جہت فرزند عزیز
قرۃ العین رفیع الدین حسین طال عمرہ وسائر طالبان این فن سادہ وقید کتابت درحیز عبارت می آید"

[1] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ عدد ۴۰۹ ۳ (۲) انڈیا آفس عدد ۲۰۵۰ (۳) اشپرینگر (۳۴۰ فہرست مخطوطات ایشیاٹک (۴) کیمبرج یونیورسٹی لائبریری (۱۰۳) (۵) بوڈلین لائبریری کا شمارہ ۱۳۴۴) (۶) برلن لائبریری (فہرست مخطوطات ص ۲۲۰) (۷) برٹش میوزیم فہرست مخطوطات ص ۵۲۹،

سنہ تصنیف تکمیل تصنیف کی تاریخ ذیل کے قطعہ سے ظاہر ہوگی،

این نامہ کز دست فن انشا بہ نظام　　گردید خوش بہ بدائع الانشا نام
تکرار کنی چو نام او یک بار　　شک نیست کہ رہبری بسال اتمام

بحساب جمل بدائع الانشا کے اعداد ۱۰۰۰ ہوتے ہیں، تکرار سے سنہ تصنیف ۲۰۰۰ عمل آتا ہے،

اقسام انشا مقدمۂ کتاب میں یوسفی نے انشا کی دو قسمیں بتائی ہیں،

۱۔ توقیعات فرامین شاہی اور احکام سلاطین (ب) محاورات، مکاتبات و مفاوضات،

مکتوب الیہ کاتب سے رتبہ میں بلند تر، برابر یا کم تر ہوتا ہے، اس لحاظ سے محاورات کی تین قسمیں بتائی ہیں،

۱۔ مرافعات، وہ عرض داشت جو بزرگوں کی خدمت میں پیش کی جائے (ب) رقاع، خطوط جو بلند مرتبہ کاتب کم رتبہ والے کو لکھے (س) مراسلات، ان مکتوبات کو کہتے ہیں، جو برابر والوں کو لکھے جائیں، ان سب کی دو قسمیں ہیں، (ا) خطابی (ب) جوابی،

ان اقسام کے علاوہ عہد نامہ، تعزیت نامہ، اور تہنیت نامہ بھی مکتوبات میں داخل ہیں،

بدائع الانشا حکیم یوسفی کا شاہکار ہے، فاضل حکیم کے قلم گوہر رقم نے اس میں ایسے الفاظ منتخب کئے ہیں کہ زبانِ قلم ان کی خوبی بیان کرنے سے قاصر ہے،

صورتش از حسن معانی غیرت ماہ تمام　　معنیش از لطف صورت رشک آب زندگی (یوسفی)

(باقی)

نوائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کے کلام سے صاحب ذوق طبقہ پوری طرح واقف ہے، ان کی پرجوش مذہبی و ملی قومی و سیاسی، اور مختلف النوع دلکش و دلپذیر نظموں اور پرکیف غزلوں کا مجموعہ نوائے حیات کے نام سے چھپ گیا ہے، شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے مبصرانہ مقدمہ ہے، ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت للعہ ملنے کا پتہ :- دار المصنفین اعظم گڈھ ۰۰

استفسار و جواب

حضرت سالار مسعود غازی رحمہ اللہ

جناب حکیم محمد بہاء الدین صاحب صدیقی | محلہ مسجد ہاٹ گنج بہرائچ (یو پی)

سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سالار ساہو متوفی ۴۲۳ھ کے صاحبزادے اور ۴۰۵ھ میں بمقام اجمیر پیدا ہوئے تھے بعد وفات سالار ساہو تقریباً ۱۰ ماہ بقید حیات رہے، اپنی تمام عمر میں دو بار اہل ہنود سے محارب ہوئے، اسی سلسلہ میں بہرائچ پہنچے اور بتاریخ ۱۴ ماہ رجب ۴۲۴ھ (تیسری جنگ میں) شہادت پائی، (مفتاح التواریخ جان ٹیل، ماتہ پنجم ص ۴۶، نولکشور پریس) ملخص،

مراۃ مسعودی سے بھی اسی بیان کی تائید ہوتی ہے، ممکن ہے مفتاح التواریخ کا ماخذ مراۃ مسعودی ہو، مگر بعض دوسرے مولفین نے بحوالہ ابوالفضل لکھا ہے، "کہ از خویشاوندان سلطان محمود غزنوی است" اور بحوالہ تاریخ فرشتہ تحریر کیا ہے، "کہ از اقارب سلطان محمود غزنوی بودہ کہ در عہد اولاد سلطان محمود غزنوی در ۵۵۰ھ بدست کفار مقتول گردید" تاریخ فرشتہ اور مراۃ مسعودی و مفتاح التواریخ کے اقوال میں اختلاف ہے، تحقیق حق کا طالب ہوں،

تحقیق طلب یہ ہے کہ یہ بزرگ کہاں کے رہنے والے تھے، سنہ پیدائش کیا ہے، وہ کس سلسلہ میں ہندوستان آئے تھے، اُن کے حالات کی اصلیت و نوعیت کیا تھی، اور شہادت کس [illegible]، [illegible]

معارف:- آپ کے سوالوں کے جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، آپکی یاددہانی کے خطوط بھی بمبئی کے سفر میں آپ کا زبانی پیام پہنچا، اور آخر میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی زاد مجدہٗ کی معرفت بھی استفسارات موصول ہوئے، حضرت سالار مسعود غازیؒ کے متعلق چند امور پیش خدمت ہیں، باقی دو سوالوں کے جواب جلد ہی روانہ خدمت ہوں گے،

حضرت سالار مسعود غازی کے متعلق جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، روایات میں اختلافات زیادہ ہیں، یوں تو ان کے مفصل سوانح حیات پر روشنی محمود غزنوی اور اس کے عین بعد کے زمانہ کی تاریخوں کی روایتوں سے بھی پڑتی ہے، لیکن تاریخوں میں ان کا براہ راست تذکرہ آٹھویں صدی کی لکھی ہوئی تاریخوں سے شروع ہوتا ہے، سفرنامہ ابن بطوطہ (۷۵۶ھ) تاریخ فیروز شاہی برنی (۷۵۸ھ) شمس سراج عفیف (۷۹۰ھ) میں ان کا اور ان کے مزار کا ذکر موجود ہے، پھر اکبری عہد کی تاریخوں میں سے طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، اکبرنامہ اور منتخب التواریخ میں ذکر آیا ہے، یہاں تک کہ صاحب مرآۃ الاسرار شیخ عبدالرحمن چشتی کی مستقل کتاب مرآۃ مسعودی سامنے آتی ہے، جو جہانگیر کے زمانہ میں تصنیف پائی ہے، اور مصنف کا بیان ہے، کہ مرآۃ مسعودی کا ماخذ ملا محمد غزنوی کی تاریخ ہے، جو محمود غزنوی کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے، اس لحاظ سے مرآۃ مسعودی کا پایہ فیروز شاہ سے اکبری دور تک کی تاریخوں سے بڑھ جاتا ہے اگرچہ مرآۃ مسعودی میں بعض روایتیں تاریخی روایات کے خلاف بھی ہیں لیکن اس کی تصدیق یا تردید عقل و درایت اور دوسری تاریخی روایتوں سے کیجا سکتی ہے، اور اسی خدمت کو جناب محمد عباس خان صاحب شروانی نے حیات مسعودی میں بڑی خوبی سے انجام دیا ہے، جناب کو اس موضوع سے دلچسپی ہے، مناسب ہے کہ حیات مسعودی کا مطالعہ فرمائیں، سرسری معلومات ذیل میں درج کر دیئے جاتے ہیں،

حضرت سالار مسعود غازیؒ کا جو نسب نامہ مرآۃ مسعودی میں ہے، اس سے وہ نسباً علوی قرار پاتے ہیں، پرانی تاریخوں مثلاً تاریخ فیروز شاہی وغیرہ میں انھیں سید سے ملقب نہیں کیا گیا ہے، مولانا

[illegible] نسب نامہ [illegible] لکھا ہے [illegible] کا ذکر بھی کیا ہے، ایک روایت اُن کے ننھیالی نسل ہونے کے متعلق بھی آئی ہے لیکن وہ کچھ صحیح معلوم ہوتی، اس لئے یہی سمجھا جاسکتا ہے، کیونکہ نسلاً علوی تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اسم گرامی اُن کے شجرہ نسب میں بارہویں پشت میں ہے، ان کے علوی ہونے کے باوجود ان کا محمود غزنوی کے رشتہ داروں میں سے ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، اس زمانہ میں ایسی رشتہ داریاں ہوتی تھیں، ان کا ننھیالی تعلق محمود غزنوی کے خاندان سے ہے، اُن کی ماں بی بی ستر معلی محمود کی بہن تھیں خواہ سگی ہوں، یا کسی دوسرے قریبی رشتہ کی

حضرت سالار مسعود غازی کے والد ماجد، سالار ساہو ۴۰۱ھ میں قندھار اور [illegible] کی راہ سے اجمیر پہنچے، اور سالار مسعود غازی کی پیدائش یہیں اجمیر میں ۴۰۵ھ میں ہوئی، تاریخ فرشتہ میں ۴۵۵ھ میں شہید کئے جانے کا جو ذکر آیا ہے، اس کو کسی حال میں صحیح نہیں کہا جاسکتا، تاریخ فرشتہ میں سنین کی غیر معمولی غلطیاں ہیں، اس لئے اس کے سنین وہی معتبر سمجھے جاسکتے ہیں، جن کی تصدیق دوسری تاریخوں سے ہوتی ہو، یا جن کی تردید میں کوئی دوسری روایت براہ راست یا بالواسطہ موجود نہ ہو، ۴۵۵ھ میں غزنویوں کا آخری دور تھا، مسعود ملک حکمران تھا، اس کے لئے اپنے تخت کا سنبھالنا دشوار تھا، اس دور میں غزنی سے نہیں باہر کیا جاتا تھا، اس لئے حضرت سالار مسعود غازی کی وفات کو ۴۵۵ھ میں کہنا نہ صرف عام تاریخوں کی روایتوں کے خلاف ہے، بلکہ سلطنت کے داخلی حالات بھی اس کے موافق نہیں، پھر ہندو سلاطین راجاؤں کے کتبوں کی شہادتیں اس کے خلاف جمع ہیں، اس لئے ان کا زمانہ ۴۰۵ھ سے ۴۲۴ھ ہی کے اندر ہے، اور انھوں نے اسی نو عمری میں جام شہادت نوش کیا ہے،

حضرت سالار مسعود غازی نے ساڑھے ۴ سال کی عمر سے تعلیم شروع کی، اور ۱۲ سال کی عمر ہی میں انھوں نے [illegible] تعلیم حاصل کر لی، یہ تعلیمی زمانہ تقریباً اجمیر ہی میں گذرا، [illegible] سلطان محمود غزنوی کے حکم سے [illegible] میں [illegible]

[illegible] اس کے بعد جب محمود غزنوی سومنات کی مشہور مہم پر ہندوستان [illegible] تشریف لے گئے تو اپنے فرزند کو ساتھ لیکر اس میں شرکت کی، اس کے بعد محمود اپنے بھانجے سالار مسعود کو اپنے ساتھ غزنی لے گیا، اور سالار ساہو اپنی خدمت پر ہندوستان میں مقیم رہے،

حضرت سالار مسعود غازی کی تعلیم و تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی، اس زمانہ میں ہندوستان کے مختلف خطوں میں پرامن اسلامی آبادیاں قائم ہو چکی تھیں، ہندوستان میں صوفیہ کرام اور مبلغین کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کی خدمت انجام پا رہی تھی، دوسری طرف پایہ تخت غزنی کے داخلی سیاسی حالات سالار موصوف کے لئے سازگار نہ تھے، محمود غزنوی تو ان سے محبت کرتا تھا، مگر مسعود غزنوی اور وزیر احمد بن حسن میمندی کو سالار سے کشیدگی تھی، اور اس کا قدرتی اثر حضرت سالار مسعود غازی پر بھی پڑا تھا، محمود کی زندگی کا یہ آخری دور تھا، اور مسعود کے اقبال کا آفتاب طلوع ہونے والا تھا، اور دربار کے امراء مسعودی جماعت میں کافی تعداد میں تھے، اس لئے سالار مسعود غازی نے پایہ تخت میں قیام رکھنا مناسب نہ سمجھا، حالات کے لحاظ سے کوئی بڑی فوج اور سامان وہاں سے نہ مل سکتے تھے، دین کی خدمت کا جذبہ بھی دل میں موجود تھا، اس لئے یہ محمود سے اجازت لے کر تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ نیم تبلیغی و نیم فوجی مہم پر ہندوستان کے لئے غزنی سے روانہ ہو گئے، یہاں پہلے وہ اپنے والد سالار ساہو کی خدمت میں آئے، پھر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اپنے مشن پر چل پڑے، چنانچہ مختلف مقامات مثلاً ملتان، اوچھ، اجودھن، دہلی، میرٹھ، گڈھ مکتیشر، سنبھل، گنور، ذبائی، دوندہ کوہ، بدایون، قنوج، ملکوپا مئو، کالپی، قصبہ، بلگرام، ملاؤن، ستر کھ، کڑا مانک پور، اور ڈالمئو میں پہنچا، مختلف مقاموں پر مختلف راجاؤں نے ان کا مقابلہ کیا، اور یہ فتحیاب ہوتے گئے، اسلامی بستیاں جو کچھ پہلے سے قائم تھیں، ان کی خبر گیری کی، نئے آبادکاروں کو بسایا اور آگے بڑھتے گئے، سالار ساہو ستر کھ میں آکر ان سے ملے، اور یہیں انھوں نے وفات پائی، پھر یہ آگے بڑھ کر بہرائچ پہنچے، اب اس دیار کے راجاؤں نے ان سے آخری فیصلہ کرنے کا عزم کیا، یہ [illegible] سے چل کر یہاں آئے، اور سرجو کے کنارے ان کے مقابلہ کی تیاری کی، چنانچہ ان سے [illegible]

ہو گئیں، چنانچہ فوراً ہی حضرت سالار مسعود کو آنا پڑا، دوسری لڑائی بھی ہندوؤں نے جیتی مگر اُن کے کافی

کی بڑی تعداد جنگ میں کام آ گئی اور تیسری ۱۳ رجب ۴۲۴ھ کو شروع ہوئی، راجاؤں کی

زمین بڑی تعداد میں تھیں اور انھیں کمک بھی ملتی رہتی تھی، دونوں فوجوں کا کوئی مقابلہ نہ تھا، چنانچہ

حضرت سالار کے ہمراہی ایک ایک کر کے شہید ہوئے اور ۱۴ رجب ۴۲۴ھ کو انھوں نے بھی جام شہادت

نوش کیا، امیر سید ابراہیم جو کیمپ کی حفاظت پر مامور تھے، لڑائی ختم ہونے کے بعد میدان جنگ میں آئے

اُن کی اور اُن کے رفقاء کی لاشیں سپرد خاک کیں، اور وہی مدفن آج تک مزار اور مرجع خلائق ہے

رحمہ اللہ تعالیٰ، والسلام۔ "س"

"ظاہری و باطنی تعلیم"

جناب سعید راشد صاحب (دکانی محلہ کھنڈ سال نالہ بریلی): محسن کاکوروی کے بارے میں کوئی مضمون معارف میں ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا ہے؟ محسن پر تنقید کہاں ملے گی، معارف کا وہ پرچہ آپ وی پی کر دیجئے، تصوف اور فارسی شاعری پر ۱۹۳۱ء اور اس کے بعد پرچوں میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں، وہ پرچے بھی وی پی مرحمت فرمائیں، بعض صوفیہ کا یہ قول کہ حضور نے حضرت ابوبکرؓ یا حضرت علیؓ کو مخصوص باطنی تعلیم دی تھی، کہاں تک صحیح ہے؟

معارف: معارف کے مطلوبہ پرچے ارسال خدمت ہو چکے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کو باطنی تعلیم دینا عجیب سی بات ہے، کسی زمانہ میں ظاہری و باطنی علم کی تقسیم نہ تھی، آپ کے فیض صحبت سے صحابہ کرام تعلیم حاصل فرماتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک میں قبول و استعداد کی جتنی صلاحیت تھی، اسی لحاظ سے وہ حضرات کرام فیضیاب ہوتے تھے

...ین حضرات کی ذاتی صلاحیتوں اور استعداد پر موقوف تھا اور اسی لحاظ سے ان میں باہم فرق مراتب ہے، عہد صحابہ و تابعین میں بھی جماعت کی جماعت اسباب جمال سے فیضیاب ہوتی تھی، اس زمانہ میں بیعت اور پیری مریدی کا یہ طریقہ رائج نہ تھا جو بعد میں جاری ہوا، پہلے کے بزرگان دین جامع حیثیات تھے، جب باطنی و روحانی اصلاح کی خدمت کے لئے علحدہ علحدہ شخصیتوں نے اپنے کو وقف کردیا، تو پھر بیعت اور حلقۂ ارادت کی بنا پڑی، اور شخص واحد شخص واحد کے فیوض و تعلیمات سے فیضیاب ہونے لگا، اور رفتہ رفتہ باطن کی اصلاح کرنے والوں اور اصلاح چاہنے والوں دونوں کے مستقل گروہ بن گئے،

ان اشارات کی روشنی میں جب آپ اپنے سوال پر نظر ڈالیں گے، تو حقیقت زیادہ واضح ہوگی، "والسلام" "س"

مطبوعاتِ جدید

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ مترجمہ جناب سید احتشام حسین صاحب لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عار پتہ: دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ،

جن لوگوں کو لسانیات یا فیلالوجی سے ذوق ہے، اُن کے لئے یہ نہایت دلچسپ فن ہے، اس کا موضوع بہت وسیع ہے، اس میں دنیا کی مختلف زبانوں کی لسانی تاریخ، اُن کی مختلف اجناس کی خصوصیت، ایک نسل و خاندان کی مختلف شاخوں کا باہمی ربط و تعلق، زبانوں کے قواعد، الفاظ کی سرگذشت، اور اُن کے لفظی و معنوی تغیرات وغیرہ جملہ لسانی پہلو داخل ہیں، یورپین زبانوں میں اس فن پر بکثرت کتابیں ہیں، عربی میں بھی عربی لغات سے متعلق تصانیف میں سامی زبانوں خصوصاً عربی فیلالوجی کے متعلق متفرق معلومات ملتے ہیں، اب اردو بھی اس سے بیگانہ نہیں ہے، ہندوستان میں بکثرت زبانیں اور بولیاں رائج ہیں، اور ان میں سے بیشتر ایک ہی خاندان کی شاخیں ہیں، اس لئے لسانیات سے ذوق رکھنے والوں کے لئے ان کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے، غدر کے بعد بنگال کے ایک انگریز کلکٹر جان بیمز نے جن کو لسانیات سے دلچسپی تھی، ہندوستانی زبانوں پر ایک کتاب[1] لکھی تھی، مذکورۂ بالا کتاب اس کا ترجمہ ہے، اور اس کے شروع میں مصنف کے قلم سے ایک مختصر سا مقدمہ ہے، یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، زبانوں کی گروہ بندی یعنی لسانی اعتبار سے اُن کی تقسیم، ہندوستانی زبانوں کے مختلف اقسام، اور اُن کے بولنے کے علاقے، زبانوں کے ارتقائی مدارج، اور اُن کی خصوصیات، اُن کی خاندانی تقسیم، یعنی ہم جنس زبانوں کی خصوصیات، بولیاں یعنی ایک ہی

[1] دی آؤٹ لائن آف انڈین فیلالوجی۔

ملک کی غیر ترقی یافتہ مقامی زبانوں اور بولیوں کے مطالعہ اور اُن کے قلمبند کرنے کے متعلق ہدایات ہیں، گو اس
کتاب کا موضوع ہندوستانی زبانوں کی لسانیات ہے، لیکن ضمناً دوسرے ملکوں کی بعض زبانوں کا
بھی اجمالی ذکر آگیا ہے، اور مختصر ہونے کے باوجود ہندوستانی لسانیات سے متعلق مفید معلومات پر
مشتمل ہے، لائق مترجم کا مقدمہ اصل کتاب سے زیادہ کارآمد ہے، اس کے بغیر یہ ترجمہ ناقص رہتا،
زبان کا مسئلہ ہر ملک و قوم میں خالص لسانی حیثیت رکھتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں اس
کو قومی و سیاسی بنا دیا گیا ہے، اس کتاب سے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے، مترجم نے خاص طور
سے اس کو مقدمہ میں پیش نظر رکھا ہے، جن لوگوں کو ہندوستانی لسانیات سے ذوق ہو، یہ کتاب ان کے
مطالعہ کے لائق ہے،

جدید معلوماتِ سائنس (حصہ اول) از جناب آفتاب حسن صاحب بی اس سی لندن تقطیع بڑی،
ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ انجمن ترقی اردو دہلی

جامعہ عثمانیہ کی بدولت اب اردو کا دامن سائنس کے معلومات سے خالی نہیں رہا، لیکن اس کی کتابیں
نصابی اور صرف تعلیم کے کام کی ہیں، اُن سے عام لوگ فائدہ نہیں اٹھا سکتے، انجمن ترقی اردو کی جانب
سے ایک مستقل رسالہ سائنس کے نام سے نکلتا ہے، جس میں اس موضوع سے متعلق نہایت مفید مضامین ہوتے
ہیں، اب انجمن نے سائنس پر ایسی جامع کتاب کی تالیف و اشاعت کا انتظام کیا ہے جو سائنس کے
ان تمام معلومات پر حاوی ہو جن کا جاننا ہر تعلیم یافتہ شخص کے لئے ضروری ہے، مذکورۂ بالا کتاب اس کی
پہلی جلد ہے، اس میں دس باب ہیں، کائنات کی کہانی، ہماری زمین، زمین کے خزانے، حیات کے کرشمے،
انسان، صحت، نباتی دنیا، حیوانی دنیا، قوت کے کرشمے، صنعت، ان ابواب میں ان کے مباحث کے
متعلق سائنس کی جملہ تحقیقات اکتشافات و ایجادات کو قلمبند کیا گیا ہے، مصنف کا بیان ایسا صاف
سلیس اور شگفتہ ہے، کہ سائنس کے خشک مسائل کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، داستان کے پڑھنے

مین فلسفے کی اصطلاحات آتی ہے، مباحث کی تشریح و تفہیم کے لئے بکثرت عملی تصویریں استعمال ہوئی ہیں، قدرت کے حیرت انگیز عجائب خانے سے واقفیت نہ صرف حصول علم کے لئے ضروری ہے بلکہ حصول معرفت کے لئے بھی مفید ہے، اس لئے ہر تعلیم یافتہ شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے، اردو میں یہ بڑا قابل قدر اضافہ ہے، تکمیل کے بعد یہ سلسلہ اردو میں سائنس کی مختصر انسائکلو پیڈیا ہوگا،

گاندھی نامہ حضرت اکبر الٰہ آبادی مرحوم تقطیع اوسط ضخامت مع مقدمہ وغیرہ ۹۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد للعہ، پتہ:۔ کتابستان کلائیو روڈ الٰہ آباد،

یہ حضرت اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ اور تاریخی تبرک ہے، ہندوستان کی ابتدائی پر آشوب سیاسی تحریکیں، خلافت اور ترک موالات ان ہی کے زمانہ میں ہوئیں، جن کے اثر سے بہت کم لوگ بچ سکے، مرحوم کے سیاسی خیالات میں فطرتاً اعتدال تھا، اور ان کی حقیقت نگر اور دور بین نگاہ سیاسیات پر بھی ناقدانہ پڑتی تھی، اس لئے اس جوش و خروش کے زمانہ میں بھی اُن کی نظر ان کے ہر پہلو پر بہت دور تک جاتی تھی، اُس زمانہ میں انھوں نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی سیاست اور ہندو مسلم مسائل کے متعلق اپنے مخصوص انداز میں جو خیالات و تاثرات ظاہر کئے تھے، گاندھی نامہ اس کا مجموعہ ہے، یہ نام انھی کا تجویز کردہ اور یہ مجموعہ انھی کا مرتب کردہ ہے، جس کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے، ہندوستان کے سیاسی طوفان اور اس کی آزادی کے بعد آج اس مجموعہ کے بہت سے خیالات قصۂ پارینہ معلوم ہوں گے، لیکن ہندو مسلم مسائل کے متعلق مرحوم نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں، ان میں سے بیشتر الہامی پیشنگوئی معلوم ہوتے ہیں، اور آج سے تیس سال پیشتر انھوں نے جو اشارات کئے تھے، وہ واقعہ کی شکل میں نظر آتے ہیں، جو مرحوم کی فراست ایمانی کا ثبوت ہے، مجموعہ کے شروع میں جناب پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب کے قلم سے اس کی تاریخ و پس منظر کی تفصیل اور اشعار میں تلمیحات اور اشارات کی تشریح ہے جس سے اس کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اس مجموعہ کی [illegible] ہے کہ حضرت اکبر الٰہ آبادی کا غیر مطبوعہ کلام ہے،

نوائے دل از جناب ہادی مچھلی شہری، ضخامت ... صفحے، کتابت و طباعت ...

مجلد، قیمت عہ، ملنے کا پتہ کتابستان، ... الہ آباد

جناب ہادی مچھلی شہری کا کلام تعارف سے مستغنی ہے، اُن کی مشق سخن پچاس سال گذر چکے ہیں، اتنی

طویل مشق ایک متشاعر کو شاعر بنا دینے کے لئے کافی ہے، اور جناب ہادی تو صاحب استعداد فطری

شاعر ہیں، ایک زمانہ میں اردو کا کوئی ادبی رسالہ ان کے کلام سے خالی نہ ہوتا تھا، لیکن اب وہ اس منزل

سے آگے بڑھ چکا ہے، نوائے دل اُن کے کلام کا مجموعہ ہے، حضرت ہادی کے کلام کا نشوونما اس دور میں

ہوا جب شاعری کی پرانی بساط الٹ رہی تھی، اور نئی محفل جم رہی تھی، اسلئے ان کا کلام دونوں کے اچھے

اثرات کا نمونہ اور خیالات کی نفاست و پاکیزگی، اور زبان و قواعد کی صحت و صفائی کا مجموعہ ہے، اور

اس میں نئے طرز کے جوش و مستی اور چمک اور تڑپ کے بجائے ایک خاص قسم کی متانت و سنجیدگی اور اعتدال و پختگی

پائی جاتی ہے، اس حیثیت سے ان کا کلام استادانہ ہے، دیوان کے شروع میں مصنف کے قلم سے انکے حالات ہیں،

جناب ڈاکٹر ... کے قلم سے کلام پر ناقدانہ تبصرہ ہے، امید ہے کہ ارباب نظر میں نوائے دل کی پوری قدردانی کیجائیگی،

حزب اللہ مرتبہ جناب پروفیسر حاجی مولوی محمد الیاس برنی صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰ صفحے،

کتابت و طباعت بہتر، محصول ڈاک بھیجکر مفت ملیگی، پتہ: بیت الاسلام سیف آباد حیدرآباد دکن،

مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح و سعادت اور مشکلات و مصائب کے حل کے لئے ظاہری تدبیروں کے

ساتھ بارگاہ خداوندی میں دعا، عجز و نیاز اور الحاح و زاری بھی ضروری ہے، اس غرض کے لئے علماء و صلحائے اسلام نے قرآن مجید

اور احادیث نبوی سے ماثور دعائیں جمع کی ہیں، ان میں حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ کی حزب البحر

زیادہ مشہور ہے، آجکل مسلمانوں پر بڑا نازک وقت ہے، اس لئے مرتب نے ان حالات کی مناسبت سے خاص خاص

آیات قرآنی کو ... اور مرتب کر کے ... ان کی خصوصی مناسبت کا خاص لحاظ رکھا ہے، کتاب کے شروع میں ...

نکات و فوائد پر مشتمل ایک مفید مقدمہ ہے، ارباب ذوق ... [illegible]

معارف
مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ
مرتبہ
سید سلیمان ندوی

جلد ۶۱ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۴۷ء عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

جدید ہندوستان کی تعمیر میں مختلف جماعتوں کے درمیان خیالات اور نظریوں کا جو اختلاف اور اسکی بنا پر جو ذہنی کشمکش ہے اس میں صرف ایک کانگریس سے صحیح رہنمائی کی اُمید تھی لیکن اس وقت اسکی پالیسی خود گروہ در گروہ اور غیر معین سی ہو گئی ہے، اہم معاملوں میں جن سے بحث کی ہے اس کے ارکان میں اختلاف ہے، صوبائی حکومتیں اسکے بتائے ہوئے اصولوں اور فیصلوں کی پروا نہیں کرتیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت زبان کے جیسے اہم مسئلہ میں ان کی روش ہے، اس بارہ میں چند بلند نظر اور کشادہ دل کانگریسیوں کے علاوہ باقی پوری جماعت ہندی زبان اور اس کے ساتھ ہندو کلچر کی حامی ہے، آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے تو ہندوستانی کو قومی و ملکی زبان قرار دیا ہے گو ابھی رسم الخط کا فیصلہ نہیں ہوا ہے مگر دستور ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کی تجویز پیش کی ہے صوبائی حکومتیں عملاً ہندی نافذ کر رہی تھیں اور دفتروں میں بھی مشغول ہیں اور اس کام میں سب سے زیادہ مستعد ہمارے صوبہ کی حکومت ہے سرکاری دفاتر سے تو پہلے ہی اردو نکل چکی تھی اس سال تعلیمی سال سے تعلیم سے بھی اسکو ختم کر دینے کے منصوبے تھے بلکہ اسکے احکام بھی صادر ہو چکے تھے، مگر بعض تعلیمی دقتوں کی وجہ سے فی الحال اس کو اختیاری زبان کی حیثیت سے باقی رکھا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں انگریزی لازمی ہے،

ہم کو ہندی سے اختلاف نہیں ہے اب تو وہ سرکاری زبان بن چکی ہے اس لئے اس کی تعلیمی اہمیت بھی لازمی طور سے بڑھ جائیگی اور ہر شخص کے لئے اس کا سیکھنا ضروری ہے لیکن اتنا تو موقع دیا جاتا کہ لوگ اسکو سیکھ سکیں یہ کونسا اصول ہے کہ جو شخص آج تک ہندی سے بالکل ناواقف ہے اس کو کل ہی سے ہندی میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے یا جو طالب علم اب تک اس سے بیگانہ ہے اسے بغیر ہندی سیکھے ہوئے دفعۃً تمام مضامین کی تعلیم ہندی میں دی جائے اور یہ دقت صرف مسلمان طلبا و اساتذہ کے لئے نہیں بلکہ ہندوؤں کیلئے بھی ویسی ہی دشواری ہے،

دوسرے یہ کہ اردو کیساتھ اجنبی زبان کا برتاؤ نہ کیا جائے چاہیں تو سکھوں کی خاطر تو گورمکھی اور اس کے رسم الخط کو سرکاری زبان بنایا جا سکتا ہے لیکن چار کروڑ مسلمانوں کی خاطر اردو زبان اس کی مستحق نہیں، اور پھر قومیت متحدہ کا دعویٰ ہے،

لیکن غنیمت ہے کہ ان حالات میں گورنر جنرل راجہ گوپال اچاریہ، پنڈت جواہر لال نہرو اور راجندر پرشاد کی ذات [illegible]

وقت ہندوستانی کی حمایت کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے جس کی صرف مرکزی حکومت کی امداد جتنا چاہئے تھا لیکن خود کانگریس کے حصہ کی
مخالفت ہوتی رہی چنانچہ پنڈت جواہر لال کی مدراس کی اس تقریر سے جس میں انہوں نے ہندوستانی زبان کی حمایت اور سنسکرت
اور فارسی الفاظ سے بوجھل بنانے کی مخالفت کی تھی خود دستور ساز اسمبلی کے بعض کانگریسی ممبروں نے سخت اختلاف کیا ہے جیسا کہ
ہندوستانی ایک دو نسلی اور مبہم زبان ہے جو بول چال میں یا ادبی حیثیت سے ملک کے کسی حصہ میں رائج نہیں ہے اور صوبائی اور قومی زبان صرف
سنسکرت آمیز ہندی ہو سکتی ہے اور ہندوستان کی قومی زبان کو سنسکرت آمیز بنانے میں کوئی حرج نہیں یہ بیان موجودہ عام ذہنیت کا ایک
نمونہ ہے ایک طرف تو کانگریسی حضرات اور کانگریسی حکومتیں ہر بات میں گاندھی جی کا حوالہ دیتی ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا عہد دہرا
رہی ہیں دوسری طرف زبان کے معاملہ میں انہیں ان کی رائے اور وصیت کا کوئی پاس لحاظ نہیں،

درحقیقت ہندوستان کے ان نادان اور کوتاہ نظر دوستوں نے جو ہندوستان میں ہندو تہذیب کا خواب دیکھ رہے ہیں زبان کو ہندو اور ایسا قومی
مسئلہ بنا رکھا ہے کہ بڑے بڑے دانا اس دام میں آگئے ہیں لیکن شاید ان کی نگاہ تہذیب و تمدن کی پیدائش ان کی ترقی و اشاعت و مقبولیت اور
ان کے زوال و خاتمہ کے طبعی اسباب و اصول پر نہیں ہے ورنہ وہ ان کی فطری رفتار میں مزاحمت کرتے، زبان اور تہذیب معاشرت وغیرہ کلچر
کے تمام اجزاء نہ جبر و قوت سے پیدا کئے جا سکتے ہیں اور نہ مٹائے جا سکتے ہیں بلکہ وہ مختلف طبعی عوامل و اسباب کے ماتحت صدیوں میں بنتے اور بگڑتے
ہیں اور ان کی اشاعت و ترقی کا ذریعہ قوت نہیں بلکہ ان کی افادی حیثیت حالات و ضروریات کا تقاضا اور ان کی مطابقت اور ظاہری
نفاست و دل آویزی ہیں اس لئے جو کلچر بھی ان اوصاف سے متصف ہوگا وہ خود بخود رائج اور مقبول ہو جائیگا اور کوئی قوت اس کو
نہ روک سکے گی، تاریخ تمدن کا یہ اصول ہمیشہ سے جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا،

اس اصول کے پیش نظر ہندو کلچر کے نقیبوں کو غور کرنا چاہئے کہ وہ موجودہ مشترک کلچر کے مقابلہ میں جو عربی ایرانی اور
ہندو (اور اب اس میں انگریزی کو بھی شامل کر لینا چاہئے) تمدنوں کے حسین و دلکش عناصر کا بوقلموں اور دلنواز مرقع ہے اور
جو صدیوں سے ہندوستانیوں کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے چھوڑ کر ہزاروں برس پرانے اور بوسیدہ تمدن کو زندہ کرنے میں
کہاں تک کامیاب ہو سکیں گے، اور کون ہندوستانی یہ رجعت قہقری کرنا پسند کرے گا، ہر دور کا کلچر اس زمانہ کے سیاسی معاشرتی و معاشی
اور ذہنی حالات کی پیداوار اور انہیں کا نتیجہ اور انہی کے لئے موزوں و مناسب ہوتا ہے دوسرے زمانہ میں نہیں چل سکتا

[illegible] کرنے کے معنی یہ ہیں کہ پوری بنیاد ہی ہلا دی جائے جس پر ہندوستان کی کئی ہزار سال کی

کی روایات کو ٹھکرا دیا جائے، اگر یہ خیال ہو تو البتہ یہ باتیں بحث کرنے کے قابل ہیں، لیکن اس پر بھی غور کر لینا چاہئے کہ اس

ہندوستان کا تمدن دنیا میں کیا درجہ ہوگا اور اپنا وجود کس طرح قائم رکھ سکے گا، ان اوہام و خرافات کی اس سے زیادہ اور

کوئی حقیقت نہیں کہ زیادہ سے زیادہ چند معاشرتی آداب و رسوم بدل جائیں گے ورنہ پہلے کچھ گوشہ کرنے کے بعد

اس میں رد کیا جائے گا اور اس کی تصویر کیا ہوگی،

ہندوستانی کلچر کی عمارت مختلف تہذیبوں کے ستونوں پر قائم ہے اور آئندہ بھی رہے گی اسی میں اس کا حسن بھی ہے اور استحکام بھی، ان میں سے جس ستون کو بھی گرانے کی کوشش کی جائے گی، اس سے عمارت کی مضبوطی اور خوبصورتی میں فرق آ جائے گا، ہندی زبان اور ہندو کلچر کی شورش سے باہمی تفریق کے سوا اور کچھ حاصل نہیں جس کے نتائج بد سے اب تک ہندوستان کو نجات نہیں ملی ہے،

ناظرین کو یہ معلوم ہے کہ دلی کے گذشتہ ہنگامے میں انجمن ترقی اردو اور ندوۃ المصنفین کو بڑا نقصان پہنچا تھا اور خیال تھا کہ وہ مدتوں نہ سنبھل سکیں گے، لیکن اس کے مخلص کارکنوں نے ہمت و استقلال سے اس صدمہ کو برداشت کیا، اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ندوۃ المصنفین نے حسب معمول پھر اپنا کاروبار جاری کر دیا ہے، اور اس نے کئی کئی کتابیں شائع کی ہیں، اب ان اداروں کی زندگی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے، اس لئے ان کی امداد و اعانت اردو کے تمام ہی خواہوں کا فرض ہے، اور کم سے کم مدد یہ ہے کہ ان کی مطبوعات و رسائل کی خریداری اور اشاعت کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے، ہم نے کسی گذشتہ اشاعت میں لکھا تھا کہ دیوان فغاں جسے ہمارے رفیق سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے مرتب کیا تھا، اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہو رہا تھا، دلی کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا، لیکن ایک تازہ اطلاع سے معلوم ہوا کہ دیوان مذکور محفوظ ہے،

لکھنؤ کے مشہور قرآنی ادارہ تعلیمات اسلامی کی جانب سے عنقریب ایک ہفتہ وار اخبار تعمیر نکلنے والا ہے، جس کی ترتیب [illegible] کی نگرانی میں ملک و ملت کی مفید تعمیری خدمات انجام دے گا [illegible]

مقالات

قومیت

ٹیگور کی کتاب نیشنلزم کے اردو ترجمہ پر مقدمہ

از

سید سلیمان ندوی

رابندر ناتھ ٹیگور ہندوستان کے ان مشاہیر مین تھے، جن کے خیالات وافکار سے نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ وامریکہ اور ایشیا کے بہت سے ملک متاثر ہوئے، اُن کی شاعری نے مادی دنیا کی نگاہون کے سامنے روحانیت کے مناظر پیش کئے، جنگ وجدل اور تعصب وعداوت سے بھری ہوئی قومون کو انسانی برادری اور اخوت ومحبت کا پیام سنایا، اُن کے افسانون اور کہانیون مین اخلاق کے سبق اور حکمت کے درس ہین اُن کی تقریرین فلسفیانہ حقایق اور حکیمانہ نکات سے لبریز ہین، اسی لئے اُن کی تصنیفات کے ترجمے متعدد مذہب ملکون مین ہوے، اور شوق کے ہاتھون سے لئے اور بصیرت کی آنکھون سے پڑھے گئے،

خاکسار کو موصوف کے دیکھنے کا اتفاق دو دفعہ ہوا، پہلی دفعہ ۱۹۲۰ء مین لندن مین ہندوستانی طالبعلمون کے ایک جلسہ مین جو شکسپیر ہٹ مین ہوا تھا، مین نے اس جلسہ مین جب پہلی دفعہ دیکھا تو اُن کا لمبا قد، صاف رنگ، لمبی سپید داڑھی، سر پر لمبے لٹکتے بال، اس پر لمبی قلندری ٹوپی، جسم پر ایک لمبا لباس، دیکھ کر عمر خیام کی وہ خیالی صورت سامنے آگئی، جو بعض کتابون مین شائع ہوئی ہے،

دوسری دفعہ ۱۹۲۲ء مین ان کو دیکھا، جب مین مصر سے اور وہ شاید امریکہ سے واپس آرہے تھے، مین

مصر کے ساحل سے جس جہاز پر ہندوستان کے لئے روانہ ہوا، اسی پر موصوف بھی سوار تھے، راستہ بھر تو دور دور سے دیکھا، وہی شکل، وہی صورت، وہی لباس تھا، جس دن جہاز ہندوستان کے ساحل کے قریب آرہا تھا، اور سارے ہندی مسافر اپنے وطن کی سرزمین کو دیکھنے کیلئے بے تاب تھے، اور بعض ٹیگور بھی تھے، مین اُن کے پاس گیا اور باتون باتون مین اُن سے پوچھا کہ کیا آپنے کبھی دیوان حافظ پڑھا ہے، انھون نے جواب دیا مین نے خود تو نہین پڑھا، البتہ میرا باپ فارسی جانتا تھا، وہ مجھکو کبھی کبھی اس کا ترجمہ سُنایا کرتا تھا"

ٹیگور کی عالمگیر شہرت نے ہندوستان کی عزت اور ناموری مین چار چاند لگا دیئے، جس کا آغاز گیتانجلی سے ہوا، جس پر ادب اور شعر وسخن کا سب سے بڑا انعام اس کو حاصل ہوا، اور جس پر اس کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر سمجھا گیا، حالانکہ اس کے فلسفیانہ خیالات اور حکیمانہ افکار بھی کچھ کم اہمیت نہین رکھتے، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اردو کی قسمت میں اس کی چند نظمون، کہانیون، اور افسانون کے سوا کچھ اور نہین آیا، اس سے بڑھکر یہ کہ اردو کے بعض ادیبون نے اُس کے طرز تحریر کی نقالی مین بعض ایسے بھونڈے نمونے پیش کئے، جن سے ناواقفون کی نگاہون مین خود ٹیگور کی بھی اہمیت نہین رہی،

آج ایک نوجوان ہندوستانی مسلمان عبدالفتاح انصاری کی کوشش سے موصوف کی ایک اہم کتاب "نیشنلزم" کا اردو ترجمہ ہمارے سامنے ہے، یہ ان کے تین مقالون یا خطبون اور ایک نظم پر مشتمل ہے، پہلے مقالہ کا عنوان "مغرب مین قومیت" اور دوسرے کا "جاپان مین قومیت" اور تیسرے کا "ہندوستان مین قومیت" ہے، اور نظم کا عنوان "صدی کا آخری غروب آفتاب" ہے، یہ مجموعہ ۱۹۱۷ء مین لندن مین چھپا تھا،

یہ مجموعہ پہلی بڑی لڑائی کے آخر مین چھپا اس لئے اس مین انسانی مصیبتون کی تلخی کی آواز موجود ہے لیکن دوسری بڑی لڑائی کے بعد یعنی تاریخ اشاعت سے آج تیس برس بعد انسانیت، قومی عصبیت، مادی خونخواری، اور انسانی برادرکشی کے مہیب مناظر کو دیکھکر جس قدر اپنے مستقبل سے ترسان اور لرزان ہے، اگر اگر آج مصنف زندہ ہوتا، تو اس کے قلم سے انسانی محبت کی موت پر وہ نالہ وشیون نکلتا، جس سے دنیا ایک

تمدن تک متاثر ہوتی،

مصنف نے اپنے پہلے مقالہ میں مغرب میں قومیت پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، تمہید میں ہندوستان کی روحانی سکینیت، اور اس کی عمیق فکر نی ذہنیت اور اوس کی دنیا سے الگ تھلگ زندگی کا نقشہ کھینچا ہے لیکن میرے خیال میں یہ ہندوستان کی یک رخی تصویر ہے، اوس کے دوسرے رُخ کی تصویر پنجاب اور اس کے ملحقہ میدان میں آریہ قوم کے داخلہ اور یہاں کی پرانی آبادیوں سے آویزش اور اُن کو اُن کے مملوکہ مقامات سے نکال کر اچھوتوں کے درجہ پر لانے کی نمایان کوششوں کے رنگ سے تیار کرنا چاہئے، یا پھر مہا بھارت رامائن اور ہندو اتہاس کے اُن غیر مدون واقعات اور حوادث کی رنگینی سے کرنا چاہئے جن میں ہر راجہ دوسرے راجہ سے اور ایک خاندان دوسرے خاندان سے اسی طرح برسر آویزش نظر آتا ہے، جس طرح ہندوستان کی قرون وسطیٰ کی ترکی اور مغل سلطنتوں میں نظر آتا ہے،

مصنف نے قوم کی تعریف نہایت دلآویز کی ہے یعنی وہ جماعت بندی جو کسی ملک کے باشندوں کے سیاسی و معاشی اتحاد سے پیدا ہو، یہ پوری آبادی کی وہ صورت ہے، جو کسی انتظامی مقصد کے لئے اس کی تنظیم کرنے سے پیدا ہوتی ہے، ہندوستان پر مختلف قوموں نے باہر سے آکر سلطنتیں کیں، اس سلسلہ کی آخری کڑی انگریز ہیں، مصنف نے بڑی خوبی سے انگریزوں کے اور اُن سے پہلے کی فاتح قوموں کے مقصدِ سلطنت کے فرق کو نمایان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ انگریزوں سے پہلے سلاطین کی حکومت تھی، یعنی ایک فرد واحد اپنے اغراض اور ضروریات کے لئے ہم پر حکومت کرتا تھا،

"ہم مغل اور پٹھانوں کو جانتے تھے جنھوں نے ہندوستان پر حملہ کیا، اور جو اپنے پسندیدہ اور ناپسندیدہ مذاہب اور رسم و رواج کے حامل تھے، لیکن ہم انھیں انسانی نسلوں کے اعتبار سے جانتے تھے، ہم نے انھیں قوم کی حیثیت سے کبھی نہیں جانا، ہم نے حالات کے اعتبار سے ان سے محبت بھی کی، اور نفرت بھی، ہم ان کے ساتھ شریک ہو کر دوسروں سے لڑے اور

کبھی یہاں کے نواب، ہم نے اُن سے ایک اپنی زبان میں گفتگو کی جو اُن کا [illegible] اور ان کا
بھی، اور اس سلطنت کی قسمت کی نگہبانی کی جس میں ہم کسی حیثیت سے حصہ دار تھے، لیکن اس
مرتبہ ہمیں واسطہ سلاطین سے نہیں پڑا تھا، نہ انسانی نسلوں سے، بلکہ ایک قوم سے اور واسطہ ہمیں
پڑا تھا جو بذاتِ خود کوئی قوم نہیں ؛

اس کے بعد مصنف نے پوری تفصیل سے مغرب کی اس قومی سلطنت کے خصوصیات دکھائے ہیں، جو ہندوستان پر مسلط ہوئی، جس کا مقصد یہ نہ تھا کہ صرف ایک سلطان کے خزانوں کی معموری کے لئے ملک کی دولت کھینچی جائے، بلکہ یہ مقصد تھا کہ سات سمندر پار کی ایک پوری قوم پورے ملک ہند پر اس طرح حملہ آور ہو کہ اس کی زراعت، معدنیات، پہاڑ، دریا، جنگل، زمین کے طبقات اور ہر نوع کے پیداوار کو اپنے قبضہ میں کرلے، یہ صرف سلطان کی حکومت نہ تھی، بلکہ لوہاروں، بڑھئیوں، موچیوں، کسانوں، سپاہیوں، سوداگروں، بنیوں اور ہر قسم کے پیشہ وروں اور صناعوں کی سلطنت ملک ہند پر تھی،

اس کا دوسرا فرق یہ تھا کہ پہلی سلطنتیں زندہ دلوں اور دھڑکنے والے انسانوں کی حکومتیں تھیں جن میں انسانی ارادوں سے محبت اور عداوت، رحم اور سنگدلی، مہر اور قہر یہ تبدیلی حالات ظاہر ہوتے تھے، مگر مغربی قومیت کی یہ سلطنت ساری مشینی ہم آہنگی سے کام کرتی تھی، جس میں انسانی ارادہ فنا ہو کر بیجان مشین اور محبت و عداوت، رحم و کرم، اور ظلم و ستم کے ہر جذبہ سے مبرّا ہو کر پوری سلطنت کے کاروبار کو حرکت دیتا ہے، یہ سیاسی و اقتصادی تنظیم جس کا دوسرا نام قوم ہے، جب خود تر عمرانی زندگی کی ہم آہنگی کو مٹا کر ہمہ گیر غلبہ حاصل کرلیتی ہے، تو بقول مصنف انسانیت کے لئے اس سے بڑھ کر بڑا دن کوئی اور نہیں ہوتا، جب ایک باپ قمار باز ہو جاتا ہے اور وہ فرائض جو بحیثیت باپ ہونے کے اپنے اہل و عیال کی جانب سے اس پر عائد ہوتے ہیں اس کے ذہن میں ثانوی جگہ حاصل کرلیتے ہیں، تو اس وقت وہ انسان نہیں رہتا بلکہ ایک خودحرکی آلہ (Automaton) بن جاتا ہے جسے اپنے کی طاقت چلا رہی ہے

صنعت کی مشینی ترقی، سائنس کی ایجادات، نقل و حمل، اسلحہ و صنعت کی تیز رفتار ترقی نے اور فرمانروا قوم کی ہمہ گیر عظیم طاقت نے محکوم قوم کے سارے عناصر و اجزاء کو اپنے دباؤ میں اس طرح لے رکھا ہے کہ اس کی گرفت سے آزادی ممکن نہیں،

مصنف نے اس مغربی قومیت کے جو خصائص اور اس کی قومی حکومت کے جو اثرات اور نتائج دکھائے ہیں، اُن کی پوری تفصیل اصل کتاب میں آئے گی، بہرحال یہ کتاب آج سے تیس برس پہلے لکھی گئی تھی، اس عرصہ میں اس مغربی قوم کی گرفت اس ملک سے ڈھیلی ہو کر بالکل ہٹ گئی، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مغربی قوم کے بجائے جو "ہندوستانی قوم" اب سلطنت کی مسند پر حکمران ہوا چاہتی ہے، وہ کس پروانہ پر حکومت کرے گی، ہندوستان میں اس وقت کانگریس پارٹی سوشیالسٹ اور کمیونسٹ اور بعض دوسری جماعتیں جو اس سلطنت کی تنظیم میں حصے رہی ہیں، یا حصہ لینا چاہتی ہیں، وہ جاندار انسانوں کی حکومت بناتی ہیں، یا بیجان مشینوں کی،؟ اس کا جواب مستقبل دے گا،

مصنف کا دوسرا مقالہ "جاپان میں قومیت" پر ہے، مصنف کو جاپان سے یک گونہ شغف بھی تھا، اس کو جاپان کے مشرق سے آفتاب نکلتا ہوا، اور اسی سمندر میں ڈوبتا ہوا نظر آتا تھا، جاپان ایشیا کا وہ ملک ہے، جس نے سب سے پہلے اپنی بیداری کا ثبوت دیا، جس نے یورپ کی صنعت و حرفت اور مادی ترقیوں کے ساتھ ساتھ نہ صرف اس کی جنگی اور حربی قوت کو بھی حاصل کیا، بلکہ یورپ کی استعماری حرص و ہوس کی بھی پوری نقل کی، مصنف کی چشم بصیرت نے اس کا اندازہ پہلے ہی سے کر لیا تھا، اس لئے جاپان کی قومی تعمیر کے عناصر میں یورپ کے جو مضر اثرات اس کو نظر آئے، اُن کی طرف جاپان کے لوگوں کو توجہ دلائی، افسوس ہے کہ چین پر جاپان کے حملہ اور گذشتہ جنگ عظیم میں مصنف زندہ نہ تھا، ورنہ وہ دیکھتا کہ جن خطرات سے اس نے جاپان کو آگاہ کیا تھا، وہ کل کے کل اس کو پیش آئے، اور مصنف کی یہ تنبیہ اور اس کے کہے کا پورا ہونا ہی یہ ثبوت ہے، کہ مادی ترقی اور ظاہری تمدن، قومی خود غرضی کے وہ لوازم ہیں جو اس سے

کبھی الگ نہیں ہو سکتے، آیندہ خدا ہی جانتا ہے، کہ امریکہ کی جبری تعلیم جاپان کی زندگی کا رخ کدھر کو پھیرتی ہے

تیسرا مقالہ ہندوستان میں قومیت پر ہے، یہ بالکل واقعہ ہے، کہ اس ملک کی اکثریت جس کا جدید نام ہندو قوم ہے، تاریخ کے ہر دور میں وسیع مفہوم کی قومیت سے عاری رہی ہے، یہ خاندانوں اور نسلوں اور خاندانی اور نسلی خداؤں مذہبوں اور رسم و رواج میں ہمیشہ جکڑی رہی ہے، اس نے دوسرے خاندانوں اور نسلوں اور قوموں اور رسموں سے ہمیشہ نفرت کی ہے، جس کا دوسرا نام چھوت چھات ہے، اس کی الگ تھلگ زندگی نے اس کو دنیا کی دوسری قوموں سے ہمیشہ دور رکھا، اور اس کا اپنا وسیع ملک ہی اس کی جنگ و جدل، فتح و شکست اور عروج و زوال کے لئے کافی رہا، اس ملک کے تمام مصلح بودھ سے لے کر گاندھی جی تک اس قوم کی اس تشخصیت سے لڑتے رہے، مگر ان کو دیرپا کامیابی حاصل نہیں ہوئی، بودھ کی تعلیم نے ایک زمانہ میں ہندوستان کو دنیا کا ایک ملک بنا دیا، اور اس کا تعلق دنیا کی ساری قوموں سے جوڑ دیا تھا لیکن بالآخر برہمنی رجعت پسندی نے اس کا خاتمہ کر دیا، اب اس زمانہ میں گاندھی جی کی تعلیم سے جو اثر پیدا ہوا اس کا انجام گاندھی جی کی حسرتناک موت سے ظاہر ہے لیکن بہرحال گاندھی جی کے اثرات کے علاوہ موجودہ مغربی تعلیم کے اثرات نے بھی ہندوستان پر کم اثر نہیں ڈالا ہے، اور اس مغربی قومیت کا اثر ہندوستان کی اکثریت میں نمایاں ہے، لیکن ڈر اس کا ہے کہ یورپ کی طرح یہ تنگ نیشنلزم جارحانہ صورت اختیار نہ کر لے، اور چھوت چھات والی نفرت مغربی وضع کی تنگ جارحانہ قومیت کے رنگ میں نہ ظاہر ہو

مصنف نے "ہندوستان میں قومیت" کا یہ مقالہ امریکہ میں پڑھا تھا جس میں ہندوستانی اور امریکی دونوں شامل تھے اور اسی تقریب سے اہل امریکہ کو یورپ کی جارحانہ قومیت کے مفہوم سے ہشیار اور ہندوستان کو مستقبل کے خطرے سے خبردار کیا ہے

جس زمانہ میں یہ مقالہ لکھا گیا تھا (۱۹۱۷ء) کانگریس با اقتدار جماعت نہ تھی، اور وہ چند اصلاحات کے سوا کچھ اور نہیں چاہتی تھی، اس لئے اس مقالہ میں کانگریس کی تعمیری حیثیت کا جس کا اضافہ گاندھی جی کے عہد میں ہوا، مصنف نے انکار کیا ہے، اور بتایا ہے اور حکیمانہ نقطہ نظر سے بالکل صحیح بتایا ہے کہ ہندوستان

کی اصلی کمزوری سیاسی نہیں بلکہ عمرانی ہے، مصنف کا یہ خیال صحیح ہے کہ اگر ہندوستان کو سیاسی آزادی حاصل بھی ہو جائے، لیکن اس کو عمرانی آزادی حاصل نہ ہو، تو وہ تباہ ہو جائے گا، یہی وہ خطرہ تھا جس کے ازالہ کے لئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد گاندھی جی ہمہ تن کوشاں تھے، اور جس کی راہ میں انھوں نے جان دی،

مصنف کے اس مقالہ کا ایک پارہ یہاں نقل کرنے کے لائق ہے،

"ہندوستان اپنے رقبہ میں بہت وسیع اور اس میں بسنے والی نسلیں بہت مختلف ہیں، یہ ایک جغرافی ظرف ہے، جس میں کئی ملک بھر دئے گئے ہیں، یہ یورپ کے بالکل ضد ہے، جو صحیح معنی میں ایک ملک ہے، لیکن اسے کئی ملکوں کی صورت میں تقسیم کر دیا گیا ہے، اس لحاظ سے یورپ کے تہذیب و تمدن اور ارتقار میں نہ صرف کئی ملکوں کی قومیں انفرادی حیثیت سے اس کی معاون ہوئیں، بلکہ اجتماعی حیثیت سے بھی اس کے برعکس ہندوستان قدرتی اعتبار سے کئی لیکن بظاہر ایک ملک ہوتے ہوئے شدید فطری اختلاف و تباین اور ناکافی ارتباط کے باعث ہمیشہ نقصان اٹھاتا رہا ہے۔"

میرے نزدیک ہندوستان کی اس بیماری کا صحیح علاج اس تباین و اختلاف کو بزور مٹانا نہیں بلکہ اس کا کھلے دل سے اعتراف کر لینا ہے، اور اس کو باقی و قائم بلکہ محفوظ رکھنے کا عہد کرنا ہے، بقول مصنف کے، امریکہ اور اسٹریلیا نے اپنے اس مسئلہ کو اس طرح آسان بنایا، کہ انھوں نے اصل باشندوں کو فنا کر دیا، لیکن ہندوستان کی نسبت مصنف کا خیال ہے، کہ اس نے شروع ہی سے نسلی فرق کو برداشت کیا، اور اس رواداری کی روح اس کی تاریخ پر اثر انداز ہوتی رہی ہے،

مصنف کا یہ بیان صحیح ہے کہ ہندوستان نے نسلی فرق کو برداشت کیا، یعنی تلوار کے زور سے اس کو فنا نہیں کیا، لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس نے غیر آریوں کو زندہ قد رہنے دیا، لیکن زندہ درگور بنا کر رکھا

جس کے معنی یہ ہین کہ تلوار کے بجاے عمران واجتماع ومعاشرت کی تلوار سے فنا فنا کر کے ان کو پہاڑون
کھوؤن اور سنسان میدانون مین ہٹ جانے پر مجبور کیا، یہان تک کہ آج ان قومون کا قوم کے نام سے
پتہ بھی نہین، بدھ ہندوستان مین پیدا ہوئے، لیکن اُن کے ماننے والے جو کبھی سارے ہندوستان مین
پھیلے ہوئے تھے، جیسا کہ اُن کی یادگارین ظاہر کرتی ہین، آج ہندوستان مین وہ بحیثیت قوم یا مذہب کے
کہین موجود نہین،

ایک بڑے خطرے کی چیز یہ ہے کہ ہندو قوم کی چھوت چھات کی بیماری اس زمانہ مین مغربی جاہلانہ
تنگ قومیت کی نئی شکل اختیار نہ کر لے، جو اپنے باشندون کو مجبور کرے، کہ وہ ایک قومیت اور تنہا ایک
قومیت کے مظاہر اختیار کرین، اُن کی ایک ہی ریاست ہو، اُن کی ایک ہی بولی ہو، اُن کی ایک ہی معاشرت
ہو، اُن کا ایک ہی طرز تخیل ہو، اور ایک ہی ظاہری شکل وصورت اور لباس ہو، جس کے معنی یہ ہین کہ ہندوستان
کی ساری نسلون کو ایک ہی قوم بننے پر مجبور کیا جائے، جس کی طرف میلان آزادی کے بعد روز بروز بڑھتا
جاتا ہے، کیونکہ آزادی کے بعد نظریہ کو قوت سے فعل مین لانے کی طاقت اس کے ہاتھ مین آگئی ہے، لیکن
یہ ہندوستان کے حق مین بڑی غلطی ہو گی، غالباً ۱۹۳۶ء مین جب کانگریس نے پہلی دفعہ اپنی وزارت بنائی
تھی، ہندوستان کے اس میلان کو دیکھ کر مین نے مدینہ مین ایک مضمون لکھا تھا، کہ ہندوستان کی بقا
ہندوستان کی "قومیتِ متحدہ" کے نظریہ مین نہین، بلکہ "ہندوستان کی اقوام مختلفہ کی جمہوریہ متحدہ کے نظریہ
مین ہے، جیسا کہ آج روس مین نظر آ رہا ہے، کہ وہ متعدد قومون اور نسلون اور زبانون کا مجموعہ ہو کر اقوام
مختلفہ کی جمہوریہ متحدہ کی صورت مین قائم ہے، اسی طرح ہندوستان کی مختلف ریاستون کو ایک ریاست
مختلف قومون کو ایک قوم، مختلف زبانون کو ایک زبان، مختلف تمدنون کو ایک تمدن اور مختلف نسلون کو
ایک نسل بنانے یا بنا کر دکھانے کی کوشش چھوڑ دی جائے، اور یہان کے سارے باشندون کو اپنی
قومیت، اپنے تمدن، اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی ترقی اور نشو ونما کے لئے پوری آزادی بخشی جائے

مصنف کا یہ مجموعہ ایک نظم پر تمام ہوا ہے، جس میں گزشتہ صدی کے آفتاب کے غروب اور نئی صدی کے طلوع پر شاعر نے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، اور امن وسلامتی کی قناعت اور سادگی کے سایہ میں بڑھنے کی دعوت دی گئی ہے۔

مصنف کا یہ مجموعہ نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ میں پوری دلچسپی اور دلآویزی کے ساتھ پڑھا گیا، اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان کے مشہور ادیب رومین رولان نے اپنی زبان میں کیا، خوشی ہے کہ اب اس کا ترجمہ اردو میں پیش کیا جا رہا ہے، اس ترجمہ کو میں نے جابجا سے پڑھا اور مجھے محسوس ہوا کہ مترجم اپنے ترجمہ میں کامیاب ہے، خیالات کی بلندی اور شاعرانہ زور بیان کے سبب سے ترجمہ آسان نہ تھا لیکن مترجم نے اپنی قابلیت اور اہلیت سے ان سخت مرحلوں کو خوبی کے ساتھ طے کیا ہے، امید ہے کہ ناظرین خود بھی آئندہ صفحوں کو پڑھ کر مجھ سے اتفاق کریں گے، اور مترجم کو اس کی کامیاب محنت پر داد دیں گے،

نوائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کے کلام سے صاحب ذوق طبقہ پوری طرح واقف ہے، اُن کی پُرجوش مذہبی وملی وقومی وسیاسی اور مختلف النوع دلکش و دلپذیر نظموں اور پُرکیف غزلوں کا مجموعہ نوائے حیات کے نام سے چھپ گیا ہے، دیوان کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے ماہرانہ مقدمہ ہے، ضخامت ۲۷۵ صفحے، قیمت: للعہ مجلد،

ملنے کا پتہ :- دارالمصنفین اعظم گڑھ،

اسلامی حکمرانوں سے مسلمانوں کی

ایک بے جا شکایت

از

مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

سوچنے سے نہ کبھی منع کیا گیا، اور نہ منع کیا جا سکتا ہے، سوچنا اگر چھوڑ دے تو انسان، انسان ہی کب باقی رہتا ہے، اس کے بعد تو وہ زندہ جانوروں کی بھیڑ میں شریک ہو جاتا ہے،

لیکن صحیح سوچ بچار یا فکر و نظر کو چاہئے کہ ہمیشہ واقعات کے تابع ہو، جان بوجھ کر دلائل کو ایسے مقدمات سے مرتب کرنا جن میں قصداً بعض حقائق و واقعات سے چشم پوشی اختیار کی گئی ہو، دنیا کی ہر عقل اس قسم کے دلائل کو مسترد کرتی رہی ہے، اور کرتی رہے گی،

یہ سوچ والے بیچارے تو ایک حد تک معذور بھی ہیں، کیونکہ حقائق و واقعات کی صف میں صرف محسوسات کو مان کر حقائق کے وجود سے اپنے دل و دماغ کو انہوں نے خالی کر لیا ہے، بقول اقبال مرحوم:-

پا بزندانِ مظاہر بستۂ　　　از حدودِ حس برون ناجستۂ

یہی ان کی فکری تعمیر کی بنیادی اینٹ ہے ۔۔۔۔ [illegible]

دانایاں بڑبڑا رہی ہوں، ان سے اس کی توقع ہی کیوں کی جائے [illegible]

خیال بھی ان کے سامنے آئے گا،

[illegible]

مجھ میں آپ ہی تاب پیکتا تو وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے

لیکن مجھے تعجب تو مسلمانوں پر ہے اُن لوگوں پر ہے جنھوں نے اب تک اس بیعت کو نہیں توڑا ہے

جو انھوں نے اور اُن کے باپ دادوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر کی تھی، وہ اپنے فکری و عملی نظام میں بھی اور عملی زندگی میں بھی اسی عہد و پیمان کے ساتھ جی رہے ہیں، کہ اسی کو واقعہ یقین کریں گے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ قرار دیا ہے، اسی کو حقیقت تسلیم کریں گے، جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باور کرایا ہے کہ وہی حقیقت ہے، مگر جب تک سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، وہ بھی مانتے اور بھی جانتے ہیں، لیکن حافظہ کی اس کمزوری کا کوئی علاج ہے، کہ جوں ہی سوچنے اور سمجھنے کی کوئی مہم پیش آتی ہے ضرورت ہوتی ہے کہ فکر و تامل سے کام لیا جائے، تو اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والوں میں اکثروں کو دیکھا جاتا ہے، کہ وہ بھی اسی طرح سوچنے لگے، جیسے حقائق و واقعات کے سلسلہ میں خدا کا انکار کرنے والا، یا نہ ماننے والا سوچتا ہو، اسباب و علل کے طویل و عریض زنجیرے کی ایک ایک کڑی پر اُن کی نظر پڑتی ہے، آگے پیچھے جو کچھ دیکھا جا سکتا ہے، دائیں بائیں جو کچھ سوچا جا سکتا ہے، سمجھا جا سکتا ہے، سب کو ٹٹولتے ہیں، اور سب کو پرکھتے ہیں، لیکن فکر و نظر کے اس عمل میں اُن کے حافظہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہی نکلا ہوا ہے، جس پر چاہیے تھا کہ سب سے پہلے نظر اُن کی پڑتی،

ما قدروا اللہ حق قدرہ	[illegible]	خدا کی قدر جیسی چاہیے ہے انھوں نے نہ کی
ما لکم لا ترجون للہ وقارا		تم کو کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے وقار اور وزن

اسی لحاظ سے میں مسلمانوں کے افکار و تعبیرات اور اُن سے نکالے ہوئے نتائج کا موازنہ جب ان دماغوں اور دلوں کے افکار و نظریات کے نتائج سے کرتا ہوں، جن میں خدا اور خدائی کار فرمائیوں کا کوئی وزن باقی نہیں رہا ہے، تو دونوں میں مجھے کسی قسم کا کوئی فرق اور امتیاز نظر نہیں آتا،

اسی لئے کہہ چکے ہیں جس کا اجمالی تذکرہ اس وقت کرنا چاہتا ہوں، جس طرح مصائب میں مبتلا ہو کر

مسلمانوں کی صحبت میں ایک عام چرچا کچھ دنوں سے جس کا پھیلا ہوا ہے یہ بھی کہ گذشتہ اسلامی عظمت والے اور فرمانرواؤں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے، کہ باوجود اقتدار و اختیار کے انھوں نے اپنے مقبوضہ و محکومہ ممالک میں غیر مسلم عناصر اور طبقات کو باقی رہنے کا موقع کیوں عطا کیا، تعبیری تبدیل کے ساتھ اسی مقصد کو کبھی ان الفاظ میں بھی ادا کیا جاتا ہے، کہ اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں بھی اسلامی [illegible] اور بادشاہوں نے جتنی توجہ کرنی چاہئے تھی، نہ کی، مطلب کہنے والوں کا یہ ہوتا ہے کہ غیر اسلامی قوتوں کے ساتھ جس قسم کی عجب کشمکش میں آج مسلمان اُلجھ گئے ہیں، یہ صورت ہرگز نہ پیش آتی، اگر اپنے مطلق العنانہ اختیار و اقتدار سے ہمارے گذشتہ سلاطین و ملوک کام لیتے،

میں اسی عام چرچے کے متعلق اس وقت کچھ کہنا چاہتا ہوں، یہ مسئلہ کہ غیر اسلامی عناصر سے پاک ہو جانے کے بعد جس بہشتی زندگی کا تصور موجودہ زمینی زندگی میں لوگ کر رہے ہیں، اگرچہ بجائے خود غور طلب ہے، اور غور طلب کیا، حجاج بن یوسف اور ابو مسلم خراسانی، تیمور لنگ اور ان جیسے ظلم کے عہد میں جن تجربات سے مسلمانوں کو گذرنا پڑا ہے، اُن کو جانتے ہوئے یہ توقع خود ہی سوچنا چاہئے کہاں تک صحیح ہو سکتی ہے کہ مصائب کے جن ہولناک طوفان میں اس وقت وہ گھر گئے ہیں، ان میں وہ نہ گھرتے، اگر ہمارے گذشتہ سلاطین و ملوک اپنے غیر مشروط اقتدار سے کام لے کر صرف مسلمانوں کے لئے ذہن کے ان خطوں کو مختص کر دیتے جن میں وہ آج آباد اور پھیلے ہوئے ہیں، اس بحث کو خیر جانے دیجئے، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کہ سلاطین اسلام کے متعلق یہ عام شکایت جو مجلسوں میں کیجاتی ہے، شکایت کرنے والوں کی اس سے آخر مراد کیا ہے ؟

کیا جبر اور زور سے اسلام کے قبول کرنے پر چاہتے ہیں کہ ہمارے سلاطین لوگوں کو مجبور کرتے، اس جبر و اکراہ کے بعد بھی جو انکار پر اصرار کرتا، محض اس لئے کہ اُن سے زمین پر کوئی پہنچنے والی بالاتر قوت انسانی گروہوں میں باقی نہیں رہی تھی، اس [illegible] انکار کرنے والوں کا [illegible]

[illegible] یہ خیال کہ [illegible] کسی [illegible] ہے [illegible]
اُن کے قلب میں پیدا ہو سکتی ہے ؟ اسلامی سلاطین تو بیچارے جا چکے، آج بھی میں مسلمانوں سے پوچھتا ہوں
کہ خود اسلام نے اُن کے اندر اس خیال کے لئے کوئی جگہ کیا باقی رکھی ہے، پھر وہ ایسی باتیں کیوں بولتے
ہیں جنھیں وہ خود سوچ بھی نہیں سکتے،

خود ہی بتائیے کہ جبراً کسی کو اسلام کے قبول کرنے پر آمادہ کرنا کیا یہ اسلام کے قبول کرنے کا مطالبہ
ہوگا، یا یہ کفر کی بدترین قسم نفاق پر مجبور کرنے کی عملی تدبیر ہوگی ؟ میں نہیں جانتا کہ کافر ہی نہیں، بلکہ منافق
بنانے کی اس قسم کی سرانجامی کی صلاحیت باوجود مسلمان ہونے کے کوئی اپنے اندر کیسے رکھ سکتا ہے، یا ہم
میں ایسا کون ہے جو کسی کو کافر بننے پر مجبور کرنے کی ہمت کر سکتا ہو، پھر منافق کا مقام تو کافر سے بھی فروتر
ہے، ہم جب کسی کو کافر بننے پر مجبور نہیں کر سکتے، ہیں تو منافق بننے پر بتایا جائے کہ کیسے جبر کر سکتے تھے، یا آج
کر سکتے ہیں؟

رہ گیا نہ ماننے والوں کا صفایا یہ سچ ہے کہ جن کی فکری تجویزوں میں خدا اور خدائی تعلیمات شریک
نہیں ہیں، جب ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس قسم کے اعمال کے ارتکاب کی جسارت کر گزرتے ہیں، اُن
کے اگلوں نے بھی اس پر عمل کیا ہے، اور اُن کے جو پچھلے ہیں، اپنے اگلوں کے ان سیاہ اعمال کو سلف کے
زرین کارناموں میں شریک کر کے ایسی حرکتیں اب بھی کر رہے ہیں، اُن کے بڑے چھوٹوں کو اس قسم کے قصے
مزے لے لے کر سناتے ہیں کہ جو ڈینگیں مارتے اکھاڑ کر فلاں مذہب والوں کو فلاں ملک سے ہم نے ختم
کر دیا، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول جن بادشاہوں نے مانا تھا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اِن
غریب بادشاہوں سے توقع کرنے والے صفایا کے اس عمل کی توقع آخر کس بنیاد پر کر رہے ہیں ؟

[illegible] صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ارقم صحابی کو [illegible] تھے جب
[illegible] ہرگز

ہرگز ظلم پہنچنے پائے، دیکھو اُن کی برداشت اور طاقت سے زیادہ اُن پہ بار نہ ڈالا جائے، اور اُن کی رضامندی

کے بغیر اُن کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے،

خبردار جو ایسا کرے گا،

فانا حجیجہ یوم القیامۃ[1]، میں اس پر قیامت کے دن دعویٰ کرونگا

اور اس سے لڑونگا،

یہی میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کی آخری عدالت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعی علیہ بن کر پیش ہونے کی طاقت کیا مسلمانوں کے بادشاہوں میں تھی، میں مانتا ہوں کہ وہ معصوم نہ تھے، اُن میں ایسے بھی گذرے جن پر اسلام کی طرف سے بہت الزامات عائد ہو سکتے ہیں، اور بعضوں کے فردِ جرم کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن یہ سب کچھ سہی پر جو جرم ایسا ہو کہ خود پیغمبر نے مدعی بن کر اس کے مقابلہ میں کھڑے ہو جانے کی دھمکی دی ہو، سوچنے کی بات ہے، کہ اس نظارے کے برداشت کی تاب تباہ جائے کہ آخران بیچاروں میں کیسے پیدا ہوتی؟

اسلامی حکومت کے نظام کو عملی قالب میں ڈھال کر پیش کرنے والے فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سانس اکھڑ رہی ہے اور اکھڑی ہوئی سانسوں ہچکیوں میں ان کی یہ آواز کانوں میں گونج رہی ہے،

"جن غیر مسلموں کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لی ہے، اُن کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں، اُن سے جو عہد کیا گیا ہے، اس کو پورا کیا جائے، ان کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کا فرض ہے، کہ ان پر حملہ کرنے والوں سے جنگ کریں، اور جس بار کو وہ برداشت نہ کر سکتے ہوں، ہرگز ایسا بوجھ اُن پر ڈالا جائے"،

---

[1] ابوداؤد میں اس حدیث کے الفاظ یہی ہیں، طبرانی میں ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس پر دعویٰ کروں گا، آگے بار بار پڑھے گا ... [illegible]

(شرح ہدایہ [illegible])

اور صرف زندگی ہی کی حد تک احترام کا یہ قانون محدود نہیں ہے بلکہ

عظام الذمی لها حرمة اذا وجدت فی قبورهم کحرمة عظام المسلمین حتی لا تکسر لان الذمی لما حرم ایذاؤه فی حیاته لذمته فتجب صیانة عظمه عن الکسر بعد موته،

(بحر الرائق ج ۲ ص ۲۱۰)

اسلامی قلمرو کے غیر مسلم باشندوں کی ہڈیوں کا بھی احترام کرنا چاہئے اگر ان کی قبروں میں پائی جائیں اسی طرح احترام کرنا چاہئے، جیسے مسلمانوں کے مردوں کی ہڈیوں کا احترام کیا جاتا ہے، چاہئے کہ غیر مسلم (مردوں) کی ہڈیوں کو توڑا نہ جائے، کیونکہ اسلامی حکومت نے جس غیر مسلم کی ذمہ داری لی ہے جیسے زندگی میں اس کو دکھ دینا حرام ہے اسی طرح واجب ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کی ہڈی کو توڑنے کی اہانت سے بچایا جائے۔

پس واقعہ وہی ہے کہ خدا کو درمیان سے نکال کر سوچنے والے جب سوچیں گے تو اسی قسم کے ناقص ادھورے افکار اُن کے دماغ میں آئیں گے، لیکن جو خدا کو مانتا ہے، خدا کی نگرانیوں پر یقین رکھتا ہے، وہ بہرحال قوموں کے ساتھ انصاف کرے گا، خواہ وہ ظلم کے کسی نقطہ تک چڑھ کر نہ پہنچ جائیں، ظالم خود تباہ نہیں ہوتا، خدا اسے تباہ کرتا ہے [illegible] نہیں ہوگی خدا اس کی پشت پناہی کرتا ہے۔

اسی طرح پر انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ صرف یہی عہد شکنی ہی نہیں، بلکہ

التحرز عن صورۃ الغدر | عہد شکنی کی ظاہری شکل و صورت سے بھی

واجب | پرہیز مسلمانوں کے لئے واجب ہے

فراخ جبی بلند نظری، علو حوصلہ کے یہ جذبات کیا ان لوگوں میں پیدا ہو سکتے ہیں، جو حق و صداقت، عدالت و انصاف کا رشتہ خدائے قادر و توانا سے توڑ کر یہ باور کراتے پھرتے ہیں، کہ ان کی کامیابیوں کی ضمانت حق و صداقت، عدالت و انصاف کے ان ہی الفاظ اور صرف الفاظ میں پوشیدہ ہے، ایسے الفاظ جن کے معانی کا صحیح تصور خود ان باور کرانے والوں کے دماغوں میں بھی پوچھنے کے بعد بسا اوقات پتہ چلتا ہے، کہ نہیں پایا جاتا، کیا الفاظ نرے ان الفاظ سے آدمی کی عقلی فطرت میں زور بھرا جا سکتا ہے، ؟

کہنے والے جب کہتے ہیں کہ سچائی ہمارے ساتھ ہے، اس لئے ہماری کامیابی یقینی ہے تو اسی وقت کیا وہ یہ بھی نہیں سوچتے، کہ سچائی کوئی مست ہاتھی نہیں ہے، جو دشمن کی صفوں میں گھس کر اس کی فوج اور فوج کے سپاہیوں کو اپنے پاؤں کے نیچے مسل ڈالے گا، یقیناً وہ جانتے ہیں، کہ حق و صداقت کے الفاظ جدید ہری بم نہیں ہیں، جسے اٹھا کر وہ باطل پرستوں اور جھوٹ کے حامیوں پر دے ماریں گے، اور یوں فتح مند و بامراد ہو کر میدان جنگ سے واپس لوٹیں گے، مگر کیا کیجئے کہ حق و صداقت کا جو واقعی پشت پناہ اور عدالت و انصاف کا آخری سرپرست مادی دنیا ہے، اسی ذرہ ذرہ خبیر و بصیر خدا بلکہ اس کے خیال تک سے یہ خود بھڑکتے ہیں، اور دوسروں کو بھڑکانے ہیں، اعتنا ہا کرتے ہیں کہ بات چیت یا عام تقریر و گفتگو میں بھی قرون وسطیٰ کی اس فرسودہ

(بقیہ حاشیہ ۱۰۱) (۱) امیر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مشہور فرمان ہے کہ مترس (مت ڈر) کے فارسی لفظ کے کہہ چکنے کے بعد کسی غیر مسلم کو اگر کوئی مسلمان سپاہی ہاتھ چھوڑے گا، تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔

(دیکھو احکام القرآن ص ۱۴ جلد سوم)

[illegible] ہو کہ جانب اسے ہو سکے ایک تنسک کا اقتضا [illegible]

سوا اور کیا یاد کرانا چاہتے ہیں کہ وہی ہو کر رہے گا اور ہمیشہ وہی ہوتا رہا، یا جو کچھ [illegible]
سوچ رہے، یا جس کی آرزو وہم پالتے رہے، دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا
ہوا، کہ قدرت کے قوانین قدرت کے قبضۂ اقتدار میں نہیں، بلکہ ہر اس شخص کے ہاتھ میں ہیں جس نے
اعلان کر دیا ہو، کہ میں رجائی یا رجائیت پرست واقع ہوا ہوں،

عہد حاضر کے درحقیقت یہی عقلی مغالطے اور ذہنی ژولیدگیاں ہیں، جن میں الجھ کر اس زمانہ
کا انسان ان بلند حوصلوں سے محروم ہو گیا ہے، جن کے بل بوتے پر وہی کیا جاتا تھا، جو کہا جاتا تھا،
بات کے دھنی اب جو پیدا نہیں ہوتے، چھوٹے ہی نہیں، بڑائی کے بلند سے بلند میناروں پر آج جو چھوٹے
نظر آرہے ہیں، ان تک کا یہی حال ہے کہ فریق مخالف زبان یا محاورے اصطلاحات وغیرہ کی
ناواقفیت کی وجہ سے الفاظ کے جس مطلب کو نہیں سمجھ سکا ہے، اُن کے اقتضاء کو تو یہ کیا پورا کرتے
آئے دن یہ دیکھا جا رہا ہے کہ طے کرنے کے بعد جن فقروں کے مقاصد و اغراض و معانی کے متعلق دو
رایوں کی بھی گنجائش کسی حیثیت سے نہیں نکل سکتی، ان پر بھی اُن کی قلبی کمزوریاں ان کو جمنے نہیں
دیتیں، مستقبل کا ابہام ہمیشہ ان کو ہول دل میں مبتلا رکھتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ معاہدہ کی قیود
سے نکلنے بھی نہیں پاتے، کہ الفاظ کے الٹ پھیر سے نفع اٹھانے کی تدبیروں کو سوچنے لگتے ہیں پھر ذہنی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۳) کے الفاظ سے رسالتمآب صلوٰۃ اللہ علیہ وسلامہ نے جو فرمائی ہے، بہر حال [illegible] ہے
کہ کہنے کی عام عادت عورتوں میں جو پائی جاتی ہے، غالباً یہ اسی کی طرف اشارہ ہے، خود [illegible]
یہ عادت کم پائی جاتی ہو، اجیت عورتوں کی اس بڑی عادت [illegible] اسی نے پیدا ہو گئی [illegible]
کہ بات قدرت کے گویا اپنے ہاتھ میں لینا ہو، مگر عصر حاضر کے رجائی دوسیاق تو جب کہ [illegible]
[illegible] مطلب جو اس تحلیل و تجزیہ کے بعد خود سمجھ کہ [illegible] فلسفہ کو [illegible]
زیادہ فرق ہے، ۲۰

[illegible]

کہ [illegible] خود [illegible] ہیں [illegible]

یہ خیال رکھتے ہیں کہ خالق موافقات کے ساتھ وہ تمسخر کر رہے ہیں، مگر شاید ان کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ

کہ خالق موافقات ہی نے ان کو اپنا مسخرہ بنا رکھا ہے،

سچی بات تو یہ ہے کہ انسانیت کی ذہنی تنظیم میں آج جن بیدی اور حسی قوتوں سے کام لینے والے

کام لے رہے ہیں، اس کا آخری انجام اور لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا، وہی ہو کر رہا،

خیال تو کیجیے کہ خدا سے ہٹنے کے لئے انسانی فطرت میں ضمیر یا کانشنس کے احساس کا جو کانٹا چبھا دیا

گیا ہے، بجائے خدا کے اسی غریب ضمیر اور ضمیر کی بے کس آواز کے ڈھیر کو اگر کافی قرار دیا جائے یا پیدا کرنے والے

خالق کے آگے اس کی بخشی ہوئی قوتوں، اور قوتوں کے اعمال و نتائج کی جواب دہی کی ذمہ داری کی جو کھٹک

آدمی اپنے اندر پاتا ہے، بجائے خالق کے اگر یہ سمجھایا جائے، جیسا کہ اس زمانے میں عموماً سمجھانے والے یہی سمجھا

بھی رہے ہیں، کہ جس سے ہم پیدا ہوئے ہیں، یا جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، اس کے آگے نہیں، بلکہ آئندہ

نسلیں خود ہم سے جو پیدا ہونے والی ہیں، ان کے آگے چاہیے کہ جواب دہی کی ذمہ داری کو ہم اپنے

اندر پیدا کریں، تو خدا جس کے ہاتھ میں ہماری زندگی بھی ہے، اور موت بھی اس سے نڈر بن جانے اور

بناوٹ [illegible] کیا واقعی اس مسکین ضمیر کی ڈکس سے آدم زاد ڈر جائے گا، ؟ وہی مسکین لاوارث

ضمیر جس کا گلا جب اور جس وقت ہمارا جی چاہے، خود گھونٹ کر رکھ سکتے ہیں، بلکہ بسا اوقات گھونٹ کر

رکھ دیتے ہیں۔

یا جس کا دیا ہوا سب کچھ ہے، اسی کی بخشی ہوئی نعمتوں اور اسی کی عطا فرمودہ قوتوں کے استعمال میں

[illegible]

[illegible]

پیدا ہونے والی نسلوں کے ان افراد کے سامنے جواب دینا پڑے گا جو اپنی عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں گے، اس وقت جواب دینے والی اگلی نسلوں کی ہڈیاں بھی جب کہ خاک میں مل چکی ہوں گی،

بہرحال آیندہ نسلوں کے سامنے بازپرس اور جواب دہی کا قصہ ہو، یا تاریخ کی عدالتوں کے آگے اعمال و افعال کی جائزہ آرائیوں کے افسانے ہوں،

ان فضیاتی بچکموں کا انسان کی خودغرض اور چالاک فطرت کا ہم تماشے وقت کیا واقعی کچھ پروا کر سکتی ہے؟"

کچھ بھی ہو، میں تو اس کو بھی قدرت ہی کے انتقام کی ایک مخفی شکل سمجھ رہا ہوں کہ جنہوں نے مالک یوم الدین کے ڈر کو انسانی قلوب سے نکالنے کی کوشش کی تھی، خود بھی نڈر بننا چاہتے تھے، اور دوسروں کو بھی نڈر بنانا چاہتے تھے، خدا کے خوف کا جنہوں نے مضحکہ اڑایا تھا، آج وہی ضمیر اور کانشنس سے ڈرنے اور ڈرانے کا وعظ کہتے پھرتے ہیں، پیدا کرنے والے سب کچھ دینے والے خالق کردگار کے آگے اعمال کی جواب دہی کا اعتقاد صرف اعتقاد، بلکہ خوش اعتقادی کی پیداوار ہے، پرانے عہد کے منبر و محراب کی پرانی یادگار ہے، جو اس کا چرچا کرتے پھرتے تھے، وہی پکار رہے ہیں، کہ پچھلی نسلوں کے سامنے اگلی نسلوں کو اپنے کرتوتوں کا جواب دینا پڑے گا،

پھر ہوا کیا؟ جو ڈرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، ڈر تو اس کے دل سے اب بھی نہ نکلا، ذمہ داریوں کے بوجھ سے جس کے سر کو چاہا گیا تھا کہ ہلکا کر دیا جائے، اس کے کندھے پر جواب دہی کی گٹھری تو اب بھی لدی ہوئی ہے، بندگی کے لئے جو بنایا گیا ہے، بندہ بننے پر تو وہ اب بھی مجبور ہے، بقول اکبر مرحوم

ع بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

فرق خدا والی بندگی اور بے خدا والی بندگی میں اگر کچھ پیدا ہوا ہے، تو اتنا ہی ہے کہ خدا کا ڈر تھا اور خدا کے سامنے جواب دہی کی ذمہ داریاں تھیں [illegible]

پیدا کرنے سے جبر کی غیر منطقی نوبت بھی کیا مشکل آسکتی ہے، تجربہ سے اسی کی تصدیق ہوتی ہے، اسی
طرح مشاہدہ بتایا جاتا ہے کہ آئندہ نسلوں یا تاریخ کے جاننے والے جب اس کی سے فیصلہ بھی کیا ہو بھی
وقت ہیں تجربہ جو کچھ ہوں سے زیادہ کبھی کامیاب ثابت نہ ہوسکیں۔

کیسی عجیب بات ہو کہ ہم ڈرتے بھی رہے، جواب دہی کی ذمہ داری کا کانٹا دل میں کھٹکتا
بھی رہا، لیکن ان برکتوں اور بلند نظریوں سے نسل انسانی محروم ہو گئی، جو صرف خالق اور پیدا کرنے والے
ہی کے خدا اسی کے آگے بازپرس کے خوف سے پیدا ہو سکتی ہیں، پیدا ہوئی تھیں، اور چاہا جاسکتا
تجربہ کرکے دیکھ لیا جائے، کہ اب بھی اُن کے پیدا کرنے میں اسی راہ سے نسل انسانی کامیاب ہوسکتی ہے،

بہرحال سلاطین سلف یا گذشتہ اسلامی حکمرانوں کے متعلق اس قسم کے وسوسوں کے بھوت آج
قلوب میں آج کل جو اُٹھ رہے ہیں، کہ قابو پانے کے بعد جبراً لوگوں کا دین کیوں نہ بدلوا دیا گیا، اور
جبر کے بعد بھی آبائی دین پر اصرار کرنے والوں کا ہمارے ان بادشاہوں نے صفایا کیوں نہ کر دیا جس سے
پوچھنے والا اُن کے زمانہ میں روئے زمین پر کوئی باقی نہ رہا تھا،

سلہ یہ ضمیر یا کانشنس یا اخلاقی حاسہ وغیرہ جس کا کچھ نہ کچھ سراغ عصر حاضر کے بے بصیرتوں کو بھی انسانی
فطرت ہی میں کسی نہ کسی رنگ میں مل رہا ہے، درحقیقت فطرت انسانی کے اسی جذبہ کی یہ ٹوٹی پھوٹی دھندلی
اور ناقص تعبیریں ہیں قرآن نے جس کا پتہ "الامانۃ" کے لفظ سے دیا ہے، بتایا گیا ہے کہ آدمی کی فطرت میں "الامانۃ"
کی کیل اگر نہ ٹھونک دی جاتی، تو عملاً الانسان صرف ظالم نہیں بلکہ ظلوم (بہت بڑا ظالم) اور صرف جاہل نہیں بلکہ
جہول (بہت بڑا جاہل) بن کر رہ جاتا، اس الامانۃ کے جذبہ کا مطلب یہی ہے، کہ جن چیزوں پر آدمی کو اقتدار
بخشا گیا ہے اس اقتدار و اختیار کے استعمال میں اسے اپنی مرضی کی نہیں بلکہ اسکی مرضی کی پابندی کرنی چاہئے جس نے یہ امانت اور
اقتدار عطا فرمایا ہے کہ اپنے اقتدار و اختیار کے استعمال میں اپنی مرضی کے پابند نہیں ہیں، اس کا اقرار تو یہ غیر ملنے کی کرنے
[illegible] ہیں سے گرگئے ہیں، اسی قسم کا تعلق انسان اختیار میں نہیں ملتا ہے، مگر الامانت کے
کی صورت میں جب یہ سوال ہوتا ہے، کہ اپنی مرضی کے مطابق جب اپنے اقتدار کے استعمال میں
ہم آزاد پیدا نہیں ہوئے ہیں تو پھر کس کی مرضی کی پابندی کریں اسی قسم اور ایک ہی پہلو جذبہ امانت

یقین ماننے کہ ان رذیل اور گھٹیے وسوسوں کی تہ میں درحقیقت بے اعتمادی اور کمزوریوں کے وہی جراثیم چھپے ہوتے ہیں، جو ہر اس قوم اور ہر اس نسل میں پیدا ہو جاتے ہیں، جب خدا کے قادر و ذوالجلال فعال لما یرید کے ذوق سے وہ خالی ہو جاتی ہے، ہراسانی پژمردگی اور دینی افسردگی کے یہ ناگزیر لازمی نتائج ہیں،

بچے مسلمانوں کی پشت سے جو نئے مسلمانوں کی جو نسلیں آج دنیا میں نکل آئی ہیں، نکل نکل کر پھیل رہی ہیں، ان پر یہ بات گران گذر رہی ہے، کہ لذیذ و تر لقموں، فاخرہ فاخرہ لباسوں، جیتی پرشوکت سواریوں اونچے اور بلند ایوانوں کے استعمال میں دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والی قومیں آج ان سے کیوں مزاحمت کر رہی ہیں، وہ سوچتے ہیں کہ موقع کی چیزیں جو ہمارے آباؤ اجداد کے ہاتھوں میں جب بار بار آتی رہیں، تو بجائے گھیٹنے کے ان چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے انھوں نے کیوں نکل جانے دیا،

یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کا سا نام رکھ کر اسلامی طاقت سے فراہم کردہ ثروت و دولت سے ہماری گذشتہ نسلیں بھی انتہائی بے شرمی اور بے حیائی کے ساتھ استفادہ کرنے میں اگر اسی طرح مشغول ہونے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتیں، جیسے مسلمانوں میں مردہ ضمیروں کا ایک طبقہ آج کل پیش کر رہا ہے اور مسلمانوں جیسے اپنے ناموں کو پیش کر کے غریب ناواقف مسلمانوں سے ووٹ حاصل کرتا ہے، اسی ذریعہ سے حکومتوں کی کرسیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو رہا ہے، لیکن اخلاقی جرأت کی شدت نا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۰) کا عصری مفکرین کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، حالانکہ فطرت انسانی کی یہی پیاس آدمی کو اس پر مجبور کرتی ہے، کہ جس کا وہ امین ہے، اس کی مرضی کو دریافت کرے، اسی سے وحی اور وحی کے بانی کی تلاش پیدا ہوتی ہے، ورنہ فرض کی پابندی فرض عائد کرنے والے کے بغیر مہمل بات ہے،

تقویت بھی اس قدر دور میں باقی نہیں چھوڑی ہے، کہ دل میں ذہن کے جو کچھ ہے اس کو نا تنگ ہو کے
کی حمایت کریں، اسلام یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر جس اعتماد کی ضرورت ہے، اعتماد کی اس دولت کو
وہ کھو چکے ہیں، لیکن اپنے اس باطنی دیوالیہ پن اور ایمانی افلاس کا اعلان بھی نہیں کر سکتے، نقرئی اور طلائی
مصالح یا جھوٹی آز جاہ کاذب کی بے پناہ آرزو، اس اعلان کی راہ میں ہمیشہ روک بن جاتی ہے،
وہ اپنی چھچھوری طبیعتوں، اور فطری تنگ ظرفیوں کے اقتضا کی توقع اپنے بلند نظر خدا دوست، [illegible]
اسلاف سے بھی رکھتے ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ ضعف ایمان کی بے اعتمادی کی یہی لعنت خدانخواستہ اگر ہمارے
بزرگوں پر بھی مسلط ہوتی، تو جو کچھ آج سوچا جا رہا ہے، شاید اُسے وہ کر گذرتے،

لیکن ظاہر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ سنا ہے ہم اس کو نہیں سنیں گے جن کے دماغوں میں یہ
گندے فیصلے جگہ بنا چکے ہیں، اُن پر ان بزرگوں کے نفسیات و احساسات کو قیاس کرنا کتنا غلط ہوگا،
جنھوں نے محمد (صلواۃ اللہ علیہ وسلامہ) ہی کو اپنی آنکھ بھی بنا لیا تھا، اور اُن ہی کو وہ اپنے کان بھی بنا
چکے تھے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی چیزوں اور اپنے کانوں سے سُنی ہوئی چیزوں
کی ان لاہوتی معلومات کے مقابلہ میں اُن کی نگاہوں میں کوئی قیمت باقی نہیں رہی تھی، جنھیں قدرت
کی عطا کی ہوئی اس جدید بینائی اور جدید شنوائی کی راہوں سے وہ پا رہے تھے، بینائی کی ایک نئی تازہ
اور مقدس روشنی نے اور شنوائی کے اس معصوم نئے احساس نے اُن کے لئے غیب کو شہادت بنا دیا تھا،
اُن دیکھے حقائق، دیکھے بھالے حقائق کی شکل اختیار کر چکے تھے، انجانی باتیں جانی بوجھی باتوں سے بھی
زیادہ جانی بوجھی پہچانی باتیں بن چکی تھیں، بلکہ بینائی کی اس نئی قوت اور شنوائی کی اس نئی[1] راہ کے
مسلسل اور پیہم تجربوں نے ایسے استوار و محکم غیر متزلزل اعتماد کو اُن کی فطرت میں راسخ کر دیا تھا کہ
اپنی جسم کی آنکھوں اور کانوں سے اُن کو اگر اس کا حکم بھی دیا جاتا، کہ غیب کے ان ہی حقائق اور واقعات کا
خود مشاہدہ کرلو، تو شاید وہ خود اس کا انکار کر دیتے، اور سچ بھی یہی ہے کہ علم کے بے خطا معصوم ذریعے

---

[1] حاشیہ آئندہ صفحہ ملاحظہ ہو

جن معلومات تک ہماری رسائی ہورہی ہو ان ہی معلومات کو غیر معصوم اور غلطی میں مبتلا ہونے والے دوربین سے جانچنے کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے، نفع سے زیادہ یہ واقعہ ہے کہ نقصان ہی کا احتمال اس میں زیادہ ہے
دوربین شیشہ کا عدسہ کسی فضائی سیارے کے خصوصیات کو ہم پر جب واشگاف کرچکا ہے، تو اسی
سیارے کو دوربین سے ہٹ کر دیکھنے کی سعی، سعی لاحاصل ہی نہیں، بلکہ سعی مضل ہی ہوسکتی ہے، نبوت کہئے
یا رسالت، وحی نام رکھئے یا پیغمبری حاصل سب کا یہی ہے کہ

زمغربی نظرے وام کن بدوست نگر
قرآن اوّل ۱۲

کرتا بدیدۂ کامل کمال او بینی

خلاصہ یہ ہے کہ تاریکی صرف اُن کے لئے ہے، جنھوں نے روشنی کے مشاہدہ اور یافت کی فطری
قوت سے رشتہ توڑ لیا ہو، لیکن ٹٹول ٹٹول کر چلنے کی اس شخص کو کیا ضرورت ہے، جو آنکھیں رکھتا ہے
ہم جن کی جان و مال، عزت و آبرو کے احترام کی ذمہ داری زندگی ہی کی حد تک نہیں بلکہ مرنے کے
بعد لاش کی ہڈیوں تک کے متعلق قبول کرتے ہیں، جن کو اسلامی قلمرو میں اس معاہدہ کے ساتھ سکونت پذیر
ہونے پر راضی ہوتے ہیں کہ معذوری و مجبوری کی صورت میں حکومت کا خزانہ بیت المال ان کی ضروریات
زندگی کو اسی طرح مہیا کرے گا، جیسے اپنے قلمرو کی ہر مسلم رعیت کا کفیل بن کر بیہ وغیرہ جیسے تاری
معاملات کے سوچنے سے وہ مستغنی کر دیتا ہے،
اسلامی حکومت کے ان امن پسند شہریوں کے ساتھ معاہدے کرنے میں ذہنی مخدورات کی گنجائش

(حاشیہ ص ۱۰۹) ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے ساتھ اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل یہ ہیں تمہارے سامنے بھی آ جائے، مومنہ خاتون نے جواب میں عرض کیا کہ آپ کے دیکھنے کے بعد اس کی ضرورت ہی باقی ہو کہ میں بھی اس کو دیکھوں (او کما قال) سلہ مغربی شاعر کا تخلص ہے فرماتے ہیں کہ دوست کو دیکھنا چاہتے ہو تو مغربی سے نگاہ قرض لو، کیونکہ دوست کے کمالات کا مشاہدہ کامل ہی کی نگاہ سے تم کرسکتے ہو۔۱۲

اسلام میں کیا چیز ہے جب معاہدے کی وہ خطرناک قسم میں کے آگے پیچھے نو شین کا وہام اور خطرات کے بادل منڈلاتے نظر آتے ہیں، یعنی جنگ کرنے والے دشمنوں کے متعلق

وان جنحوا للسلم فاجنح لہا — اگر دشمن صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ، (الانفال)

کا مشورہ دیتے ہوئے ان سارے سوراخوں کو بند کرنے کے لئے جن کی راہ سے قدرۃً خطرات کے گھس پڑنے کا احساس قلوب میں پیدا ہوتا ہے، ان ہی سوراخوں کو بند کرنے کے لئے قرآن میں حکم دیا گیا کہ

وتوکل علی اللہ اِنَّ اللہ سمیعٌ بصیر — خدا پر اعتماد رکھو وہ سننے والا اور جاننے والا ہے،

صرف اسی حکم کو دیکھ خطرات کے سارے سوراخوں کو بند ہی نہیں کر دیا گیا ہے، بلکہ دشمنوں کے ساتھ اس نوعیت کے معاہدوں میں فریب اور دھوکے کے خطرناک نتائج کا تجربہ کبھی کبھی جو ہوتا رہتا ہے، معاہدے کے اسی سبب سے بڑے خطرے کا ذکر ان الفاظ میں فرمانے کے بعد یعنی

فان ارادوا ان یخدعوک — صلح کے معاہدے کی شکل میں اگر دشمن دھوکا دینا چاہتے ہوں،

تو بجائے ذہنی "مخوفات" کے جن نے اپنے معاہدے کی بنیاد "توکل علی اللہ" کی حقیقی چٹان پر قائم کی ہے، ان کو

فان حسبک اللہ — تو ایسی صورت میں اللہ تیرے لئے کافی ہے،

کا قرآنی وثیقہ عطا کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہی ہوا کہ دھوکا اور فریب خواہ جتنا بھی خطرناک ہو، معاہدے کے ذریعہ دشمن اگر دینا چاہیں گے تو خدا نے مسلمانون سے وعدہ کیا ہے، کہ ان کے ہر فریب اور چال کو بے کار کر کے رکھ دیا جائے گا، اور خدا کی غیبی نصرتین اُن کو خطرے سے نکال لیا کرین گی،

ان لوگون سے تو بحث ہی نہین ہے، جنھون نے قرآن کو خدائے قادر و توانا کی کتاب ہی نہین تسلیم کیا ہے، یا تسلیم کرنے کے بعد جو شک مین مبتلا ہین، یا العیاذ باللہ مرتد ہو چکے ہین، بلکہ میری گفتگو سلف کے اُن مسلمانون تک محدود ہے، جنھون نے یہ مان لیا تھا کہ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (تو قطعاً اللہ میرے لئے کافی ہے) کے یہ الفاظ خدائی الفاظ اور آسمانی وثیقہ کی حیثیت رکھتے ہین، یہ ذمہ داری اس نے لی ہے جس سے ظاہر و باطن، اندر و باہر کا کوئی حال مخفی نہین ہے، اور جس کا زور اور زور والے کے زور کو قطعی طور پر ہر حال مین ختم کر دینے کے لئے کافی ہے، ذرا سوچئے تو سہی کہ اس ایمان، ایقان اور لاہوتی سکینت و اطمینان کے بعد کیا اس کا امکان رہ جاتا ہے، کہ معاہدے مین جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے سوا بھی کچھ سوچا جائے،

خود پیغمبر (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) بھی سکھاتے ہی تھے، اور اسی کو کر کے دکھاتے بھی تھے، حدیبیہ کی صلح کے موقع پر کون نہین جانتا کہ معاہدہ باضابطہ تحریری قالب مین ابھی آیا بھی نہین تھا، صرف زبانی گفتگو مین منجملہ دوسری باتون کے یہ بھی مان لیا گیا تھا، کہ قریش کا جو آدمی مسلمانون مین آکر شریک ہوگا، اسے واپس کر دیا جائے گا، بات ابھی ہو ہی رہی تھی، کہ ابوجندل زنجیر مین گھسٹتے ہوئے اسلام اور اسلام کی دہائی دیتے ہوئے سامنے نمودار ہوتے ہین، پیغمبر اور پیغمبر کے صحابیون کو خطاب کرتے ہوئے کہ مسلمان ہونے کے جرم مین قریش نے زنجیرون مین مجھے جکڑ رکھا تھا، مین آپ لوگون کی امداد کے بھروسے پر کسی نہ کسی طرح بھاگ کر پہنچنے مین کامیاب ہو گیا ہون قریش کا وکیل آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے کہتا ہے، کہ لکھا نہ گیا ہو، لیکن زبانی مان لیا گیا ہے، اس لئے ابوجندل کو واپس کیجئے، آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جیسا کہ مشہور ہے سب ہی جانتے ہین یا نوشتہ

... وقت ... ہوئے قریش کے وکیل سے فرمایا

صدقت   تم سچ کہتے ہو،

حالانکہ ابوجندل چیختے رہے چلاتے رہے، کہتے رہے، کہ مسلمانو! کیا مجھے دین کے ان دشمنوں کے حوالہ کر دیا جائے گا، لیکن باوجود اس کے تاریخ نے اس واقعہ کو اب تک محفوظ رکھا ہے، کہ ابوجندل سے تسلی کے الفاظ فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم ان لوگوں سے عہد کر چکے ہیں

لا نغدر بهم (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۱)   ہم ان کے ساتھ عہد شکنی نہیں کر سکتے،

اور کیا امت مسلمہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اٹھے ہاتھوں کو بھول سکتی ہے، جو خدا کے سامنے اٹھے ہوئے تھے، اور قبیلہ بنی جذیمہ کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان کے چند مسلح اور ہتھیار بند سپاہیوں کو حضرت خالد بن الولید نے قتل کرا دیا تھا، قتل کے اسی غلط اور غیر قانونی حادثہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے،

"اے اللہ خالد نے جو کچھ کیا ہے تیرے سامنے اس سے اپنی برأت پیش کرتا ہوں"

بار بار اسی کو دہراتے جاتے تھے، اور اسی پر بس نہ فرمایا گیا، بلکہ عرب جو اس قسم کے قتل و قتال کے عموماً عادی تھے، ان کو دیکھ کر حیرت ہو گئی، کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اونٹوں پر سامان لادے ہوئے اسی بنی جذیمہ کے قبیلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے پہنچے ہیں، اور مال و جان کا جو نقصان حضرت خالدؓ کی غلط فہمی کی وجہ سے پہنچ گیا تھا، اس نقصان کی تلافی کے لئے آپ نے یہ اعلان عام فرمایا کہ ہر ایک اپنا دعویٰ پیش کرے، جس نے جو دعویٰ پیش کیا، اور حساب سے جس ہرجانہ کا جو مستحق تھا، حضرت علیؓ نے ہر ایک کو ادا فرما دیا،

حتی میلغة کلب   حتی کہ کتے کے کھانے پینے کی ہنڈیا

[illegible] (البدایہ و النہایہ وغیرہ)   تک ادا کی گئی

آخر میں یہ پوچھنے کے بعد کہ تم لوگوں کو تشفی ہو گئی، جواب میں سب نے رضامندی کا جب اظہار کیا تو حضرت علیؓ نے ایک قسط ادا کر پیش کی، اور کہا کہ یہ اس نقصان کا معاوضہ ہے، جو معلوم نہ ہو سکا، جو کہا جائے گا وہی کیا بھی جائے گا، اس کی ان ہی عملی نظیروں کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے، پھر مسلمانوں پر جب تک دین کا اثر غالب رہا، تاریخ بتاتی ہے کہ معاہدات کی تکمیل میں غیر مسلموں کے ساتھ انھوں نے ہمیشہ وہی کیا، جس کا وعدہ کیا جاتا تھا،

ایک اندھا میلے کچیلے کپڑوں میں بوڑھا یہودی فقیر ہے، اس کے بازو کو پکڑے ہوئے اپنے عہد کے سارے حکمرانوں میں سب سے بڑے حکمران عمر فاروقؓ لئے چلے آرہے ہیں، بیت المال کے ناظم کے پاس کھڑے ہوئے ہیں، اور اسی یہودی نابینا بوڑھے فقیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:-

"ہم نے ہرگز انصاف نہیں کیا، اگر جوانی میں ان لوگوں کی کمائی کھاتے رہے، اور بڑھاپے میں ان کو چھوڑ دیں"

آخر میں ناظم بیت المال کو خلافت کی طرف سے یہ فرمان دیا گیا، کہ

انظر ھذا و ضرباءہ   اس اندھے یہودی فقیر اور اس جیسے

(کتاب الخراج ص ۱۲۶)   جو بھی ہوں سب کی خبر گیری کرتے رہو،

یہی تو غور کرنے کا مقام ہے، کہ اسلامی قلمرو کے غیر مسلم طبقات کے معذوروں اور بڈھوں تک کی پرورش جب اسلامی بیت المال کے ذمہ واجب ہے، تو کیا اسی اسلام اور اسلام کے ماننے والے سے یہ توقع کسی حیثیت سے بھی قابلِ تصور ہو سکتی ہے، کہ اسلامی حکومتیں اپنے علاقہ کے غیر مسلم باشندوں کے صفایا کے مسئلہ کو سوچ بھی سکتی تھیں؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت کا مشہور واقعہ ہے، کہ حیرہ کے کسی

یہودی یا نصرانی کو بکر بن وائل قبیلہ کے کسی مسلمان نے قتل کر دیا تھا، مدینہ سے حضرت عمرؓ کا فرمان والی حیرہ کے نام آیا،

اس قاتل کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا جائے جی چاہے اُن کا تو بدلہ میں اس کو قتل کریں، یا جی چاہے تو معاف کر دیں،

والی نے قاتل کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا، مقتول کا وارث جس کا نام حنین تھا لکھا ہے کہ

فقتلہ، حنین نے اس مسلمان قاتل کو قتل کر دیا،

(نصب الرایہ ج ۳ ص۳۳۳)

بجنسہ اسی نوعیت کا ایک مقدمہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانہ میں پیش آیا، حضرت مرتضیٰ علیہ السلام کے اجلاس میں مقدمہ پیش ہوا، گواہیاں گذریں، مجرم پر جرم قتل ثابت ہوا، حضرت نے اس مسلمان قاتل کے قتل کا فیصلہ صادر فرمایا، فیصلہ کے بعد مقتول جو غیر مسلم تھا اس کے وارث حاضر ہوئے، اور انھوں نے درخواست پیش کی کہ ہم لوگ اس کو قتل کرانا نہیں چاہتے،

حضرت علیؓ نے درخواست دینے والوں کو بلا کر دریافت کیا، کہ

"کیا مسلمانوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے؟"

جواب میں انھوں نے کہا کہ

"جی نہیں کسی نے نہ ڈرایا ہے، اور نہ دھمکایا ہے، بلکہ ہم لوگ سوچتے ہیں کہ قاتل کے مارنے سے ہمارا مقتول بھائی اب زندہ ہونے سے رہا، اس نے ہماری درخواست یہ ہے کہ ہمیں معاوضہ دلایا جائے (یعنی خون بہا کا مطالبہ کیا)

یہ سن کر مرتضیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ

تم اپنے معاملہ کو زیادہ سمجھ سکتے ہو"

مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے ڈرانے دھمکانے سے بجائے قتل کے خون بہا دلانے کی تم نے یہ درخواست اگر پیش کی ہے، تو حکومت تمہاری پشت پناہی کرنے کے لئے تیار ہے، لیکن واقعی اگر تمہاری سمجھ میں یہی آیا ہے کہ قتل کرانے کا کیا فائدہ تو تم کو اس کا قانون نے اختیار دیا ہے[1] حضرت نے اس کے بعد غیر مسلموں کو خطاب کرکے اعلان فرمایا، کہ

مَنْ کَانَ لَہٗ ذمتنا فدمہ [illegible] کدمنا ودیتہ کدیتنا،	ہم نے یعنی ہماری حکومت نے جن لوگوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے (معلوم ہونا چاہئے کہ اس معاہدہ کے بعد) اُن کا خون ہمارے خون کے اور ان کے خون کی قیمت (یعنی دیت) ہمارے خون کی قیمت کے برابر
(نصب الرایہ ج ۳ صفحہ ۳۳۴)	

اسلامی قلمرو کے غیر مسلم باشندوں کی جان اور خون کی قیمت جب مسلمانوں کی جان اور خون کی قیمت کے برابر قرار پا چکی تھی تو اسلامی حکمرانوں کے لئے خود ہی سوچئے کہ صفایا تو صفایا اپنے اپنے علاقے کے غیر مسلم باشندوں کو کیا ٹیڑھی نظروں سے بھی دیکھ سکتے تھے،

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام رواداری کے سلسلہ میں جب اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ مسلمانوں کی خاص عبادتگاہوں یعنی مسجدوں کے اندر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ)

---

[1] جیسا کہ معلوم ہے کہ مقدمہ میں مقتول کے وارثوں کو اسلام نے اختیار دیا ہے، چاہیں تو قاتل کو قتل کرکے اپنے دل کی تسکین انتقام سے حاصل کریں، اور چاہیں تو بجائے قتل کے خاندان کی ایک کمانے والی قوت کے گھٹ جانے سے جو نقصان پہنچا ہے اس نقصان کی تلافی دیت یعنی خون بہا لے کر کرلیں، ۱۲،

ہی کو نہیں بلکہ طائف کے بت پرست مشرکین تک کو اجازت مرحمت فرمائی، کہ مسجد کے صحن کے ایک حصہ میں اپنے خیمے نصب کریں، پوچھنے والوں نے پوچھا بھی

انزلتھم المسجد وھم مشرکون — آپ لوگوں کو مسجد میں اتارتے ہیں حالانکہ وہ تو مشرک ہیں

جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان الارض لا تنجس[1] (نصب الرایہ) — زمین ناپاک نہیں ہوتی،

ذرا اندازہ کیجئے اس کا کہ خود پیغمبر اسلام علیہ السلام کا حال جب یہ ہو، بخاری میں ہے کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ اچانک آپ نے فرمایا،

---

[1] مطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جیسا کہ بظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، یہ تھا کہ زمین پر وہ ٹک گئے، اور زمین کسی کے چلنے پھرنے سے یا اٹھنے بیٹھنے سے ناپاک نہیں ہوتی، یہ تو خدا کا بچھایا ہوا فرش ہے، سب ہی کو اس پر چلنے پھرنے کا حق ہے، طائف کے اس وفد سے پہلے نجران کے عیسائیوں کو بھی مسجد میں اتارا گیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ان ہی رواداریوں میں اس کے دائرہ کی وسعت کا بڑا راز پوشیدہ تھا، جن ادیان و مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے ادیان و مذاہب کو صرف اپنی بلندی اور برتری کا ذریعہ بنا رکھا ہے، قوموں کے قلوب میں بغض و عداوت کا ان کی طرف سے پیدا ہو جانا ایک قدرتی نتیجہ ہے، بھلا یہودیوں کی ان خرمغزیوں کو کون برداشت کر سکتا تھا جب وہ کہتے تھے کہ ہم تو خدا کے بیٹے اور خدا کے محبوب ہیں یا بعض دوسرے ادیان و مذاہب والوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کے متعلق اس قسم کے قوانین بنا رکھے تھے، کہ اُن کے مذہب کی کتاب کا کوئی فقرہ اس کے کان میں اگر اتفاقاً چلا جائے گا، تو کان ہی سے نہیں، بلکہ جان سے بھی ہاتھ اس کو دھونا پڑے گا، [illegible] باقی رہے، اس لئے تجویز کیا جاتا تھا کہ ناپاک جو سمجھے جاتے ہیں، وہ راستہ چلتے ہوئے ہاتھ سے ڈگڈگی بھی بجاتے جائیں، قرآن میں اس کے برخلاف حکم دیا گیا ہے، کہ غیر مذہب کا آدمی خواہ

قوموا بنا نعود جارنا الیهودی — کھڑے ہو جاؤ، ہمارے ساتھ ہم سب اپنے پڑوسی

(کتاب الآثار لامام محمد) — یہودی کی بیمار پرسی کو چلیں،

پیغمبر خود بھی ہیں، اور اپنے ساتھ اپنے صحابیون کو لئے ہوئے اس بیمار یہودی نوجوان کے پاس پہنچے ہین جو مدینہ کا باشندہ تھا، جوار اور پڑوس کے حق کو اس عملی شکل مین کر کے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دکھایا تھا تو غیر مذہب کے ہم وطنوں اور پڑوسیوں کے ساتھ بتایا جائے کہ مسلمانون کے تعلقات کی نوعیت قدرۃً جو ہو گئی، اس کے سوا اور کیا ہوتی؟[۱]

لوگ جبر جبر کے لفظ کو اسلام اور مسلمانون کی طرف منسوب کر کر کے اس سوال کا جواب حاصل کرنا چاہتے ہیں، کہ اتنے قلیل عرصہ مین مشرق و مغرب، جنوب شمال ایشیا و افریقہ، بلکہ یورپ کے بعض

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۷) مشرک ہی کیوں نہ ہو، قرآن سننا چاہے، تو اس کو خدا کا کلام سنایا جائے، مسجدون میں ٹھہرانے کی غرض بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تھی کہ اسلام کے مشاہدے اور تجربہ کا لوگون کو موقع ملے، یہی طائف والے کہاں تو اتنے سخت تھے، کہتے تھے کہ ہم اپنے سرینون کو اس طرح اٹھا بٹھا نہین سکتے، جیسے تم لوگ رکوع اور سجدے مین کرتے ہو، مگر مسلمانون کی نمازون کی دلکشی نے دیکھنے کے بعد ان پر اتنا اثر کیا، کہ واپسی سے پہلے وہ مسلمان ہو گئے، شمس الائمہ سرخسی نے شرح کبیر میں لکھا ہے، کہ غیر مسلم رعایا کے لئے اسلامی حکومت نے مساوات کا جو قانون نافذ کیا ہے، اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ

وربما یرون محاسن الشریعة ویسلمون فکان هذا فی معنی الدعاء الی الطریقین ج ۳ ص ۲۵۰ — (یعنی اس ذریعہ سے ان کو اسلامی شریعت کی خوبیون کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے، اور بسا اوقات اسی سے) اسلام قبول کر لیتے ہین گویا اسلامی دعوت کی

ابن بطال کے حوالہ سے الکتانی نے نقل کیا ہے، کہ قرآن (علم و حدیث وغیرہ) فقہ کی تعلیم نہ صرف اسلامی قلمرو کے مسلم باشندون بلکہ ان کے سوا دوسرے غیر مسلمون کو دینا چاہئے، یہ ابوحنیفہ والشافعی کا مقولہ ہے ص ۲۰۴ ج ۲ سلسلہ عظیم

حدود تک میں اسلام کیسے پھیل گیا؟ اسی یہودی بیمار کے قصہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاج پرسی کے بعد اسلام کو اس پر تین دفعہ پیش کیا تیسری دفعہ آپکے فرمانے اور اپنے باپ کا اشارہ پانے پر اس نوجوان یہودی نے اسلام قبول کر لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہوگئے،

الحمد للہ الذی اعتقہ بی	اس خدا کا شکر ہے جس نے میرے ذریعہ
من النار	ایک انسانی روح کو جہنم کے عذاب سے
	آزادی عطا فرمائی،

"تلاش کرنے والے چاہیں تو ان واقعات میں اور غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کے اس سلوک خاص میں اپنے سوال کا واقعی جواب تلاش کر سکتے ہیں،

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عیسائی غلام استق کے حال سے لوگ واقف ہونگے جو سالہا سال تک حضرت کی خدمت میں رہا، لیکن اس کا خود بیان ہے، کہ حضرت عمر نے اسلام کے قبول کرنے پر اس کو کبھی مجبور نہیں کیا، زیادہ سے زیادہ یہی فرماتے رہے کہ استق تو مسلمان ہو جائے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۸) اقوام کے پڑوسیوں کے ساتھ مسلمانوں کے وہی تعلقات جنہیں عہد حاضر کا مسلمان پڑھتا ہے، اور دل ہی دل میں دنیا کی ان ہی غیر مسلم اقوام کی موجودہ نسلوں کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو   تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

یہی یہودی قوم جس کے ایک فرد کی عیادت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے سینکڑوں سال تک ان کی پناہ گاہ مسلمانوں کے ممالک رہے جن کا کچھ ذکر آگے بھی آیا ہے لیکن ان کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہے، دنیا دیکھ رہی ہے، یہ سب سونا ہوا تھا، ہم نے اسکو جگایا، جگنے کے ساتھ ہمارے سینے پر چڑھ بیٹھا، خدا جانے کس کس کا ذکر کروں قوموں کو سوچنا چاہئے کہ آخر شرافت کیا اسی کا نام ہے، انسانیت اسی کو کہتے ہیں۔

تو کتنی اچھی بات ہو گی، حضرت عمرؓ کی یہی نرمی سختی سے زیادہ کارگر ہوئی، استق آپ کی وفات کے بعد محض

آپکے حسن سلوک کی وجہ سے مسلمان ہو گیا، (طبقات ابن سعد)

اور پیچھے آئیندہ اسلامی حکمرانوں کے متعلق اس قسم کے قصے تاریخوں میں جو پائے جاتے

ہیں، خلافت عباسیہ کے معاصر ابوجعفر منصور ہی کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا چہیتا نصرانی طبیب

جس کا نام جورجیس تھا، بیمار پڑا، حالت زیادہ خراب ہونے لگی، تو منصور پیدل اس کی مزاج پرسی کے لئے

دارالخلافت سے جورجیس کے گھر پہنچا، خلیفہ کی اس عنایت خاص کو دیکھ کر رونے لگا، منصور نے جورجیس کو اس حال میں پاکر

کہنا شروع کیا کہ

اتق اللہ واسلم وانا ضمن لک — جورجیس اللہ سے ڈر اسلام ہو جا تیرے لئے

بجنة (طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۲۵) — جنت کی میں ضمانت لیتا ہوں،

مگر عیسائی بہر حال عیسائی تھا، جواب میں اس نے خلیفہ سے کہا،

میں تو اپنے باپ دادا اور ان کے دین ہی پر مرنا چاہتا ہوں، وہی جگہ مجھے پسند ہے، جہاں وہ

ہوں، خواہ وہ جنت ہو، یا دوزخ (ج ۱ ص ۱۲۵)

مگر آپ جانتے ہیں اس جواب کو سن کر منصور جیسے غضبناک بادشاہ پر کیا اثر طاری ہوا؟

لکھا ہے کہ

فضحك الخليفة من قوله، — خلیفہ جورجیس کے اس جواب کو سن کر ہنسا۔

کیا دین پر جبر کرنے کی یہی صورت ہوتی ہے؟ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ جورجیس نے منصور سے

خواہش کی کہ مجھے اپنے وطن جندیساپور پہنچا دیجئے، تاکہ اپنے بزرگوں کے قبرستان میں دفن ہونے سے اگر

مر گیا تو محروم نہ رہوں، منصور نے اسی وقت دس ہزار اشرفیوں کی منظوری صادر کی، اور حکم دیا کہ پورے

انتظام کے ساتھ اس کو گھر پہنچا دیا جائے، اور جورجیس وطن پہنچ گیا اور وہیں جا کر مرا۔ (باقی)

قطب الدین ایبک کی علمی مجلس

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

سلاطین[1] دہلی کی حکومت غلامون کی بادشاہت سے شروع ہوتی ہے، اور یہ اسلامی مساوات و اخوت کا ایک بہت روشن پہلو ہے، کہ غلامون نے بھی مسندِ حکومت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد اپنے آقا ؤن کی طرح کشورکشائی اور جہانبانی کی، اور جس تدبر اور دانشمندی سے زمام سلطنت کو سنبھالا، وہ اس کی بین دلیل ہے، کہ ان غلامون کی تعلیم و تربیت انکے آقا ؤن نے اپنے خاندان کے افراد کی طرح کی تھی، چنانچہ قطب الدین ایبک کی ابتدائی زندگی کے ذکر مین مولانا منہاج سراج مؤلف طبقات ناصری رقمطراز ہین:

"سلطان قطب الدین جب پہلی دفعہ ترکستان سے لایا گیا، تو شہر نیشاپور مین آیا، قاضی القضاۃ فخر الدین عبد العزیز کوفی نے جو امام اعظم ابو حنیفہ کوفی رضی اللہ عنہ کی اولاد مین اور نیشاپور، اور اس کے مضافات کے حاکم تھے، اس کو خریدا، اور انہون نے اس کے لڑکے کے ساتھ کلام اللہ پڑھا اور سواری اور تیر اندازی کی تعلیم پائی،" (ص ۱۳۰)

تاریخ مبارک شاہی کے مؤلف یحیی سرہندی نے بھی اس واقعہ کو تھوڑے تغیر کے ساتھ لکھا ہے، تاریخ فرشتہ مین ہے:

---

[1] راقم الحروف نے شاہان تیموریہ کی طرح سلاطین دہلی کی علم نوازی و علم پروری کے حالات بھی قلمبند کرنا شروع کیا ہے، یہ مقالہ اسی کا ایک ٹکڑا ہے،

"ایک سوداگر اس کو ترکستان سے نیشاپور لایا، بچپن ہی میں سوداگر نے قطب الدین کو قاضی فخر الدین بن عبد العزیز کوفی کے ہاتھ جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے، فروخت کیا، چونکہ خدا کو ایک دن اس لڑکے کو بڑا آدمی بنانا منظور تھا، اس نے بچپن ہی سے بزرگی اور برتری کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے، قاضی فخر الدین نے اپنے بیٹون کے ساتھ قطب الدین کو بھی تعلیم دلانی شروع کی، اور وہ تھوڑے ہی دنون مین کلام پاک، علم دین اور رسم الخط وغیرہ سے بخوبی واقف ہوگیا، آداب اور کمالات مین بھی اچھی مہارت حاصل کر لی، قاضی فخر الدین نے تمام عمر قطب الدین کو اپنے سے جدا نہین کیا، اور مثل اپنے بیٹون کے اس کی پرورش و پرداخت کرتے رہے، قاضی صاحب کے مرنے کے بعد ایک سوداگر نے قطب الدین کو قاضی کے کسی بیٹے سے خریدا، اور تحفے کے طور پر سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت مین پیش کیا، بادشاہ نے قطب الدین کو اس سوداگر سے بہت بڑی رقم پر خریدا، چونکہ قطب الدین کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی، بادشاہ اور درباری اسے ایبک کہنے لگے"[1]

قطب الدین ایبک اوائل زندگی ہی سے جود و سخا مین مشہور تھا، بادشاہ ہونے کے بعد اس کی فیاضی و داد و دہش کے واقعات ضرب المثل ہوگئے، وہ انعام و اکرام مین لاکھون روپے تقسیم کر دیتا، اور اس کی یہ زر پاشی صرف اس کے اہل دربار ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ ہر محتاج اور ضرورت مند اس کی سخاوت سے فیضیاب ہوتا تھا، اسی لئے وہ لک بخش کے نام سے مشہور ہوا، علماء اور شعراء بھی اس کے خوان کرم سے متمتع ہوئے، امام ملک الکلام بہاؤ الدین اوشی کے حسب ذیل دو شعر اس کی مدح مین ہیں،

اے بخشش تو لک بجہان آوردہ ۔۔۔ کار تو کف تو کار بجان آوردہ

از رشک کف تو خون گرفتہ دل کان ۔۔۔ پس لعل بہانہ درمیان آوردہ

---

[1] تاریخ فرشتہ ص ۶۳، نولکشور پریس،

بہاء الدین اوشی، اوش سے ہندوستان آیا، اپنے زمانہ کا مشہور شاعر اور ادیب تھا، عوفی نے لب الالباب مین اس کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے،

"الامام الاجل بہاء الدین محمد الاوشی، ایک خوشگو واعظ، جوان طبع انشاء پرداز، اور فصیح نطیفہ پرداز تھا، ہمیشہ اپنے کو مخاطب کرکے کہتا تھا کہ اے بہاء اوشی تو بہاء اوشی (یعنی اے بہاء اوشی تو اوش کی رونق ہے) اس کی نظم بھی پسندیدہ اور خوشنما ہوتی تھی، لیکن اس کی نثر نظم سے بہتر تھی، اور تمام معاصر فضلاء نے انصاف کے ساتھ اعتراف کیا ہے، کہ بدیہہ گوئی مین کوئی اس کا مد مقابل نہ تھا، (جلد اوّل ص ۱۰۰)

ہندوستان آکر قطب الدین ایبک کے دامن دولت سے وابستہ ہوا اور اس کی شان مین قصائد کہہ کر اپنی خوش گوئی اور فصیح البیانی کی داد لیتا، اور اس کے فیض و کرم سے سیراب ہوتا، مندرجۂ ذیل قصیدہ مین اس نے قطب الدین ایبک کی بہادری، فیاضی، اور عدل پروری کا ذکر جس والہانہ انداز سے کیا ہے، وہ سلطان وقت کی ذات سے اس کی شیفتگی اور خود سلطان کی علم پروری کی دلیل ہے،

ای قطب آسمان کہ ز سہم و ز باس تو　　در روز رزم رستم خونخوار بشکند
از شرم فیض قلزم مواج کف تو　　در وقت بزم بحر گہر بار بشکند
قطبی و آفتاب ز نور تو وام خواست　　گر رد کنی ز تو دل آن یار بشکند
در قدر تو بگرد فلک بر نیامدی　　ہم کار و بار گنبد دوار بشکند
ناہید گر نہ گوید مدح تو در نوا　　زخمہ اش بوقت زخم بر او تار بشکند
بی بوی خلق تو نوزاند صبا بعمد　　کز جعد زلف یار یکی تار بشکند
بر ہر کہ بوی خلق تو روزی گذر کند　　او آرزوی نافۂ تاتار بشکند
اسرار روزگار بہرست ورای تو　　ہر بعد ہر نامۂ اسرار بشکند

تو مرکزی و چرخ چو پرگار گرد تو — یکسر اگر شود ز تو پرگار بشکند

در گرد صیت تو نرسد خوش رو صبا — سیار تیز رو منہ تطیار بشکند

خاشہ کہ پائے بے زرہ خصم تو تخت — دست زمانہ خود سر آن خار بشکند

بازار ظلم اگر بشود گرم در جہان — از عدل تو ستم را بازار بشکند

از نشکند ردیف نکرم ز بہر آن — تا پاد شعر طرہ بہنجار بشکند

باد احیات ذات تو جنت ثبات دعز — تا آنگہے کہ طاق نگونسار بشکند[1]

قطب الدین ایبک کے ایک دوسرے درباری شاعر کا نام عوفی نے الصدر الاجل افتخار الملک افضل العصر جمال الدین محمد بن نصیر لکھا ہے جس کی لیاقت و قابلیت کا اندازہ عوفی کے اس بیان سے ہوگا،

"فضل و بزرگی کے فلک پر ایک قطب اور مجد و بزرگواری کے آسمان پر ایک چاند تھا، اپنے فضائل میں عدیم المثال، اور فنون میں بے نظیر بلاغت، و براعت میں تمام معاصرین سے سبقت لے گیا تھا، برسوں ملوک جمال کی دولت سے فیضیاب ہوتا رہا، .... اسکی مؤلفات تمام اطراف میں مقبول ہیں، .... مجلس آرائی شہابی اس کی ایک مختصر لیکن بہت مفید تصنیف ہے، اس سے اس کے فضل و کمال کا اظہار ہوتا ہے، اس کے اشعار میں براعت اور فصاحت ہوتی ہے، اور دونوں زبان میں اس کے شعر ہیں،

(جلد اول ص ۱۱۷)

قطب الدین ایبک نے جمال الدین محمد کے علم کی بھی بڑی قدر دانی کی اور اس کے التفات شاہانہ سے جمال الدین محمد کی زندگی عیش و عشرت میں گذری عوفی رقمطراز ہے کہ

---

[1] لباب الالباب از محمد عوفی جلد اول ص ۱۰۹،

[illegible] بادگاہ و ساحت درگاہ [illegible]

قطب الدین ایبک کے مبارک عہد کے پروردہ شاعر کا نام عونی نے افاضل الامام حمید الدین [illegible]
الافاضل علی بن عمر المحمودی لکھا ہے، عونی اس کے علمی فضائل اور شاعرانہ کمال کا بہت مداح ہے،
اس کو "قدوۂ افاضل عصر و والی و متصرف بر ولایت نظم و نثر" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے، اور لکھتا ہے کہ

"رسالات و منشآت او درین بلاد مشہور است و بر زبانہاے فضلا مذکور"

ان رسائل و منشآت کا نام معلوم نہ ہو سکا، البتہ اس کے کلام کے نمونے لب اللباب میں ملتے ہیں[1]،
سعد الدین مسعود نے ایک بار اس کو ایک قطعہ لکھ بھیجا، اس قطعہ کی ردیف عقیق تھی، جب یہ قطعہ علی
ابن عمر المحمودی کے پاس پہنچا تو اس وقت اس کی آنکھیں آشوب کرآئی تھیں، اسی حالت میں اس نے قطعہ کا
حسب ذیل جواب لکھ کر سعد الدین مسعود کو ارسال کیا،

فرزانہ سعد دولت و دین صدر اہل فضل   دور از تو ہست چشم من از درد چون عقیق
در جزع دیدگانم دری کہ داشتم   گشت از درد بعینہ آن در کنون عقیق
از کان عقیق زاید و از بحر چشم من   بر ضد و عکس آید ہر دم برون عقیق
زین پیش بحر رویم ہرگز شبہ نداد   و اکنون چہ شد کہ دادم این دہر دون عقیق
از دیدہ درد دیدہ چو بہتر شود مرا   سازم ردیف مدح تو اے ذوفنون عقیق

عونی نے السید الاجل ظہیر الدین تاج الکتاب السرخسی کے ذکر میں لکھا ہے کہ

"مدتہا دیوان انشاء سلطان شہید بر ہم او بود"

عونی نے سلطان شہید کا لقب قطب الدین ایبک اور معز الدین سام شہاب الدین محمد [illegible]
دونوں کے لئے استعمال کیا ہے، میرا خیال ہے کہ ظہیر الدین سلطان معز الدین [illegible]

---

[1] لباب الالباب ج ا ص ۱۱۸، ۱۱۹

[illegible] شروع کرا دی کہ وہ سلطان وقت کی خواہش کے مطابق [illegible]
[illegible] قطب الدین ایبک نے اس زمانہ میں اپنے فتوحات کا حال لکھنے کا حکم دیا تھا، چنانچہ حسن نظامی نے
تقریباً ۶۰۲ھ میں کتاب لکھنی شروع کی جو ۵۸۷ھ سے ۶۱۴ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، اس
سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد بھی تصنیف جاری رکھی، یہ کتاب
اس لئے زیادہ اہم ہے کہ سلاطین دہلی کے حالات میں پہلی تاریخ ہے، مگر چونکہ شروع سے آخر تک بہت
مرصع اور مسجع عبارت میں لکھی گئی ہے اس لئے اس کی عبارت آرائی موجودہ مذاق پر گراں گذرتی ہے،
کہا جاتا ہے کہ اس میں بارہ ہزار سطریں ہیں جن میں سے سات ہزار عربی اور فارسی اشعار ہیں، حسن نظامی
نے یہ کتاب لکھ کر ادب و انشا میں اپنی غیر معمولی مہارت و قدرت کا ثبوت دیا ہے، مگر اس زمانہ میں
مرصع و مسجع انشا پردازی کے لئے ہندوستان کی فضا ساز گار نہیں تھی، اس لئے حسن نظامی کا طرز انشا
مقبول نہیں ہوا، چنانچہ بعد کی تاریخوں میں طبقات ناصری کی زبان بہت آسان اور عام فہم ہے، ضیاء الدین
برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں ترصیع سے کام لینے کی کوشش تو کی ہے، مگر وہ بہت زیادہ مرصع
ہونے نہیں پائی ہے، شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں بھی زیادہ عبارت آرائی نہیں ہے،
یحییٰ سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی کی زبان بھی سادہ ہے، مسجع اور مرصع انشا پردازی درحقیقت پر شکوہ
اور پر تکلف تمدن کا نتیجہ ہے، جو اس وقت تک پیدا نہ ہوا تھا، تیموری بادشاہوں کے دور میں ابو الفضل نے
اکبر نامہ میں جو طرز اختیار کیا، وہ اس دور کے تمدن کا لازمی نتیجہ تھا، یہ تمدن عرصہ تک قائم رہا، اس لئے
اکبر نامہ کا طرز انشا بھی مدتوں تک جاری رہا، سلاطین دہلی کے زمانہ میں تمدن کے مظاہر میں شوکت و
جلال کا تو مظاہرہ تھا، لیکن تصنع اور تکلف سے پاک تھا، اسی لئے اس عہد کی زبان بھی بہت زیادہ مرصع
نہیں تھی، اس کا اطلاق امیر خسرو کی زبان پر کرنا صحیح نہیں، کیونکہ وہ نظم و نثر دونوں میں اپنی قادر الکلامی
کا ثبوت دیتے اور ہر رنگ میں اپنی زبان و قلم کے جوہر دکھاتے تھے۔

[illegible] کے ہے

گئی لیکن یہ کتاب جب تک [illegible] اس کے چھپنے کی نوبت [illegible]

جناب سید سلیمان ندوی نے [illegible] دسمبر [illegible] کے خطبہ

صدارت [illegible] دہلی [illegible] میں اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ

"حسن نظامی نے تاج المآثر میں بعض غلام سلاطین کے حالات لکھے ہیں لیکن اس کی عبارت

آرائی کی وجہ سے اس کی تاریخی اہمیت نہیں دی جاتی ہے، اور یہ کہکر اس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے

کہ اس میں واقعات کم اور الفاظ کا طومار زیادہ ہے، شاید اسی لئے اب تک نہیں چھپ سکی ہے اس

میں واقعات کم ہوں مگر اس کی سطروں کے درمیان بعض ایسی ضروری چیزیں مل جاتی ہیں جن سے

اس زمانہ کے بعض تمدنی، ثقافتی اور عمرانی پہلو واضح ہو جاتے ہیں، جس طرز کی عبارت اس

میں استعمال ہوتی ہے اس سے اس زمانہ کے علمی اور انشا پردازانہ ذوق کا بھی اندازہ

ہوتا ہے، اس کے شائع ہونے سے اس عہد کے تاریخی اور علمی حالات کا جائزہ لینے میں کچھ

نہ کچھ ضرور مدد مل سکتی ہے"

سلطان وقت کے ذوق کی تقلید اس کے ملوک و امرا بھی کرتے تھے، چنانچہ بختیار خلجی نے جب

بنگال فتح کیا، تو وہاں اس نے اور اس کے ساتھ کے امرا نے تعلیم کی اشاعت کے لئے جا بجا مدرسے قائم

کئے طبقات ناصری میں ہے،

"چون محمد بختیار آن ملک (یعنی بنگال) را ضبط کرد ..... بر موضع که لکھنوتی است

دار الملک ساخت و اطراف آن ممالک را در تصرف آورد و خطبه و سکه در هر طرف قائم کرد

و بقاع خیر و مساجد و مدارس و خانقاہات در آن دیار از خود و امرای او بنا شد (ص ۱۵۱)

اس زمانہ میں [illegible] کی قدر و منزلت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ [illegible]

[illegible] تھا، ایک بار اُس نے تادیب کے لیے غصہ میں ایک کھونسا لڑکے کی [illegible]

اتفاقاً اس کو سخت چوٹ آگئی اور وہ تڑپ کر ہلاک ہوگیا، تاج الدین یلدز کو خبر ہوئی تو اس نے

استاد کو بلایا اور زادِ راہ دے کر کہا کہ قبل اس کے کہ لڑکے کی ماں کو خبر ہو تم یہاں سے چلے جاؤ[1]

قطب الدین ایبک کی ایک لڑکی کی شادی ناصر الدین قباچہ اور ایک کی شمس الدین التمش سے ہوئی، دونوں علیحدہ علیحدہ سلطنتوں کے فرمانروا ہوئے، دونوں کی علم پروری اور معارف نوازی مشہور تھی، اس لئے دونوں کا دربار بھی علمی حیثیت سے ممتاز رہا،

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۴۲۔

بکہ مبارکہ

از

جناب مولانا ابوالجلال صاحب ندوی

توراۃ کے اندر مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے حکم سے جب اپنا آبائی وطن چھوڑا تو ارض کنعان میں سکم کے مقام سے مورہ تک سفر کرتے رہے، (تکوین ۱۲: ۶) سکم اسی مقام کا نام تھا جسے ان دنوں نابلس کہتے ہیں، مورہ کا مقام بحث طلب ہے حضرت ابراہیم جب سفر کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے تو یہاں اُن کو خداوند عالم کی تجلی نظر آئی، مقام تجلی پر انھوں نے خدا کے لئے ایک قربانگاہ بنائی (تکوین ۱۲: ۷) توراۃ کے بیان کے مطابق اس مقام کے علاوہ حضرت ابراہیم اور اُن کے بیٹوں پوتوں نے اور مقامات کو بھی [illegible] مقرر کیا، لیکن قدامت کے لحاظ سے اولین معبد یہی مورہ کے پاس والا تھا۔

مورہ نام کے بائبل میں دو مقامات کا ذکر ہے ایک مورہ جلجال کے مقابل کنعانیوں کی سرزمین میں یردن کے پار مغرب جانب واقع تھا، جہاں قاضی جدعون کے زمانہ میں بنو اسرائیل اور بنو مدیان سے جنگ ہوئی تھی، (استثنا ۱۱: ۳۰ و قاضیون ۷: ۱)

دوسرے مورہ کا ذکر زبور میں وارد ہے، بائبل کے مترجموں نے اس مورہ کے ذکر کو پردہ خفا میں رکھنے کی نہائی کوشش کی ہے لیکن حقیقت کا چھپانا نہایت ہی مشکل کام ہے حضرت داؤد علیہ السلام کے [illegible] کا اردو میں حسب ذیل ترجمہ کیا ہے،

[illegible] خداوند تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں [illegible]

[illegible] ہے بلکہ گداز ہوتی ہے میرا دل اور میرا جسم زندہ خدا کے لئے [illegible]

گوریّا نے بھی اپنا گھر بنا لیا اور ابابیل نے اپنا آشیانہ پایا جہاں وہ اپنے بچے رکھتی

تیری قربانگاہوں کو، اے لشکروں کے خداوند، میرے بادشاہ میرے خدا۔ مبارک ہیں وہ

جو تیرے گھر میں بستے ہیں، وہ سدا تیری ستائش کرتے رہیں گے۔ سلاہ ۞ مبارک ہیں وہ انسان جن

کی قوت تجھ سے ہے، اُن کے دل میں تیری راہیں ہیں[1] ۞

وے بکا کی وادی میں گذرتے ہوئے اُسے ایک کنواں بناتے ہیں، پہلی برسات اسے برکتوں سے

ڈھانپ لیتی ہے، ۞ وہ قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ خدا

کے آگے صیہون میں حاضر ہوتے ہیں ۞، المزمور ۸۴،

چھٹی اور ساتویں آیت کا ترجمہ انگریزی میں بھی تقریباً یہی کیا گیا ہے، اور غالباً مترجمین نے ترجمہ

میں اردو ترجمہ لفظی سے کام لیا ہے، صحیح ترجمہ حسب ذیل ہے،

عبری بعمق ہبکہ	وہ بکہ کے بطن میں چلتے ہیں،
معین یشیتوھو	ایک کنویں کے پاس پھرتے ہیں،
گم برکوت یعطنہ مورہ	جمیع برکتیں، مورہ کی ڈھانپ لیتی ہیں
یلکو محیل ال حیل	وہ قوت سے قوت تک چلتے ہیں،
یراہ ال الوھیم بصیون	خدا سے صیہون سے ڈرتے ہوئے،

مورہ درحقیقت وہی لفظ ہے، جسے قرآن کریم میں ہم بصورت مروہ پاتے ہیں خدا نے فرمایا،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ	یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں
شَعَائِرِ اللّٰہِ،	سے ہیں،

[1] یعنی شرفین،

جبلال کے قریب جو موجود تھا، اس کے پاس کسی مقدس معبد کا پوری تاریخ یہود کے کسی عہد میں سراغ نہیں ملتا، پس بلا شبہ یقینی طور پر ملت ابراہیم کا پہلا معبد وہی ہے جس کا ذکر زبور نمبر ۸۴ میں ہے اور یہی خانہ کعبہ ہے،

خانہ کعبہ جس شہر یا علاقہ میں واقع ہے، اس کا معروف ترین نام بکہ نہیں بلکہ مکہ ہے، قرآن پاک میں ایک جگہ مکہ کے نام سے بھی اس کا ذکر آیا ہے، زیر بحث آیت میں شہر کے معروف تر نام کی جگہ غیر مشہور نام کو ترجیح دی گئی ہے، اس کی دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ اہل کتاب کو یہ بتانا مقصود تھا، کہ وہ معبد جس کے پاس تورات کے اندر مذکور معبد اول کو ہونا چاہئے، جبلال کے پاس نہیں، بلکہ اس وادی بکہ میں واقع ہے، جس کا زبور میں ذکر ہے، دوسری یہ کہ مکہ دراصل بکہ کے نام کی بدلی ہوئی صورت ہے، اخر یہی نام اس شہر کا بکہ تھا لیکن عوام کی زبان نے اسے مکہ بنا دیا،

سب سے قدیم نوشتہ جس میں ہم کو "مکہ" کا نام ملتا ہے، وہ قرآن مجید ہے لیکن بکہ کا نام قرآن سے پیشتر زبور میں ملتا ہے، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف جب ۳۵ برس کی تھی تو قریش نے خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی، اس زمانہ میں خانہ کعبہ کی بنیاد کے اندر سے چند پتھر ملے جن پر کچھ عبارتیں منقوش تھیں، قریش نے یمن سے ایک یہودی اور ایک نصرانی راہب کو بلا کر وہ تحریریں پڑھوائیں، ایک پتھر کے ایک پہلو پر لکھا ہوا تھا کہ

انا اللہ ذو بکۃ	میں ہوں اللہ بکہ کا حاکم،
حففتہا بسبعۃ املاک حنفاء	میں نے اس کی حفاظت کی سات خدا پرست فرشتوں سے،
بارکت لاھلہا فی الماء واللحم	اس کے باشندوں کے لئے پانی اور گوشت میں برکت دی

مختلف روایات میں کچھ اور الفاظ بھی ہیں لیکن ہم نے جتنے الفاظ نقل کئے ہیں وہ ان پر سب

روایتوں کا اتفاق ہے روایات کے مطابق یہ نوشتہ کعبہ کی بنائے ابراہیم کے اندر تھا،

عجیب بات ہے کہ قدیم نوشتوں کی تحریف کا سلسلہ اہل کتاب نے حضرت یسعیاہ کے قبل سے جو شروع کیا تھا وہ آج تک برقرار ہے، ہمارے ناظرین شاید حیرت کریں گے کہ جب ہم تحریف نوشتہ کی حیثیت سے اس موقع پر ڈوزی کا نام لیں گے،

ابھی چند یوم گذرے پادری ندویکر کی ایک کتاب میں اس عجیب بات پر نظر پڑی کہ ڈوزی کو خانۂ کعبہ میں ایک تحریر ملی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ

"عہد اسیری سے بنو اسرائیل کا ایک طبقہ مکہ معظمہ میں آکر آباد ہو گیا تھا"

اس حیرت انگیز خبر کو پڑھنے کے بعد ڈوزی کی کتاب "ڈائی اسرائیلٹن تسو مکہ" اٹھا کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ ڈوزی نے صرف بزور تحریف بنو اسرائیل کو مکہ میں آباد کر دیا ہے،

[illegible]ھ میں خانہ کعبہ کی بنیاد سے جو کتبے برآمد ہوئے تھے، اُن کا ذکر اخبار مکہ لکھنے والے تقریباً ہر مؤلف نے کیا ہے، سیوطی نے درمنثور میں کئی مولفوں کے حوالہ سے مندرجۂ صدر نوشتوں کا ذکر کیا ہے، ازرقی نے اپنی اخبار مکہ میں اس کا ایک خاص باب باندھا ہے، اخبار مکہ پر ایک کتاب محمد بن اسحاق الفاکہی نے بھی لکھی تھی جس کا حوالہ مقریزی کی کتابوں میں ملتا ہے، ڈوزی صاحب کو الفاکہی کی اخبار مکہ دستیاب ہوئی، اس مؤلف نے نہ صرف روایات کو نقل کیا ہے بلکہ اصل کتبہ کی تین سطریں بھی نقل کی ہیں جو خود اُس نے [illegible]ھ میں پڑھی تھیں، ان تین سطروں کو نقل کر کے اُس نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"اس قدر نقوش میری سمجھ میں آئے جو نقوش سمجھ میں نہ آئے، میں نے انہیں کے جیسا میں نے لکھا دیکھا نقل کر دیا، اور اپنی کوشش میں کوئی کمی نہ کی،"

ڈوزی نے الفاکہی کی کتاب سے ان نقوش کو اپنی کتاب کے آخر میں نقل کر کے اس کی تشریح کی ہے، اصل [illegible] عبرانی زبان میں ان سطروں کا حسب ذیل ترجمہ دیتے ہیں،

(۵) جمع [illegible] اعی یحد — [illegible]

شاہد و ھو بیت — [illegible]

× عد تو جلد دامہ مہد — خدا کے آبا میوں کے ز جلد [illegible]

یہ قرأت محض مصنوعی قرأت ہے اس عبارت کا محض مصنوعی ہونا کتبۂ زیر بحث کی تشریح سے [illegible] ہو جاتا تھا، اپنی پڑھی ہوئی عبارت کو با معنی بنانے کے لئے فاضل قاری نے حسب ذیل تغیرات کئے [illegible]

(۱) پہلی سطر کے آغاز میں اپنی طرف سے واو بڑھا دیا تاکہ مستقبل ماضی بن جائے،

(۲) پڑھا "نش" اور اسے "نشی ای" بنا کر با معنی کیا،

(۳) بیت کو با معنی بنانے کے لئے ببیت کر دیا

(۴) سطر سوم کا پہلا نقش پڑھا نہیں گیا، اسے زبردستی یہوہ کا قائم مقام مان لیا، یہ کتبہ مکہ میں تھا، اس کی زبان کو عربی ہونا چاہئے تھا، مگر ڈوزی نے اس کو عبرانی بنا دیا اور جو زمانہ تحریر فرض کیا ہے اس میں عبرانی لوگ اپنا مستقل طرز تحریر رکھتے تھے، مگر حیرت ہے کہ یہ کتبہ عبرانی تحریر میں نہیں،

ڈوزی نے اپنی کتاب میں بارہا ازرقی کی کتاب کا حوالہ دیا ہے، ازرقی کی کتاب میں بصراحت مذکور ہے کہ قریش نے یمن سے ایک یہودی اور ایک نصرانی قاری کو بلا کر وہ کتبے پڑھائے تھے، لیکن ڈوزی نے اس کے برخلاف دعویٰ کیا ہے کہ

"محمد کے زمانہ میں قریش جب خانۂ کعبہ کی پھر سے تعمیر کر رہے تھے، تو ان کو چند نوشتے بنیاد کے پتھروں پر جو ہم کے کندہ کئے ہوئے ملے لیکن وہ ان اجنبی نقوش کو نہیں سمجھ سکے"

یہ صحیح ہے کہ قریش ان نقوش کو خود نہیں پڑھ سکتے تھے، لیکن انہوں نے دوسروں سے پڑھوا لیا تھا جس کی قرأت ہماری کتابوں میں بصراحت مذکور ہے، کتبے کے تین فقرے ہم اوپر نقل کر چکے ہیں، ان فقروں کی اصل حسب تحریر فاکہی کی روایت کے مطابق حسب ذیل [illegible]

ڈوڈری نے کسی خاص مصلحت کے مطابق قدیم قرات سے چشم پوشی کرکے اس عبارت کو ایک نئی آواز اور نیا مطلب دیا ہے، اس نئی آواز اور نئے مطلب کو ڈوڈری نے ایسے اشباہ و نظائر کی مدد سے تصنیف کیا ہے، جن کو اصلی نقوش سے بہت دور کا واسطہ ہے، شلنہ کے یہودی اور نصرانی قارئین نے اشباہ و نظائر کی مدد سے نہیں، بلکہ عبارت کو علم نقوش کی بنا پر اس طرح سے پڑھا تھا جس طرح ہم اردو یا ہندی کی تحریر پڑھ لیتے ہیں،

ڈوڈری کے اشباہ و نظائر سے بے نیاز ہو کر ہم نے جب بطور خود دوسرے اشباہ و نظائر کی مدد سے نقوش پڑھنے کی کوشش کی، تو پہلی سطر بعینہٖ روایتی مفہوم کی پہلی نظر کے مطابق نظر آئی،

کی تشریح ڈوڈری کے اشباہ و نظائر کے مطابق حسب ذیل ہے،

ا		قدیم مقام عبری نقش		یعنی	ک
ب		" " " "		"	س
ج		پالمیرا "		"	ح
د		پالمیری "		"	ک
ه		عبری "		"	ل
و		قدیم عبری "		"	ه
ز		[illegible]		"	[illegible]

۸- ۴	" "	حمیری "	۹	" ی
۹- ط	" "	حبشی "	Z	" ہ
۱۰- ۲	" "	حمیری "	۵	" ہ

اس قسم کی بعید مشابہتوں سے کام لینے کی آزادی ہو، تو کسی عبارت کو کوئی بھی آواز اور مطلب دیا جاسکتا ہے، دو حبشی "ھ" جیسے تین نقوش ہیں، سے دو کو ی اور ایک کو واؤ پڑھا، ۲ مصری میں "کا" کی آواز دیتا ہے، لیکن عبارت کو با معنی بنانے کیا ہوا مطلب دینے کے لئے اُسے ے اور ہا کا مجموعہ قرار دیکر ط اور ح کا قائم مقام قرار دیا، اس کو ے کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے،

[illegible] کے قاریوں نے اشباہ و نظائر کی مدد سے یہ عبارت نہیں پڑھی تھی، مگر اُن کی طرف سے ذیل میں ہم دوسرے اشباہ و نظائر دیتے ہیں،

[illegible]	۴ = [illegible]	مصری	ا	
	∩ = ∩	"	ن	
	ıı = ıı	صفوی	ی	(مکرر) = إلی
ᴙ	M = H	حمیری	ذ	= ذو
	ח = ח	حمیری	ب	
	٦ = .	مصری	ک	
	٧ = ٧	حجازی	ت	

نفر کے بیان کے مطابق ... ق ا کے متعدد نقوش سے ایک

	٤ = [illegible]	حجازی	ک	بجک
[illegible]	۴ = [illegible]	مصری	ا	

ل	جازی	ـــا	.	ط
اق	ا	معری	ص	. م

اشباہ و نظائر کی مدد سے ہم نے پڑھا ہے، پڑھا ہے، "انی ذو بکتک اللہ" (میں ہوں اللہ تیرے بکہ کا حاکم) روایت نے اسی مطلب کو "انا اللہ ذو بکہ" کے لفظ میں ادا کیا ہے، (میں ہوں اللہ بکہ کا حاکم)

سطر دوم کو ڈاؤذی نے حسب ذیل طریقہ سے پڑھا،

ش =	نیروس اڈلر (؟)	ـــد	=	⊔
ل =	حمیری	7	.	ج
م =	عبری	□	.	□
د	پالمیری	ϕ	.	ϕ
ہ	حمیری	Ч	=	Ч
ع	قدیم عبری	∇	=	◁
م	عبری	□	=	□
ب	حمیری	Π	=	Π
ب ت	حمیری	Π×	.	⊠

ان نقوش میں سے اولیں نقش کو شین کی بجائے کاف پڑھنا چاہئے، کسی طرز تحریر کی شین سے نقش اوّل کو شباہت نہیں، نقش چہارم سطر اوّل کی تشریح کے مطابق الف ہے، ◁ ہمدانی کے مطابق حمیری ت کی شکلوں میں سے ایک ہے، جسے فو، فا، اور فی پڑھا جا سکتا ہے، □ چوکور شکل ربع مسکون کی صورت ہے، معری تحریروں میں زمین کی ایک شکل یہ ہے کہ عربی میں اسے سم الارض پڑھ سکتے ہیں، Π کو Π کی بدلی ہوئی شکل بھی باور کیا جا سکتا ہے، Π دراصل آسمان کی شکل ہے، جسے اہل مصر

تو کہتے تھے، عربی میں ہم اُسے اسماء پڑھ سکتے ہیں،

معری میں دیوتا فتاح کا نام ہے جس کا عربی ترجمہ خلاق ہے، دوسری سطر کو ہم دائیں سے بائیں

پڑھیں تو اس کا مطلب ہوا،

کل ما ھا فی الارض و السماء — ہر چیز جو ہے آسمان میں اور زمین میں

خلق — اس نے بنائی،

اسکے معنی ہم نے "ہے" بتائے ہیں، اس پر تعجب نہ کیجئے، ھا یا (ماضی) اور ہی (حال) عبرانی میں

یہی مطلب ادا کرتے ہیں، کوئی عورت اگر کسی مرد کو پیغام دیتی تو کہہ سکتی تھی ھیتی لک، میں تیری ہوں

یہی عبرانی فقرہ ذرا متغیر ہو کر سورۂ یوسف میں امراۃ العزیز کی زبان سے وارد ہے کہ ھیت لک،

یہ قرات سطر دوم کی ہم کو زیادہ پسند ہے، مگر شاید میں قریش نے جن یہودی اور نصرانی مدیون

سے یہ عبارت پڑھوائی تھی، انھوں نے سطر دوم کو غالباً بائیں سے دائیں پڑھا تھا،

عربوں کی سمت قرار کے مختلف اشکال میں ایک × ہے، تبار کی شکل تری ہلاکت پر دلالت

کرتی ہو، یہ ماحصل تانگ پر رکھی ہوئی ایک چھری کی شکل تھی، جیسا کہ معری تحریروں سے ظاہر ہے، اس کو

گھیر دینے یا سمت تجیر ○ کے اندر رکھ دینے سے نقش کا مطلب تباہی سے بچانا ہو جاتا ہے، اس تشریح کے بعد

اب دوسری سطر بائیں سے پڑھئے،

⌧ = خفظت،

⊓ =		
◁□ =	ب+ب = ،	بسم
ب =	ه	

از

جناب شیخ فرید صاحب ایم اے

(۲)

المعتمد فی المعتقد | "المعتمد فی المعتقد" موسوم بہ "عقائد تورپشتی" کے تین نسخے زیر نظر ہیں،

کیفیت مخطوطہ[۱] ۹ × ۵ خط تعلیق کے ۱۹۰ ورقوں پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۱۵ سطریں ہیں خط

خوشنما نسخ، روشنائی سیاہ، کاغذ دبیز بادامی ہے، مخطوطہ کے آخری چند اوراق کا نچلا حصہ کیڑے کھا گئے

ہیں حاشیے زیادہ کرم خوردہ ہیں اکثر لغات مشکلہ حواشی پر درج ہے،

خاتمۂ کتاب پر یہ عبارت ہے،

تمت نسخۃ الشریفۃ المعتمد فی المعتقد ......[۲] الاعظم

السعید الواصل الی رحمۃ اللہ ...... النجیب متقن ی

الامثل شہاب الحق والدین فضل تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ

قوبل بالاصل ...... بقدر الوسع والامکان ...... ام

سید عبداللطیف ولد سید ولی دولت آبادی

۱؎ فرزندِ سید احکام اللہ صاحب بخاری امام جامع مسجد ... کتب خانہ ... نسخہ موجود

۲؎ مقصد کی جلد میں کرم خوردہ ہے ...

باب دہم :- در ایمان بفرشتگان و کتب و [illegible]

باب سیزدہم :- در مسائل اختلافی بر مذہب [illegible]

کتاب کی اہمیت اور اس کی خصوصیات

عقائد اہل سنت و جماعت [illegible] اہم کتاب ہے [illegible] اور مدلل بیان کئے گئے ہیں، اس کتاب میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے [illegible]

"حق میداند کہ ہر آنچہ گفتیم بسیار احتیاط کردیم و از اصطلاحات دیگران احتراز کردیم۔"

اصول اعتقادات میں سے صرف اُن ہی عقائد کو بیان کیا گیا ہے، جو عام مسلمانوں کی سمجھ میں آسانی سے آسکتے ہیں، اکثر علمائے کرام نے اپنی تصنیفات و تالیفات میں اس کے حوالے دیئے ہیں، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "اشعۃ اللمعات" کے مقدمہ میں اس معتبر تصنیف کا ذکر اکثر مقامات پر کیا ہے، علامہ برہان مسکین نے اپنی کتاب "عقائد موسوم بہ ارشاد المسلمین" میں اس کتاب کے بہت سے مسائل نقل کئے ہیں، حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے ایک مکتوب (نمبر ۱۹۳ دفتر اول) میں لکھا ہے، کہ عقائد حقہ کی درستی کے لئے امام توربشتی کا رسالہ نہایت مناسب[1] اور عام فہم ہے، محمد جمیل ابن ابو تراب البدخشی نے اپنی کتاب عقائد اسلامیہ منظومہ (قلمی) میں اس کتاب[2] کے جابجا حوالے دیئے ہیں۔

---

[1] دیباچہ المعراد المستوی ص ۳۵

مخطوطہ شرح نصاب بدیع العجائب

از

جناب ملک ابو یحییٰ امام خان نوشہروی

مخطوطہ نصاب جات (ذوب زبان کھڑی) کا سراپا معارف اکتوبر [illegible] میں نکتہ سنجانِ علم و ادب کے حضور میں پیش ہوا تھا، اس مضمون میں ایک دوسرے نادر مخطوطہ بدیع العجائب کا تعارف مقصود ہے جس کا اشارہ مضمون سابق میں کیا جا چکا ہے،

نصاب بدیع العجائب کا متن حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تصنیف اور اس کی شرح امان اللہ سنبھلی نے کی ہے، جیسا کہ ورقِ آخر میں مرقوم ہے،

"خامۂ سپاس بے قیاس صانعے را کہ در دیوان ازرق شمار آسمانِ نظم پروین و نثر نسرین رقم زدہ........ یعنی شرح نصاب بدیع العجائب کہ محتمل بر قطعات غرائب و لغات عجائب است بعرض چند ہفتہ چون ماہ دو ہفتہ بعد تمام بدستیاری این ذرۂ خاکسار مہجور امان اللہ سنبھلی رسیدہ........ در روز مراد ہفتم شہریور ماہ الٰہی اتمام یافت، تمت تمام من نصرت اللہ و توفیقہ شرح نصاب بدیع العجائب تصنیف حضرت امیر خسرو دہلوی نور اللہ مضجعہ بیا حزر اجابہ دعا [illegible] شب چہارم شہر رجب المرجب [illegible] روز سہ شنبہ [illegible] صاحب تحریر یافت"

[illegible]

اکتوبر ۱۹۸۱ء ص ۲۹۰) میں گذرا،

شرح نصاب بدیع العجائب کا ورق اول غائب ہے ۱۴ سطر، اسطری اجزا اوراق کا شمار ۱۳۱ ہے، دوسرے صفحہ کی ابتدا لفظ باید سے ہوتی ہے یعنی

"باید ساخت کہ تا نا آشنایان بحر معانی بے دستیاری شناوران دریاے دانش بہ ساحل مقصود بردہ گوہر مراد بدست آرند، و تشنہ لبان وادی سخن بے استمداد خضر نشان چشمہ ہدایت بر سوتن ابحواۃ معانی مطلوبہ فائز گردیدہ شیرین کام و سیراب شوند، اگرچہ در آئینہ زنگار خوردہ طبعم از بس پریشانی و حیرانی صورت این خیال محال می نمود........ با وجود درد دلی و سراسیمگی حواس درونی معانی لغات نصاب مسطورہ از صراح و دستور الاخوان و موید الفضلاء و فرہنگ جہانگیری وغیرہ بسنہ ۱۱۱۳ یکہزار و یکصد و سیزدہ ہجری استنباط و استخراج نمودہ............ و اللہ ولی وبہ التوفیق و الارشاد ومنہ المبداء الیہ المعاد" (ص ۳)

اصل متن منظوم، اور شرح سنبھلی منثور ہے، اشعار مبوب بعنوان القطعۃ الاولیٰ، اور بعض ابواب کی سرخی میں الف ولام نہیں ہے، مثلاً قطعہ سادس" کل ابواب ۲۰ ہیں، لغات کی تعداد ۶۶۰، اور لغات مکرر ۱۲۰ ہیں، کہ بسبب ضرورت تصنع تبکرار آمدہ اند،[۱] لغت تازی ۲۰ ہیں، نمونہ یہ ہے،

"القطعۃ الاولیٰ فی البحر الرمل المثمن ۵۴"

ہم چو جان دہ خدایا عشق مطلق جاودان — سوختن لذت دہ نے ساختن با دل ستان

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات — رمل مقصور است با تجنیس تام از نکتہ دان

مہر شہر و شہر ماہ و ماہ آب و خون سہم — سہم تیر و اجنحہ پر بال باشد بال جان

ع ف ع ف ع ف ع ف — ع ف ع ف ف ع ف

امان اللہ کی شرح مختصر مگر جامع ہے، اور اس کا نمونہ یہ ہے،

"در تمام این قطعہ اولی صنعت تجنیس تام واقع گردیدہ، و آن این ست کہ لفظی یا

---

[۱] المرقاۃ آخر شرح امان اللہ سنبھلی ۱۵ ابواب و علامات تحت اللغت تنکری ہیں،

شاعر در نظم یا در نثر دو لفظ یا زیادہ را بر وجہے ذکر نماید کہ متحد باشند در حروف و ترتیب اعراب ومختلف شوند در معنی چنانچہ شہر و شہر یکے ترجمہ معروف دیگر عربی ماہ ست، مصر بکسر میم ......"

شعر مذکور بالا میں ایک ایک لفظ کی لغت منقول ہے، اور جن کے معنوں میں تعدد ہے انکی شارح نے تفصیل کر دی ہے، مثلاً لفظ تیر کی شرح میں لکھتے ہیں کہ

"بزبان فارسی بست و پنج معنی دارد، اول معروف، دوم اسم فرشتہ کہ بر ستوران موکل است سیوم نام ماہ و چہارم بود از سال شمسی و اہل ہند آنرا ساون گویند، چہارم نام روز سیزدہم است از ہر ماہ شمسی پنجم بمعنی حصہ و بہرہ وحظ و نصیب آمدہ، فخری بمعنی ماہ و روز و حصہ گفتہ ؎

بروز تیر و ماہ تیر و مہر تیر عزم شادی کن | کہ از سپہر ترا فتح و نصرت آمد تیر

ششم عطارد گویند (عطارد کے بعد را چاہیے) ہفتم قہر و غضب و خشم را مانند ہشتم بمعنی تنگ آمدہ کہ آنرا تازی ضیق خوانند، نہم تیرہ و تاریک بود، دہم فصل تیر را مانند و آن فصل را خزان نیز گویند، یازدہم قدر و مرتبہ باشد شیخ فیضی گفتہ"

قسم بقبضۂ قدر و کمان قدرت تو | کہ با تو نیست کس اندر شمار در یک تیر

دوازدہم تیر چوب راست را گویند و تیرے کہ خانہ بدان بپوشند، و تیرے[1] کہ میان کشتی نصب کنند و بادبان آویختہ و تیر عصّاری[2]، سیزدہم صاعقہ یعنی برق را مانند چہاردہم شگوفہ خرما باشد پانزدہم طاقت بود، شانزدہم نام از نوعے مار است ہفدہم جنس از مرغ بود ہژدہم تیر خامہ بود، نوزدہم مور را گویند، بیستم گرپاس را گویند بست و یکم نام نرگس است، بست و دوم چیزے را گویند کہ از انواع اجناس خود بہتر باشد، بست و سیوم گولہ توپ و تفنگ و امثال آن بست و چہارم رشتہ را گویند، بست و پنجم تکیہ را خوانند، چنانچہ از شیخ مصلح الدین شیرازی

---

[1] پہر سہ لغت (۱) و (۲)، و (۳) بھی تعداد میں شریک ہو سکیں تو (لفظ تیر کے) ۲۸ معنی ہوتے ہیں،

شیرازی است ؎

چو تیرے تو دارد ببرش فرن ما من (۱) (فرہنگ جہانگیری ص ۳۲)

یہ آج سے ڈھائی سو سال قبل کی تحقیق و تفصیل کا انداز تھا جب کہ نہ کتابوں کی یہ فراوانی تھی، اور نہ سفر کی یہ سہولتیں، اور کتب نوادر بھی کم تھے، جن پر موجودہ محققین کی تحقیق و اکتشاف کا مدار ہے، ان میں جدید کٹیلاگ کو بھی شامل کر لیجئے، پھر امان اللہ سنبھلی جیسے غیر معروف لغت دان کی تلاش و تجسس کی داد دیجئے،

اور "قطعۂ ثانی در بحر رمل مسدس و مشتمل بر صنعت قلب بطریق لف و نشر مرتب"

"و آن آن باشد کہ منشی یا شاعر در نظم یا در نثر لفظے یا عبارتے را بوجہے ذکر کند کہ ہمہ حروف آن منقلب شوند و از آن لفظے دیگر حاصل بود" (ص ۱۹)

اور "قطعۂ ثالث در بحر مذکور مشتمل بر صنعت قلب مستوی بطریق لف و نشر مرتب"

"و آن آن باشد کہ منشی یا شاعر در نظم یا در نثر لفظے و عبارتے را بنوعے بیارد کہ ہم راست (۱) توان خواند و ہم از گردن چنانکہ درین قطعہ ظاہر است" (ص ۲۲)

نصاب بدیع العجائب میں اشارہ ان قطعہ "مشعر بر لغت معرّبہ" بھی ہے،

"و تعریب آن باشد کہ منشیان تازی و شاعران حجازی چند الفاظ فارسی را باندک تغیر عربی کنند و میان خود مصطلح سازند، چنانچہ درین قطعہ است" (ص ۵۲)

اور آخری قطعہ ؟ "سابع عشرین بر صنعت منقوط الحروف" ہے،

فیض بخشش فضل جنبش خشف تیز
ع ف ع ع عف

کشف ضیق وجذب تیق وجنق تیز (۱)
ع عف ع ع عف ف

"و آن آن باشد کہ منشی یا شاعر در نظم یا در نثر الفاظ بیارد کہ ہمگی حروف آن

---

(۱) علامت عف شاید ایسے الفاظ کے لئے ہو جو عربی یا فارسی دونوں میں مستعمل ہیں،

خلاصہ ناشندہ (ص ۶۱، ۶۲)

الغرض زیر نظر نصاب اور اس کی شرح دونوں اسی طرح حروف و معانی کے بدائع و عجائبات سے معمور ہیں،

ختم کتاب کے بعد جو بیاض رہ گئی اس میں بھی کاتب محمد قاسم ادہمی نے من جملہ اور اشعار کے طاہر وحید کی اس غزل کے ۲ شعر زیب قرطاس فرما دیئے ہیں،

گر نظرم فتد بہ تو چشم بچشم مو بمو
شرح دہم غم ترا نکتہ بنکتہ مو بمو

اس شعر کے لفظ شرح کو اس کتاب شرح نصاب بدیع العجائب سے بھی پوری مناسبت ہے یعنی ع شرح دہم غم ترا نکتہ بنکتہ مو بمو،

تاریخ اسلام حصہ اوّل

عہد رسالت و خلافتِ راشدہ یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافتِ راشدہ کے اختتام تک، اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی، اور علمی تاریخ، طبع ثانی جسمیں کچھ اصلاح اور اضافے بھی کئے گئے ہیں،

ضخامت :- ۵۹۶ صفحے،

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

(زیر طبع)

منیجر

ادبیات

اللہ کی نشانیاں

"ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند"

از

جناب یحییٰ اعظمی

یہ چاند، سورج یہ کوہ و دریا — یہ مرغ و ماہی یہ وحش و طائر

یہ سقفِ گردوں، یہ بزمِ انجم — ارض و سما کے آثار ظاہر

یہ پھل، یہ پتے، یہ گل، یہ غنچے — درس و حکم کے اوراقِ طاہر

معمور جن سے صحنِ چمن ہے — وہ رنگ و بو کے سارے مناظر

نکہت یہ جن کی رقصاں ہے بلبل — نگہت سے جن کی بیخود ہے شاعر

یہ جو پہاڑوں کے دامنوں میں — چشمے ہیں جاری شفاف و طاہر

ہیں کس کی فطرت کے یہ کرشمے — ہیں کس کی قدرت کے یہ مظاہر

کس نے بنائے ہیں یہ عجائب — کس نے سجائے ہیں یہ نوادر

برگ و شجر ہوں یا سبزۂ و گل — ہر ایک ذاکر ہر ایک شاکر

یہ ابر و باد و خورشید و انجم — گردش میں پیہم ہیں کس کی خاطر

خود جاں نوازی کو یہ ہوائیں — خدمت میں کس کی رہتی ہیں حاضر

کس کے لئے ہیں سب کارفرما — اک لمحہ تم بھی سوچو تو آخر

یونہی نہیں یہ پیدا ہوئے ہیں   دیتے ہیں یہ کچھ درسِ بصائر
فکر و نظر کا ہے باز و فتر   در کار لیکن ہے چشمِ غائر

مامور خدمت ہے ذرہ ذرہ
اے وائے گر خود انساں ہو قاصر

اعتدال

از جناب شفیق صدیقی جونپوری

طاقت ہو تو ملحوظ رہے حسنِ نظر بھی   فولاد کے بازو ہوں تو چہرہ گل تر بھی
شیرانہ گرج چاہئے آواز میں لیکن   کچھ درد بھی ہو شور بھی ہو کیف و اثر بھی
ہمت ہے جلانے کی بجھانا بھی تو سیکھو   پانی بھی ہو شبنم بھی ہو شعلہ بھی شرر بھی
مغرور کی محفل ہو تو مسند کو بھی ٹھکرائے   مزدور کا مجمع ہو تو ہو شیر و شکر بھی
ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دے اخلاق ہو ایسا   ٹکرائے تو پھر توڑ دے باطل کی کمر بھی
کچھ نقش ہو کچھ رنگ ہو کچھ تابِ تواں ہو   شہباز کے پنجے بھی ہوں طاؤس کے پر بھی
پا فیض ہو دریا کی طرح ظاہر و باطن   ہو سطح پہ کشتی تو نہاں تہ میں گہر بھی
بند آنکھیں ہوں تو عرش بریں دیکھ رہا ہو   غافل ہو خود اپنے سے زمانے کی خبر بھی
سجدہ کرے تو خاک کے ذروں پہ جبیں ہو   لے ہاتھ میں پرچم تو جھکیں شمس و قمر بھی
دل اتنا جفا کش ہو کہ کانٹوں پہ بھی نیند آئے   بستر پہ کبھی پھول بھی ہو برگ و ثمر بھی
حلقے میں لئے پھرتے ہوں معزب کے گل اندام   دامن کی قسم کھاتی ہو حوروں کی نظر بھی

خدمت کا بھی جذبہ ہو جلالت کا بھی احساس
ہاتھوں میں علم ہو در خیبر پہ نظر بھی

غزل

ازجناب مولوی محمد عزیز صاحب ایم۔ اے لکچرار مسلم یونیورسٹی

تمھاری یاد مین شام و سحر کی ۔۔۔ کہانی ہے یہ اپنی عمر بھر کی

محبت اور پھر اُس کی محبت ۔۔۔ جسارت دیکھیے قلب و جگر کی

یہ کس کا روے انور ہے نظر مین ۔۔۔ پلک جھپکی نہین شمس و قمر کی

بہے جاتے ہین آنسو بے تکلف ۔۔۔ لٹی جاتی ہے دولت چشم تر کی

ملے گر یا جہان کی ساری نعمت ۔۔۔ جو لذت پائیے آہ و سحر کی

اُسی سے رونق بزم جہان ہے ۔۔۔ اُسی سے آبرو لعل و گہر کی

اُسی سے خلوت دل رشک فردوس ۔۔۔ اُسی سے تازگی فکر و نظر کی

عزیز اس زندگی سے موت بہتر ۔۔۔ جو یون ہی عمر فرقت مین بسر کی

کیا ہوگا......؟

ازجناب خاور لکھنوی

بتا کہ گردش لیل و نہار کیا ہوگا ۔۔۔ یہی روش ہے تو انجام کار کیا ہوگا

ہر ایک موڑ پہ اک طرح نو تمنا کی ۔۔۔ مآل زیست دل بے قرار کیا ہوگا

نفس نفس مین تمنا مگر نظر مین سکون ۔۔۔ کسی کا راز الم آشکار کیا ہوگا

شفق کے پردے مین جنبش کسی کے دامن کی ۔۔۔ فریب اور دل بے قرار کیا ہوگا

کبھی ہے درد کبھی آرزو کبھی حسرت ۔۔۔ خبر نہین، دل آشفتہ کار کیا ہوگا

قضا سے کم نہین خاور، جمود زیست کہ جب

کوئی اسیر کہے بار بار "کیا ہوگا"

مطبوعات جدیدہ

خلاصہ تحفۃ النظار از جناب مولوی عبدالرحمٰن خان صاحب صدر حیدر آباد اکیڈمی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۲ عہ قسم اعلیٰ سے ر پتہ : مکتبہ برہان جامع مسجد دہلی،

ابن بطوطہ کے مشہور سفرنامے تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار کا اردو میں خلاصہ ہے اس کا مکمل اردو ترجمہ عرصہ ہوا چھپ چکا ہے، گو اس تلخیص میں اصل سفرنامہ کا لطف اور دلچسپی نہیں ہے اور واقعات و حالات بھی کم ہیں، تاہم بیشتر ضروری معلومات آگئے ہیں، فاضل ملخص کی تمہید یا دیباچہ اور تشریحات مفید اور کارآمد اضافے ہیں، تمہید میں قدیم مسلمان سیاحوں کا مختصر تذکرہ اور ابن بطوطہ کے زمانہ تک دنیائے اسلام کے عروج و زوال پر مختصر تبصرہ ہے، جس سے سفرنامہ کا پس منظر معلوم ہو جاتا ہے، سفرنامہ کے بعض قدیم اسماء و اعلام و مقامات اور اس قبیل کے بعض دوسرے قابل شرح امور کی تشریح اور کہیں کہیں ان سے متعلق تاریخی واقعات کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے، جابجا واقعات پر تنقید بھی ہے، ہر ملک کی سیاحت کا نقشہ بھی دیدیا ہے جس سے سفرنامہ کی افادی حیثیت بڑھ گئی ہے،

گرد راہ از جناب وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۶ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عار پتہ کونسل ہاؤس لکھنؤ،

لائق مصنف پرانے اہل قلم اور بدایوں کے مشہور و مرحوم ادبی رسالہ نقیب کے اڈیٹر تھے، پھر بزم ادب سے رزمگاہ سیاست میں چلے گئے، اور ایک مدت تک ادبی دنیا سے غائب رہنے کے بعد اب ایوان حکومت

میں نمودار ہونے ہیں، لیکن یہ خوشی کا مقام ہے، کہ اس خارستان میں ان کا ذوقِ ادب مجروح نہیں ہوا ہے، اور اس کی تازگی قائم ہے، "گردِ راہ" ان کے چند مضامین اور ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے، جو بیشتر سیاسی اور بعض ادبی ہیں، "انسان اقبال کی نظر میں" اور "اقبال کا نظریہ سعی وعمل" میں ان دونوں سے متعلق اقبال کے افکار و معتقدات کی نکتہ سنجی اور دقتِ نظر سے تشریح کی گئی ہے، ممبروں کے حقوق میں کونسل کے ممبروں کے حاکمانہ حقوق کا دلچسپ نقشہ دکھایا گیا ہے، سیاسی مضامین تقریباً سب مسلمانوں کی سیاست سے متعلق ہیں، ان میں ان کی موجودہ سیاسی پوزیشن کا جائزہ لے کر آئندہ طرزِ عمل کے متعلق مشورہ دیا گیا ہے جو اس وقت مسلمانوں کے لئے امن وسلامتی کی راہ ہے، ان مضامین میں مصنف کا ذوقِ ادب اور اس کی سلامتِ فکر پوری طرح نمایاں ہے،

ناروا، از جناب غلام احمد صاحب فرقت، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، غالباً ڈیڑھ دو روپیہ تک ہوگی، پتہ کتابخانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

مصنف اپنی کتاب "مدارا" کے ذریعہ جو ترقی پسند اور آزاد شاعری کی خامیوں اور بے عنوانیوں کی اصلاح کے لئے ظریفانہ تنقیدی رنگ میں لکھی تھی، روشناس ہو چکے ہیں، ناروا بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، یہ گویا موجودہ ترقی پسند شعراء کا تنقیدی تذکرہ ہے، جس میں اٹھاسی شعراء کا تعارف، ان کے کلام پر تبصرہ اور اس کا نمونہ ہے، تعارف و تبصرہ میں ہر شاعر اور اس کے کلام کی خصوصیات کا نہایت دلچسپ جائزہ لیا گیا ہے، اور طنز و مزاح کے پردہ میں ان کی صحیح نقادی کی گئی ہے، کہیں کہیں قلم میں شوخی زیادہ آگئی ہے، جس سے اس قسم کی تحریروں میں بچنا مشکل ہے، اردو طنزیات میں یہ کتاب دلچسپ اضافہ ہے،

زہریلے آنسو، مترجمہ جناب غلام سرور صاحب فگار، تقطیع اوسط ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد سے، رسالہ بہار کلدار، پتہ نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن،

قاضی نذر الاسلام بنگالی زبان کے نامور اور باکمال شاعر ہیں، اور صداقت کا نذرانہ کی ...

کہ شاعری میں اُن کا درجہ ٹیگور سے کم نہیں، خود ٹیگور اُن کے اتنے معترف اور قدردان تھے، کہ اپنی ایک تصنیف اُن کے نام معنون کی، اس کے باوجود ایسے شاعر کے کلام سے اردو زبان اور اردو دان طبقہ تقریباً بیگانہ ہے، مترجم نے جن کو شاعر سے خاص عقیدت ہے، زہریلے آنسو کے نام سے اُن کی چند منتخب نظموں کا ترجمہ کیا ہے، اس میں بزم و رزم اور متغزلانہ اور انقلابی دونوں رنگ کی نظموں کے نمونے ہیں، شاعری کا حسن احساس کی لطافت زیادہ تر الفاظ سے وابستہ ہوتی ہے، بلکہ معنوی محاسن میں بھی الفاظ کو بڑا دخل ہے، اس لئے کسی زبان کی شاعری کا اس کے پورے محاسن کے ساتھ ترجمہ نہیں ہو سکتا، تاہم لائق مترجم نے ظاہری حسن کو بھی قائم رکھنے کی امکانی کوشش کی ہے، ان نظموں سے قاضی نذر الاسلام کے کلام کی خصوصیات اور اس کے محاسن کا بڑی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے،

کیفیات از جناب نثار یار جنگ تقطیع بڑی ضخامت ۱۵۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ تحریر نہیں،

کیفیات مصنف کے کلام کا مجموعہ ہے، راقم اُن کے نام سے تو آشنا لیکن دوسری حیثیتوں سے ناواقف تھا، اس لئے محض "یار جنگ" کا کلام سمجھ کر اس کا مطالعہ شروع کیا، لیکن دو ہی چار غزلوں کے بعد کلام کے تیور اور زبان کی نفاست و پاکیزگی سے اندازہ ہوا، کہ یہ تو کسی اور ہی ٹکسال کا سکہ ہے، تعارف پر نگاہ ڈالی تو تصدیق ہو گئی کہ مصنف کا وطن علی گڈھ ہے، اور وہ اس کے خیر القرون کی پیداوار ہیں، اور اب حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے، وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں، اُن کی مشق سخن پر چالیس سال سے زیادہ گذر چکے ہیں، کلام ہر حیثیت سے استادانہ ہے، زبان اتنی شستہ و رفتہ اور انداز بیان اتنا سلیس و برجستہ و دلآویز ہے، کہ اکثر اشعار زبان کی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے سکے معلوم ہوتے ہیں، دیوان کے شروع میں جناب ماہر القادری کے قلم سے مصنف کے حالات اور حضرت جگر مرادآبادی کے قلم سے کلام پر دیباچہ اور اس کا انتخاب ہے، امید ہے کہ ارباب ذوق کیفیات کی پوری قدردانی فرمائیں گے،

قضیۃ الحدیث فی حجیۃ الحدیث | از مولانا ابوالقاسم صاحب بنارسی مدرس مدرسہ اہل حدیث تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۳ر پتہ بزم توحید مدنپورہ بنارس

مسلمانوں میں ایک طبقہ احادیث نبوی کی صحت اور اُس کی حجیت کا منکر ہے، اس کی تردید میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، مولانا ابوالقاسم صاحب بنارسی نے اس موضوع پر تقریر فرمائی تھی، اسی کو کتابی شکل میں شائع کردیا گیا ہے اس میں احادیث کی اہمیت اسکی صحت اور حجیت کے دلائل دئیے گئے ہیں، جو زیادہ تر پیشین گوئی کی احادیث پر مشتمل ہیں، اس سے انکار نہیں کہ پیشین گوئیوں کی صحیح احادیث بھی ہیں لیکن تنہا پیشین گوئی کی صحت کسی چیز کی صداقت کا معیار نہیں ہے، اس کے علمی دلائل دوسرے ہیں جن کی جانب مولانا نے توجہ نہیں فرمائی ہے، اور تعجب یہ ہے کہ مولانا نے وحشت ہوکر رطب و یابس احادیث میں امتیاز نہیں فرمایا ہے حتی کہ اپنے مسلک آمین بالجہر کے جھگڑے کی پیشینگوئی بھی حدیث سے ڈھونڈھ نکالی ہے کم از کم اس کتاب کو جو حدیث کی حجیت پر لکھی گئی ہے، اس قسم کی کچی احادیث سے خالی ہونا چاہئے تھا، غالباً مولانا نے یہ تقریر عوام میں کی تھی اور یہ کتاب بھی عوام ہی کے مطالعہ کی ہے لیکن نام ایسا رکھا ہے کہ جسے خواص بھی بغیر لغت کے نہیں سمجھ سکتے البتہ اس نام سے یہ کتاب باوزن ہوگئی ہے،

مجموعۂ رباعیات حکیم صوفی محمد عبداللہ خان صاحب مضطر ٹونکی مرحوم تقطیع جیبی، ضخامت ۱۴۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت تحریر نہیں، پتہ:- حکیم صوفی محمد یونس صاحب محلہ رجبن ریاست ٹونک راجپوتانہ،

مصنف جیسا کہ اُن کے نام اور کلام سے بھی ظاہر ہے ایک صاحب دل صوفی تھے، فارسی میں مشق سخن کرتے اور حکیم وصوفی شعراء کے طریقہ پر زیادہ تر رباعی کہتے تھے، اس مجموعہ کی تمام رباعیاں اخلاقی تعلیمات اور عارفانہ و حکیمانہ مضامین و مسائل پر مشتمل ہیں، آخر میں چند نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، اُن کی زبان میں اہل زبان کی شیرینی و لطافت اور کلام میں پُرانے اساتذہ کی پختگی ہے، کتاب کے شروع میں اس کے ناشر ہدایت اللہ خان صاحب کے قلم سے مصنف کے مختصر حالات ہیں،

تابعین

مرتبہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمرؒ بن عبد العزیز، حضرت حسن بصری، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمدؒ حنفیہ، حضرت سعید بنؒ مسیب، حضرت سعیدؒ بن جبیر، حضرت محمد بن سیرین، حضرت ابنؒ شہاب زہری، امام ربیعہؒ رائی، امام مکحولؒ شامی، قاضی شریحؒ، وغیرہ چیاونؒے اکابر تابعینؒ کے سوانح، اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

ضخامت :- ۵۰۰ صفحے،

قیمت :- چار روپیہ،

[illegible]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا عظیم الشان ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت و احتیاط کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات و غزوات ہیں اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہل بیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو روایات صحیحہ سے ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کی عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق، فضائل اور آداب کے عنوانوں اور اس کی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیم کی تفصیل ہے۔

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول [illegible] حصہ دوم [illegible] حصہ سوم [illegible] حصہ چہارم [illegible] حصہ پنجم [illegible] حصہ ششم [illegible]

[illegible]

[illegible]

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت چھ روپے سالانہ

دار المصنفین اعظم گڈھ

دارالمصنفین کی نئی کتاب

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اُترا تھا، اور اُن کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے اُن کے آثار نمایان ہین لیکن اس کے باوجود اُردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصّل و محققانہ تاریخ موجود نہین تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہِ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت مین شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہان ایک نئی حکومت کی بنیادین استوار ہو رہی ہین،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے،

قیمت :- چھ روپیہ،

"منیجر"

جلد ۶۲ ماہ شوال المکرم و ذی قعدہ ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۴۸ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

اردو ہندی کا قصہ تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہو چکا، اب ہندی اور ہندوستانی کا قصہ چل رہا ہے، معارف کے پرانے پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ مین نے سمجھوتے کے طور پر ہمیشہ ہی ہندوستانی کی تائید کی ہے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستانی کی تحریک چلانے والا اگر مین اکیلا نہین تو اس کے چلانے والون مین سے ایک مین بھی ہون، آخر ۱۹۴۵ء مین وہ دن بھی آیا جب گاندھی جی نے بھی اس کو مان لیا، اور انھون نے وردھا مین اس کے لئے ایک جلسہ بلایا جس مین ہندو اور مسلمان دونون ہی تھے، اور اس مین ہندوستانی کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کی تجویز سوچی اور مانی گئی،

————— ٭ ٭ ٭ —————

اس جلسہ مین بہت سے ہندو اور مسلمانون نے اپنی اپنی تقریرین کین جو ہندوستانی پرچار سبھا کی رپورٹ مین چھپ بھی چکی ہین، اس مین جتنی تقریرین ہوئین وہ اس انداز پر ہوئین، کہ جو کوئی جو کچھ کہے اوس کو سب ہی سمجھین، بڑے اچنبھے کی بات یہ ہو کہ یوپی غالباً پرتاب گڈھ کے ایک نوجوان نے جن کو باس سے مین پہلے مسلمان سمجھا بعد کو وہ ہندو نکلے، اپنی تقریر مین یہان تک کہا کہ اس وقت یہان جتنی تقریرین ہوئین، ان مین پوری پوری ہندوستانی سید سلیمان کی تقریر تھی، حالانکہ مین ہندی نہین جانتا مگر بات یہ ہو کہ اردو مین سیدھے اور صاف اور آسان لفظ اتنے ہین کہ اُن کے سہارے سے اچھی خاصی تقریر کی جا سکتی ہے،

————— ٭ ٭ ٭ —————

اس جلسہ مین گاندھی جی نے ٹنڈن جی کو بھی بلایا تھا، مگر وہ حیلہ بہانہ کرتے رہے اور آخر تک نہین آئے، اور پھر بعد کو اخبارون مین ہندوستانی سے اپنا اختلاف صاف صاف ظاہر کر دیا، اور اب بھی وہ اسی پر اڑے ہین، اُن کے جی کی بات یہ ہو کہ ہندوستان ہندوؤن کا ملک ہو اس کی بولی بھی وہی ہونی چاہئے جو ہندوؤن کی ہو، اگر ہم اُن کی اس بات کو گھڑی بھر کو مان بھی لین تو بھی یہ بات نہین مانی جا سکتی کہ وہ ہندی یعنی سنسکرتی ہندی جس کو وہ ہندوؤن کی بولی بتاتے ہین وہ

حقیقت میں آج بھی جب ہندی کا اتنا پرچار ہو چکا ہے کسی صوبہ کے بھی ہندوؤں کی مادری بولی ہے، جب چاہے جانچ کے کسی جلسہ اور ملاقات میں اس کا تجربہ کر لیجئے، باقی ہندی کے اخباروں اور کتابوں میں جو بولی لکھی جا رہی ہے وہ بناوٹ سے چند سال سے لکھی ضرور جا رہی ہے، مگر بولی کہیں نہیں جاتی،

معلوم نہیں یہ سنسکرتی ہندی والے ہندوستانی کو کیا سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ اس بولی کا نام ہے جس کو ہم آسان اردو اور آسان ہندی دونوں کہہ سکتے ہیں، اور جس کو ہندو اور مسلمان بول رہے ہیں، ہم نے کبھی کبھی ریڈیو پر گاندھی جی، راجندر پرشاد، جواہر لال نہرو، پنڈت پنت، بلکہ پٹیل صاحب کی تقریریں سنی ہیں، ابھی کچھ دنوں پہلے ۱۳ اگست کی رات کو پنت جی کی تقریر غلے اور کپڑوں کے کنٹرولوں پر سنی یہ پوری ہندوستانی تھی جس کو اردو اور ہندی دونوں کے جاننے والے اور دیہات اور شہر دونوں کے رہنے والے برابر سمجھ سکتے تھے، کہیں کہیں ان میں زبردستی سنسکرتی ٹائپ کا کوئی لفظ آ جایا کرتا تھا، مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ اوپرے آدمی نہیں یعنی اس کو لایا گیا ہے، یہ خود آیا نہیں ہے،

کانگریس کی پہلی وزارت کے زمانہ میں صوبہ بہار کی وزارت تعلیم نے ملک کے اردو اور ہندی ادیبوں کی ایک کمیٹی بنائی تھی، جو ہندوستانی زبان کی صرف و نحو کے قاعدے لکھے، ڈکشنری تیار کرے، اور علمی اصطلاحوں کو بنائے، یہ کام پٹنہ میں کئی سال تک ہوتا رہا اور سب کچھ جب بن کر تیار ہو چکا تو حکومت بدل گئی، خیال تھا کہ اب جب کانگریس کی آزاد حکومت قائم ہو گئی تو پھر اسی بنیاد پر زبان کا سوال طے ہو جائے گا، مگر معلوم ہوا کہ ملک کی آزادی پا کر بعض نا سمجھ اس بنے ہوئے کام کو بھی بگاڑنے میں لگے ہیں، ۹ جولائی کو بہار کے موجودہ وزیر تعلیم سے ملنا ہوا جو خود بھی ہمارے ساتھ اس ہندوستانی کمیٹی کے ممبر اور اس کام میں شریک تھے، تو معلوم ہوا کہ سارا معاملہ ابھی تک جیوں کا تیوں ہے، اور ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا ہے، کیا عجب ہے کہ وہ بہار ہی اس اردو ہندی کے سوال کو حل کرے جہاں پہلی دفعہ یہ جھگڑا انگریزوں نے کھڑا کیا تھا

مجھے گذشتہ جولائی کے بیچ میں بہار کے سینہ تعلیمات کے بلاوے پر رانچی جانا پڑا، بھوپال سے لکھنؤ، پھر اعظم گڑھ، پھر پٹنہ اور پٹنہ سے رانچی تک راہ میں ہر جگہ مسافروں سے ملتے، اپنے ہمسفروں سے باتیں کرتے، ٹکٹ لیتے، ٹکٹ دیتے، ہوا کھانے میں ایک ہی بولی سنائی دی اور وہی لوگوں کو بولتے سنا، مجھے حیرت تھی اور اب بھی ہے کہ اس کا نام ہندوستانی کے سوا اور کیا نہیں ہو سکتا، پھر کیا یہی بولی دفتروں عدالتوں کونسلوں، اور یونیورسٹیوں میں بھی نہیں بولی جا سکتی ؟

جولائی کے پرچہ میں ہندو کلچر کی بات میرے قلم سے نکلی تھی، وہ اخباروں میں چھپی، اور اس پر کچھ سوال جواب بھی ہوئے مگر ابھی تازہ سفروں میں میرے سامنے بعض ایسے منظر گذرے کہ جن سے میری بات کی سچائی کھلی کھلی معلوم ہونے لگی، ابھی تین مہینے ہوئے مجھے الٰہ آباد جانا ہوا، بعض ہندو دوستوں نے اپنے ہاں شام کو چائے پر بلایا، ہندو مسلمان عیسائی اور سکھ سب ہی تھے، کرسیوں پر نشست تھی، میزوں پر کھانے کی چیزیں، چائے کی پیالیاں اور شربت کے گلاس تھے، سب مل کر ایک ساتھ کھا رہے تھے، غور سے دیکھا تو کھانے کی چیزوں میں کھانے کے سامان اور برتنوں میں ہندو مسلمان کا کوئی فرق محسوس نہیں ہوا، اتنے میں مغرب کا وقت آگیا، میزبان نے ایک کمرہ بتایا، اس میں کھدر کی صاف سپید چادر بچھی تھی، ہم نے اس پر مغرب کی نماز پڑھی، ہندو نوکر چاکر جو ادھر سے گذرتے ہم کو نماز پڑھتے دیکھ کر ادب سے پیچھے ہٹ جاتے، یہ دیکھ کر میں تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا کہ میں اس وقت کسی مسلمان کے گھر میں ہوں یا ہندو کے،

رانچی سے چل کر گومو اسٹیشن پر دہرہ ایکسپریس پر بیٹھا، اس ڈبے میں دو تین مدراسی ہندو اور ایک مدراسی رومن کیتھولک پادری اور ایک دو بہار یا یوپی کے ہندو تھے، عجیب تماشا تھا کہ ان مدراسی ہندوؤں سے، لباس میں بول چال میں سر کے بالوں میں ادھر کے ہندوؤں کی کوئی مناسبت نہ تھی، ہم میں آپس میں بات چیت ہو رہی تھی، مگر شاید انھوں نے ہماری، اور نہ ہم نے اُن کی طرف توجہ کی، کیونکہ وہ نہ ہماری، اور نہ ہم اُن کی سمجھ سکتے تھے، اُن کو دیکھ کر نظر آیا کہ صوبہ صوبہ کی تہذیب اور کلچر تو الگ الگ ہے، مگر مذہبی عبادات و رسوم، یا بعض اور بھی چیزیں، جیسے ہندو لٹیا اور مسلمانی لوٹے کا فرق تو تھا، مگر جتنا اودھ کے ایک ہندو کو اودھ کے ایک مسلمان سے قربت ہوتی ہے وہ ایک ہندو کو مدراس یا بنگال کے ہندو سے نہیں، اب جب چاہیں اس کو آزما کر دیکھ لیں،

لکھنؤ میں جو ٹھہرا یا رمضان کا دن تھا، ایک صاحب آئے ادھیڑ عمر، تن و توش والے، داڑھی مونچھ صاف، قمیص شیروانی ڈھیلا پاجامہ، سر پر وہی شیروانی کے کپڑے کی کشتی نما ٹوپی، شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے، چہرہ پر تھوڑی سی بدحواسی، ایک ہاتھ میں بڑے رومال میں دو تین کھانے کی پلیٹیں بندھی ہوئی جن میں سے پریشانی میں شوربہ کا دھبہ ہو کر شیروانی کے دامن پر ٹپک پڑا تھا، مجھے ذرا بھی شبہہ نہیں ہوا کہ یہ مسلمان نہیں ہیں، یہی سمجھا کہ مسلمان ہیں روزہ کا دن ہے کھانے کا سامان ساتھ ہے، بات چیت کسی چیز میں فرق محسوس نہیں ہوا، لکھنؤ کے قریب آکر نام سن کر یا کسی اور طریق سے معلوم ہوا کہ ہندو ہیں، اسی سفر میں راجہ جلت گڈھ (واللہ اعلم) کے خاندان کے ایک صاحب بھی ساتھ تھے، ملازم نے چاندی کا خاصدان لاکر ان کو دیا، انھوں نے خاصدان اٹھا کر کھولا، ڈبیا اور الائچی سب کے سامنے پیش کی، مدراسیوں کے سوا کہ انھوں نے قبول ہی نہیں کیا، کسی نے لیا اور کسی نے نہیں لیا، اور جس نے نہیں لیا اس نے ایک طرح تواضع کر کے ان کا شکریہ ادا کیا، اب میں سوچ میں پڑ گیا کہ وہ ہندو کلچر کون سا ہے جس کی ڈھنڈوری مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں تو چاہئے کہ پہلے ہندوؤں ہی کو اپنے فرضی ہندو کلچر کی دعوت دیں،

مقالات

ہندوستانی کی اصلیت اور اس کے کچھ اصول

اب سے دس بارہ سال پہلے حکومت بہار نے ہندوستانی زبان کے سلسلہ میں ایک کمیٹی بنائی تھی، جس میں گاندھی جی کی خواہش کے مطابق عبدالحق راجندر پیکیٹ ہوا تھا، اس کے ایک ممبر حضرت الاستاذ مدظلہ بھی تھے، موصوف نے اس سلسلہ میں عرصہ ہوا ہندوستانی زبان کی اصلیت اور اس کے اصول پر ایک مختصر بنیادی یادداشت تحریر فرمائی تھی، گو اب صوبائی حکومتوں نے ہندی کو سرکاری زبان قرار دے دیا ہے، لیکن کانگریس ابھی تک ہندوستانی ہی کو ملک کی زبان مانتی ہے، اور دستور ساز اسمبلی میں بھی اس کے متعلق آخری فیصلہ نہیں ہوا ہے، اور مرکزی حکومت کو اس مسئلہ پر غور کرنے کا موقع ہے، اس لئے ہم اس یادداشت کو شائع کرتے ہیں، اگر کانگریس اور مرکزی حکومت درحقیقت ہندوستانی کو ملک کی زبان بنانا چاہتی ہے، تو اس یادداشت سے اس مسئلہ کے حل میں مدد مل سکتی ہے، کاش ہمارے صوبہ کی حکومت کو بھی اس پر غور کرنے کی توفیق ہو۔

"م"

آج سے سات آٹھ برس پہلے پٹنہ میں گاندھی جی کے کہنے سے جو عبدالحق راجندر پیکیٹ ہوا تھا، اس میں ہندوستانی کی تعریف یہ کی گئی تھی،

"یہ وہ بولی ہے جس کو اتری ہندوستان میں ہندو مسلمان دونوں عام طور سے بولتے اور سمجھتے ہیں جس میں عربی، فارسی اور سنسکرت اور ہندی کے بڑے بڑے [illegible]

ہندی دونون حرفون مین کر سکتے ہین،

مین اب بھی ہندستانی کی تعریف یہی کرتا ہون اور اسی کو ہندستانی سمجھتا ہون، جہان تک شہرون کا لگاؤ ہے اور لکھے پڑھے لوگون کی بات چیت ہے، بہت حد تک ہندوؤن اور مسلمانون کی زبان ایک ہی سی ہے، البتہ گاؤن مین گاؤن کی حالت؛ دوری اور تعلیم عام نہ ہونے کے سبب سے زبان کی یہ یکسانی نہین ہے، اسکے لئے دیہاتی بولی بھی جگہ جگہ بدلی ہوئی ہے، ایک اسی صوبہ یوپی کو لے لیجئے تو پتہ چلے گا، کہ انبالہ کے پاس کی بولی سہارنپور سے اور سہارنپور کی دلی کے آس پاس سے اور روہیلکھنڈ کی اس سے اور اودھ کی روہیلکھنڈ سے، اور الہ آباد کی بلیا غازیپور اور گورکھپور سے اور پھر بہار پہنچ کر آرہ، پٹنہ اور ترہت کی بولیون مین لفظون کے کھنچاؤ، لہجہ کے اتار چڑھاؤ اور خاص خاص مقامی لفظون اور چیزون کے نامون مین بہت کچھ فرق ہے، لیکن یہ فرق کچھ ہندوستان ہی مین نہین، دوسرے ملکون کی زبانون مین بھی ہے، مگر تعلیم اور ادب کی زبان ہر جگہ شہرون مین پھیلی ہوئی زبان ہے، نہ کہ دیہاتون کی بولیان جو ایک دوسرے سے کافی فرق رکھتی ہین،

جس بولی کو ہم آج ہندستانی کا نام دیتے ہین، وہ ہندی کی مختلف شکلون مین سے وہ شکل ہے جو کبھی دلی کے آس پاس بولی جاتی تھی، اور جو راجدھانی کی زبان ہونے کے سبب سے سارے دیس کی بول چال کی زبان ہو گئی، اور جس مین مسلمانون کے میل جول سے کچھ عربی اور فارسی کے لفظ اُن کے مذہبی اور تمدنی ضرورتون کی چیزون کے نام جن کا بدل ہندی مین نہین مل سکتا تھا، رُل مل گئے ہین، جس طرح اس مین ہندوؤن کے رسوم اور دھرم اور شاستر کی چیزین بھی پائی جاتی ہین، اور ہندی اور سنسکرت کے شبد بھی اس کے خزانہ مین موجود ہین، یہ ملی جُلی زبان ایک زمانہ سے جس پر صدیان گذر چکین، پورے ملک مین بولی اور سمجھی اور پڑھی، اور پڑھائی جاتی ہے، ضرورت اس کی ہے کہ اس کو صاف کرکے اور نکھار کر ہم اور بھی اس کو اپنی آنے والی ملکی اور قومی ضرورتون کے مطابق بنالین، اور اس کو عربی اور فارسی اور ہندی اور سنسکرت بنانے کی جگہ خالص ہندوستانی روپ مین پیش کرین تاکہ ہندوستان کی ہر قوم اس کو اپنا سکے،

ہمارا یہ کام اس سے اوپر دس سال ہوگیا ہے کہ ہم نے ہماری ہندوستانی کمیٹی میں اس کو بہت کچھ سوچ سمجھ لیا ہے، اور اس کام کے بہت سے کٹھن راستوں کو طے کر لیا ہے، اور ہر علم اور فن کی اصطلاحوں کا بڑا ذخیرہ اکٹھا کر لیا ہے، اور اب یہ ساری چیزیں ہمارے سامنے ہیں، اس کام کے کرنے میں یہ اصول اور قاعدے ہمارے سامنے رہے ہیں،

۱- ہندی اور سنسکرت کے وہ سب لفظ جو اردو بول چال میں آگئے ہیں، وہ ہندوستانی کے لفظ ہیں،

۲- اسی طرح عربی اور فارسی کے وہ سارے لفظ جو ہندی لٹریچر میں آگئے ہیں، وہ بھی ہماری ہندوستانی کے لفظ ہیں،

۳- اس ہندوستانی میں ہندی اور سنسکرت اور عربی اور فارسی، یا انگریزی و پرتگالی کے لفظ جس شکل اور لہجہ میں بولے اور لکھے جاتے ہیں، وہی ہندوستانی کے صحیح لفظ ہیں، خواہ وہ اصل زبانوں کے قواعد اور گرامر کے لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہوں، ہم نیچے مثال کے لئے کچھ لفظ دیتے ہیں،

برکھا ہندی میں ورش، برسات برکھا رت ہے، گن، گنترا ہے، برہمن، برہمنڑ ہے، لیکن اب ہندوستانی میں ورش، برکھارت، گنترا، اور برہمنڑ بولنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے، بلکہ برکھا، برسات، گن، اور برہمن ہی بولنا چاہئے،

ہم ہندوستانی میں مشکور، محاذ، اثرات، طرح، رقم، جنس، دولت، مویشی، محافظ، آمیز، غریب بولتے ہیں، حالانکہ عربی گرامر اور لغت سے یہ سب یا غلط ہیں یا عربی میں اُن کے دوسرے ہی معنی ہیں، یہ لفظ عربی کے ضرور ہیں، مگر اُن کی یہ شکل یا اُن کے یہ معنی عربی میں نہیں، بلکہ یہ خالص ہندوستانی ہیں لیکن اب یہ ہمارے ہندوستانی کے صحیح لفظ ہیں، اور اُن کے معنی بھی ہندوستانی میں صحیح ہیں،

دیہات، دستہ جات، رہائش، مالگذاری، سرکار، فارسی لفظ یا ہندی لفظ کی فارسی شکلیں ہیں، مگر ان شکلوں اور ان معنوں میں خالص ہندوستانی ہیں، ایران کے لوگ اُن کو سمجھ بھی نہیں سکتے،

اسی طرح ریل، لالٹین، تھرما میٹر، پاؤڈر وغیرہ یورپ کی زبانوں سے آئے ہیں، مگر اُن کے معنی آ
ان کی یہ شکل خالص ہندوستانی ہے، اب ہم ریل گاڑی چھوڑ نہیں سکتے، اور نہ اب لالٹین کی جگہ لینٹرن اور نہ لیمپ
کی جگہ تھرما میٹر کو اس نام سے پاؤڈر کو پوں بولیں گے،

اس کا حاصل یہ ہوا کہ ہندوستانی ایک مستقل زبان ہے، یہ ہندی یا سنسکرت، یا عربی یا فارسی یا
انگریزی کی بگڑی ہوئی شکل نہیں ہے، دوسری زبان کا جو لفظ بھی اس میں آئے گا، اُس کی وہی شکل
ہندوستانی ہوگی، جس کو ہم ہندوستانی والے جانتے پہچانتے ہیں، ہر زبان کا یہی قاعدہ ہے، اور یہی فطرت
کا اصول ہے،

۴۔ اس ہندوستانی زبان کو جن قوموں نے اپنایا ہے، وہ قومیں مذہب اور تمدن، اور کلچر کے لحاظ
سے الگ الگ ہیں، اس لئے ان کے مذہبی تمدنی اور رہنے سہنے کھانے پینے، اوڑھنے بچھانے کے بہت سے
سامان ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں، اس لئے ہر قوم کو حق ہے، کہ وہ اپنے لئے ان لفظوں کو قائم رکھے،
جیسے مسلمانوں کے لئے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جنازہ، تلاوت، رکوع، سجدہ، قیام، تشہد، لحاف، رضائی،
توشک، عمامہ، صدری، پلاؤ، قورمہ، کباب، وغیرہ سیکڑوں لفظ ہیں، اسی طرح ہندو دھرم کے
لفظ سندھیا، پوجا، مندر، آرتی، آواگون، بیکنٹھ، جاترا، وغیرہ سیکڑوں لفظ ہیں، اسی طرح عیسائیوں
کے لئے گرجا، پادری، بپتسمہ وغیرہ اُن کے جو لفظ ہیں وہ جوں کے توں رہیں گے،

۵۔ ہندوستانی لفظوں کی جانچ پڑتال کی کسوٹی بازار کا چلن اور اس وقت کی بول چال کی صورت ہوگی
نہ کہ شبد ساگر اور قاموس کے صفحوں سے اُن کی درستی کی جائیگی،

۶۔ اصطلاحوں کے بنانے میں یہ قاعدہ بنایا گیا ہے، کہ جہاں تک ہو سکے ہندوستانی لفظوں سے
اصطلاحیں بنائی جائیں، اگر نہ بن سکے تو دوسری زبانوں سے خواہ وہ کوئی ہو، ایسا آسان لفظ لیا جائے
جو ہندوستانی میں چل سکے، اور اگر ایسا نہ مل سکے، تو پھر اردو والے کوئی اپنی پسند کا اور ہندی والے

اپنی پسند کا لیتا رہین، ہندی مین ہندی اصطلاح لکھکر دو لکیرون کے بیچ مین اردو اصطلاح، اور اردو مین اردو اصطلاح لکھکر دو لکیرون کے بیچ مین ہندی اصطلاح لکھی جائے،

۶- اس وقت ہماری بول چال مین جتنے ایسے لفظ ہین جو چلن مین ہین، اور بول چال مین آتے ہین، اور جن کو عام طور سے بولا اور سمجھا جاتا ہے، خواہ وہ کسی زبان کے ہون وہ سب ہندستانی ہین،

۷- اس بات کی کوشش کی جائے کہ ایسے لفظون مین بولا چالا جائے اور لکھا پڑھا جائے جن کو زیادہ سے زیادہ آدمی سمجھ سکین، ہندو بولتے اور لکھتے وقت یہ دھیان رکھین کہ اُن کی بولی ایسی ہو جس کو مسلمان بھی سمجھیں، اور مسلمان بولتے اور لکھتے وقت یہ خیال مین رکھین کہ ان کی بولی کو ہندو بھی سمجھ سکین،

۸- ہندی، سنسکرت، فارسی، اور عربی کے جو لفظ جن معنون مین ہندستانی مین بولے اور سمجھے جاتے ہین، وہ ان ہی معنون مین باقی رکھے جائین، جیسے "سمان" کا ہندی لفظ، ہندستانی مین ایک خاص معنی رکھتا ہے، جیسے "اُس وقت کا عجیب سمان ہے" اسی طرح "عالم" کا عربی لفظ ہے، جس کے ہندستانی مین کبھی خاص معنی ہوتے ہین، جو عربی مین نہین، جیسے "اُس وقت عجیب عالم تھا" یا "یہ آپ کا عالم کیا ہے" یہ دونون لفظ گو ہندی اور عربی محاورہ کے لحاظ سے غلط ہین لیکن ہندستانی مین صحیح ہین،

۹- کسی عربی یا فارسی لفظ کو اس لئے نکالا نہ جائے کہ وہ عربی یا فارسی ہے، بلکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے، یا نہین، جیسے معاملہ مقدمہ اور کچہری کے جو لفظ ایک زمانہ سے چل رہے، دیہاتی تک اُن کو سمجھتے ہین اُن کے نکالنے کی اس لئے کوشش کرنا کہ وہ بدیسی ہین، زبان کی ترقی کی چال کو سیکڑون برس پیچھے ڈھکیل دینا ہے، ایسے ہی ہندی اور سنسکرت کے لفظ اگر بول چال مین ہین، تو ہم کو انھین نکالنا نہین چاہئے، جیسے پریم، شانتی، درشن، بھگت، تیرتھ، جاترا،

غرض ہندستانی کو ایک خود مختار زبان مان کر ہم کو اس کا کام شروع کرنا چاہئے، اور

جہاں تک یہ زبان اپنے لفظوں اور محاوروں کے ساتھ ہندوستان میں بڑھ اور پھیل چکی ہے، اوس سے اس کو گرانے کی جگہ اوس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے، اور ہمارے بزرگوں نے صدیوں کی محنت میں اپنے میل جول کی جو یادگار چھوڑی ہے، اُس کے مٹانے کے درپے نہ ہونا چاہئے،

ہندوستانی زبان کے نمونہ کے لئے اردو والوں کے سامنے جو کتابیں رکھی جا سکتی ہیں، اُن میں شاہ عبدالقادر صاحب کا قرآن پاک کا ترجمہ، میرامن کی باغ و بہار، انشاء اللہ خان کی رانی کیتکی کی کہانی، میر حسن کی مثنوی سحر البیان، پنڈت دیاشنکر نسیم کی گل بکاولی، حالی کی بہت سی نظمیں؛ اسی طرح ہندی میں ایسی آسان بولی میں لکھی ہوئی کتابوں کے نام ہندی والے بتا سکتے ہیں، مناسب ہوگا، اگر ہم ہندوستانی کے نمونہ کے طور پر اس قسم کے لٹریچر کو اردو اور ہندی سے لیکر دونوں حرفوں میں چھاپیں اور لوگوں میں پھیلائیں،

نوائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کے کلام سے صاحب ذوق طبقہ پوری طرح واقف ہے، اُن کی پرجوش مذہبی، ملی، قومی، سیاسی اور مختلف النوع دلکش و دلپذیر نظموں اور پُرکیف غزلوں کا مجموعہ نوائے حیات کے نام سے چھپ گیا ہے، دیوان کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے مبصرانہ مقدمہ ہے، ضخامت :- ۱۷۵ صفحے، قیمت :- عللہ مجلد،

ملنے کا پتہ :- دارالمصنفین اعظم گڈھ،

رقعاتِ عالمگیر

اورنگزیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے بہادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور اُن سے علم و ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیوں حقایق کا انکشاف ہوتا ہے،

قیمت :- ؎ ، ضخامت ۲۰۰ صفحے،

"منیجر"

تصوف و سلوک کی تجدیدات

از

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

کتاب جامع المجددین کے سلسلہ کے اب تک جو مضامین (قومیات[۱] وسیاسیات، تجدید[۲] تبلیغ اور تجدید[۳] تعلیم) معارف اور الفرقان کے ذریعہ سے پیش کئے جاچکے، اُن کا تعلق زیادہ تر قومی و جماعتی مسائل کی تجدیدات واصلاحات سے تھا لیکن تصوف وسلوک کا تعلق براہِ راست نفسِ دین اور افراد دین کے کمال وتکمیل سے ہے، یعنی تصوف جیسا کہ آگے مفصلاً معلوم ہوگا نام ہے دین کے درجۂ کمال اور افراد دین کی تکمیل یا اس درجۂ کمال کی راہ میں سعی وطلب کا، اس لئے قدرۃً اس کے مباحث زیادہ نازک اور بہت کچھ شخصی وانفرادی ذوق وحال اور تجربہ و تحقیق سے متعلق ہیں،

حضرت سید صاحب (مولانا سید سلیمان ندوی) دامت فیوضہم نے اپنی بے شمار مصروفیتوں کے باوجود بڑا ہی احسان فرمایا، کہ راقم عاجز کی درخواست پر اس مضمون کو نہایت توجہ کے ساتھ حرفاً حرفاً بنظر اصلاح ملاحظہ فرمالیا، اور جابجا اپنے افاداتِ اصلاحیہ میں درج فرمادیا ہے، احسن اللہ جزاھم۔ دیگر حضرات خصوصاً حضرت علیہ الرحمۃ کے اکابر نسبت وعقیدت سے بھی التجا ہے، کہ راقم بدحال کی قالی غلطیوں اور کوتاہیوں پر تنبیہ فرماکر ممنون فرمائیں؟ عنداللہ ماجور ہوں گے خود میں ان اکابر پر حق ہے، کہ حضرت کی ترجمانی میں نابہ امکان

سہو وخطا کو سامنے پانے دیں،

حضرات علماء وصوفیہ اور قدیم وجدید مذاق کے اہل علم وذوق انشاء اللہ سب اس حصہ کے مباحث میں حتی الوسع پرانی طرح طرح کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کے ازالہ اور اصلاح کے ساتھ ساتھ بہت سے دلچسپ معلومات وتحقیقات کو بھی پائیں گے، اس لئے اسی ایک حصہ کو اور بھی خصوصیت کے ساتھ کتاب سے پہلے معارف کے ذریعہ اہلِ معارف کی خدمت میں پیش کر دینے کا جی چاہا،

باقی الحمد للہ کہ اصل کتاب نظر ثانی اور تبییض وغیرہ کے اپنے اختیاری مراحل سے گذر کر مکمل ہو چکی ہے، لیکن اس زمانہ میں تالیف وتصنیف کے مراحل سے بہت زیادہ سخت طباعت واشاعت کا ہفت خوان ہے، حد یہ کہ لکھنؤ میں قریبًا سال کا سال ہو گیا کہ اس مدت میں لکھنے اور مسودہ صاف کرانے کا کاغذ بمشکل ایک دستہ دستیاب ہوا، پہلے کا کچھ ذخیرہ تھا جس پر لکھنے کا کام چلتا رہا، اور ایک محترم کرمفرما نے اپنے خاص اندوختہ سے کچھ عطا فرمایا تب مسودہ صاف ہو سکا، اب تحریر وتبییض کے اختتام کے ساتھ ہی ان دونوں ذخیروں کا آخری ورق بھی ختم ہے،! والسّلام

"عبدالباری"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصوف کی حقیقت | بظاہر کتنی عجیب بات ہے کہ تصوف ایک طرف تو کمالِ دین یا درجۂ احسان ہے جو اسلام وایمان کا بلند ترین مقام ہے، اور حضرات صوفیہ یا اولیاء اللہ کی نسبت تصوّر یہ ہے کہ ان کو حق تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب وقربیت حضور ومعیت کا جو مقام حاصل ہوتا ہے وہ خالی علوم ظاہر کے ماہرین بڑے بڑے فقہاء ومحدثین کو بھی نہیں ہوتا، اُن کو اپنی زندگی کے سارے اعمال وافعال حتیٰ

وسکنات میں ایک ایسی نسبت میسر ہوتی ہے کہ گویا وہ ہر وقت اللہ کے مشاہدہ وحضوری میں ہیں، اور کسی نہ کسی نوع کے مکالمہ ومناجات سے بھی مشرف ہیں، اس طرح صوفیہ سے بلند درجہ صرف انبیاء علیہم السلام کا ہے، یہ اولیاء اللہ یا بزرگانِ دین کے بارے میں عوام ہی کا عقیدہ نہیں، بلکہ خواص ومحققین کے ہاں بھی کسی نہ کسی صورت میں مسلم ہے،

لیکن دوسری طرف تصوف کے متعلق اور تصوف کی راہ سے جتنی غلطیاں، غلط فہمیاں، بلکہ طرح طرح کی گمراہیاں امت میں پھیلی ہیں، فرق اسلامیہ اور علوم اسلامیہ میں شاید ہی کسی فرقہ یا علم وفن کی راہ سے یا اس کے متعلق پھیلی ہوں، بدعات وخرافات، اباحت والحاد، کفر وشرک تک کی کوئی شکل مشکل ہی سے بچی ہوگی، جس کو کوئی نہ کوئی داخل تصوف بلکہ عین تصوف نہ جانتا ہو، اسی بنا پر بہت سے اکابر اسلام تصوف کے سرے سے منکر ہوگئے، یا اسکو سراپا ضلالت قرار دیدیا،

بات یہ ہے کہ کسی شے کے کمال کا تعلق ہمیشہ اس کے ظاہر سے زیادہ باطن، کم سے زیادہ کیف، قشر سے زیادہ مغز یا جسم سے زیادہ جان اور صورت سے زیادہ معنی سے ہوتا ہے، ساتھ ہی جس شے میں جتنا زیادہ کیف و بطون ہوتا ہے، اتنا ہی اس کی نسبت غلطیاں اور گمراہیاں زیادہ راہ پا جاتی ہیں، پھر ظاہر ہے کہ جس غلطی و گمراہی کو دین ہی نہیں کمال دین سمجھ لیا جائے، اس کی جڑ کتنی گہری ہوگی، اور اس کا استیصال کتنا دشوار ہوگا، یہی وجہ ہے کہ تصوف کی راہ سے شرک والحاد تک کی جو گمراہیاں مسلمانوں میں جڑ پکڑ گئیں، اُن کو چونکہ عین دین یقین کیا جانے لگا، اس لئے ان کا ازالہ آسان نہیں ہوتا،

عوام اور بہت سے خواص سب کے سب کیسے کیسے مغالطے میں ہیں، کہ کوئی کشف وکرامات اور تصرفات کو تصوف جانتا ہے، کوئی اشغال ومراقبات اور احوال وکیفیات کو تصوف یقین کرتا ہے، کوئی خاص خاص رسوم و عادات کو تصوف سمجھتا ہے، کسی کے نزدیک تصوف نام ہے ریاضیات و مجاہدات اور ترک تعلقات کا، کوئی فلسفی یا فلسفی مزاج تصوف سے مراد وحدۃ الوجود ووحدۃ الشہود کے نظریات لیتا ہے، اور کوئی اس کو امرار

دینیات کا مجموعہ قرار دیتا ہے حتیٰ کہ اہلِ مغرب نے اس کا نام ہی سنٹرنیٹ (مسٹزم) رکھدیا، خود مسلمانوں میں بھی بعضوں نے اس کو ایک سینہ بسینہ ہتریا راز ہی بنا رکھا ہے، اور سب گمراہیوں سے بڑی گمراہی میں مبتلا وہ ہیں جنہوں نے تصوف اور طریقت، حقیقت و معرفت کو شریعت کا مقابل یا اس کی ضد گمان کرلیا ہے،

اس طرح کی تمام گوناگون اغلاط کو ایک ایک کرکے دور فرمایا گیا ہے، لیکن یہ تجدید تصوّف کا صرف سلبی پہلو تھا، اصل تجدیدی کارنامہ اس باب میں طریقت کے اس ایجابی پہلو کو واضح فرمانا ہے کہ وہ شریعت ہی کا دوسرا رُخ بلکہ عین شریعت ہے، پھر اس رُخ کو صرف نظری حیثیت سے پیش نہیں فرمایا گیا ہے بلکہ عملی طور سے اس کی تعلیم و تربیت کا غایت تحقیق و اجتہاد کی شان سے از سرِ نو احیا فرمایا گیا ہے،

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح "انسانِ کامل" کے دو رُخ ہیں، ظاہر و باطن یا قلب و قالب، اسی طرح "دینِ کامل" کے بھی دو رُخ ہیں، شریعت و طریقت، اور جس طرح شریعت نام ہے ظاہر یا قالب کے اعمال و احکام کا، اسی طرح طریقت یا تصوف نام ہے باطن یا قلب کے اعمال و احکام کا، دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ تصوف نام ہے، باطن کی فقہ کا، جس طرح نماز روزہ وغیرہ کے ارکان و اعمال کی ایک ظاہری صورت ہے، جس کے احکام فقہ میں بیان ہوتے ہیں، اسی طرح خشوع و خضوع، حضورِ قلب یا دل سے حق تعالیٰ کی یاد و ذکر (اقم الصلوٰۃ لذکری) قلب و باطن کے اعمال ہیں، جس طرح ترک اکل و شرب روزہ کا ظاہر ہے، اسی طرح اس کا باطن تقویٰ (لعلکم تتقون) ہے، پھر جس طرح مختلف اعمالِ شرعیہ اپنی اپنی قالبی صورت رکھتے ہیں، اسی طرح ان سب کی صحت و سقم، قبول و عدمِ قبول کا مدار قلبی نیتوں (الاعمال بالنیات) اور درجاتِ اخلاص پر ہے، سب سے بڑھ کر ایمان اور عقائد جن پر نجات اور ظاہر و جوارح کے سارے اعمال کی صحت و قبولیت کا مدار ہے، اور جن کے بغیر نہ نماز نماز ہے نہ روزہ روزہ، وہ بالکلیہ یقین و اذعان کے قلبی و باطنی فعل ہی کا نام ہیں،

سارے عقائد و ایمانیات کی جڑ توحید الٰہی یا لا الٰہ الا اللہ ہے، یعنی الوہیت و معبودیت میں یا حق و فرد

کی یعنی فعل و اثر کی ساری مخلوقات یا غیر اللہ سے نفی اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا اثبات، ظاہر ہے کہ الٰہ و معبود وہی ہوتا یا بنایا جاتا ہے، پوجا اور پرستش اسی کی ہوتی اور کیجاتی ہے جس کے ہاتھ میں ہم اپنا نفع و ضرر[1] دیکھتے اور یقین کرتے ہیں، غرض لا الٰہ الا اللہ پر ایمان و یقین کے معنی ہی یہ ہیں، کہ ہم کو موت و زندگی، بیماری و تندرستی، ناداری و تونگری، ذلت و عزت وغیرہ کی ظاہری راہوں اور اسباب سے جو جو کچھ بھی نفع و ضرر پہنچتا ہے، سب کا فاعل حقیقی، اللہ تعالیٰ ہی کو جاننا اور ماننا، اور کسی فعل و اثر کا خالق غیر اللہ کو نہ سمجھنا ہمارا مسلمہ عقیدہ ہے، یہ جاننا اور ماننا قلب باطن کے فعل کے سوا کیا ہے؟ لیکن علوم و احکام ظاہر کے عالم کتنے ہیں جو نفع و ضرر یا فعل و اثر کا ان ہی اسباب غیر اللہ کی طرف یقین و مشاہدہ نہیں کرتے رہتے، کیا اس یقین و مشاہدہ کی تغلیط اور اس کو مضمحل و فنا کرکے ہر فعل و اثر میں اللہ تعالیٰ ہی کو بالذات فاعل و موثر مشاہدہ کرنے لگنا، جس کو حدیث میں عبادت و بندگی کے مقام احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اور جس کو اصطلاح صوفیہ میں توحید افعال سے موسوم کیا گیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کے تعلق کو اس طرح قائم کرنا کہ ساری زندگی اور اس کے سارے افعال و اعمال میں اسی کے مشاہدہ و رویت حضور و معیت کا علم و اذعان حاصل ہو، کیا یہ عین دین اور کمال دین کے سوا کچھ اور ہے، بلکہ کیا یہ قلبی و باطنی علم و اذعان یقین و ایمان سارے ظاہری عبادات و معاملات کی روح و جان نہیں، اور کیا اس روح و جان یا ایمان و عقیدہ کی صحت و حفاظت سارے اعمال و افعال جوارح سے بڑھ کر فرض و واجب نہیں،

تصوف نام ہے فقہ باطن کا

غرض تصوف یا علم باطن کی حقیقت، جس کو خدا جانے لوگوں نے کیا کیا، دور از کار ضال و مضل معنی پہنا رکھے ہیں، صرف یہ ہے کہ وہ ظاہر جسم یا جوارح کے اعمال و احکام اوامر و نواہی اور صلاح و فساد کی فقہ کے بجائے نام ہے قلب و باطن کے اوامر و نواہی اور اس کے صلاح و فساد کی فقہ کا، جس کے احکام کتاب و سنت دونوں میں اسی طرح منصوص ہیں، جس طرح فقہ ظاہر کے، اور جس کی

---

[1] کما قال اللہ تعالیٰ افتعبدون من دون اللہ ما لا ینفعکم شیئا ولا یضرکم اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ

اہمیت واقدمیت قرآن و حدیث ہی کے اشارات وتصریحات سے ثابت ہے، کما قال اللہ تعالیٰ یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم" اور حدیث میں اسی کی شرح وتفسیر یوں فرمائی گئی ہے کہ خوب سمجھ لو کہ بدن کے اندر ایک لوتھڑا ہے اگر وہ سنورا اور بنا تو سارا بدن بن سنور جاتا ہے، اور اگر وہ بگڑا تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے، اور خوب سمجھ لو کہ وہ قلب ہے[1] یعنی ظاہر جسم کے اعمال وافعال کا بناؤ بگاڑ تمام تر اسی باطن قلب کے بناؤ بگاڑ پر موقوف ہے، اور تصوف یا فقہ باطن کا موضوع بحث اسی قلب کا بناؤ وسنوار اسی کی سلامتی وصحت کی حفاظت، اور اسی کے بگاڑ یا فساد و بیماری کا علاج ہے،

تصوف وطریقت کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اس کا دین وشریعت کے منافی و مغائر ہونا تو الگ رہا، بغیر صوفی ہوئے مسلمان مسلمان ہی کب ہو سکتا ہے، باقی اگر کسی خشک دماغ کو صوفی تصوف کے نام واصطلاح یا اس کے علٰحدہ و مستقل علم و فن ہونے سے بھڑک ہے، تو پھر اس کو تفسیر و مفسر، تجوید و مجود، حدیث و محدث، فقہ و فقیہ، کلام و متکلم، وغیرہ سب ہی جداگانہ دینی علوم و فنون اور ان کے عرفی واصطلاحی ناموں سے بھڑکنا چاہئے، اور اگر یہ نام قرآن و حدیث کے الفاظ و اشارات سے ماخوذ ہیں، تو راقم الحروف کے نزدیک صوفی کی اصل بھی صوف پوش کے بجائے اصحاب صفہ کیوں نہ ہو، اس پر بھی اگر نام ہی کھٹکتا ہے، تو علم تصوف کے بجائے اس کا نام علم احسان یا علم قرب رکھ لو، جیسا کہ خود بعض اکابر صوفیہ نے رکھا بھی ہے،

تصوف کی حقیقت کی یہ تجدید یا اس کی از سر نو تعلیم وتفہیم جیسی کچھ ضروری تھی، اس کے دیکھئے حضرت مجدد نے مستقل و غیر مستقل رسائل و تصنیفات مواعظ و ملفوظات میں بہ کثرت و جا بجا اجمال و تفصیل کے ساتھ مختلف عنوانات و تعبیرات سے سمجھایا اور واضح فرمایا ہے، حقیقت تصوف کے نام سے ایک مستقل

---

[1] الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب،

رسالہ کی تمہید میں ارشاد ہے :-

"شریعت کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے، وہ دو قسم کے ہیں، بعض کا تعلق ظاہر بدن یا ظاہری چیزوں سے ہے، جیسے کلمہ پڑھنا، نماز روزہ حج زکوٰۃ ماں باپ کی خدمت، ان کو مامورات کہتے ہیں، اور کلمات کفر کہنا، شرک کے افعال کرنا، زنا چوری سود خواری، رشوت وغیرہ ان کو مناہی کہتے ہیں، بعض اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے جیسے ایمان و تصدیق، وعقائد حقہ، صبر و شکر، و توکل و رضا، تفویض، اخلاص محبت خدا و رسول وغیرہ ان کو مامورات و فضائل کہتے ہیں، اور عقائد باطلہ بے صبری، ناشکری، ریا و تکبر، عجب وغیرہ یہ مناہی و رذائل ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے،

جس طرح قرآن شریف میں اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ موجود ہے، اسی طرح یاایھا الذین آمنوا اصبروا (اے ایماندارو صبر کرو) اور واشکروا للہ (اللہ کا شکر بجالاؤ) بھی موجود ہے، اگر ایک مقام پر کتب علیکم الصیام اور للہ علی الناس حج البیت پاؤ گے تو دوسرے مقام میں یحبھم و یحبونہ اور والذین آمنوا اشد حبا للہ بھی دیکھو گے، جہاں اذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ ہے اس کے ساتھ ہی یراؤن الناس بھی موجود ہے، اگر ایک مقام میں تارک نماز و تارک زکوٰۃ کی مذمت ہے، تو دوسرے مقام میں تکبر و عجب کی بھی برائی موجود ہے، اسی طرح احادیث کو دیکھو جس طرح ان میں ابواب نماز روزہ، بیع و شراء نکاح و طلاق پاؤ گے، ابواب ریا و سمعہ کبر وغیرہ بھی دیکھو گے،

اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے، کہ جس طرح اعمال ظاہرہ حکم خداوندی ہیں اسی طرح اعمال باطنہ بھی حکم الٰہی ہیں، کیا اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ امر کا صیغہ ہے اور اصبروا و اشکروا امر کا صیغہ نہیں کیا کتب علیکم الصیام سے روزہ کی فرضیت

اور مامور بہ ہونا ثابت ہے، اور وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ سے محبت کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں، بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال سب ہی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں اور باطن کی صفائی مقصود و موجب نجات اور اس کی کدورت موجب ہلاکت ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا، — بے شک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا، اور جس نے اوسکو میلا کیا ناکامیاب رہا،

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ، — جس دن مال و اولاد کام نہ آئیں گے مگر جو شخص اللہ کے پاس سلامت قلب لیکر آیا،

دیکھو پہلی آیت میں تزکیہ باطن کو موجب فلاح، اور دوسری میں سلامتی قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع تبلایا گیا،

ایمان و عقائد جن پر سارے اعمال کی مقبولیت منحصر ہے، قلب ہی کا فعل ہے اور ظاہر ہے کہ جتنے اعمال ہیں سب ایمان ہی کی تکمیل کے لئے ہیں پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دل کی اصلاح ہے، دل بمنزلہ بادشاہ کے ہے، اور اعضاء اس کے لشکر یا غلام ہیں، اگر بادشاہ درست ہو جائے تو توابع خود بخود اس کی مطابقت کرنے لگیں الا ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت، فسد الجسد کله الا وهی القلب کے معنی یہی ہیں کہ بدن کے اندر جو قلب ہے، اگر یہ بنا تو سب بنا، یہ بگڑا تو سب بگڑا، اور یہ امور دن رات آنکھوں کے سامنے ہیں، کہ جس چیز کا دھیان دل میں سما جاتا ہے، سارے اعضاء اس کی دھن میں لگ جاتے ہیں آنکھ اُس چیز کو دیکھنے، کان اس کو سننے، ہاتھ اس کو پکڑنے، اور پاؤں اس کی جانب چلنے کو چاہتا ہے، خواہ وہ شے بری ہو یا بھلی، مگر دل کا خیال ان اعضاء کو اس کے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، دنیادارون کو دیکھو کہ کس طرح دنیا کے کامون میں سر سے

یا ذن تک مشغول رہتے ہیں، کہ ان کے کان میں اذان کی آواز تک نہیں آتی، ایسا ہی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد اور دھن میں رہتے ہیں، ہر طرف سے اُن کو اللہ ہی کا خیال آتا ہے،

بس کہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی   ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

ایک بڑا مغالطہ | بڑے بڑے لوگوں کو یہ ہے کہ قلب و باطن کی جس صفائی و تزکیہ پر تصوف میں اس قدر زور ہے کہ گویا سارا تصوف یہی ہے، وہ چونکہ غیر مسلم اشراقیہ اور خصوصاً خود ہمارے ہندوستان کے جوگیوں میں کثرت اور بڑے بڑے خوارق کے ساتھ پایا جاتا ہے، اس لئے ان کو بھی بہتوں نے صوفی ہی سمجھ رکھا ہے۔ الصُّوفی لَا مَذْهَبَ لَهٗ کا مشرب و مقام کسی خاص شریعت و مذہب سے آشنا سیع اور بلند قرار دے دیا جاتا ہے کہ کفر و اسلام کی قید سے بھی آزاد ہو جاتا ہے، اس لئے تنبیہ فرمایا کہ

"تزکیہ و صفائی باطن اور تصوف کا اطلاق اس صفائی پر کیا جاتا ہے، جو شریعت کے احکام کی پابندی سے حاصل ہو، کیونکہ تزکیہ سے مراد وہ تزکیہ ہے، جو موجب فلاح ہے، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا، اور ظاہر ہے کہ فلاح منحصر ہے، اتباع شریعت پر، پس ہندو جوگی وغیرہ جو ریاضت کرتے ہیں، وہ سرے سے صفائی ہی نہیں، یا لغوی معنی کے اعتبار سے اس کو صفائی کہو تو ساتھ ہی غیر مقبول کہنا ہوگا، اس صورت میں صفائی کی دو قسمیں ہوں گی، ایک مقبول دوسری مردود۔[1]"

اس کی مثال کیسی عجیب دی ہے کہ

"آئینہ پر اگر گرد و غبار بیٹھا ہو تو ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کو پانی سے دھو کر صاف کر دیا جائے، دوسرا یہ کہ پیشاب سے دھو کر گرد و غبار دور کیا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ بادشاہی دربار میں

---

[1] کسی نے حضرت کے اسی قسم کے ملفوظات کی تعبیر اس شعر میں کی ہے،

نکلے ابلیس ہزار تجلی مگر کہاں   یہ آگ ہے ضرور مگر طور کی نہیں "ش"

جس طرح پہلے آئینہ کو پیش کرنے سے انعام و خوشنودی کا استحقاق ہوگا، دوسرے کے پیش کرنے سے عتاب و خفگی ہوگی،

اسی طرح خلاف شریعت سے عقبیٰ میں کچھ فائدہ نصیب نہیں ہو سکتا، اور اصطلاح و عرف میں تصوف اس علم کا نام ہے، جس پر عمل کرنے سے باطن کی وہ صفائی نصیب ہوتی ہے جس سے انسان مقبول بارگاہ اور صاحب مدارج و مقام ہوتا ہے"

عشق و محبت | جو تصوف کی جان ہے، اور جس سے تصوف کا سارا دفتر بھرا پڑا ہے، اور جو قلب و باطن ہی کی ایک اعلیٰ صفت و کمال ہے، اس کی راہ بھی خود نص کتاب سے تمام تر اتباع سنت و شریعت پر ہے،

"محبت خدا و رسول جو منجملہ صفات حمیدہ قلبیہ اور اعلیٰ درجہ کی چیز ہے، اس کا تعلق بھی اتباع شریعت ہی سے ہے، بدون اتباع شریعت محبت کہاں (قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله) دیکھو اس آیت میں اتباع رسول ہی کو ذریعہ محبت بتایا گیا ہے،

یہ الصوفی لا مذھب لہ کا مقام بعض جاہل اور نام کے صوفیہ کے ہاں نام نہاد تزکیۂ قلب کے بعد اتنا اونچا ہو جاتا ہے، کہ نماز روزہ تک نیچے پڑ جاتا ہے، بلکہ سرے سے سارے احکام شریعت ہی مرتفع ہو جاتے ہیں، حالانکہ اسلام میں اور تصوف اسلام میں وہی صفات قلب معتبر و مقبول ہیں، جو نماز روزہ وغیرہ کے مشروع و مامور عبادات و احکام سے نصیب ہوتے ہیں، مثلاً

قد افلح المومنون الذین ھم فی صلوتھم خاشعون میں خشوع جو صفت قلب ہے اس کو اسی صورت میں وسیلۂ نجات و فلاح فرمایا گیا ہے، جو نماز کے اندر پایا جائے، پس اگر سرے سے نماز ہی نہ پڑھی جائے تو یہ نماز والا خشوع کس طرح میسر ہو سکتا ہے، اور فلاح کا اثر کس طرح مرتب ہو سکتا ہے، ایسے ہی زکوٰۃ، صدقہ، حج، روزہ وغیرہ اعمال صالحہ

سے جو اثر قلب پر پڑتا ہے، اور اس سے صفائی میسر ہوتی ہے، وہی مفید آخرت ہو،

"خلاصہ یہ کہ جب تک انسان احکام شرع کی پابندی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کرے نجاتِ جنت و رضائے مولیٰ کہ مقصود اصلی ہے، میسر نہیں آ سکتا، تو بلا پابندی شرع کے تصوف کہاں! جس طرح کرامت کی تعریف میں خرق عادات کے ساتھ یہ قید ہے کہ عبد صالح متبع شریعت سے صادر ہو، اسی طرح تصوف میں صفائی و تزکیۂ باطن کے ساتھ یہ قید ہے، کہ اتباع شریعت سے حاصل ہو، صحابہ رضی اللہ عنہم باتفاق امت سارے اولیا سے افضل ہیں، مگر اُن کا طریقہ بھی پابندی شریعت نماز روزہ حج زکوٰۃ، جہاد، تلاوت، امر بالمعروف نہی عن المنکر وغیرہ تھا، اسی سے ان کے قلوب ایسے متجلی و مصفی تھے، کہ اُن کے لئے خطاب رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کیا گیا" بہرکیف تصوف نام ہے صفائی باطن مع پابندی شرع کا

فلسفہ کے ایک ولایتی ڈاکٹر اور پروفیسر ہمارے دوست جو بڑے تصوف دوست بھی ہیں مگر ساتھ ہی تصوف کا وہی تصور رکھتے ہیں جو شریعت کا متبع و پابند بنانے کے بجائے سرے سے ہر مذہب کی قید و بند سے آزاد کر دیتا ہے، ان کو ایک دفعہ راقم نے حضرت کے مکتوبات پڑھنے کو دیئے، ہیں بڑے ذہین، کہنے لگے بھائی ملائیت و صوفیت کو خوب ہی ملایا ہے، اصطلاح میں کیا جھگڑا، پھر اپنی جگہ تصوف صوفی کو جس معنی و مراد کے لئے چاہے، اصطلاح بنا لے، البتہ اس کو تصوف اسلام کہنا، اور سمجھنا بڑی جسارت و جہالت ہے، تصوفِ اسلام تو بہرحال تمام اکابر و محققین صوفیائے کرام کے نزدیک وہی ہے جو شریعت کے ساتھ جمع ہی نہیں، بلکہ عین شریعت ہے،

تصوف کا عرف و اصطلاح | اب رہ گیا اس زمانہ کا عرف، اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ و اصول فقہ وغیرہ جدا جدا ممتاز نہ تھے، پیچھے حالات زمانہ کی تائید و تبلیغ کے لئے ایک ایک علم الگ کر کے اس کے قواعد مقرر کئے اسی طرح

علم تصوف کو بھی مشائخ کرام نے قرآن و حدیث سے نکال کر باطن کی صفائی کے بعض اذکار و اشغال و مراقبات خاص طریقہ سے تبلاتے ہیں، کہ ان پر عمل کرکے انسان کو تزکیۂ باطنی جلد نصیب ہو جاتا ہے،

جس طرح پچھلے زمانہ میں قرآن و حدیث سے استنباط کرکے بہت سے علوم نکالے گئے اور ہر ایک کا نام جداگانہ تجویز ہوا، اور اُن کے واضعین کو سب نے امام مانا حتی کہ امام شافعی ایسے لوگوں کو امام ابوحنیفہ کی شان اور تفقہ فی الدین دیکھ کر الناس فی الفقہ عیال ابی حنیفہ، کہنا پڑا امام بخاری حدیث میں ایسے امام مانے گئے، کہ آج تک ان کی محدثیت کا ڈنکا بج رہا ہے، اسی طرح تزکیۂ باطن کے تبلانے والے ایسے بزرگان دین گذرے ہیں، کہ ان کو سب نے پیشوا مانا ہے، جیسے پیران پیر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی اور خواجہ بہاؤ الدین و خواجہ معین الدین چشتی و شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ تعالیٰ اور اُن کے قبل جنید بغدادی حضرت شبلی وغیرہ اور جس طرح اور علوم میں پچھلوں کو اگلوں کی تقلید و پیروی کے سوا چارہ نہیں، علم تصوف میں بھی بدون اتباع طریقۂ بزرگان چارہ نہیں گو ادنیٰ درجہ کا تزکیہ جو موجب نجات ہے، بدون اتباع مشائخ طریق بھی میسر ہو سکتا ہے، مگر وہ امر کہ مطلوب ہے اور کمال کہلاتا ہے، اس کا حصول بدون صحبت کاملین متبعین مشائخ کے ممکن نہیں،

اور جس طرح دیگر علوم متخرجہ و مستنبطہ کا خاص نام ہو گیا، جیسے علم فقہ و علم حدیث اسی طرح مشائخ کے اس خاص متخرجہ طریقہ کا نام تصوف ہو گیا، اگر کوئی شرح وقایہ و ہدایہ پڑھتا ہے، تو کہا جاتا ہے، کہ فقہ پڑھتا ہے، اور اگر تفسیر یا حدیث پڑھتا ہو تو یوں نہیں کہتے کہ فقہ پڑھتا ہے، حالانکہ فقہ بالمعنی الاعم یعنی معرفۃ النفس مالہا و ما علیہا میں بہت سے علوم حدیث و تفسیر حتی کہ علم کلام وغیرہ بھی داخل ہیں، اسی طرح جب کوئی شغل کیا

کے بتلائے ہوئے طریقہ پر چلتا ہے، تو کہا جاتا ہے کہ یہ تصوف کیمتا ہے، یا صوفی ہے، اور نماز روزہ کرنے والے کو صوفی نہیں کہتے، حالانکہ تصوف تزکیۂ باطن بالمعنی الاعم سب کو شامل ہے۔

اور یہاں اصطلاحی تصوف کی حقیقت بیان کرنا منظور ہے، جو نام ہے باطن کو رذائل سے خالی کرنے اور فضائل سے آراستہ کرنے کا جس میں توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے، عام اس سے کہ وہ کسی عمل شرعی سے ہو۔"

حاصل یہ کہ پورا دین نام ہے فلاح آخرت اور رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کا اور جیسا کہ الظاھر والباطن کی مخلوق و مظہر ساری کائنات کا ہر ہر ذرہ ظاہر و باطن دونوں کا مظہر ہے، اور انسان اس کا مظہر اتم ہے، اسی طرح اس کو اپنے کمال مقصد تک پہنچنے کے لئے جو صراط مستقیم دکھلائی گئی ہے، اس کے بھی دو رخ ہیں، ظاہر اور باطن یا قلب و قالب، ظاہری علوم دین کا تعلق ظاہری اعمال و احکام یا ظاہر کی درستی و آراستگی سے ہے، اور علم باطن یا تصوف کا تعلق باطن کی درستی و آراستگی سے ہے، اور جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا کہ کمال وحقیقت کا تعلق کم کے مقابلہ میں کیف یا ظاہر کے مقابلہ میں باطن سے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے دین میں بھی کمال رسی اور حقیقت یابی بلا تصوف یا صوفی بنے بغیر ممکن نہیں، خواہ اس دعوے سے اہل قشر کتنا ہی ناخوش ہوں لیکن مغز مغز ہی ہے، البتہ بے مغز مدعیان تصوف بھی آگاہ رہیں کہ مغز قشر کے اندر ہی ملتا ہے، اور قشر یا ظاہری مغز یا باطن کا محافظ ہوتا ہے،

تجدید تصوف کا اصل کارنامہ | حضرت جامع المجددین رحمہ اللہ کی تصوف میں تجدید و اصلاح کا اصل کارنامہ ظاہر و باطن یا شریعت و طریقت کی علمی و تعلیمی جامعیت ہے، یا وہی "ملامتیت و صوفیت" کو ملا کر شیر و شکر کر دینا، اور جس طرح تجدید کے ہر باب میں حضرت نے محض علم و اصول کی رہنمائی پر قناعت نہیں فرمائی بلکہ اپنی حد و استطاعت تک اس کو عمل میں بھی لاکر دکھا دیا، اسی طرح شریعت و طریقت کی تعلیم و تدریس تالیف و تصنیف کے مضمون سے الگ تھا، و مشائخ نے جو ترکیب قائم فرمائے تھے، ان کو خود اپنی

علی زندگی اور ساری تقریری و تحریری خدمات میں از سر تا پا جسم و جان کی طرح ایسا ہم وجود بنا دیا، کہ دونوں میں امتیاز و جدائی داستان ماضی بن کر رہ گئی، مواعظ و ملفوظات تالیفات و تصنیفات سب میں دونوں رنگ ہو کر بالکل یک جان و ہم رنگ ہو گئے ہیں بہشتی زیور سے لے کر حیات المسلمین اور سب سے آخری تالیفی مجموعہ بوادر النوادر اور سب اسی مجمع البحرین کا نظارہ پیش کرتے ہیں،

بہشتی زیور جو راقم الحروف کے نزدیک جیسا کہ اوپر معلوم ہو گا حضرت کی تجدید کا باعتبار تعلیم بنیادی پتھر ہے، اس میں صوم و صلوٰۃ، نکاح و طلاق، بیع و شرا کے فقہی یا ظاہری احکام کے پہلو بہ پہلو باطنی اخلاق، قلب کی صفائی، باطن کی درستی، بلکہ پیری و مریدی تک کے مضامین کا پورا ایک حصہ (ساتواں) اس تمہید کے ساتھ شریک ہے کہ "اس حصے میں زیادہ مضامین اصلاح قلب کے متعلق ہیں، جس کو تصوف اور درویشی کہتے ہیں، اور یہ سب شرع کے اور حکموں کی طرح ضروری ہیں، جن سے بے پروائی نہ برتنا چاہئے"

دوسری کتاب حضرت کے اس تجدیدی سلسلہ کی تعلیم الدین ہے، اس میں تو عقائد عبادات معاملات و معاشرات کی دینی تعلیمات کے ساتھ نصف سے زائد حصہ میں سلوک و ولایت، مجاہدہ و ریاضت، بیعت، اذکار و اشغال، حقائق و معارف اور تصوف کے سارے فرعی مسائل و اصطلاحات خاصہ وغیرہ پورے تصوف کا نچوڑ موجود ہے، ظاہر و باطن شریعت و طریقت کے جمع و جامعیت کے اس تجدیدی اہتمام کی انتہا یہ ہے، کہ جمعہ کے لئے سال بھر کے خطبات کا ایک مجموعہ مرتب فرمایا گیا ہے، اس میں اصلاح باطن فقر و زہد، مراقبہ و محاسبہ، شوق و انس، وغیرہ صوفیانہ مضامین پر مستقل خطبات موجود ہیں،

اوپر تعلیم و تبلیغ کے باب میں دینی و عربی مدارس کی تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں جن اصلاحات و تجدیدات کا ذکر آ چکا، اُن میں بھی مدارس کو اس اصلاح کی طرف بتاکید متوجہ فرمایا گیا ہے کہ نصاب درس میں باقاعدہ اخلاق و تصوف کی تدریس کو بھی شریک کیا جائے، خود تعلیمات عشرہ کے نام سے رسالہ مختصر نصاب جو مرتب فرمایا ہے، اس میں دیگر علوم دینیہ کے ساتھ اخلاق و تصوف کے مضامین کا ملخص بھی

جز ولاینفک ہے، اپنی تفسیر بیان القرآن پر صوفیانہ تفسیری اعتبارات کا پورا حاشیہ چڑھا گیا ہے،

باقی مواعظ و ملفوظات میں تو متن و حاشیہ تصنیفی ابواب و فصول کا فصل و امتیاز بھی ظاہر و باطن شریعت و طریقت کے علوم و تعلیمات میں حاجب نہیں کوئی عام و خاص خلوت و جلوت کی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں شریعت و طریقت ظاہر و باطن کے اس سنگم کے دونوں پانی ایک ساتھ نہ بہتے ہوں یہی حال مواعظ کا تھا کہ ہر وعظ بوقت واحد شریعت کے مسائل اور حقیقت کے معارف کا گنجینہ ہے، عجیب لطف توافق کی بات ہے کہ جس طرح حضرت کی خانقاہ مسجد و مدرسہ سب ہم صحن اور ایک ہی گھر کے دیوار و در معلوم ہوتے ہیں اسی طرح حضرت کی تجدید و اصلاح نے خانقاہ کے باطنی معارف و حقوق اور مسجد و مدرسہ کے ظاہری احکام و مسائل کو ایک ہی گھر کے در و دیوار بنا کر اُن کی دوئی کو بالکل دور فرما دیا تھا ایک وعظ میں تصوف کی مشہور حدیث احسانِ عبادت یعنی عبادت و بندگی کو سنوارنے یا اچھا کرنے کے سلسلہ میں اس دوئی کا حجاب اس طرح دور فرماتے ہیں، کہ

"اس حدیث میں عبادت کو اچھا کرنے کی حقیقت بتائی ہے، اور ظاہر ہے کسی چیز کے اچھا ہونے کے کیا معنی ہوا کرتے ہیں کہ اس میں کوئی نقصان و کسر نہ رہے جیسی چاہئے ویسی ہو، مثلاً اچھی روٹی وہ ہوگی جس کا مادہ بھی اچھا ہو صورت بھی اچھی ہو ثمرہ بھی اچھا ہو، اسی طرح عبادت کے اچھا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کسی چیز کی کسر نہ رہے، لوگ عموماً غلطی کرتے ہیں، اور صرف صورت و نقل عبادت بنا کر عبادت سمجھتے ہیں، مثلاً نماز میں قیام رکوع سجدہ قعدہ قومہ وغیرہ جو فقہا نے ضبط کر دیا ہے، اس میں شک نہیں کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے ٹھیک ہے، اور جز فقہ کا موضوع تھا، اس کے موافق لکھا ہے، لیکن یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ عبادت سے متعلق تمام امور اسی میں منحصر ہیں،

شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فقہ کے ساتھ ایک دوسری فقہ باطن شریعت کی

معنی کا بھی اعتبار ہے، اسی معنوی فقہ کو تصوف کہتے ہیں، تصوف کو علیحدہ کتابوں میں لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فقہ سے خارج ہو جائے یہ علیحدگی ایسی ہی ہے، جیسے مشہور فقہ میں کتاب الزکوٰۃ اور کتاب الصلوٰۃ الگ الگ ہیں، اسی طرح کتاب التصوف بھی فقہ ہے، اگر کوئی ہدایہ کی ہر ہر کتاب کو الگ الگ چھاپ دے تو کیا کتاب الصلوٰۃ کتاب الزکوٰۃ وغیرہ ہدایہ سے خارج ہو جائیں گی؟ اسی طرح توحید و اخلاص یا کبر و تواضع عجب وغیرہ اخلاق حمیدہ و رذیلہ کے احکام بھی فقہ میں داخل ہیں[1]

اور صوری فقہ کو جانے دیجئے کیا خود قرآن و حدیث میں صوری فقہ کے احکام کے ساتھ ساتھ اور اس سے بھی بڑھ کر تاکید معنوی فقہ کے اوامر و نواہی کی قدم قدم پر نہیں ملتی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ علم برائے علم خود اتنا مقصود بنگیا ہے، کہ علمائے دین و مدارس دین میں بھی سارا زور معلومات اور کتابوں ہی پر ہے، امتحان ہے تو اُن کا انعام ہے، تو ان پر سند ہے تو اُن کی تحقیقات ہے تو اُن کی اور اب تو ماشاء اللہ ریسرچ اور ڈاکٹری کا میدان بھی علوم دین اور علمائے دین کے لئے کھل کر دینا طلبی کا دروازہ وسیع ہو گیا ہے، اس کے بعد عمل کا کیا ذکر، پھر جب صورت ہی کی پروا نہیں تو معنی کی کیا ہو ارشاد ہے

"لوگوں کو علم کی تو فکر ہے لیکن عمل کی نہیں، بڑا اہتمام اس کا ہوتا ہے، کہ ساری کتابیں پوری کریں، ہدایہ بھی قدوری بھی شمس بازغہ بھی لیکن عمل کی ذرا پروا نہیں، حالانکہ فقط کسی چیز کا جان لینا کوئی ایسا کمال نہیں، شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے، بڑے بڑوں کو بہکاتا ہے، تفسیر میں وہ ماہر حدیث سے وہ واقف، فقہ میں وہ کامل، اور اگر یہ سب علما سے زیادہ نہ جانتا ہو تو اُن کو بہکا کیسے سکتا ہے، شیطان میں اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا، حدیث شریف میں ہے، کہ ایسا علم جو عمل کے لئے نہ ہو، جہنم کا ذریعہ ہے[2]

---

[1] مواعظ اشرفیہ ص ۸ لغایتہ [2] ایضاً،

غرض ایک تو عمل ہی سرے سے مفقود ہے، اور جو کچھ ہے بھی تو صورت بے معنی یا جسد بے روح یعنی عمل کو بجائے اچھی طرح اور سنوار کر کرنے کے بیگار کی طرح ٹال کر کیا جاتا ہے،

مثلاً بظاہر اٹھ بیٹھ لئے، اور نماز ادا ہو گئی، خصوصاً اہل علم بھی اس کا خیال نہیں کرتے، کہ سوائے ظاہری قیام اور قعود کے اور بھی کچھ ہے، اور وہ ضروری بھی ہے حالانکہ قرآن میں جہاں قد افلح المومنون الذین ھم فی صلوٰتھم ہے اسی کے ساتھ ہی خاشعون بھی لگا ہے، جب صلوٰتھم سے نماز کو مطلوب شرعی سمجھتے ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ "خاشعون" سے خشوع کو مطلوب نہیں سمجھتے، حالانکہ دونوں حکم ضروری ہیں اور یہ خشوع ہی ہے، جس سے عبادت اچھی ہوتی ہے، اس سے احسان حاصل ہوتا ہے"، احسان کے متعلق تین چیزیں ہیں، اوّل اس کا ضروری ہونا، دوسرے اس کی حقیقت، تیسرے اس کے حاصل کرنے کا طریقہ،

اوپر اجمالاً معلوم ہو چکا کہ احسان حاصل تو خشوع سے ہوتا ہے، اور خشوع کا مطلوب ہونا قد افلح المومنون الخ سے معلوم ہو چکا اب اس کا ضروری ہونا سنئے ارشاد ہے، الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم، یہاں ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت کا بیان ہے، اور ذکر اللہ میں ساری عبادتیں آگئیں، دیکھو عبادت میں اس خشوع کے نہ ہونے پر کیسی وعید ہے، یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دے کر ذکر کیا ہے، کہ ایسے نہ ہو جس سے ظاہر ہے کہ ترک خشوع کیسی بری چیز ہے، جس کے باعث آدمی کافروں سے مشابہ ہو جاتا ہے، اور اس کا ثمرہ بیان فرمایا ہے، کہ فقست قلوبھم، قساوت قلبی ایسی بری چیز ہے، کہ قرآن شریف میں ہے کہ فویل للقاسیۃ قلوبھم من ذکر اللہ اولٰئک فی ضلال مبین، یعنی تباہی و ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل خدا کی یاد سے

سخت ہو رہے ہیں، وہ لوگ کھلی کھلی گمراہی میں ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

قلب قاسی خدا سے بہت دور ہے[1]

طرح طرح سے اس تنظیم و تفصیل کا معا نظ یہ ہے کہ جس طرح فقہائے ظاہر نے قرآن و حدیث ہی کے ظاہر و قالب کے شرعی احکام و اعمال ضبط و مرتب فرمائے ہیں، اسی طرح فقہائے باطن یا صوفیائے قلب و باطن کے احکام و اعمال مدون فرما دیئے ہیں، دو نوں شریعت ہی کے دو رُخ اور عین شریعت ہیں، اس لئے تصوف یا فقہ معنوی سے نا بلد رہنا یا پھر کنا جہل و محرومی ہی نہیں، بلکہ اس کے بغیر دین کی حقیقت و معنویت یا دین کا کمال و احسان نصیب ہی نہیں ہو سکتا،

"لہذا جس طرح کنز و ہدایہ ضروری ہے، ویسے ہی ابو طالب کی کی قوت القلوب اور امام غزالی کی اربعین اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف کا پڑھنا بھی ضروری ہے (لیکن صرف پڑھ لینا کافی نہیں) یہ تو گویا طب کا صرف پڑھ لینا ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو

کیسی نا انصافی ہے کہ جب دس برس علم ظاہر کی تحصیل میں صرف کئے تو کم سے کم دس ماہ تو باطن کی اصلاح میں صرف کرو اور اس کا یہی طریق ہے کہ کسی کامل کی صحبت میں رہو، اس کے اخلاق و عادات و عبادات کو دیکھو کہ غصہ کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے، شہوت کے وقت کس حالت میں کیا رہتا ہے، خوشامد کا اس پر کہاں تک اثر پڑتا ہے، اسی طرح تمام اخلاق کا حال ہے، کیونکہ پھر جب کبھی اس کو غصہ آئے گا تو سوچیگا کہ اس کامل کی غصہ کے وقت کیا حالت تھی، اسی طرح اس کے دیگر اخلاق و عادات پیش نظر رہیں گے۔"[2]

---

[1] مواعظ اشرفیہ ص ۔ [2] ...

احقر تو اکثر بطور تمثیل عرض کیا کرتا ہے کہ اس کے والد طبیب تھے، گھر میں عربی، فارسی، اردو کی طب کی کتابوں سے الماری کی الماری بھری ہیں، اور تینوں زبانوں میں ان کو پڑھ اور بڑی حد تک سمجھ بھی سکتا ہوں، یہی نہیں بلکہ اگر کسی استاد سے سبقاً سبقاً پڑھ اور سمجھ لوں لیکن باقاعدہ کسی ماہر طبیب کے مطب میں اس کی عملی مشق و تجربہ حاصل نہ کروں اور خود مطب کھول کر بیٹھ جاؤں تو لوگوں کے لئے ہلاکت کا دروازہ کھول دینے کے سوا کیا ہوگا،

یہی حال آج کل کے اکثر مسلمان قومی و سیاسی اطبا یا قائدین کا ہے، کہ بہتوں نے تو سرے سے دین کا کوئی معتد بہ علم ہی نہیں حاصل کیا، اور جنہوں نے کچھ کیا ہے، ان میں سے مطلب شاذ ہی کسی نے کسی طبیب حاذق کی صحبت میں کیا ہے، اس کی بدولت کتابی علم دین کے اچھے اچھے واقفین و ماہرین نے ہلاکت فروشی کی دوکان لگا رکھی ہے، جہاں دین کے نام سے بھی عین دنیا کی دانستہ یا نادانستہ سوداگری ہو رہی ہے، اگر نرا کتابی علم دین ہی صلاح و اصلاح اور کمال دین کے لئے کافی ہوتا، تو حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے مابعد کی قرون اور سارے طبقات امت کے مقابلہ میں ناقص و غیر صالح ہوتے، دشتان بینہما! ان کا فضل و کمال مابعد کے بڑے بڑے فقہا و محدثین اور اولیا و اقطاب کے مقابلہ میں اسی لئے تو مسلم ہے، کہ ان کو سب سے بڑے مرد کامل کے سامنے پامال ہونے کی سعادت یا صحبت نصیب تھی، جو خود لفظ صحابہ و صحابیات کے عرف و اصطلاح کی عظمت سے ظاہر ہے،

پھر ہمارے یہ قائدین و مصلحین رنگ رنگ کے جھنڈے لے کر اور طرح طرح کی جماعتیں اور مجالس آگے پیچھے اسلام اور اسلامی کا لفظ لگا کر مسلمانوں کو اپنے حال کی جس اصلاح و انقلاب کی دعوت دے رہے ہیں، خوب یاد رکھیں کہ وہ اس راہ سے پہلے کی طرح آیندہ بھی صدا بصحرا یا جسم بے روح ہی رہے گی جب تک انقلاب بہ تقلب یعنی تصوف کی راہ نہ اختیار کی جائے، قرآن مجید کی جو آیت ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم ہر قدم پر پہلے مسلمانوں کی تیرہ حالی کے لئے زبان

رہتی ہے، اس کا مطلب بھی صوفی بنانا ہے یعنی اگر تم دنیاوی وسیاسی یا ظاہری ترقی بھی چاہتے ہو تو وہ بھی قانون قدرت یا سنت اللہ کی رو سے بلا باطنی یا نفسی اصلاح وتغیر کے ناممکن ہے، یہ "ما بانفسہم" کا تغیر باطنی یا قلب کے تغیر وانقلاب کے سوا کیا ہے،

اور بہت سے دنیادار بھی کسی نہ کسی عنوان سے اسی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ جنگ سے آراستہ جرار لشکر کا اگر اخلاق باطن (مورل) بگڑ جائے، تو ظاہری ساز وسامان سب دھرا رہ جاتا ہے،

صوفی بنے بغیر دنیا بھی نہیں مل سکتی

اور مسلمان تو خوب کان اور دل کھول کر سُن اور سمجھ لیں کہ ان کو صوفی بنے بغیر جس کا ترجمہ ہے "پکا مسلمان" دین تو دین دنیا بھی کسی اور فن سے حاصل نہیں ہو سکتی، جس کے وجوہ واسباب کی تفصیل حضرت مجددی کی زبانی "قومیات وسیاسیات" کے باب میں مفصلاً مذکور ہیں، جب مسلمان مسلمان تھے اور ان کو دنیاوی اعتبار سے بھی غلبہ وتفوق حاصل تھا، تو اس کا سبب بھی ظاہری ساز وسامان وجمعیت کا غلبہ وتفوق نہ تھا، بلکہ قلوب کی سلامتی وجمعیت تھی، کہ دشمنوں کے قلوب اُن کے مقابلے میں باہم پھٹے ہوتے، اور ان کے ملے ہوتے تھے، خود قرآن پاک شہادت دیتا ہے کہ تحسبھم جمیعًا وقلوبھم شتّٰی ذٰلک بانھم قومٌ لا یعقلون یعنی اُن کی لڑائی آپس ہی میں سخت ہے تم سمجھتے ہو کہ وہ اکٹھے ہیں حالانکہ ان کے قلوب پھٹے ہوئے ہیں، یہ اس لئے کہ سمجھ اور عقل سے کام نہیں لیتے، یعنی عقل کی بات بھی یہی ہے، کہ کام قلب و باطن کی قوت و جمعیت سے چلتا ہے، نہ کہ محض ظاہری ونمایشی اتحاد واتفاق سے، مولانا شبیر احمد عثمانی ان آیات کے تفسیری حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ

"مسلمانوں کے مقابلہ میں اُن کے ظاہری اتحاد واتفاق سے دھوکا مت کھاؤ، اُن کے دل اندر سے پھٹے ہوئے ہیں، ہر ایک اپنی غرض وخواہش کا بندہ اور خیالات میں ایک دوسرے سے جدا ہے، پھر حقیقی یکجہتی کہاں میسر آسکتی ہے، اگر عقل ہو تو سمجھیں کہ یہ نمایشی اتحاد کس کام کا، اتحاد اسے کہتے ہیں جو مومنین میں پایا جاتا ہے، کہ تمام اغراض وخواہشات سے یکسو ہو کر

سینے اللہ کی دستی تھام کہی ہے بہ سب کام آئینہ یوں منہ کے بل

کیا دلوں کی پھوٹ کا یہ نقشہ جو کبھی ہمارے دشمنوں کا تھا، آج خود ہمارے دلوں کا آئینہ نہیں ؟

غرض یہ کہ بلا اندر کے اتفاق و اتحاد یعنی قلب و باطن کی اصلاح و انقلاب کے یا صاف لفظوں میں بلا صوفی بنے، نہ خدا مل سکتا ہے، نہ منعم، نہ دین کے حقیقی ثمرات نصیب ہو سکتے ہیں نہ دنیا کے ظاہری منافع حاصل ہو سکتے ہیں

مسلمانوں کی اس سراسر غیر اسلامی قومیات و سیاسیات سے جس طرح دل کڑھتا رہتا ہے، احقر نے زیادہ تر اسی کے تقاضے سے تصوف کی بحث میں بھی بظاہر یہ بے جوڑ جملہ معترضہ داخل کر دیا تھا، لیکن ابھی یہ جملہ معترضہ بمشکل ختم ہی ہوا تھا، کہ خود حضرت کا تصوف ہی پر گفتگو کے سلسلہ میں بقیہ اسی مضمون کا ایک ملفوظ تائید غیبی کی طرح سامنے آگیا، جس کا ماحصل وہی ہے، کہ صوفی بنے بغیر حکومت و سلطنت بھی ہاتھ نہیں آسکتی، فرماتے ہیں کہ

"اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں کے اندر اوروں سے زیادہ سلطنت کرنے کی صفات موجود ہیں، مثلاً عدل و انصاف، ترحم وغیرہ، بس یہ کمی ہے کہ ان میں نظم نہیں، اور نظم نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ اتفاق و اتحاد نہیں، اور اتفاق و اتحاد کی جڑ حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب نے عجیب فرمائی، جس کی تمام عقلا کو بھی خبر نہیں، فرماتے تھے کہ اتفاق کی جڑ تواضع ہے، اگر ہر شخص دوسرے کو اپنے سے افضل سمجھنے لگے، (جو تصوف کی تعلیم و تربیت کا لازمہ ہے) تو پھر نااتفاقی کی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ نااتفاقی اسی سے تو پیدا ہوتی ہے، کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے افضل سمجھتا، اور اس سے بڑھا چاہتا ہے، سبحان اللہ کیا حقیقت ظاہر فرمائی..... اب تو یہ ہے کہ کسی کو اپنا بڑا تسلیم کر لینے میں عار آتی ہے، اور جب تک کسی کو بڑا تسلیم نہ کیا جائے، مرکزیت جو نظم کے لئے ضروری ہے، قائم نہیں ہو سکتی"

ابھی کچھ دن پہلے ایک مشہور خالص دینی مدرسہ میں اسی عار کا بڑا عبرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ ایک

نہایت متقی جوان صالح، خود حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کے تربیت یافتہ ومجاز، جو ایک غیر مشہور دینی مدرسہ کو حقیقی معنی میں دینی تربیت کے ساتھ کئی سال سے چلا رہے ہیں، اور جن کی دینی تربیت کی مہارت کا خود اسی مشہور مدرسہ کے سب سے بڑے ذمہ دار بزرگ کو جب چشم دید تجربہ ومشاہدہ ہوا تو اپنے صاحبزادہ کو اس مشہور مدرسہ سے نکال کر اسی غیر مشہور مدرسہ کے حوالہ فرما دینا چاہا تھا، مگر مشہور مدرسہ کے مہتمم صاحب اس کو اپنے مدرسہ کے لئے عار جان کر مانع ہوگئے،

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہمارے دینی مدارس پر بھی آج کل کے دنیوی مدارس کے رنگ واثر کا غلبہ اتنا ہوگیا ہے کہ سارا زور کتابوں کی تعلیم اور امتحانات پر دیا جاتا ہے، عملی تربیت کی طرف دوسرے درجہ کی توجہ بھی مشکل سے فرمائی جاتی ہے، خصوصاً اخلاقی وباطنی تربیت کا اہتمام تو کہنا چاہئے کہ ان کے اساتذہ والا بر ہی میں مفقود ہے تو طلبہ واصاغر کا کیا ذکر، مذکورۂ بالا مشہور مدرسہ میں بھی سب سے بڑی کمی دین کی ظاہری اور اس سے بڑھ کر باطنی تربیت کی اساتذہ وطلبہ سب ہی میں ہے، اس کے ایک بے جاہ وقربت خیر خواہ نے عملی تربیت کے ان نقائص کی اصلاح کے لئے موصوف الصدر جوان صالح کے مشورہ وتجربہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک تجویز پیش کردی، جس کو سب سے بڑے ذمہ دار بزرگ نے پہلی گفتگو میں قبول بھی فرمالیا، لیکن جب مہتمم صاحب کو (جو ماشاء اللہ اپنے بڑوں کے بڑے مطیع ہیں) اس پر آمادہ فرمانا چاہا، تو وہی احساس عار کا جواب ملا کہ آخر مجھ پر کتنوں کو نگران بنایا جائے گا، حالانکہ اگر ان کے اوپر ان کے بقول کئی نگران تھے (گو واقعہ میں کوئی نہیں) تو ایک اور کا اضافہ سہی، بلکہ خود اپنی جماعت کے اس مجوزہ کے مشورہ ونگرانی کے قبول فرمانے پر راضی تھے، مگر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان جوان صالح سے استفادہ میں ان کی جوانی، عدم شہرت، غیر مشہور مدرسہ یا غیر جماعت سے تعلق کی کون سی عار اتنی سنگین دیوار بن کر ان کے سامنے کھڑی ہوگئی، کہ آخر اصل ذمہ دار بزرگ کو بھی باوجود اپنی ذمہ داری کے کماحقہ اعانہ فرما سکنے کی معذوری سے اسی سنگین دیوار سے ٹکرا کر پسپا ہونا پڑا،

یہ صرف ایک مثال برائے مثال ہے، ورنہ کیا عرض کیا جائے کہ اس راقم احقر نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہوش سنبھالا ہے، جب سے تھانہ بھون کے تجدید یافتہ اسلامی تصوف کو کچھ دیکھا اور سنا ہے، تب سے خود اپنے اندر اور باہر انفرادی و اجتماعی قومی و سیاسی، کسی معاملہ میں جہاں اور جو فساد نظر آتا ہے، اس کا بڑا سبب براہ راست اسی اسلامی تصوف یا اخلاقی و باطنی تربیت کی صلاح و اصلاح کی کمی و خامی دکھائی دیتی ہے، جس کی نسبت اسی ملفوظ میں آگے ارشاد ہے کہ

بلا تصوف کام نہیں چل سکتا | خلاصہ یہ کہ تصوف کے بغیر کام نہیں چل سکتا، کیونکہ سب سے اول چیز تصوف میں تواضع ہی کی تعلیم ہے، جس کو اصطلاح میں فنا کہتے ہیں، عموماً تو تصوف میں فنا سب سے آخر مقام سمجھا جاتا ہے، لیکن درحقیقت سب سے اول مقام بھی فنا ہی ہے، اور سب سے آخر مقام بھی فنا ہی ہے، کیونکہ فنا کے درجات ہیں، باقی بدون فنا کے تو اس طریق میں کوئی شخص ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، خواہ لاکھ ورد وظیفے پڑھے، لاکھ تسبیحیں پھیرے،

لوگ کہتے ہیں کہ حجروں میں بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا، میدان میں آنا چاہئے، میں کہتا ہوں کہ حجروں ہی میں بیٹھنے سے میدان کی قابلیت پیدا ہوتی ہے، جیسے ریڈیو حجرہ ہی میں رکھا جاتا ہے، اور پھر اسی سے تقریریں نشر ہو کر تمام عالم میں ہلچل پڑ جاتی ہے، اس پر یاد آیا کہ سعد بن وقاص ایک معرکہ میں امیر لشکر تھے، اور بوجہ دنبل نکل آنے کے نقل و حرکت سے معذور تھے، پھر بھی اپنے خیمے میں بیٹھے بیٹھے ہی فوج کی کمان کر رہے تھے،[1]

جب حضرات انبیاء علیہم السلام بلکہ نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی بدر سے پہلے حرا تھا، تو بدیگراں چہ رسد، غازی الہ آبادی نے خوب ہی فرمایا،

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھکو بدر سے غار حرا پہلے

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۲۰۰،

آگے اسی مقام فنا کا ایک میدانی کارنامہ[1] نقل فرمایا ہے، کہ

"حضرت ابومحجن ثقفی اس جرم میں کہ انھوں نے شراب کی تعریف میں اشعار کہے تھے، عین کارزار میں زنجیر سے باندھ دیئے گئے تھے، کفار میں ایک شخص رستم نامی تھا جس نے کئی مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا، حضرت ابومحجن کو یہ دیکھ کر جوش اٹھا کہ میں جا کر اس کا مقابلہ کروں، مگر مجبور تھے، زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے، بالآخر رہا نہ گیا، اور امیر لشکر کی بیوی سے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا، کہ مجھ کو اس وقت چھوڑ دیا جائے، وعدہ کرتا ہوں کہ اگر سلامت واپس آگیا، تو پھر اپنے کو اسی زنجیر سے بندھوا دوں گا، اور اگر شہید ہو گیا، تب بھی امیر لشکر کا کچھ حرج نہ ہوگا، کیونکہ مجھ سے ناراض ہیں ہی چھٹکارا مل جائے گا، (غرض کسی طرح) رستم کے مقابلہ کے لئے جا پہنچے، لیکن اس ڈر سے کہ امیر لشکر کا سامنا نہ ہو جائے، منہ چھپا لیا تھا، رستم کے پاس پہونچتے ہی اس کو قتل کر دیا، اور خود واپس آکر حسب وعدہ پھر اپنے کو مقید کر دیا، اور امیر لشکر نے بھی حکم شریعت کے جاری کرنے میں عین موقع کارزار میں پس و پیش نہ کیا، اور ایسے کارآمد شخص کو بھی قید کر دیا بات یہ ہے کہ وہاں اصل مقصود اتباع احکام اور تحصیل رضائے الٰہی تھا، اسی میں امیر لشکر اور لشکری سب فنا تھے) اس کے مقابلہ میں اور کسی مصلحت کی پروا نہ تھی،

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار

بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند[2]

عجیب مجددانہ نکتہ | اسی سلسلہ میں ایک عام غلط فہمی کے متعلق عجیب مجددانہ نکتہ بیان فرمایا، کہ

"شہادت کے متعلق عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ جہاد میں مقتول ہو کر شہید ہو جاتا ہے"

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۲۰۸، [2] ایضاً ۲۰۷

اصل مقصود ہے، حالانکہ یہ غلط ہے، مقتول ہونا اصل مقصود نہیں، بلکہ قاتل ہونا اصل مقصود ہے، اور مقتول ہونا قاتل ہونے کی حد تک ہے، یعنی حکم یہ ہے کہ مقتول ہونے کی حد تک بھی قاتل بنے رہو، اور قاتل ہونے میں مقتول ہونے کی بھی نوبت آجائے تب بھی پروانہ کرو۔[1]

جملہ معترضہ ذرا طویل ہو گیا، لیکن "حجرہ کے تصوف" کی تحقیر جس جہل و نادانی پر مبنی ہے اس کے رد کرنے اور نام کے سیاسی میدانیوں پر پوری طرح واضح کرنے کے لئے کہ کام میدان میں بھی "تصوف" کے بغیر چل نہیں سکتا، "دراصل اسلامی تصوف ہی کے بارے میں یہ ایک بڑے تجدیدی نکتہ کی ضروری تفصیل تھی،

(باقی)

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۳۰۰،

اسلامی حکمرانون سے مسلمانون کی

ایک بے جا شکایت

از مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(۲)

مسلمان فرمان رواؤن کے دربار مین غیر مذہب کے ارباب کمال کی جو قدر و عزت کی گئی ہی اس کی تفصیل کے لئے تو دفتر درکار ہے، واقعہ یہ ہو کہ دوسرون پر جبر اور زبردستی تو خیر بڑی بات ہے، عباسیون کے کی حکومت کا ابتدائی عہد ہے، اسی ابوجعفر منصور کے زمانے کا قصہ ہی، اس کو سنئے، اور اندازہ کیجئے کہ عام مسلمانون کے قلوب تک مین رواداری کے جذبات ترقی کے کس نقطہ تک اسلامی حکومت کے زمانے مین پہونچے ہوئے تھے،

خطیب نے اس واقعہ کو بیان کیا ہی جس کا حاصل یہ ہو کہ بصرہ جو خاص مسلمانون کی فوجی چھاؤنی تھی یہین ایک یہودی پہونچا، اور مسلمانون کے علماء کو مناظرے کا اس نے چیلنج دیا۔ لوگ آتے تھے اور اس سے بحث کرتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ مناظرے کے ڈھنگ مین یہودی اتنا مشاق تھا کہ جو بھی اس سے بحث کرتا اس کو خاموش کر دیتا، اس زمانے مین ابوالہذیل العلاف جو بعد کو فرقۂ معتزلہ کا امام ہوا، ابھی کمسن تھا، اس کا بیان ہو کہ مین نے اپنے چچا سے کہا کہ اس یہودی کی بڑی شہرت ہو رہی ہے، کیا مجھے آپ اس کے پاس لے چل سکتے ہین، تا کہ مین اس سے بحث کرون، ابوالہذیل کے چچا نے کہا بیٹا! بڑے بڑے لوگون کو وہ خاموش کر رہا ہے، تم اس سے بھلا کیا مناظرہ کروگے، لیکن مین نے ضد کی،

آخر مجھے لے کر اس مجلس میں میرے چچا پہونچے، جہاں لوگوں کا مجمع تھا، اور یہودی سے بحث ہو رہی تھی،
اس وقت یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے متعلق کہہ رہا تھا کہ ان کی نبوت تو طے شدہ
مسئلہ ہے، اس لئے اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں، البتہ اپنے پیغمبر (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم) کی نبوت کی صحت کی دلیل تم مسلمانوں کو پیش کرنا چاہئے، ہمارے لئے تو صرف انکار کافی ہے،
اسی قسم کی باتیں وہ کر رہا تھا، اتنے میں ابو الہذیل آگے بڑھا اور یہودی کو مخاطب کر کے کہا کہ میں آپ سے
بحث کرنا چاہتا ہوں، یہودی نے ایک کمسن لڑکے کو دیکھ کر کہا کہ

میاں صاحبزادے اپنے بڑے بوڑھوں کے حال سے تمہیں عبرت نہیں ہو رہی ہے،
تم بھلا مجھ سے کیا بحث کر سکتے ہو،

مگر ابو الہذیل کے اصرار کو دیکھ کر بحث پر آمادہ ہو گیا، سوال و جواب کا ایک طویل سلسلہ اس کے
بعد نقل کیا گیا ہے، جس کے درج کرنے کی یہاں گنجایش نہیں ہے، پیش کرنے کی چیز آخری جزء ہے
ابو الہذیل کا بیان ہے کہ میرے سوالات سے یہودی زچ ہوا، میں نے دیکھا کہ اچانک وہ میری طرف
بڑھا، ایسا معلوم ہوا کہ کان میں کچھ کہنا چاہتا ہے، میں نے بھی اپنا کان اس کی طرف بڑھا دیا،
یہی قصہ سننے کا ہے، ابو الہذیل ہی کے الفاظ میں سنئے، ایک یہودی کی جرأت بصرہ جیسے مقام میں دوسری
صدی ہجری کی ابتدا تک میں کہاں تک بڑھی ہوئی تھی، ابو الہذیل کے الفاظ میں۔

فسارنی فقال امك كذا كذا	اس یہودی نے کان میں مجھ کو گالیاں دینی شروع
وام من علمك لا يكنى	کیں کہہ رہا تھا کہ تیری ماں کی ایسی تیسی، اور جس نے
(ص ۳۶۸)	تجھے پڑھایا ہے اس کی ماں کی ایسی تیسی، وہ فحش
	گالیاں دے رہا تھا اور اشارے کنائے سے
	بھی کام نہیں لے رہا تھا

یہودی کا اپنے اس طرز عمل سے جو مقصد تھا ابو الہذیل نے بھانپ لیا اور کسی قسم کی برہمی اپنے اندر اس کے پیدا ہونے نہ دی، پھر مجمع کی طرف خطاب کر کے ابو الہذیل نے کہا کہ

حضرات! خدا آپ لوگوں کی عزت کو قائم رکھے، آپ لوگوں نے دیکھ لیا کہ میرے سوالوں کے جواب سے یہ عاجز ہو چکا ہے، اب کان میں اس نے مجھو اس قسم کی گالیاں محض اس لئے دی ہیں تاکہ مجھے غصہ آ جائے اور یوں مجلس درہم برہم ہو جائے یہودی کو اس کا موقع مل جائے کہ مسلمانوں نے شور و شغب سے کام لیا ورنہ ان کا وکیل شکست کھا چکا تھا (صفحہ ۔۔)

آزادی خیال، آزادی تقریر کی آپ ہی بتائیے کہ اس سے زیادہ معیاری مثال اور کیا ہو سکتی ہے، بصرہ جیسے خالص اسلامی شہر میں وہ مسلمانوں کے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر علانیہ بھری مجلس میں اعتراض کرتا ہے، مسلمانوں کے علما، اس سے سوال جواب کرتے ہیں، اپنی تقریری قوت سے وہ سب کو چپ کرتا چلا جا رہا ہے، نہ حکومت ہی کی طرف سے اس کی دار و گیر ہوتی ہے اور نہ مسلمانوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے خلاف شورش کرتے ہیں، بلکہ توقع یہی کی جاتی ہے کہ تقریر کا جواب تقریر سے دیا جائے، ذرا اس یہودی کی جسارت کا اندازہ کیجئے کہ مسلمانوں کی اس بھری مجلس میں بقول مولانا دریابادی صنعت غیر منقوط میں وہ سب کچھ سناتا ہے جو سنانا چاہتا ہے، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جب تک اس کو مسلمانوں کے حلم و بردباری کے متعلق اطمینان نہ تھا اس بزدل یہودی میں کیا ۔۔۔ میں سی اس کی ہمت ہی کیسے ہو سکتی تھی، انتہا یہ ہے کہ کان میں ابو الہذیل کے جو گالیاں ان کو اور ان کے اساتذہ کو اس نے سنائی تھیں، اس کی خبر جب مجمع کے مسلمانوں کو ہوئی، تو جیسا کہ چاہئے تھا لوگوں میں برہمی پیدا ہوئی لیکن اس برہمی کے بعد بھی کیا ہوا، ؟ ابو الہذیل ہی کا بیان ہے کہ یہودی مجمع سے نکل بھاگا حالانکہ بقول ابو الہذیل،

شقتنی بالشتم الذی یوجب الحد — اس یہودی نے جو گالیاں مجھے دی تھیں وہ اس کو قانونی سزا کی مستحق بنا چکی تھیں،

(ج ۳ صفحہ ۳۶۱)

یعنی حد قذف[1] کا یہودی قانوناً مستحق ہو چکا تھا، لیکن باین ہمہ مسلمانوں کی حکومت نے بھی، اور خود مسلمانوں نے بھی اتنا موقع اس کو پھر بھی دیا کہ

خرج هاربا من البصرة، — بصرہ سے بھاگ نکلا

موجودہ زمانہ کی بے دین حکومتوں کا سب سے بڑا امتیازی وصف یہی قرار دیا جاتا ہے کہ "مذہبی معاملات میں رواداری کا جذبہ لوگوں میں اس نے پیدا کر دیا ہے"، اگرچہ اس میں زیادہ دخل جہاں تک میں سمجھتا ہوں بجائے رواداری کے پژمردگی کے ان رجحانات کو ہے، جو عموماً اس زمانہ میں مذہب کی جانب سے قلوب میں پھوٹ پڑے ہیں، یورپ اور یورپ کے مذہب کی تاریخ کے یہ نتائج ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے[2]،

مگر خیال کیجئے اس زمانہ کو یعنی دوسری صدی ہجری کی ابتدائی شاخوں کو جن میں تقریباً ہر مسلمان دین کے نشہ میں سرشار اور مخمور تھا۔

لیکن ان کے دین ہی نے مسلمانوں میں بھی اور ان کی حکومت کے اندر بھی رواداری کے جس جذبہ

---

[1] کسی کو بلا وجہ افعال شنیعہ کے ساتھ متہم کرنا اور اس کی آبروریزی کی تعبیر عربی میں "قذف" کے لفظ سے کی جاتی ہے، جس کی سزا اسی کوڑے مقرر ہیں، اور ایسا آدمی مردود الشہادۃ عدالت سے قرار دیا جاتا ہے،

[2] تفصیل تو اس کی سورہ کہف کی آیت فلعلک باخع نفسک علیٰ آثارھم آلایہ میں آثارھم کے لفظ کی تفسیر میں دیکھئے یعنی خدا کے متعلق ولدیت کا عقیدہ جن آثار کو چھوڑ کر جائے گا ان کو خوب سوچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا گیا ہے کہ غم میں اپنے آپ کو کیا آپ ہلاک کر دیں گے، خاکسار کے نزدیک مسیحی دین کی تاریخ کی طرف آثارھم کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے کلیسا کا نظام کیسے پیدا ہوا، پوپ غیر معمولی اقتدار کا مالک سارے مسیحی ممالک میں ہو گیا اور کلیسا کی فرعونی طاقت کی پشت پناہی میں دین مسیحی کے نمائندوں نے جو مظالم ڈھائے ہیں کہ رد عمل نے الحاد اور بے دینی کے اس دور کو پیدا کیا،

کی نشوونما میں کامیابی حاصل کی تھی، میں تو نہیں سمجھتا کہ اس کی نظیر آج بھی مل سکتی ہے،

اس قسم کے خیالات کہیے یا وساوس، لوگوں میں ان واقعات کے سننے کے بعد جو پیدا ہوتے ہیں، یعنی سمجھ لیا جاتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی ان رواداریوں میں بھی دخل ان لاچاریوں کو تھا، جو مذہب کی جانب سے ان میں پیدا ہو گئی تھیں، میرے نزدیک اسلامی تاریخ کی جہالت پر مبنی ہیں ورنہ جنہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا صحیح مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک دفعہ نہیں مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں ایسی صورتیں پیش آئی ہیں کہ اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے متعلق وقت کے بادشاہوں اور حکمرانوں میں زیادتی کا ارادہ پیدا ہوا لیکن مسلمانوں کا مذہب سامنے آکر کھڑا ہو گیا، اور زیادتی کی طرف بڑھنے والے ہاتھوں کو اسی وقت روک دیا،

عہد صحابہ جس کا اول و آخر ظاہر و باطن جیسا کہ میں نے عرض کیا سب کچھ دین ہی دین تھا، دین کے عنفوان شباب کے اس عہد میں تو خیر اس قسم کے واقعات کے پیش آنے کی صورت ہی کیا تھی؟ تاہم ارادۃً نہ سہی بلا ارادہ یا عدم واقفیت کی وجہ سے اس زمانہ میں بھی بعض ایسی صورتیں جب کبھی پیش آئی ہیں، تو خود اسلام ہی نے غیر مسلموں کو نقصان سے بچا لیا، امیر معاویہؓ کے زمانہ کے اس واقعہ کا ذکر شاید کسی اور مناسب مقام پر آئے گا۔ جب ان میں اور قسطنطنیہ کی عیسائی حکومت کے درمیان خاص مدت تک کے لئے صلح کا معاہدہ طے پایا تھا۔ مدت صلح کے اختتام کی تاریخ جب قریب آ لگی تو امیر معاویہؓ نے رومی سرحد کی طرف اپنی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا، فوج کی قیادت خود ہی کر رہے تھے، ارادہ ان کا یہ تھا کہ مدتِ صلح کے ختم ہونے کے ساتھ ہی غفلت میں رومی سرحد پر دھاوا بول دیا جائے، مسلمانوں کی فوج رومی سرحد کے قریب پہونچ ہی چکی تھی کہ اچانک دیکھا گیا گھوڑے پر ایک سوار

اللہ اکبر وفاء لا غدر

خدا سب سے بڑا ہے، معاہدہ کی تکمیل ہونی چاہئے،
غدر اور عہد شکنی سے کام نہ لینا چاہئے،

کا نعرہ لگا رہا ہے، امیر معاویہؓ نے ان کو طلب کیا، معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عمرو بن عنبسہؓ ہیں،

امیر معاویہؓ نے پوچھا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں، بولے کہ مین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو کہ معاہدے کے بعد دشمن پر حملہ اس وقت تک درست نہ ہوگا جب تک کہ معاہدے کی تاریخ کے ختم ہونے ساتھ فریق کو مطلع نہ کر دیا جائے، یہ سننے کے ساتھ ہی امیر معاویہؓ اپنی فوج کو لے کر واپس ہو گئے رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

اور اسلامی حکومت کے ان غیر مسلم باشندوں کے ساتھ جن کی ذمہ داری حکومت قبول کر لیتی تھی صحابہ کی ہمدردیوں یا حکام کی زیادتیوں سے بچا لینے کے لئے خود سینہ سپر ہو جانے کے واقعات کا تو ایک سلسلہ ہے جو مختلف علاقوں مین مختلف مواقع مین پیش آتے رہے، حدیث وسیر کی عام کتابوں مین اس کے نمونے آپ کو مل سکتے ہین،

مگر اس عہد سعادت کے گذر جانے کے بعد بھی بنی امیہ والوں کے ہاتھ مین اسلامی حکومت کی باگ جب آگئی، اور بجائے خلفاے راشدین کے جیسا کہ معلوم ہے اپنے طریقۂ حکومت مین وہ رومیون اور ایرانیوں کے نقش قدم کو دیکھ کر چلنے کے عادی ہو گئے تھے، لیکن اس زمانے مین بھی اور اس کے بعد بھی غیر مسلم طبقات کی حفاظت وصیانت مین آپ کو نظر آئے گا کہ مسلمانوں کے دین ہی نے کوشش کا کوئی

ؔ سیوطی نے بیہقی کی شعب الایمان اور ابن مردویہ کی تفسیر کے حوالہ سے اس روایت کو جن الفاظ مین نقل کیا ہے ان ہی مین یہ بھی ہے کہ عمرو بن عنبسہؓ نے کہا سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من کان بینہ وبین قوم عہد فلا یشد عقدۃ ولا یحلہا حتی ینقضی امدھا وینبذ الیہم علی سواء یعنی جب کسی سے معاہدہ کیا جائے تو معاہدے کے بعد کوئی گرہ بندھ سکتی ہے اور نہ کھل سکتی ہے جب تک کہ مدت معاہدے کی پوری نہ ہو جائے، اور معاہدے کے فریق کے ساتھ برابری پر ختم کیا جائے اسی مناسبت سے ان کا وہ عامل ہے جو مین نے درج کیا ہے (دیکھئے در منثور ج ۳ ص ۱۵۳)

وقتاً اٹھا رکھا تھا مسلمانوں کی رائے عامہ پر چونکہ مذہب کا اثر تھا، اس لئے حکمرانوں کو ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا،

البلاذری نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کے مشہور عیاش و بین باختہ حکمران ولید بن یزید نے منجملہ دوسری حرکتوں کے ایک حرکت یہ بھی کی تھی کہ قبرس کے غیر مسلم باشندوں کی ایک ٹولی کو اس نے قبرس کے جزیرے سے نکال کر شام میں توطن اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا، چونکہ ولید کا یہ فعل شرعاً صحیح نہ تھا اس لئے مسلمانوں کی رائے عامہ نے بھی اس کی مخالفت کی اور

استعظمہ الفقہاء (ص ۱۶۳) اسلامی فقہا نے اسے جرم عظیم خیال کیا

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولید جب مارا گیا، اور یزید بن الولید بن عبدالملک اس کا جانشین ہوا تو

ردھم الی قبرس ، ان غیر مسلم لوگوں کو اس نے قبرس واپس کر دیا

لکھا ہے کہ فقہائے امت کے اس فتوے کی جب تعمیل حکومت نے کی تو

فاستحسن المسلمون ذلک من عام مسلمانوں نے یزید کے اس کام کو سراہا

فعلہ ورد ہ عدلاً اور اس کے اس طرز عمل کو عدالت اور انصاف کا تقاضا قرار دیا گیا،

البلاذری ہی نے یہ بھی بیان کیا ہے، کہ کوہ لبنان کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ بھی اسی قسم کی صورت ایک دفعہ پیش آئی، یعنی بعض لوگ جنھوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی، ان کے ساتھ چند ایسے آدمی جو مجرم نہ تھے ان کو بھی حکومت کی طرف سے جلاوطنی کا حکم دیا گیا اس وقت امام اوزاعی موجود تھے، انھوں نے اس علاقہ کے صوبہ دار کے نام جس نے جلاوطنی کا حکم دیا تھا ایک طویل مراسلہ لکھا، اس مراسلہ کے بعض اجزاء البلاذری نے نقل کئے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے کہ

چند خاص لوگوں کے جرم میں تعین کیا حق تھا کہ جرم میں جو شریک نہ تھے ان کو بھی تم نے سزا میں شریک کر دیا، قرآن کا حکم ہے کہ "ایک کا بوجھ[1] دوسرا نہیں اٹھاتا"

امام اوزاعی نے اس قرآنی حکم کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

جس کے سامنے ٹھہر جانا چاہئے وہ قرآن ہی کا حکم ہے،

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشہور ارشاد کی طرف توجہ دلائی، یعنی اسلامی حکومت جن لوگوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے کچھ دیر پہلے انکی حفاظت و صیانت کی طرف خاص توجہ مسلمانوں کو دلائی تھی۔

میں نے اس حدیث کا پہلے بھی ذکر کیا ہے، الاحکام السلطانیہ میں الماوردی نے اسی حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری گفتگو[2] جو فرمائی وہی تھی، ان کے الفاظ یہ ہیں

روی نافع عن ابن عمر قال	نافع ابن عمر کے حوالہ سے یہ بیان کرتے
کان آخر ما تکلم به النبی	تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری

---

[1] قرآنی آیت کا مزر وازرۃ وزر اخریٰ کو امام اوزاعی نے مراسلہ میں نقل کیا تھا میں نے اسی کا ترجمہ کر دیا ہے،

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری الفاظ کے متعلق روایتوں میں بظاہر کچھ اختلاف پایا جاتا ہے، بعضوں میں ہے کہ اللھم بالرفیق الاعلیٰ آخری الفاظ تھے، بعضوں میں ہے الصلوٰۃ وماملکت ایمانکم ان لوگوں کا خیال رکھنا جن کے تم مالک ہو یعنی غلاموں کا خیال کرنا، اور بعض روایتوں میں وہی ہے کہ غیر مسلم اقوام کی مذکورۂ بالا ذمہ داری کی نگرانی و حفاظت کی طرف توجہ دلائی، مگر بظاہر اختلاف اس کو میں اس لئے قرار دیتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے متعلق آخری بات بالرفیق الاعلیٰ کی تھی مسلمانوں کے ساتھ خصوصی وصیت نماز اور غلاموں کی تھی اور سب سے جہان کی رحمت نے غیر مسلم اقوام کے متعلق جو آخری گفتگو فرمائی وہ مذکورہ الفاظ ہیں۔

صلی اللہ علیہ وسلم ان قال
احفظوا فی ذمتی،
(ص ۱۳۰)

گفتگو جو فرمائی وہ یہ تھی کہ میری ذمہ کی نگرانی کیجئے
(یعنی جن لوگوں کی ذمہ داری میں نے مسلمانوں
کے حکمران ہونے کی حیثیت سے لی ہے ان
کی ذمہ داریاں پوری کی جائیں،

بہرحال، امام اوزاعی نے اسی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے مراسلہ کے آخر میں لکھا تھا کہ
"دنیا کی ساری وصیتوں میں سب سے زیادہ توجہ اور تعمیل کی مستحق رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی وصیت ہے، آپ نے فرمایا کہ عہد جن لوگوں سے کیا جا چکا ہو، ان پر جو ظلم و
زیادتی کرے گا یا ان کی برداشت سے زیادہ بار ان پر ڈالے گا میں قیامت کے دن
اس کے خلاف مدعی بن کر کھڑا ہوں گا، (البلاذری ص ۱۶۹)

رائے عامہ اور دین کے خصوصی نمائندے یعنی علماء و فقہاء کی اسی دار و گیر کا نتیجہ تھا کہ اس
قسم کے غیر مسلم اقوام کے متعلق جب حکومت کے سامنے کوئی مسئلہ پیش آتا تو عموماً قاعدہ تھا کہ وقت
کے علمائے دین سے اس مسئلہ کے متعلق حکومت عموماً دریافت کرتی اور علماء کا جو فتوی ہوتا، اسی کے
مطابق عمل کرتی تھی،

بنی امیہ کا دور ختم ہو چکا تھا اور عباسیوں کی دولت قائم ہو چکی تھی، اسی جزیرہ قبرس ہی کے متعلق
عباسیوں کے عہد میں بھی پیچیدگی پیدا ہوئی، اور یہ سوال اٹھا کہ جو طرز عمل اس جزیرے کے غیر مسلم باشندوں
نے اختیار کیا ہے اس سے معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے یا نہیں، لکھا ہے کہ وقت کے علماء کی خدمت
میں حکومت کی طرف سے سوال بھیجا گیا جن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر لیث بن سعد امام مصر،
مالک بن انس امام دار الہجرۃ مدینہ منورہ، سفیان بن عیینہ امام حرم مکہ کے سوا، موسیٰ بن اعین، اسمٰعیل بن
عیاش، یحییٰ بن حمزہ، اسحاق الفزاری اور مخلد بن حسین بھی تھے، البلاذری نے ان میں ہر عالم کے جواب

کا ذکر کیا ہے،

الغرض جوابات اگرچہ مختلف تھے لیکن تقریباً اکثروں نے عموماً وہی جواب دیا تھا جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے دیا گیا تھا، امام مالکؒ نے جو کچھ لکھا تھا اس کا خلاصہ یہی تھا کہ

"قبرس والوں کے ساتھ امن و امان کا معاہدہ بہت پرانی بات ہے، اسلامی حکمرانوں نے ہمیشہ اس معاہدے کی پابندی کی"،

اسی کے بعد آپ نے ارقام فرمایا تھا کہ

مین نے کسی حاکم کو نہین دیکھا جس نے صلح کے اس معاہدے کو توڑا ہو، جو قبرس والون سے کیا گیا ہے اور نہ ان کو ان کے علاقے سے نکالنے کی جرات کسی نے کی، پس چاہئے کہ ان کے متعلق جلد بازی سے فیصلہ مین کام نہ لیا جائے، بلکہ معاہدے کو باقی رکھا جائے۔ قرآنی حکم کا بھی یہی اقتضاء ہے، ہان اس کے بعد بھی اگر اپنے معاہدے پر قبرس والے قائم نہ رہین، اور دشمنوں کے ساتھ اندرونی میل جول کو ترک نہ کرین، ان کی عہد شکنی واضح ہو جائے تب پھر حکومت کے لئے عذر صحیح ہوگا، اور اس کے بعد جو معاملہ بھی ان کے ساتھ کیا جائے گا امید کی جاتی ہے کہ خدا کی طرف سے

---

[1] دراصل قبرس (سائپرس) کا یہ جزیرہ بحر روم کے جزائر مین کلیدی جزیرے کی حیثیت رکھتا ہے، قسطنطنیہ کی رومی حکومت ہمیشہ یہان کے غیر مسلم باشندون کے ساتھ جو عیسائی تھے، ساز باز کرنے کے لئے جوڑ توڑ کرتی رہتی تھی، اسی سلسلہ مین مسلمانون کی حکومت کو اس جزیرے کے غیر مسلم باشندون سے شکایت پیدا ہو جاتی تھی، شکایتون کا یہ سلسلہ زمانہ تک جاری رہا، لیکن ایک دفعہ نہین بار ہا یہ صورتین پیش آئین کہ رومیون کی پشت پناہی اور ان کی ساز باز سے جرائم کا علم جزیرے کے عیسائیون کے متعلق مسلمانون کی حکومت کو ہوا حکومت تشدد پر آمادہ ہوئی لیکن مسلمانون کو دین ... اتارا ... تفصیل کے لئے طبری، ابن اثیر وغیرہ پڑھیئے۔

امداد ہوگی اور دشمنوں کو ذلت اور رسوائی اٹھانی پڑے گی[1]،

لیث بن سعد نے بھی سال بھر انتظار کرنے کا مشورہ دیا تھا،

عباسیوں ہی کے عہد حکومت کا مشہور واقعہ ہے کہ ہارون رشید نے بنی تغلب کے عیسائیوں کے ان حقوق میں دست اندازی کا ارادہ کیا جو خلافت راشدہ کے زمانہ سے اس قبیلے کے عیسائیوں کو حاصل تھے، ہارون رشید کے قاضی القضاۃ قاضی ابو یوسفؒ کی وفات ہو چکی تھی، اس لئے امام ابو حنیفہؒ کے دوسرے شاگرد امام محمدؒ بن الحسن الشیبانی کو ہارون نے بلا کر مسئلہ دریافت کرتے ہوئے اپنے ارادے کا اظہار کیا، اس نے امام محمدؒ سے کہا کہ

بنی تغلب کے ان عیسائیوں کو میں دیکھ رہا ہوں کہ جن امور کی پابندی انھوں نے قبول کی تھی ان کی مسلسل خلاف ورزی کر رہے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ ان خلاف ورزیوں کے بعد ان حقوق سے وہ محروم ہو گئے جو اسلامی حکومت کی طرف سے از روے معاہدہ ان کو حاصل تھے،،

ہارون رشید جیسے مطلق العنان حکمران کے اس ارادے اور اس کی اس تقریر کو سن لینے کے بعد آپ جانتے ہیں امام محمدؒ نے کیا فرمایا، لکھا ہے کہ ہارون سے امام نے پوچھا کہ جن دفعات کی خلاف ورزیوں کا الزام ان عیسائیوں پر آپ لگا رہے ہیں کیا یہ کوئی نئی بات ہے، یا حضرت عمرؓ بن کی حکومت نے ان سے معاہدہ کیا تھا، ان ہی کے زمانے سے ان خلاف ورزیوں کے وہ مرتکب ہوتے چلے آرہے ہیں انھوں نے یہ بھی کہا کہ عمر فاروقؓ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بھی کیا یہی وہ نہیں کرتے رہے

---

[1] امام مالکؒ کے یہ الفاظ قابل غور ہیں، تیج کی حمایت اس لئے کرنی چاہئے کہ دفع ہو اس قسم کے جھوٹ کے کھپنے کی صلاحیت کم از کم مسلمانوں میں نہیں پائی جاتی ہم تو تیج کی حمایت اس لئے کرتے ہیں کہ سب سے بڑی قوت [illegible] کی تمامت کرنے [illegible] بن جاتا ہے امام مالکؒ [illegible] فرمایا [illegible] کے [illegible] صرف [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] بنی تغلب کے عیسائیوں کی پوزیشن کی تفصیل [illegible] کی سیاسی زندگی [illegible]

جاری کر رہے ہیں اور جن کا الزام آپ ان پر لگا رہے ہیں،

امام محمدؒ نے کہا کہ حکومت کے ان سارے ادوار میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں بنی تغلب سے بازپرس نہیں کی گئی تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ

فھذا اصلح من الخلفاء بعدہ و	حضرت عمرؓ کے بعد کے خلفاء کی طرف سے
لا شئ یلحقک فی ذلک	اب گویا ان کے ساتھ صلح کی یہی صورت طے ہو گئی،
	اور اس صلح میں دست اندازی کا کوئی حق آپ کو
(تاریخ بغداد خطیب ج ۲ ص ۱۷۴)	نہیں پہنچتا

بعض روایتوں میں ہے کہ ہارون نے امام محمدؒ سے پہلے کہا تھا کہ حضرت عمرؓ کو موقع نہ مل سکا، کیونکہ بنی تغلب کے ساتھ صلح کرنے کے کچھ ہی دن بعد ان کی شہادت کا واقعہ پیش آگیا، امام محمدؒ نے کہا کہ مان لیا جائے کہ عمرؓ کو موقع نہ ملا، لیکن ان کے بعد بھی دو عادل ائمہ (عثمانؓ و علیؓ) کے زمانہ میں بھی یہ جانتے ہوئے کہ بنی تغلب معاہدے کے بعض دفعات کی تکمیل نہیں کر رہے ہیں، ان سے پوچھ گچھ نہ کی گئی، جس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ بنی تغلب کے معاہدے سے اس شرط کو عملاً حکومت نے خارج کر دیا، آپ کے لئے ایسی صورت میں دخل اندازی کی کوئی قانونی شکل باقی نہیں رہتی، لکھا ہے کہ ہارون نے امام محمد کے اس فتوے کو سن کر کہا کہ

نجریہ علی ما اجروا ان شاء	ہم بھی انشاء اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اسی طرز
اللہ تعالیٰ،	عمل کو جاری رکھیں گے جیسے ان خلفاء نے
(ج ۲ ص ۱۷۴)	ان کے ساتھ جاری رکھا،

کہتے ہیں کہ آخر میں ہارون نے امام محمدؒ سے یہ بھی کہا کہ

آپ اس شخص کے لئے دعا کرتے رہیں جس کے ہاتھ میں خدا نے لوگوں کے معاملات

سپرد کئے ہیں اور اپنے شاگردوں کو بھی کہئے کہ اسی کی وصاءت بھی کرتے ہیں (ص ۴۵۱)

دیکھا آپ نے مسلمانوں کا حکمران اپنی حکومت کے ایک غیر مسلم طبقہ کے ساتھ زیادتی کا ارادہ کر رہا تھا لیکن اسلام نے آگے بڑھ کر اس کو روک دیا اور بنی تغلب کے عیسائیوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا،

لوگ علمائے اسلام پر تنگ نظری کا الزام عائد کرتے ہیں، اسلام اپنی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے نرم و گرم ہر طرح کے لوگ عالم ہوتے رہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ کبھی بعضوں کی طرف سے ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہو، جن پر تنگ نظری کا اطلاق درست ہو، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں اکثر تو علماء میں بھی ان ہی لوگوں کی نظر آتی ہے جن کی ایک مثال امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کا مذکورہ طرز عمل ہے،

اور یہ تو خیر اسلام کے اس عہد کی مثال ہے، جس کے متعلق دوست ہی نہیں دشمنوں میں بھی جن لوگوں نے اسلامی تاریخ اور اسلامی علماء کے حالات کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کی آزادیٔ رائے اور وسعت نظری کے اعتراف میں مجبور ہیں،

مگر میں تو آپ کے سامنے اس زمانہ تک کی مثالیں پیش کرتا ہوں جب یہ واقعہ ہو کہ علمائے اسلام اپنی پرانی خصوصیتوں سے محروم ہو چکے تھے، امام محمدؒ کی طرح فتوی دینے میں قانون کے ساتھ ساتھ حالات اور واقعات کو بھی سامنے رکھنے کی عادت روز بروز کم ہوتی چلی جارہی تھی، قانون کی روح سے زیادہ قانون کے الفاظ پر اصرار بیجا کا طریقہ مولویوں میں پھیل چکا تھا، تاہم زوال و انحطاط کے اس زمانے کی بھی یہ مثالیں لوگوں کی آنکھیں کھول سکتی ہیں،

آپ جانتے ہیں کہ عثمانی ترکوں کے زمانہ کے علماء پر قانون کے الفاظ کا رعب چھایا ہوا تھا، تاہم اسی زمانہ کا قصہ ہے مشرقی یورپ کا بڑا حصہ ترکوں کے قبضہ میں آچکا تھا، نہ صرف اسی

علاقے کے عیسائیون بلکہ ترکی علاقے کے ہر عیسائی کے متعلق لکھا ہے کہ سلطان سلیم عثمانی نے ارادہ کیا کہ

"عیسائیون کو اسلام کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے یا ان کو یہ حکم دیا جائے

کہ ہمارے علاقہ سے وہ نکل جائین"

سلیم اپنے ارادہ اور عزم مین جتنا پختہ تھا، اس سے سلاطین ترکی کے حالات کے جاننے والے واقف ہین، یہ واقعہ ہے کہ سلطان سلیم کا یہ ارادہ اگر نافذ ہو کر عمل کی صورت اختیار کر لیتا تو سلطنت ترکی ہی مین نہین بلکہ بلقانی ریاستون کے اکثر حصون مین آج عیسائیت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا، مگر اس وقت بھی مسلمانون کے اس حکمران کو جس قوت نے اپنے حدود سے آگے بڑھنے نہ دیا وہ لا مذہبیت اور بے دینی کی قوت نہ تھی بلکہ دینی طاقت کے ایک نمایندہ عالم جن کا نام مفتی جمالی تھا، وہ سلیم کے دربار مین حاضر ہوتے ہین، اور اس غضبناک خونی بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر صاف لفظون مین اعلان کرتے ہین،

لا یحل لک ذلک — تمھارے لئے یہ اقدام مذہبًا کسی حیثیت سے بھی

(تعلیقات مقدمہ ابن خلدون صفحہ شکیب ارسلان) — جائز نہین ہو سکتا،

مفتی جمالی نے اس قوت کے ساتھ اسلام کے اس فتویٰ کو سلیم کے سامنے پیش کیا، کہ اس کا آہنی ارادہ بھی موم بن کر رہ گیا،

اسی سلطنت ترکی کے ایک دوسرے واقعہ کا تذکرہ تاریخون مین ملتا ہے، یہ قصہ تو طویل ہے، حاصل یہی کہ مراد رابع کا ۱۰۴۹ھ مین انتقال ہو گیا، اور خاندان عثمانی مین مراد کے بھائی ابراہیم کے سوا کوئی دوسرا شاہزادہ ایسا باقی نہ رہا تھا جسے بادشاہ بنایا جائے، ارباب حل و عقد نے ابراہیم ہی کو بادشاہ منتخب کیا، آسٹریا اور سلطنت ترکی سے جو آویزش زمانے سے چلی آرہی تھی اس آویزش کو حالانکہ ابراہیم نے صلح کر کے ختم کر دیا تھا لیکن بایں ہمہ حسب عادت یورپ

والے ترکی حکومت کو بر و بحر میں زک پہونچانے کی فکر میں لگے رہتے تھے، ایک جہاز ترکی سے عرب روانہ ہوا، اس میں حرم شاہی کی ایک حرم بھی تھی، اور حرم کے ساتھ بچہ بھی تھا، مالٹا کے بحری قزاقوں نے اس ترکی جہاز پر حملہ کیا، کش مکش کے بعد جہاز والے مغلوب ہوگئے، اور حرم سرا کی لونڈی اپنے بچہ کے ساتھ مالٹا والوں کے ہاتھ آئی، حالانکہ یہ بچہ ابراہیم کا زائیدہ نہ تھا، لیکن حرم شاہی کے ساتھ اس کو پاکر یہی مشہور کردیا گیا کہ ایک عثمانی شاہزادہ گرفتار ہوا ہے، اس شہرت کے ساتھ اس بچہ کو جبراً عیسائی بنالیا گیا، اور مذہبی تعلیم دے کر مذہبی پیشوا بھی لوگوں نے اس کو بنالیا، لکھا ہے کہ مالٹا کے عیسائیوں میں ottoman padre) یعنی عثمانی پادری کے نام سے مشہور ہوا، سارے یورپ والے اس پادری کو ترکوں کے شاہی خاندان کا شاہزادہ سمجھتے تھے، اسی کے ساتھ ساتھ جزیرہ کریٹ پر بھی اسی زمانے میں مالٹا والوں نے حملہ کردیا، بہرحال اس عام رسوائی اور فضیحت کے سوا جو اس فرضی ترکی شاہزادے کے پادری بن جانے کی وجہ سے سلطنت ترکی کی ہورہی تھی، دوسرے واقعات نے بھی انتقام کے جذبہ کو ہوا دی، ابراہیم پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی، اسی جنون میں اس نے یہ فرمان نافذ کیا کہ

"ممالک محروسہ کے ایک ایک عیسائی کو چن چن کر قتل کردیا جائے۔"

مگر ان بے قصور عیسائیوں کی جان بچانے کے لئے اس وقت بھی جو آگے بڑھا وہ سلطنت ترکی کا شیخ الاسلام ہی تھا،

امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ

ان شیخ الاسلام عارض بشدۃ فوقف عن انفاذ ھذا الامر[1] (تعلیقات مقدمہ ابن خلدون ص ۲۳۰)	شیخ الاسلام نے بڑی قوت کیساتھ ابراہیم کو اس فرمان کا مقابلہ کیا تاآنکہ شاہی فرمان کا نفاذ نہ ہوسکا

---

[1] ابراہیم نے پھر یونان کے باشندوں کے قتل کا حکم دیا جو ترکی علاقوں میں تھے، لیکن اس حکم کی تعمیل بھی نہ ہوسکی،

دور کیوں جایئے، اسی ہندوستان میں یہ واقعہ پیش آچکا ہے یعنی سکندر لودی نے علماء کو بلا کر جیساکہ فرشتہ نے لکھا ہے یہ دریافت کیا کہ تھانیسر (کورک شیتر) میں ہندوؤں کا جو اشنان گھاٹ ہے، اور طرح طرح کے افعال کا ارتکاب وہاں کیا جاتا ہے اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ ایک عالم نے سکندر کے رجحانات کو جاننے کے باوجود صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ

"نہ وہاں کے بت خانے کو آپ ہاتھ لگا سکتے ہیں اور نہ اس تالاب میں دست اندازی کر سکتے ہیں جس میں ہنود غسل کرتے ہیں،،

کہتے ہیں کہ مولوی کے اس فتوے کو سن کر سکندر بیتاب ہو گیا

دست بخنجر کردہ گفت کہ حمایت کفار می کنی، — خنجر کو ہاتھ میں لیکر سکندر نے اس مولوی کو خطاب کرکے کہا کہ تم کافروں کی حمایت کرتے ہو

بادشاہ بے دینی پر آمادہ تھا، خنجر بکف سامنے آگیا ہے لیکن اسلامی دین کا نمائندہ ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر اس وقت بھی یہی کہہ رہا تھا

انچہ در شرع آمدہ ست می گویم ورواہ خلاف نمی گویم — شریعت اسلامی کا جو حکم ہے میں اسی کو دہرا رہا ہوں اور کوئی غیر شرعی بات نہیں کہہ رہا ہوں' (ص ۱۸۷ ج ۱)

(باقی حاشیہ ص ۲۱۰) آخر میں صرف یورپین حکومتوں کے سفراء گرفتار کر لئے گئے، اور ان کو ذمہ دار ٹھرایا گیا کہ حکومت ترکی کی یہ رسوائی تم لوگوں نے اور تمھاری حکومتوں نے کیسے برداشت کی، ان میں انگلستان، ہالینڈ، وینس وغیرہ کے سفراء سب ہی شریک تھے سفیروں نے جواب دیا کہ ماشا کے ان لیٹروں پر ہماری حکومتوں کا کسی قسم کا اقتدار نہیں ہے، البتہ فرانس کی حکومت چاہتی تو ان کو روک سکتی تھی، ابراہیم نے ان کو قید سے چھوڑ دیا اور حکم دیا کہ فرانس پر چڑھائی کا اہتمام کیا جائے مگر وزراء نے کریٹ کی فتح کی طرف سلطان کو متوجہ کرکے اس ارادہ کو ملتوی کرا دیا (تعلیقات مقدمہ ابن خلدون ص ۲۴۸)

سکندر اور سکندر کے عہد کے وہ دیوی دیوتا صاحب دنیا میں باقی نہ رہے لیکن کورک شیتر اپنی ساری
عبادتگاہوں اور رہبان گھاٹوں کے ساتھ آج بھی موجود ہے، یقیناً اس دن اسلام ہی تھا جس نے ہندوؤں
کے ان معابد اور غسل خانوں کو بچالیا، ورنہ سکندر اور اس کی طاقت سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے
ہیں کہ مذہب درمیان میں اگر اس کا ہاتھ اگر نہ روک لیتا تو آج کوئی کورک شیتر کا جاننے والا بھی دنیا میں موجود رہ سکتا تھا،

بہر حال میری غرض یہ ہے کہ سلف کے اسلامی حکمرانوں پر مسلمانوں کا ایک طبقہ جو آج جھنجھلا
رہا ہے، اور اپنی موجودہ پریشانیوں کا الزام ان کے سر تھوپنا چاہتا ہے، میرا خیال ہے کہ واقعات سے
واقف ہو جانے کے بعد مسلمان بادشاہوں پر نہیں، بلکہ اس کو چاہئے کہ اسی دین پر الزام لگائے، جس
دین کی حفاظت اور صیانت کی خیالی تدبیروں میں اپنی اس تدبیر کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ اپنی حکومت
کے غیر مسلم باشندوں کو ہمارے بادشاہوں نے باقی کیوں رہنے دیا۔ ورنہ جو مصیبت ان ہی کی پچھلی نسلوں
نے مسلمانوں پر توڑی ہے اور توڑ رہی ہیں، اس مصیبت کا سدباب اسی زمانہ میں ہو جاتا

اب ان بھولے بھالے معصوموں کو میں کیا سمجھاؤں، یورپ میں تو اسی کا انتظام کیا گیا تھا، چن
چن کر وہاں کے باشندے عیسائی بنا لئے گئے[1] لیکن باوجودیکہ سارا یورپ ایک مذہب کا پیرو بن گیا، مگر
اسی ایک دین کے ماننے والے عیسائیوں کے درمیان کیا کچھ نہیں ہوا۔ اور کیا نہیں ہو رہا ہے،

غرب یورپ نے دینی وحدت ہی نہیں بلکہ تعلیم و جمہوریت، اور خدا جانے کن کن طریقوں سے ان مصائب کے
انسداد کی کوشش کی، لیکن کوئی تدبیر اس راہ میں کارگر ثابت ہوئی ہے؟

جب ان مصائب کے اسباب ہی دوسرے ہیں تو یہ خود ساختہ اسباب کے ازالہ کی کوشش ہمیشہ ناکام رہے گی، (باقی)

---

[1] عیسائی سلطنتوں نے اپنی کل رعایا کو اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا اور یوں متحد مذہب والی قومیں بنالیں، ڈاکٹر
عبدالحکیم مرحوم نے اپنی سیرت میں ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو سے یہ شہادت نقل کی ہے دیکھو انکی کتاب النبی والاسلام
خود ہندوستان میں بودھ مذہب کو اسی لئے ناپید کیا گیا مگر اسی ترکیب سے ہندوستان صدیوں کی غلامی میں مبتلا ہو گیا

ناصر الدین قباچہ کا علمی دربار

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب (علیگ)

ناصر الدین قباچہ اور شمس الدین التمش دونون سلطان قطب الدین ایبک کے داماد تھے، اور دونون علحدہ علحدہ سلطنتون کے مالک ہوئے، التمش دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا، اور قباچہ کا دار السلطنت ملتان قرار پایا، اس کی مملکت مین اُچہ، سیوستان، تبرہندہ (بھٹنڈہ)، کھرام اور سرستی وغیرہ شامل تھے، طبقات ناصری کے مؤلف مولانا منہاج سراج جو ہندوستان پہنچکر قباچہ ہی کے دربار کے علمی اُفق پر نمودار ہوئے، اس کی فہم و فراست، عقل و دانش اور تدبیر کی تعریف مین رطب اللسان ہین، ان اوصاف کے ساتھ وہ شعراء و فضلاء، اور علماء کا بھی بڑا قدردان تھا، تاتاریون کی غارتگری، وحشت انگیزی اور خون ریزی سے گھبرا کر خراسان، غور اور غزنین کے جن اکابر و اشراف نے ہندوستان کا رُخ کیا، اُن مین شعراء و علما بھی تھے، قباچہ کے دربار مین اُن کی بڑی پذیرائی ہوئی، طبقات ناصری مین ہے کہ

"اوایشان قباچہ، درحق جگنان انعام و اکرام وافر فرمودہ" (ص ۱۴۳)

محمد عوفی جس کا ستارۂ اقبال قباچہ ہی کے دربار مین چمکا، اپنے تذکرہ لبّ اللباب مین رقمطراز ہے:

"یہ دربار علماء و فضلا سے بھرا ہے یہ ایک ایسا آسمان ہے جس مین ارباب کمال کے ستارے چمکتے ہین، یہ ایک ایسا بوستان ہے، جہان فضل کی کلیان اور ہنر کے شگوفے کھلے ہوئے ہین"

(ص ۹۰ و ۹۱ جلد دوم)

عوفی نے ان علماء فضلا، اور شعراء میں صرف دو چار کا ذکر کیا ہے، ان کے نام مع القاب کے حسب ذیل ہیں،

(۱) الاجل المحترم شمس الدولہ والدین سید الندماء تاج الفضلا مفخر القدماء محمد الکاتب البلخی (۲) الاجل فخر الشعراء ضیاء الدین السجزی، بقیہ دو کے نام لب الالباب کے مرتب ای جی۔ براؤن کو غالباً قلمی نسخے کے کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے معلوم نہیں ہو سکے، اس لئے لب الالباب کے مطبوعہ نسخہ کے ص ۲۰۱ و ص ۲۲۲ میں اُن کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے، مگر اورنٹیل کالج میگزین لاہور (نومبر ۱۹۳۲ء) کے ایک مضمون نگار نے گل رعنا مؤلفہ لچھمی نرائن کی مدد سے نمبر ۲، ۱ کے شاعر کا نام فضلی ملتانی بتایا ہے،

عوفی شمس الدین محمد بلخی کے شاعرانہ کمال اور ذاتی اوصاف و محاسن، لطافت طبع خلق و کرم اور دوست پروری وغیرہ کا بڑا معترف ہو چنانچہ لکھتا ہے،

"وہ ایک ایسا جوان ہے جس کی نظیر چرخ پیر نے نہیں دیکھی ہے، اور چکر لگانے والے آسمان نے اس کے جیسا جامع صفات کسی اور کو نہیں پایا" (ص ۲۰۰)

شمس الدین بلخی اعلیٰ درجہ کا خطاط بھی تھا، عوفی کا بیان ہے کہ وہ اس فن میں مشہور خطاط ابن البواب اور ابن مقلہ سے بھی بہتر تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"در خط بدرجۂ کہ ابن البواب انگشت بر حرف او نتواند نہاد و ابن مقلہ دیدہ از مشاہدہ دلبران خط او بر نتواند داشت" (ص ۲۲۱)

عوفی رقمطراز ہے کہ شاعری میں شمس بلخی انوری کا ہم پایہ تھا، "در شعر عدیل انوری" (ص ۲۲۱)

اور تاج الفضلا اور مفخر القدماء کے جیسے القاب سے اس کو یاد کیا ہے، قباچہ کے دربار میں اس کی شاعری کو اور بھی زیادہ فروغ ہوا، اور اس نے سلطان کی مدح کے قصائد میں اپنی شاعری کا جوہر خوب دکھایا، اس کا سرپرست اور مولیٰ قباچہ کا وزیر عین الملک بھی تھا، اس کی مدح میں بھی شمس الدین

قصیدے لکھے جن کا ذکر آئے گا۔

مولانا فضلی ملتانی بخارا میں عوفی کے ہم درس اور ہم مکتب تھے یہیں دونوں نے امام فخر الدین کی جامع الصغیر حفظ کی، جب مولانا فضلی ملتانی قباچہ کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے تو یہاں ان کے علم و فضل کو ایسا عروج ہوا کہ ابنائے کبار و علمائے نامدار میں اس کا شمار ہونے لگا، (لب الالباب جلد دوم ص ۲۲۳) وہ اپنے زمانہ کے ممتاز شاعر بھی تھے، اور قباچہ اُن کی شاعری کا قدردان تھا، اس قدر دانی کی وجہ سے ان کو بھی سلطان کی ذات سے گرویدگی تھی، چنانچہ اس کی شان میں قصائد لکھکر اپنے جذبات و تاثرات کا اظہار کیا ہے، ایک قصیدہ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں،

اے ظفر ہمدم تر از بخت بر نا آمدہ نامۂ تائید تو اِنّا فتحنا آمدہ
ناصر دین خسرو دنیا قباچہ شاہ شرق اے سر چتر تو بر گردون مینا آمدہ
از پئے اعلائے دین نصر من اللّٰہ در ازل بر سر منشور شاہی تو طغرا آمدہ
منظر قصرت ز کیوان در گذشتہ از علو مسند قدرت بر از عرش معلا آمدہ
ظلم پیدا فتنہ پنہان کردہ روی از ہیبت امن سر پوشیدہ از عدلت بصحرا آمدہ
گر مثالت فی المثل رفتہ سوی فغفور چین بے توقف زو جواب تو اطعنا آمدہ
ابر نیسان کم زدہ لاف سخاوت چون کفت در گہر بخشی فزون از ہفت دریا آمدہ
بادۂ جام تو اے اسکندر ثانی بہ بزم چون زلال چشمہ حیوان مصفا آمدہ
چون کشتی لشکر بعزم رزم لشکر گاہ تو جملہ ہامون و دشت و شیب بالا آمدہ[1]

ناظرین کی ضیافت کے لئے مولانا فضلی کی کچھ رباعیاں بھی پیش کیجاتی ہیں،

کردی سیم زان شب گیسو کہ تراست نیکوست رخت و لیک بہ خوکہ تراست

---

[1] لب الالباب جلد دوم ص ۲۲۵،

در پہلوے تیر غمزۂ مردم کش   احسنت زہے کمان ابروکہ تراست

آغاز نہاد فتنہ بازش چہ کنم   چون داشتہ ام محرم رازش چکنم

بسیار زخشم دست بر دست زدم   کوتاہ نشد دست درازش چکنم

ہر لالہ کہ چشم کوہساری بودست   صد قطرہ زخون تاجداری بودست

مپسر بقدم سبزۂ بستان گستاخ   کان وسمۂ ابروی نگاری بودست

ضیاء الدین سنجری کو عوفی نے فخر الشعراء لکھا ہے، یہ اپنے زمانہ کے قادر الکلام شاعر تھے، اس کے قصیدہ کا نمونہ آگے پیش کیا جائے گا،

طبقاتِ ناصری کے مؤلف مولانا ابو عمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین الجوزجانی کا علمی اقبال بھی ہندوستان مین قباچہ ہی کے دربار مین چمکا، انکا سنہ پیدائش ۵۸۹ھ ہے، انھون نے سلطان غیاث الدین محمد بن سام کی لڑکی شہزادی ماہ ملک کے محل مین پرورش پائی، ان کی والدہ کو شہزادی ماہ ملک کی دودھ شریک بہن ہونے کا فخر حاصل تھا، ان کے دادا کی شادی غزنین کی شاہی خاندان مین ہوئی تھی، سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد مختلف مقامات مثلاً حصار تولک، کریو، تمران اور غور کی سیاحت کی، مختلف مقامات مین مختلف سلطانون کی جانب سے رسالت وسفارت کی خدمت انجام دیتے رہے، ۶۲۱ھ و ۶۲۲ھ مین حصار تولک سے قستان اسی خدمت کے سلسلے مین گئے تھے، ۶۲۳ھ مین ملک غزنار کے رکن الدین محمد بختیار کی جانب سے سیستان کے بادشاہ ملک تاج الدین نیالتگین کے پاس گئے، اس نے ان کو اس سال قستان کے بادشاہ شمس الدین محتشم کے پاس بھیجا، وہان سے واپس ہو کر ملک رکن الدین کے ساتھ قیام پذیر ہوئے، اور دوبارہ ملک رکن الدین کے لڑکے کے ساتھ نیالتگین کی جانب شرائط صلح طے کرنے کے لئے شمس الدین

محمد شاہ کی خدمت میں بھیج گئے، وہاں سے مراجعت کے بعد بنا لگین نے ان کو پھر شمس الدین التمش کے پاس بھیجنا چاہا، تو انھوں نے انکار کیا، اس کی سزا میں قید میں ڈال دیئے گئے، مگر ملک رکن الدین کی سفارش سے رہا ہوئے، رہائی کے بعد غزنین ہونے ہوئے سنہ ۶۲۴ھ میں اُچ پہونچے، ناصرالدین قباچہ کے دربار میں اُن کی بڑی پذیرائی ہوئی، مدرسۂ فیروزی اُن کے سپرد کیا گیا، اور قباچہ کے لڑکے علاؤالدین بہرام شاہ کے لشکر کے قاضی مقرر ہوئے[1]، ان کا ذکر دوسرے سلاطین دہلی کے سلسلہ میں بھی آئے گا،

قباچہ کے دربار کی علمی فضا اس کے وزیر عین الملک ملک الندما، فخرالدین الحسین ابن شرف الملک رضی الدین ابی بکر الاشعری کی علم دوستی اور علم پروری سے اور بھی زیادہ روشن اور منور تھی، وہ علوم و فنون کا دلدادہ اور اپنے آقا کی طرح شعراء کا بڑا مربی اور سرپرست تھا، شعراء سلطان اور وزیر دونوں کی شان میں قصیدے کہتے اور دونوں سے داد پاتے تھے، عین الملک کی مدح میں تاج الفضلا، مولانا شمس الدین بلخی ایک قصیدہ میں کہتے ہیں،

یوسفِ کنعانِ حسنے در دو عناب تو ہست — سال و ماہم پائمال دست گرگان یافتہ

زر دریائے ملاحت صورتِ زیبائے تو — اشکم اندر عشق خود ہم رنگ مرجان یافتہ

آبِ حیوان لعلِ تست و معجزِ عیسیٰ خرد — دایم از خاک در دستور گیہان یافتہ

صاحبِ جمشید رتبت فخرِ دنیا عین ملک — آنکہ ملک از رائے او تمکین و امکان یافتہ

از سواد موسیٰ کلکت ید بیضائے ملک — ہمچو موسیٰ از عصا اعجاز ثعبان یافتہ

خصم بدکیش ترا چرخ کمان وش روز عید — از حسامت بر بساط کینہ قربان یافتہ

تا جہان باشد بقائے دولت و جاہ تو باد

اے جلالِ عز و جاہ از فضل یزدان یافتہ

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۴۲ و ۱۵۸ - و ۱۸۸ ص ۴۲۳ و ص ۴۱۴، ص ۴۱۶ و ص ۱۴۴،

ضیاء الدین بجزی نے بھی عین الملک کی مداحی کی ہے جس کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں، ان سے قصیدہ نگار کے ممدوح کی فیاضی اور علم دوستی کے ساتھ اس کے کلام کا رنگ اور اس زمانہ کی قصیدہ گوئی کے طرز کا کچھ اندازہ بھی ہوگا،

زین طراوت تا ابد خالی نہ بینی باغ ما　　زانکہ از دولت سرای صاحب دریا عطاست

خواجۂ آفاق عین الملک کز تعظیم او　　آسمانِ مرتبت را آفتابِ کبریاست

آصفِ جمشید رتبت فخرِ دین و دولت آن　　کاستان چرخ سایش سجدہ جای اصفیاست

ای حسن خلق حسین اسمی کہ از بہر شرف　　بخت بر درگاہ امرت بندۂ فرمانرواست

صاحبا در بندگیت ایام برنائی تمام　　صرف کردم جاہ تو بر صدق دین و عوی گواست

ملجأ خود جز جناب جاہ تو نشناختم　　از جوانی تا گہ پیری کہ ہنگام عناست

عہد برنائی گذشت اکنون مویم شد سپید　　ور نمانہ نا امید یہای دیگر در قفاست

در جوانی چون عزیزم داشتی از راہ لطف　　حق پیری را اکنون گر شناکرم اری رواست

باد عا سازم کہ در مدح تو عاجز یافتم　　خاطر خود را اگرچہ مبلغ حمد و ثناست

رتبتِ صدر وزارت جاودان جاہ تو باد
کز ترقی جاہِ تو پیرایۂ عز و بقاست[1]

عین الملک کی مدح میں لباب الالباب میں ایک اور قصیدہ درج ہے مگر قصیدہ نگار کا نام مرتب لباب الالباب کو معلوم نہیں ہو سکا، گو اس کے کچھ حالات کتاب میں موجود ہیں، وہ بامیان کا رہنے والا تھا، صاحب قلم اور صاحب سیف بھی تھا، اس نے سمنگان اور سیرک کی ایالت بھی کچھ دنوں تک کی تھی، سلطان جلال الدین کی طرف سے اس کو بغرش کا لقب عطا ہوا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان

---

[1] لباب الالباب ص ۴۰، ۲۴۲،

ملک میں اس کی قدر دانی کم ہو گئی تھی، اسی لئے وہ قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان پہونچا یہاں قباچہ کے دربار سے وابستہ ہوا، اور عین الملک کے دامن عاطفت میں پناہ لی، اور بقول عوفی اپنے قلم مشکبار سے اس کی مداحی شروع کی، اس کی شان میں ایک قصیدہ سوال و جواب کی شکل صنعت میں لکھا ہے لیکن اس صنعت کے باوجود قصیدہ کا ہر شعر زور بیان، سلاست اور روانی کی اعلیٰ مثال ہے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

گفتم بدان نگار کہ خورشید انوری — گفتا ز وی نکو ترم ار نیک بنگری
گفتم کہ دل ربائی جانان ز عاشقان — گفتا بزلف عنبری و چشم عبہری
گفتم مہ چہار دہی بر سپہر حسن — گفتا مہ مراست ہزاران تو مشتری
گفتم بہ بندگی تو اقرار می کنم — گفتا چو تو بسیت کنونم بچہ کری
گفتم کہ جان نزد تو آرم بخدمتے — گفتا کہ تحفہ ایست ز بے سیمی و زری
گفتم کہ می فشانی ز اوصاف شاعریت — گفتا کہ زندستانیت آئین دلبری
گفتم کہ شعر من گہر بحر خاطرست — گفتا کہ شعر خواہم دیبای ششتری
گفتم ثنائے صاحب آفاق خوانمت — گفتا کہ چون بخوانی خوانم بابری
گفتم کہ عین ملک جہان فخر دین حق — گفتا کہ آن حسین ابو بکر اشعری
گفتم بیان اوست بہ از تیغ خسروی — گفتا بنان اوست بہ از رمح صفدری
گفتم گہر برآرد غواص کلک او — گفتا ز بحر وصل گہ آشنا وری[1]

عین الملک کے گلدستہ علم و ادب کا گل سر سبد نور الدین (یا سدید الدین) محمد عوفی تھا، وہ مشہور صحابی، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی اولاد سے تھا، اسی لئے عوفی لکھتا ہے، عوفی کے دادا قاضی الامام شرف الدین سید المحدثین ابو طاہر یحییٰ بن طاہر بن عثمان العوفی ماوراء النہر کے مشہور علماء میں تھے

[1] لباب الالباب جلد دوم ص ۱۰۹،

عوفی بخارا میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی، پھر اس کی تکمیل اور علما و مشائخ سے استفادہ
کے لئے ماوراء النہر، خراسان، سمرقند، اوش، خوارزم، مرو، نیشاپور، ہرات، اسفزار، سجستان، فرواہ
غزنین کی سیاحت کی، اور یہاں کے علماء و فضلاء سے مستفید ہوا، سفر کے دوران میں امراء و سلاطین
سے بھی تقرب حاصل کرتا رہا، ۵۹۷ھ میں ماوراء النہر کے بادشاہ شاہ قلیچ طمغاج خان ابراہیم کے لڑکے
قلیچ ارسلان خاقان نصرۃ الدین عثمان کی ملازمت میں داخل ہو کر اس کے دیوان انشاء کا نگران مقرر ہوا،
مگر یہاں زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہرا، یہاں سے نکل کر کچھ دنوں خراسان میں رہا، اور نیشاپور، اسفرائن اور
ہرات وغیرہ کی سیاحت کی، پھر تاتاریوں کی یورش کے زمانہ میں خراسان سے نکل کر ۶۱۷ھ میں
ناصر الدین قباچہ کے دربار میں اُچہ پہنچا، یہاں اُس کو شاہی امام و واعظ کے عہدہ پر ممتاز کر کے اسکی
قدردانی کی گئی، ۶۱۷ھ میں عید کے موقع پر اُس نے عربی میں جو خطبہ دیا تھا، وہ لباب الالباب جلد
اول ص ۱۱۵ پر منقول ہے، کچھ دنوں کے بعد وہ کسی عہدہ پر مامور ہو کر کنبھائت پہنچا، یہاں اُس نے
قاضی ابی علی المحسن بن علی بن محمد بن داؤد تنوخی (المتوفی ۳۸۴ھ) کی کتاب الفرج بعد الشدۃ کا فارسی
ترجمہ شروع کیا، اور اپنے آقا کے نام کے ساتھ اس کا انتساب کیا، اس انتساب میں اس نے سلطان
کے لئے جو القاب استعمال کئے ہیں، اس سے اس کے ساتھ اس کے احترام و عقیدت کا پتہ چلتا ہے، لکھتا ہے:-

"قدر فرمان ملک معظم خسرو اعظم مالک رقاب امم مولی ملوک الترک والعجم ناصر الدنیا و
الدین غیاث الاسلام والمسلمین اعدل الملوک واکرام السلاطین سلطان ارض اللہ ناصر عباد اللہ
حافظ بلاد اللہ المؤید بنصر اللہ محترز ممالک الدنیا مظہر العلیاء ابو الفتح قباچہ[1]"

عوفی کا اصلی شاہکار اس کی کتاب لُبابُ الالباب ہے جو اُس نے ناصر الدین قباچہ کی

---

[1] انڈیا آفس کیٹلاگ ص ۵۰۴، نمبر ۳، عوفی کے حالات کے لئے دیکھو مقدمہ لباب الالباب حصہ اول، براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۴۷۷-۴۸۰،

ملازمت کے زمانہ میں عین الملک کی سرپرستی میں لکھی، یہ کتاب دو جلدوں میں پروفیسر براؤن نے محمد بن عبدالوہاب قزوینی کی تعلیقات کے ساتھ ۱۹۰۳ء میں انگلستان سے شائع کی ہے، پہلی جلد سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلے چار ابواب میں شعر و شاعری کی فضیلت اور معنی پر بحث ہے، پانچویں اور چھٹے میں مختلف سلاطین، ملوک، امراء اور وزراء کی فارسی شاعری کا ذکر ہے، ساتویں میں ماوراءالنہر، خراسان، نیمروز، عراق، غزنین اور جبال کے ائمہ، علماء اور فضلاء کی شاعری پر تبصرہ ہے، دوسری جلد کی پانچ فصلوں میں آل طاہر، آل لیث، آل سامان، آل ناصر، آل سلجوق اور ناصرالدین قباچہ کے درباری شعراء کا بیان ہے، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب فارسی کے ابتدائی دور کے شعراء کا تذکرہ ہے جو دولت شاہ کے تذکرۃ الشعراء سے ڈھائی سو سال پہلے لکھا گیا ہے، اس لحاظ سے فارسی شعراء کے تذکروں میں یہ قدیم ترین تذکرہ سمجھا جاتا ہے[۱]، فارسی کے بہت سے قدیم شعراء کے حالات اور ان کی شاعری کے نمونے صرف اسی کتاب کی بدولت ملتے ہیں، گو مصنف نے اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق شعراء کے حالات زیادہ تفصیل سے تو نہیں لکھے ہیں، پھر بھی فارسی کے قدیم شعراء کی شاعری کے مطالعہ کے سلسلہ میں یہ کتاب اب تک بہت زیادہ قابل قدر سمجھی جاتی ہے، اس کی عبارت شروع سے آخر تک مسجع اور مرصع ہے جس کو اس زمانہ کی انشا پردازی کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے،

یہ کتاب عین الملک کی سرپرستی میں لکھی گئی، اس لئے مؤلف نے دیباچہ کے ابتدائی چھ صفحوں میں اپنے مربی اور محسن کی مدح و توصیف نثر اور نظم دونوں ہی کی ہے، نثر میں جو القاب اپنے ممدوح کے لئے لکھے ہیں وہ ... عین الملک سے اس کی عقیدت کے ساتھ اس کے اشہب قلم کی جولانی کی بھی دلیل ہیں، دیباچہ کے علاوہ بھی جا بجا وہ عین الملک سے اپنے عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار والہانہ انداز سے کرتا ہے، ایک قصیدہ میں کہتا ہے:-

---

[۱] دیکھو مقدمہ لباب الالباب جلد اول از براؤن ص ۱۱ - لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۴۴۴،

مردم دیدہ نگر چون روح در تن آمدہ || بادہ از زیر موج اشک بر سر آمدہ

دو عینی بین کہ چون نزدیک گردد غم بدو || چون عروس شادمان در در و گوہر آمدہ

آن بہشتی لعبت میمون لقا را روز و شب || منزل و ماوی نگر در آب کوثر آمدہ

چون مشعبد ہندوی زنگی نژاد حبشی او ببین || دست لعبت ہر زمان از رنگ دیگر آمدہ

ہمچو لطف صاحب صاحب قرآن تصویر او || نزد اہل عقل و دل با جان برابر آمدہ

آصف ایام عین الملک فخر الدین کہ ہست || قدر او از مرکز افلاک برتر آمدہ

قدوۂ دوران حسین ان صاحبی کز عز و جاہ || راہ را خاک درش از رنگ وافسر آمدہ[1]

ایک قطعہ میں رقمطراز ہے:

توآن وزیرے کہ انصاف پادشاہ جہان || بحکم تست منور زہے ستودہ وزیر

ہر آنکہ جز تو کسے را وزیر پندارد || جلال و قدر تو واجب کند برو تعزیر

توئی سزاے وزارت بلے بکس نرسد || گزاف دولت واللہ بالعباد نصیر[2]

(اپنے مربی کے لئے بار بار دعائیں کرتا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے،

تا فلک گردان بود دستور عین الملک باد || دیدۂ ملک جہان را نور عین الملک باد

چون بناے ظلم از والی عدلش شد خراب || تا بود قصر سما معمور عین الملک باد

واے پیرشس چون غم کار ممالک می خورد || دایم از بخت جوان مسرور عین الملک باد

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے،

اے آنکہ پاسبانی قصرت از زحل || چون ماہ و آفتاب بجان گشت مشتری

تا نقش صورتش طراز جلال باد || صدر جہان حسین ابوبکر اشعری

۱؎ لباب الالباب جلد اول ص ۹۴ ۲؎ ایضاً ص ۵

عین الملک کے حق میں دعائیں کرتا ہوا عوفی اپنی کتاب کو ختم کرتا ہے، دعا کے آخری دو شعر یہ ہیں:۔

زمانہ را یسار تو باد جملہ یسار — سپہر را بہ یمین تو باد جملہ یمین

زخلق بر تو ثنا باد و از فلک احسنت — زبخت بر تو دعا باد و از ملک آمین

یہ جذبات محض شاعرانہ نہیں ہیں، بلکہ اپنے سرپرست کی علم پروری اور علم دوستی کا سچے دل سے معترف ہے، ایک موقع پر لکھتا ہے،

"شعر را ہیچ فضیلت نیست جز آنکہ جلوہ گری جلال صدر ایوان جمال و ماہ آسمان کمال و یگانہ بشر و دوم مطر و سیوم شمس و قمر صاحب کبیر عالم عادل موید مظفر منصور مجاہد عین الملک ملک الوزرا راست ضاعف اللہ جلالہ تامت" (ص ۱۶ جلد اول)

ایک دوسرے موقع پر عین الملک کے متعلق رقمطراز ہے،

"بآداب فضائل قدوۂ سحبان وائل و صاحب و صابی در دیوان معاملت پیش او کی صبی و دیگر باقل" (جلد اول ص ۱۹۳)

عوفی کی دوسری مشہور تصنیف جوامع الحکایات ولوامع الروایات ہے جو اس نے سلطان ناصر الدین قباچہ ہی کے حکم سے لکھنی شروع کی تھی، مگر ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی، کہ قباچہ التمش کے ہاتھوں شکست کھا کر دریائے سندھ میں ڈوب کر اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی، عوفی بھی دوسرے فضلا، و شعرا، کی طرح التمش کے دربار میں منتقل ہو گیا، اور اس کے وزیر نظام الملک محمد بن ابی سعد الجنیدی کی سرپرستی میں اس نے جوامع الحکایات ولوامع الروایات کو مکمل کر کے اس معارف پرور وزیر کے نام سے معنون کیا، (دیکھو دیباچہ جوامع الحکایات) یہ کتاب چار جلدوں میں ایک سو ابواب پر مشتمل ہے، اور اس میں دو ہزار ایک سو تیرہ حکایتیں ہیں، یہ اپنی خصوصیات

کی وجہ سے بہت مقبول اور مشہور ہوئی اور مختلف زبانون مین اس کے ترجمے ہوئے، اس کی بعض حکایتین تاریخی لٹریچر کی حیثیت رکھتی ہین، اور بعض قصون مین مذہبی، علمی، معاشرتی، عمرانی نکات پیش کئے گئے ہین، اور زیادہ تر ایسی کہانیان ہین جن مین اخلاقی مسائل مثلاً عدل، حیا، تواضع، عفو، کرم، حلم، بردباری، ہمت، رحم، ایثار، سخاوت، صبر و شکر، حزم، زہد، جد و جہد، سکوت، نطق، وفاداری، محافظت عہد، امانت داری، اور دوسرے مکارم اخلاق کے سبق آموز پہلو کی وضاحت کی گئی ہو،

عوفی نے یہ تمام حکایتین تاریخ اور دوسرے فنون کی کتابون سے جمع کی ہین، اُن کے نام بھی جا بجا لکھدیئے ہین، مثلاً تاریخ یمینی، تاریخ ناصری، تاریخ ملوک العجم، تاریخ العباس، مجمع الامثال، عیون الاخبار، شرف النبی، الفرج بعد الشدۃ، خلق الانسان، فوائد کتب حکایتی، مفتاح الحجج، سراللہ، فرحۃ الحق، اخبار البرامکہ وغیرہ،

عوفی کی ایک کتاب مدائح السلطان بھی تھی، جس مین غالباً اس کے قصائد کا مجموعہ تھا،

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخ عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ

(حصہ اول)

دار المصنفین کے سلسلہ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی حلقون نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدر افزائی کی، متعدد یونیورسٹیون کے نصاب مین بھی شامل ہے، اس لئے اس کے کئی حصے ختم ہوگئے، جو اس وقت زیر کتابت و طباعت ہین، اس کی پہلی جلد دوبارہ چھپ کر شائع ہو گئی ہے، اس کے پہلے اڈیشن مین جو خامیان رہ گئی تھین ان کی اس مین اصلاح کر دی گئی ہے، اس مین آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی پوری مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ آگئی ہے،

ضخامت   صفحے   قیمت   مینجر

تفسیر ابن جریر طبری کی اہمیت

از

جناب ابو محفوظ الکریم صاحب ریسرچ اسکالر مدرسہ عالیہ ڈھاکہ

امام المفسرین علامہ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری ان ائمہ کبار میں ہیں جن کی نادر تصانیف کی بدولت اسلامی علوم زندۂ جاوید رہیں گے، آپ کی ولادت ۲۲۴ھ قصبۂ آمل[1] واقع طبرستان میں اور وفات ۳۱۰ھ بروز شنبہ[2] شوال کے مہینے، ستاسی[3] برس کی عمر میں بغداد میں ہوئی، اور یکشنبہ کے دن[4] اپنے گھر میں مدفون ہوئے[5]۔

امام طبری نے بغداد کو اپنا مسکن[6] بنایا، بغداد کے مشرقی حصہ میں قنطرۃ البردان میں آپ کی سکونت تھی، یہ مقام بڑے بڑے ائمہ نحو و لغت کا فرودگاہ رہا ہے، ابو عبید قاسم بن سلام، علان الازدی، ابو بکر بن معاویہ الضریر، ابو عبید اللہ محمد بن یحییٰ الکسائی جیسے اکابر اعیان قنطرۃ البردان میں رہے تھے، ان میں سے

۱؎ آمل (بفتح میم و اللام) طبرستان کا ایک مردم خیز شہر تھا، جہاں طبری جیسے ائمہ علم و فن پیدا ہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر یہاں سے آملی طبری کہلائے، جیحون کے مغربی ساحل پر فربر (فربری راوی صحیح بخاری کا وطن) کے بالمقابل ایک اور شہر اسی نام کا آباد تھا جو آمو اور اموّیہ بھی کہلاتا تھا، تفسیر طبری مطبوعہ میمنیہ کے شروع میں امام طبری کا ترجمہ طبقات ابن السبکی اور وفیات الاعیان سے الگ الگ منقول ہے جس میں طبری کی جائے پیدائش کا نام بجائے آمل طبرستان کے آمد طبرستان مرقوم ہے، یہ طباعت کی غلطی ہے، کیونکہ طبرستان کے کسی خطہ کا نام آمد نہیں، بلکہ یہ دیار بکر کے ایک مشہور شہر کا نام ہے، جو ۲۳ھ میں عربوں کے ہاتھوں فتح ہوا، (معجم البلدان جلد اول ص ۷۵-۷۶، کتاب الفہرست ص ۳۲۶، الانساب ج ۴ ص ۲۳۳) ۲؎ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام طبری ۳؎ الانساب جلد ۴ ص ۲۳۳ ۴؎ الفہرست ص ۳۲۶ ۵؎ الانساب ج ۴ ص ۲۳۳ ۶؎ تاریخ بغداد جلد ۲ ص ۱۶۶ و معجم الادباء جلد ۱۸ ص ۴۹

ہر ایک کی سمجھ اپنے اپنے زمانہ مین طلاب علم وادب کا کعبۂ مقصود رہ چکی تھی، علامہ طبری نے بصرہ، کوفہ، مصر، شام، اور دیگر بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے بعد اپنی اقامت کے لئے اسی مقام کو منتخب کیا، تفسیر و حدیث، فقہ و احکام، نحو و لغت کے علاوہ منطق، طب، علم حساب، جبر و مقابلہ مین بھی آپ کو دستگاہ حاصل تھی، کثرت معلومات اور حذاقت کا یہ حال تھا، کہ جس فن مین تقریر یا تحریر کرتے، اس مین فرد و یگانہ معلوم ہوتے، عبد العزیز ابن محمد کا بیان ہے[1]،

"وکان کالقاری الذی لا یعرف الا القرآن	ایسے قاری معلوم ہوتے تھے گویا قرآن کے سوا کچھ نہین جانتے،
وکالمحدث الذی لا یعرف الا الحدیث	اور ایسے محدث ،، ،، حدیث ،، ،،
وکالفقیہ الذی ،، الا الفقہ	،، ،، فقیہ ،، ،، فقہ ،، ،،
وکالنحوی الذی ،، الا النحو	،، ،، نحوی ،، ،، نحو ،، ،،
وکالحاسب الذی ،، الا الحساب	،، ،، حساب دان ،، ،، حساب ،، ،،
وکان عالمًا بالعبادات جامعًا للعلوم الخ	اور عبادات کے عالم و علوم کے جامع تھے وغیرہ وغیرہ'

علامہ طبری کے حالات زندگی سے بحث کرنا اس مضمون کا مقصد نہین، اُن کے حالات معارف مین شائع ہو چکے ہین[2]، بلکہ یہان صرف اُن کی شہرۂ آفاق تصنیف جامع البیان فی تاویل القرآن کے مختلف مضامین کا اجمالی خاکہ پیش کرنا مقصود ہے،

تفسیر طبری کو اگر معارفِ قرآنیہ کی انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو بجا ہے، عالم اسلامی مین شاید یہ پہلی تفسیر ہے جو اُمت کی ضرورتون کے ماتحت روایت و درایت، فقہ و کلام، ادب، لغت و زباندانی کی قیمتی تحقیقات سے آراستہ کی گئی،

---

[1] معجم الادباء جلد ۶ ص ۴۱۱ [2] رسالہ معارف اعظم گڈھ، پرچہ ماہ اگست و ستمبر ۱۹۲۳ء، از جناب مولوی محمد اویس صاحب نگرامی،

اس تفسیر سے قبل صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مختلف ادوار میں قرآن حکیم کی تفسیریں مدون ہو چکی تھیں لیکن ان تفسیروں کی حیثیت تفسیری روایات و آثار کے مجموعوں سے زیادہ نہیں تھی، محدثین کی تفسیریں بھی اسی قسم کی تھیں، امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ اور امام مسلمؒ وغیرہم کے ابواب التفسیر ہماری نظروں کے سامنے ہیں جن سے تابعین و تبع تابعین کی تفسیروں کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے،

ائمۂ نحو عربیہ نے معانی القرآن، غریب القرآن اور اعراب القرآن وغیرہ لکھ کر قرآن حکیم کی بلا شبہہ خدمت کی، اور یہ فرض بحسن و خوبی انجام دیا لیکن اب تک کوئی ایسی تفسیر نہیں لکھی گئی تھی، جو صحابہؓ و تابعین کی تفسیروں، مفرداتِ قرآنیہ کی لغوی تحقیق، زبانِ عربی کے اسالیب و تراکیب کے مباحث، اختلافِ لغات و قراءت، مباحثِ فقہیہ، مضامین علم الکلام اور قرآنی نکات و معارف کا مجموعہ ہو، اس قسم کی سب سے پہلی تفسیر جامع البیان ہی نظر آتی ہے، جس کے اوراق میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت سعید بن جبیر رضوان اللہ علیہم اور مجاہد، قتادہ، حسن بصری، عکرمہ، ضحاک، عبد الرحمن بن زید بن اسلم، ابن جریج، مقاتل بن حیان کی تفسیروں کا عطر و خلاصہ کھنچا ہوا ہے، اعراب و معانی اور بلاغت و زباندانی کے مضامین علی بن حمزۃ الکسائی، یحییٰ بن زیاد الفراء . . . . .

. . . . ابو الحسن الاخفش اور ابو علی قطرب کی کتابوں سے ماخوذ ہیں[۵۹]، امام موصوف نے اپنی تفسیر میں عقلی نتائج و استنباط[۶۰] اور مسائل کلامیہ کی تشریح کو بھی ملحوظ رکھا ہے، آیاتِ قرآنیہ سے فقہی مسائل کے استنباط میں بھی قوتِ اجتہاد کا ثبوت دیا ہے، ساتھ ہی قدریہ[۶۱]، جہمیہ، معتزلہ اور روافض وغیرہ فرقِ باطلہ کی تردید و ابطال اور دیگر شبہات کا حل بھی کرتے گئے ہیں، اور اسی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ تابعین و تبع تابعین کے اقوال کو بیان کرنے کے بعد ایک نقاد و مبصر کی حیثیت سے اپنے مختار اور راجح مسلک کی بھی تصریح کرتے ہیں،

---

[۵۹] الادباء ج ۱۸ ص ۶۲ [۶۰] ۲۸ ص ۶۵ [۶۱] ملاحظہ ہو تفسیر طبری مطبوعہ میمنیہ ج ۱ ص ۱۲۳، جلد ۱ ص ۲۹۱، جلد ۱۵ ص ۱۳ وغیرہ [۶۲]

ملاحظہ ہو تفسیر طبری، ص ۵۳، ۵۵، ۱۲۰، ۵۲ - جلد اول مثلاً،

ابوبکر بن بالویہ کے قول کے مطابق اس تفسیر کی تصنیف کا زمانہ ۲۸۳ھ ہجری سے ۲۹۰ھ تک ہے[۱]
ان کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن جریر طبری نے پوری تفسیر کا املا کرایا تھا[۲]، امام طبری کے
ایک اور شاگرد ابوبکر بن کامل کا بیان ہے[۳]،

املی علینا من کتاب التفسیر مائۃ	کتاب تفسیر سے ڈیڑھ سو آیتوں کی تفسیر
وخمسین آیۃ ثم خرج بعد ذلک الی آخر	کا املا کرایا پھر آخر قرآن تک پڑھ گئے،
القرآن فقراءہ علینا وذلک فی سنۃ سبعین[۴]	یہ ۲۷۰ھ میں واقع ہوا،

اس کتاب کی عظمت اور اہمیت کی سند اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ عربی زبان کے بڑے بڑے
مثلاً احمد بن یحیٰی ثعلب، ابو العباس محمد بن یزید المبرد، ابو جعفر الرستمی، ابو حسن بن کیسان، مفضل بن سلمہ
جعد، ابو اسحاق الزجاج وغیرہ کی موجودگی میں تفسیر طبری کو مقبولیت عامہ حاصل ہو چکی تھی، اس عہد کے علماء نے
اس کو دیکھا، اور اس کی اہمیت و عظمت کا اعتراف کیا[۵]، فقیہ ابو حامد الاسفرائنی کہتے ہیں[۶] "کہ اگر کوئی
شخص صرف تفسیر ابن جریر کے لئے چین کا سفر کرے تو بھی کچھ زیادہ نہیں" ابن خزیمہ نے ابوبکر بن بالویہ
سے اس کتاب کو مستعار لے کر دیکھا، اور ایک مدت کے بعد یہ کہتے ہوئے واپس کیا[۸]،

قد نظرت فیہ من اولہ الی آخرہ	میں نے اول سے آخر تک اس کتاب پر
وما اعلم علی ادیم الارض اعلم	نظر ڈالی، اور میرے علم میں روئے زمین
من محمد بن جریر ولقد ظلمتہ	پر محمد بن جریر سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں،
الحنابلۃ،	حنابلہ نے اُن کے ساتھ ظلم کیا،

علامہ سیوطی اتقان[۹] میں فرماتے ہیں،

۱؎ تاریخ بغداد جلد ۲ ص ۱۶۲، ۲؎ الادباء ج ۱۸ ص ۶۲ ۳؎ الادباء جلد ۱۸ ص ۴۲ ۴؎ ایضاً ص ۶۳ ۵؎ کشف الظنون
(فلوگل) ص ۳۴۶ ج ۲ ۶؎ الادباء جلد ۱۸ ص ۴۳ ۷؎ تاریخ بغداد جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ ۸؎ ایضاً ص ۱۹۱،

عربی	ترجمہ
وکتابہ اجلّ التفاسیر واعظمہا	وہ ان کی کتاب تفاسیر میں اجل و اعظم ہے۔
.... فانّہ یتعرض لتوجیہ	کیونکہ وہ اقوال کی توجیہ اور ان میں سے بعض
الاقوال وترجیح بعضہا علٰی	کو بعض پر ترجیح دیتے اور اعراب و استنباط
بعضٍ والاعراب والاستنباط	سے بھی تعرض کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان
فھو یفوق بذٰلک علٰی تفاسیر	کے پیش روؤں کی تفاسیر پر ان کی تفسیر
الاقدمین۔[1]	فوقیت رکھتی ہے۔

اسی مقام میں یہ بھی فرماتے ہیں:۔[2]

عربی	ترجمہ
فان قلت فای التفاسیر ترشد الیہ	اگر تم مجھ سے یہ پوچھو کہ کونسی تفسیر ایسی
وتامر الناظر ان یعول علیہ قلت	ہے جس پر اعتماد کیا جائے، اور جس کو دیکھا
تفسیر الامام ابی جعفر بن جریر	جائے تو میں کہوں گا کہ تفسیر ابن جریر،
الطبری الذی اجمع العلماء المعتبرون	جس پر معتبر علماء کا اتفاق ہے، کہ اس کے
علٰی انّہ لم یؤلف فی التفسیر مثلہٗ	مثل کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی،

امام نووی کہتے ہیں،[3]

عربی	ترجمہ
اجمعت الامّۃ علٰی انّہ لم یصنف	اس پر امت کا اتفاق ہے کہ اس کے مثل
مثل تفسیر الطبری،	کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی،

امام طبری کے معاصرین نے بھی تفسیریں لکھیں، ان میں سے بعض اہم بھی ہیں، مثلاً حافظ بقی قرطبی (المتوفی ۲۷۶ھ) کی تفسیر جس کے متعلق ابن حزم کہتے ہیں کہ اس سے اچھی تفسیر نہیں لکھی گئی، اس کے علاوہ ابن ماجہ (المتوفی ۲۷۳ھ) ابوسعید الکندی (المتوفی ۲۵۷ھ) ابواسحٰق انماطی نیشاپوری (المتوفی ۳۰۳ھ)

---

[1] الاتقان جلد ۲ صفحہ ۱۹۰ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۹۰ [3] معارف، اگست ۱۹۲۲ء

اور دینوری (المتوفی ۲۹۰ھ) کی تفسیرون کا ذکر صاحب کشف الظنون نے کیا ہے لیکن تفسیر طبری کے خصائص و مزایا ان سب سے جداگانہ ہین، اس کی جامعیت اور مقبولیت عامہ کسی کو نصیب نہین ہوئی،

حق یہ ہو کہ امام طبری نے یہ تفسیر لکھ کر صحابۂ کرام و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اکثر و بیشتر تفسیری اقوال کو زمانہ کے دست برد سے بچا لیا، اور بعد کے مفسرین کے لئے تفسیر کا بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے، حضرت عبد اللہ بن عباس، سعید بن جبیر، مجاہد، قتادہ، عکرمہ، ضحاک وغیرہ کی تفسیرین جن کا تذکرہ ہم صرف تاریخون مین پڑھتے ہین، آج بھی ہمارے پیش نظر ہو سکتی ہین، اگر ان کو تفسیر طبری کی ضخیم جلدون سے چن کر مرتب کر لیا جائے، اسی طرح اگر اس کتاب کے اوراق سے مختلف مضامین کو الگ الگ مجموعون مین ترتیب دیا جائے، تو حسب ذیل مفید و دلچسپ کتابین مرتب ہو سکتی ہین،

۱۔ معانی القرآن، قرآن کے مشکل الفاظ کی تشریح، اُن کی لغوی تحقیق، اختلاف لغات، محاورات عرب اور شواہد وغیرہ کا ذخیرہ جو تفسیر طبری مین بکھرا پڑا ہے،

۲۔ اعراب القرآن، اسالیب نحویہ و صرفیہ اور زبان عربی سے جتنے مباحث متعلق ہین، ان کا مجموعہ،

۳۔ بلاغات القرآن، ایجاز و اختصار، تقدیم و تاخیر، حذف و تکرار اور فصاحت و بلاغت کے منتشر مسائل کا مجموعہ،

۴۔ قرأت القرآن، امام طبری ان ائمۂ قرأت سے ہین جن کو کسی قرأت کو ترجیح دینے کا حق حاصل ہے، اس فن مین اُن کی دو کتابون کا تذکرہ ملتا ہے، ایک کے متعلق[۱] ابو الحسن بن علی الاہوازی (المتوفی ۴۴۶ھ) کہتے ہین، کہ مین نے قرأۃ مین ابن جریر کی ایک کتاب آٹھ جلدون مین دیکھی ہے، اس مین انھون نے تمام مشہور اور شاذ قرأتون کو جمع کر دیا ہے، اور اپنی پسندیدہ قرأت کا بھی ذکر

---

[۱] تبیان الجزائری ص ۹۰ معارف اگست ۱۹۲۱ء (از شرح سبعہ قرأت مولوی محی الاسلام صاحب پانی پتی)

کیا ہے، مگر اس اختیار و انتخاب میں وہ قراۃ مشہورہ سے الگ نہیں ہوئے۔"

ممکن ہے اس کتاب کا نام کتاب القرات ہو، جس کا تذکرہ[1] امام طبری نے "مالک یوم الدین" کی وجوہ قرأت کو بیان کرتے ہوئے کیا ہے، ابوبکر بن مجاہد اس کتاب کے مداح تھے، اور اُن کا خیال تھا کہ ابوعبید قاسم بن سلام کی کتاب کے طرز پر امام طبری نے کتاب القرات کی بنیاد رکھی ہے، طبری کے پاس ابوعبید کی کتاب احمد بن یوسف کی روایت سے موجود تھی، کتاب القرات کا ذکر ابن الندیم نے بھی کیا ہے؛

دوسری کتاب کا نام کتاب الفصل بین القرأت ہے جس میں قراۃ و تجوید کے متعلق ایک مفید خطبہ کے بعد اصل کتاب تھی، اس میں مصنف نے حروف القرآن کی ادائگی میں قراء کے اختلاف کو بیان کیا ہے، اور حرمین شریفین، بصرہ، کوفہ اور شام وغیرہ کے قراء کے نام کے ساتھ ان کی قرأۃ کی تصریح کی ہے

---

[1] تفسیر الطبری: ج ۱ ص ۴۹، امام طبری نے کتاب القرات کے سوا اپنی چند اور تصانیف کا ذکر بھی جا بجا تفسیر میں کیا ہے، مثلاً:-

۱- کتاب اللطیف فی احکام شرائع الاسلام، یہ کتاب طبری کی معرکۃ الآرا تصنیف تھی جس پر اُن کے مذہب کے معتقدین کا دارومدار تھا، مضامین کی دقت اور تعلیلات کی کثرت کی وجہ سے طبری نے اس کا نام لطیف القول رکھا تھا، وزیر ابو احمد عباس بن حسن العزیزی کی فرمائش پر کتاب اللطیف کو مختصر کر کے کتاب الخفیف فی شرائع الاسلام کے نام سے موسوم کیا، کتاب اللطیف ڈھائی ہزار اوراق میں پھیلی ہوئی تھی، اس کا نام تفسیر طبری مطبوعہ میمنیہ کے ج ۱ ص ۳۶ ج ۲ ص ۲۶۹، ج ۲ ص ۲۳۴ ج ۵ ص ۱۳۵، ج ۸ ص ۲۹، جلد ۹ ص ۴۳، ج ۱۰ ص ۳۰ ج ۱۱ ص ۵۰ ج ۱۱ ص ۲۰ میں ملاحظہ ہو؛

۲- کتاب الاکبر من احکام شرائع الاسلام؛ اس کتاب کا نام صرف ج ۱ ص ۲۳ پر مذکور ہے، مصنف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر کے زمانۂ تصنیف تک یہ کتاب یا تو لغیر مکمل تھی، یا اس کا خاکہ مصنف کے ذہن میں تھا، فرماتے ہیں ستستقصی بیان ذلک بحکایۃ اقوال المختلفین فیہ من الصحابۃ والتابعین والمتقدمین

اسا کی توجیہ و تاویل اور اپنے مختار اقوال کو بھی مدلل لکھا ہے،

امام طبری نے تفسیر میں اختلاف مصاحف و اختلاف قرأت کا بیان بھی کیا ہے، اور ان قرأتوں کی توجیہ و تاویل اور کوفہ و بصرہ و دیگر بلاد کے قرا کے اختلاف آرار کی تصریح کے ساتھ اپنی مختار قرأت کو بھی لکھا ہے، اگر قرأۃ کے ان بکھرے ہوئے جواہر پارون کو تفسیر سے چن کر الگ ترتیب دیا جائے، تو قرأت کی ایک اہم کتاب معرض وجود مین آسکتی ہے، جو اگرچہ طبری کی اصل کتاب القرات کی طرح مفصل تو نہ ہوگی، لیکن اس کا جوہر و خلاصہ بن سکتی ہے،

۵- کتاب المسائل الکلامیۃ والرّد علی الفرق المبتدعۃ: عقائد و علم الکلام کے مسائل کی تبیین اور فرق باطلہ کی تردید و ابطال تفسیر طبری کی خاص شان ہے، ان اجزا

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۳) والمتاخرین فی کتابنا الاکبر من احکام شرائع الاسلام الخ،

۳- کتاب البیان عن اصول الاحکام؛ اس کتاب کے لئے تفسیر کے صفحات ج ۱ ص ۲۰۱، ج ۱ ص ۲۰۲، ج ۱ ص ۳۰۲، اور ج ۲ ص ۹، ج ۹ ص ۲۶، ج ۱۵ ص ۵۱ ملاحظہ ہون،

۴- کتاب الرسالۃ من لطیف القول فی البیان عن اصول الاحکام؛ ملاحظہ ہو جلد ۱ ص ۲۴۴، میرا خیال ہو کہ اسی کتاب کا نام ج ۱۰ ص ۹۸ مین لطیف البیان عن اصول الاحکام اور ج ۲ ص ۲۵۲ پر لطیف القول من البیان عن اصول الاحکام ہو، بہت ممکن ہو کہ یہ کتاب اللطیف فی احکام شرائع الاسلام ہی کا کوئی شاخ ہو جس مین امام طبری نے اصول فقہ، اجماع، اخبار احاد، مراسیل، ناسخ و منسوخ اور دیگر مباحث پر روشنی ڈالی ہو، اس رسالہ کا ذکر یاقوت نے معجم الادبار مین کیا ہے، ملاحظہ ہو الادبار: ج ۱۸ ص ۴۷،

۵- کتاب الایمان؛ ص ۲۴۱ ج ۲، کے علاوہ اور کہین اس کا نام نہین ملتا، کتاب الشروط، کتاب الوصایا اور کتاب ادب القاضی وغیرہ کی طرح یہ بھی امام طبری کا فقہی رسالہ معلوم ہوتا ہے،

۶- کتاب الجراح معلوم نہین یہ کتاب کس فن مین تھی، نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید طب مین تھی، صرف ج ۱۵ ص ۵۹ مین اس کا نام آیا ہو، امام طبری کو طب مین اچھی دستگاہ حاصل تھی، ملاحظہ ہو الادبار ج ۱۸ ص ۶۱،

۷- کتاب الصلوٰۃ؛ ابن الندیم نے کتاب الفہرست ص ۲۳۴ مین اور خود امام طبری نے تفسیر کی آخر جلد مین اس کتاب کا ذکر کیا ہے،

کو اگر ترتیب دیا جائے تو علم الکلام کا ایک بصیرت افروز اور قابلِ اعتماد رسالہ تیار ہو سکتا ہے،

۶۔ مختارات الطبری، تفسیر طبری شروع سے اخیر تک جلد وا ولی الاقوال بالصواب عندی سے بھری ہوئی ہے، اس جلد کے تحت میں مصنف معانی و اعراب اور بلاغت و قراءۃ وغیرہ کے اختلافات و توجیہات بیان کرنے کے بعد اپنے اختیار کردہ قول کا ذکر تے ہیں، ان کے اقوال کے مجموعہ کو مختارات الطبری کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے، جو لغوی، نحوی، اور تفسیری مسائل میں امام طبری کے مختارات کا مرقع ہوگا،

۷۔ کتاب اسباب النزول: آیاتِ قرآنیہ کے شانِ نزول کا علم بھی تفسیر کا ایک اہم شعبہ ہے اگر اسبابِ نزول سے متعلق تفسیر طبری کی تمام روایتوں کا استقصاء کر کے اُن کو جمع کر لیا جائے، تو اسباب النزول کا مستند قیمتی اضافہ ہو سکتا ہے،

اسی طرح تفسیر طبری میں اور مضامین مثلاً اصول، فقہ، احکام وغیرہ ملتے ہیں، جن کو یکجا ترتیب دینے سے قیمتی و کار آمد مجموعے تیار ہو سکتے ہیں،

اگر مذکورہ بالا خاکہ کے مطابق تفسیر طبری پر کام کیا جائے تو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا، کہ ایک ہی مضمون کے بیش بہا اجزاء جو تفسیر کے ہزاروں صفحات میں بکھرے پڑے ہیں مرتب ہو جائیں گے، اور شائقین کو بسہولت تمام معانی، اعراب، تجوید و قراءت اور تفسیر کے دیگر مضامین سے استفادہ کا موقع ملیگا، اس کے علاوہ اس تفسیر کی اہمیت و خصوصیت اور اس کی امتیازی حیثیت نمایاں اور روشن ہو جائیگی، تفسیر طبری کی اس تجزیہ سے یہ بھی واضح ہو جائے گا، کہ یہ تفسیر صرف روایات کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس کے صفحات میں نحو و صرف کے قیمتی مباحث، فصاحت و بلاغت کے دقیق مسائل، فقہی استنباطات و قرآنی نکات و دیگر علمی مباحث کا بڑا بیش قیمت ذخیرہ محفوظ ہے،

اس میں شبہ نہیں کہ یہ کام بہت مشکل ہے، لیکن ایک ایک مضمون کا بیڑا اگر مختلف اربابِ علم اٹھائیں تو بڑی آسانی سے یہ کام انجام پا سکتا ہے،

الحمد للہ کہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی معانی القرآن للطبری کی ترتیب و تالیف، دارالتالیف والترجمہ مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے زیر نگرانی راقم السطور کے ہاتھوں ایک عرصہ دراز کی عرق ریزی کے بعد اختتام کو پہنچ چکی ہے، اور مولانا عبد الرحمٰن الکاشغری کی رہنمائی میں اس کتاب کی باقاعدہ ترتیب و تصحیح اور ضروری امور کی تفتیش و تصریح کا کام بھی شروع ہو چکا ہے،

حسب تصریح بالا اس کتاب میں الفاظ قرآنیہ کے معانی اور ان کی لغوی تحقیق سے متعلق صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین وائمۂ لغات کی روایات و اقوال کو مع بیان شواہد حسب بیان طبری جمع کر دیا گیا ہے، اس طرح لغات قرآن کا ایک معتبر و مستند مجموعہ تیار ہو گیا ہے، اس کتاب کو اس اعتبار سے کہ اس میں سارے الفاظ امام طبری کے ہیں، مفردات راغب اصفہانی جیسی کتاب پر بھی فوقیت حاصل ہے، اور اس سے علما و شائقین کے لئے یہ آسانی ہو گئی ہے کہ وہ تحقیق الفاظ قرآنیہ کے لئے تفسیر طبری جیسی ضخیم و کمیاب کتاب کی تلاش و جستجو سے بچ جائیں گے، اور اس کتاب سے کم سے کم وقت میں استفادہ کر سکیں گے،

اخیر میں پرنسپل مدرسہ عالیہ مولانا ضیاء الحق صاحب ایم اے کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن کی عنایت و شفقت نے اس عظیم الشان کام کی انجام دہی کا موقع بہم پہونچایا، ہو الحمد للہ وما توفیقی الا باللہ،

ادبیات

غزل

از جناب شفیق صدیقی جونپوری

خوشا وہ جذبۂ وحشت زہے وہ جامہ دری
کیا کرے کوئی تارِ نگہ سے بخیہ گری

نہ تھا قرینِ ادب ادعائے حق نگری
وہاں قبول ہوا اعتراف کم نظری

اندھیری رات بھی روشن ہے کیا تصور ہے
وہ طلعتِ رُخِ محبوب و لیلۃ القمری

گئی بہار تو کیا دے گئی گلستان کو
کہ شاخ شاخ کو ہے شکوۂ بے ثمری

نسیم تجھ کو خدا اور خوشخرام کرے
اذا لقیت حبیبی فقل لہ خبری

خلاصہ حرف و حکایات و علم و عرفاں کا
حدیث عشق ہے باقی تمام دردسری

کہاں مقام طلب میں ترا گذر زاہد
تجھے نصیب ہوئی بیدلی نہ بے جگری

خود اپنا راہ نما ہے شعورِ انسانی
نہ حکمت عملی ہے، نہ حکمتِ نظری

وہاں سے اہل خرد اور نامراد آئے
ہوئی تو رحم کے قابل ہماری بے ہنری

در قبول نہیں بند، مانگنے والے
دعا کی بے اثری ہے زبان کی بے اثری

صبا گلوں کو بتا دے کہ گریۂ شبنم
سکھا نہ دے چمنستان کو رسم نوحہ گری

نظر سے سارے حجابات اٹھتے جاتے ہیں
عجب مقام ہے اے دل مقامِ بے خبری

مٹوں تو ذرے سے لاکھوں ستارے پیدا ہوں
کہ میری خاک میں ہے جذبۂ حیات گری

نظر کا ذوق بقدرِ نقاب بڑھتا ہے — ترا حجاب نہ ہو جائے وجہ پردہ دری

ہمیں بھی یاد کریں گے تری گلی والے — کہ پھر کہاں ہیں یہ دیوار نالۂ سحری

مرے چمن کو ملا بھی تو باغبان ایسا — کہ جس کے دور میں دیکھی نہ کوئی شاخ ہری

اٹھو شفیقؔ کہ بستر پہ کروٹیں کب تک

ستارے ڈوب چکے شمع ہو چکی سحری

نقاشِ فطرت

از جناب حسینی اعظمی

فطرت کے قلم کی گل کاری کس درجہ ہے لائق دیدوری — ہیں رنگ برنگ کے پھول کھلے پتے ہیں ہر ایک شاخیں ہیں ہری

یہ چاند یہ سورج یہ انجم، یہ بزمِ فلک تاروں سے بھری — سوچا بھی ہے غافل تو نے کبھی کس حسن کی ہے یہ جلوہ گری

اس کون و مکاں کا ہر ذرہ ہے کس کے فیض سے نورانی — ہیں کس کی پرتو افشانی، یہ دن شمسی راتیں قمری

یہ مزرعِ عالم یہ گیتی دیکھو تو ہرا از سر تا بہ قدم — پودوں کی سبھی پھولوں سے لدی خوشبو سے پٹی ذوق بھری

ہے کس کے خامۂ رنگین کی نقش آرائی و شورہ انگیزی — اُف گل کی یہ چہرہ افروزی بلبل کی یہ شوریدہ جگری

یہ حمد و ثنا کے نغمے یہ گلبانگ دعا اللہ اللہ — ہیں زمزمہ سنجانِ گلشن مصروف نوا ہائے سحری

اس گلکدۂ فطرت میں اگر ہو ذوقِ تماشا ذوقِ نظر — دیکھے کوئی پتے پتے پر نقاشِ ازل کی نقش گری

اب بھی نہ کسی کو نظر آئیں گر حسنِ حقیقت کے جلوے — ہے ذہن کی یہ نارسائی ہے فکر کی یہ بے بال و پری

ہے ورنہ چمن کا ہر ذرہ اسرار و معارف کا دفتر

ہے تیری ہی نادان کم نگہی ہے تیری ہی غافل کم نظری

مطبوعات جدیدہ

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت
از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۲؎ پتہ: مکتبۂ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی دینی دعوت سے مذہبی طبقہ پوری طرح واقف ہے اس زمانہ میں جب کہ مسلمان عام طور سے اپنے مذہب سے ناواقف وبے گانہ ہیں، دیندار مسلمانوں کا سب سے مقدم فرض ان کی اصلاح اور ان کو مسلمان بنانا ہے، مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کے بعد اُن کی جماعت جس اخلاص اور جوش عمل کے ساتھ اس فرض کو انجام دے رہی ہے، اس کی مثال گذشتہ کئی صدیوں میں نہیں ملتی، اس کتاب میں مولانا کے سوانح اُن کی دعوت اور اس کے نتائج کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، مولانا کی ذات سراپا عمل اور سلف صالحین کا نمونہ تھی، اور اصلاحی وتبلیغی دعوت اُن کے دل ودماغ پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ ان کی ہر نقل وحرکت، ہر قول وعمل اور ہر لمحہ اس کے لئے وقف تھا، اور اُن کی پوری زندگی، عبادت تھی، تبلیغ سے فاضل مصنف کے دل میں بھی دین وخدمت دین کی وہی لگن ہے، اور وہ اس دعوت کے ایک پرجوش داعی ہیں، اس لئے اس کتاب میں مولانا محمد الیاس کے سوانح کے ساتھ دین کی پوری روح اور تبلیغ کا پورا نظام آگیا ہے، اور وہ دین کا درس اور تبلیغ دین کا نصاب بن گئی ہے، اور مصنف کے اخلاص کی یہ تاثیر ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے اصلاح وتبلیغ کا ولولہ پیدا ہوتا ہے کتاب کے شروع میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے اصلاح وتبلیغ کے فریضہ اور اس کے اصولوں اور طریقوں پر نہایت حکیمانہ تبصرہ ہے جس سے اس کام میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے، یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر مسلمان کو

اس کا مطالعہ کرنا چاہئے،

ریان از جناب مولانا سید لائق علی صاحب قاسمی کاغذ کتابت و طباعت بہتر،
ضخامت ۱۵۲ صفحے قیمت تحریر نہیں، پتہ:- کتب خانہ محمودیہ مدرسہ دار العلوم جامع
مسجد، میرٹھ، و مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی،

ہوائے نفس اور مادی کثافتوں سے تطہیر اور روحانی تزکیہ کا ایک بڑا ذریعہ روزہ بھی ہے،
اس لئے وہ تقریباً تمام مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، اور اسلام میں اس کی سب سے زیادہ
مکمل اور جامع صورت ہے، روزہ محض فاقہ کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے بہت سے لوازم و شرائط
ہیں، جن کی تکمیل کے بغیر روزہ حقیقی معنوں میں روزہ نہیں کہا جا سکتا، اس کتاب میں اس کی تفصیل بیان
کی گئی ہے، اور روزہ کی حقیقت، دوسرے مذاہب میں اس کی تاریخ، اسلام میں فرض روزوں سے
پہلے کے روزے، ان کے اقسام، فضائل رمضان، روزے کے تدریجی احکام، ان کی عقلی حیثیت، فوائد
اور رمضان سے متعلق دوسری عبادتوں تہجد، تراویح، شب قدر، اور عید الفطر وغیرہ کے احکام و مصالح
پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور ضمناً دوسری اسلامی عبادتوں اور ان کی غرض و غایت کے متعلق
بھی مفید معلومات آگئے ہیں، کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامع ہے، ایک مقام پر خفیف سا تسامح
ہو گیا ہے، دن کو روزہ رکھنے اور راتوں کو عبادت کرنے کا جو واقعہ حضرت عمرو بن العاص کی جانب
منسوب کیا گیا ہے، وہ ان کا نہیں، بلکہ ان کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن عمرو کا ہے (بخاری
باب حق الجسم فی الصوم)

تحقیقات: از جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴، صفحے کاغذ
کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ جمیل اکیڈمی دہلی،

مصنف اردو کے مشہور ادیب اور صاحب نظر نقاد ہیں تحقیقات ان کے ادبی و تنقیدی اور بعض

علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں مستند ہوش کی لسانی غلطیاں، حق آید و حق بجا کی پردہ دری، شمشیر

اور ایتیمش کی تحقیق و پاکیزہ رضیہ اور فارسی ادبیات پر مصنف کی وسعت نگاہ، دقت نظر اور ذوق تحقیق

کے شاہد ہیں، مدح یا ہجو گو مختصر ہے مگر اس میں ایک مفید انکشاف اور ایک عام غلط فہمی کا ازالہ ہے جس میں

بہت سے خواص تک مبتلا ہیں، آزاد نظم میں ترقی پسند شاعروں کی حقیقت خوب واضح کی گئی ہو البتہ خواجہ حافظ

کی شراب و شاہد میں مصنف کا دعوی قابل بحث ہے یہ نہیں کہا جاتا کہ حافظ کے ہر شعر کو بادۂ معرفت کا جام

اور ان کے شاہد کو شاہد حقیقی مانا جائے لیکن اس سے حافظ کی بادہ نوشی اور شاہد بازی کا نتیجہ نکالنا بھی صحیح

نہیں ہے اگر شاعری کے مضامین ہی واقعہ کا ثبوت ہو سکتے ہیں تو پھر اردو فارسی کے کسی شاعر کا دامن اس سے

پاک نہیں نکل سکتا جس کو شاید مصنف بھی ماننے کے لئے آمادہ نہ ہوں، درحقیقت عشق و محبت اور ہجر و وصال

وغیرہ کی طرح شراب و شاہد کے مضامین بھی ہمیشہ سے شاعری کا جزو رہے ہیں اس لئے اگر ان مضامین کو

شاعر کی آپ بیتی تصور نہیں کیا جاتا بلکہ محض شاعرانہ تخیل، مانا جاتا ہے تو پھر حافظ کی شراب و شاہد کو ان کی

ذاتی روداد کیوں فرض کیا جائے، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب اردو ادب کا ذوق رکھنے والوں کے مطالعہ

کے لائق ہے،

مسلمانانِ عالم کی کمزوری کے بنیادی اسباب اور اُن کا قرآنی علاج	از مولانا محمد منظور صاحب مدیر الفرقان تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰ صفحے کاغذ کتابت

وطباعت بہتر قیمت ۲ر پتہ:۔ مکتبہ الفرقان، گوئن روڈ لکھنؤ،

قرآن مجید مسلمانوں کی اخروی فلاح و سعادت کے ساتھ ان کی دنیاوی کامیابی کا بھی صحیفہ ہے،

یعنی اس کی تعلیمات پر عمل کئے بغیر ان کو دنیاوی ترقی بھی حاصل نہیں ہو سکتی اور ان کے زوال کا جو سبب

ان سے غفلت و لاپروائی ہے اس لئے ان کی دنیاوی ترقی کے لئے بھی مادی تدبیروں کے ساتھ قرآن کی بتلائی

ہوئی تدبیروں پر عمل ضروری ہے اس رسالہ میں اسی نقطۂ نظر سے آیات قرآنی سے مسلمانوں کے زوال کے

اسباب بیان کرکے ان کی قرآنی تدبیر بھی بتائی گئی ہے اس لئے ہر مسلمان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے،

مشکوٰۃ الصلوات مرتبہ جناب پیر فیسر مولوی محمد الیاس صاحب برنی تقطیع اوسط ا ضخامت ۱۵۰ صفحے قیمت ۱۲ پتہ :- (۱) مرتب بیت السلام سیف آباد حیدرآباد دکن (۲) شرف الدین و اولادہ تاجر کتب نمبر ۲۹، محمد علی روڈ بمبئی (۳) تاج کمپنی تاجر کتب لاہور پاکستان،

فاضل مرتب نے عرصہ ہوا، کلام مجید، کتب احادیث اور صلحاء و اخیار کی معتبر کتابوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و شمائل، درود وسلام اور ماثورہ دعاؤں کا ایک مجموعہ مشکوٰۃ الصلوٰۃ کے نام سے مرتب کیا تھا اور پڑھنے والوں کی سہولت کے لئے ہفتہ کے حساب سے سات جزوں میں اس کو تقسیم کردیا تھا، یہ مجموعہ اتنا مقبول ہوا کہ اس کے کئی اڈیشن شائع ہوئے یہ نیا اڈیشن خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہے، ٹائٹل بھی دیدہ وزیب ہے، اور حسن ظاہر و حسن معنی دونوں حیثیتوں سے خوش اوقات اصحاب ذوق کے ورد میں رہنے کے لائق ہے،

اردو ہندی ٹیچر، از جناب محمد ابو القاسم صاحب حیدری، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸ پتہ جلیل اکیڈمی، بریلی،

جب سے ہندی حکومت کی زبان قرار پائی ہے، اور اس کا سیکھنا ضروری ہوگیا ہے، اس وقت سے اردو خوانوں کی ہندی سے ابتدائی واقفیت کے لئے متعدد اردو ہندی ریڈریں شائع ہوچکی ہیں، اردو ہندی ٹیچر بھی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اسی قسم کی کتاب ہے، اس سے ابتدائی ہندی آسانی کے ساتھ سیکھی جاسکتی ہے،

"م"

تابعین

مرتبہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور اُن کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمرؒ بن عبد العزیز، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمدؒ حنفیہ، حضرت سعیدؒ بن مسیب، حضرت سعیدؒ بن جبیر، حضرت محمد بنؒ سیرین، حضرت ابنؒ شہاب زہری، امام ربیعہؒ رائی، امام مکحول شامی، قاضی شریحؒ، وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح، اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے۔

ضخامت:- ۵۶۰ صفحے،

قیمت:- چار روپیے،

منیجر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، غزوات، متعلق معاملات وغیرہ [illegible]

جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر سخت محنت و اہتمام سے

مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات و غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فنِ سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیلِ دین، تاسیسِ حکومتِ الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلِ بیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائصِ نبوت پر بحث ہے، اس میں پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایاتِ صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے، جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کی عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق، فضائل اور آداب کے عنوانوں اور اس کی ذیلی سرخیوں کے تحت [illegible]

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول [illegible] طبع [illegible] حصہ دوم تقطیع خورد [illegible]

تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلاں باختلاف کاغذ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

معارف

دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: چھ روپے سالانہ

دار المصنفین اعظم گڑھ

جلد ۶۲ ماہ ذیحجہ ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۴۸ء عیسوی عدد ۴

مضامین

مقالات

باب المراسلہ

ادبیات

اعلان

ملک کے فسادات اور تقسیم ہندوستان اور بعض اور وجوہ سے بعض خریداران معارف اپنے مستقر کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں اسلئے معارف کے بہت کافی پرچے واپس آرہے ہیں، اسلئے گذارش ہے کہ خریداران معارف اپنے موجودہ پتہ سے دفتر کو جلد از جلد مطلع کردیں نیز اپنی ڈاک کی حفاظت کا انتظام کریں تاکہ دفتر کو دوبارہ پرچہ بھیجنے کی دشواری نہ ہو، معارف ڈاکخانہ کے ضابطہ کے مطابق ہر مہینہ کی ۱۰ تاریخ کو نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہو جاتا ہے، اگر خدانخواستہ اسکے خلاف کبھی ہو جائیگا تو خریداروں کو بذریعہ کارڈ اسکی اطلاع دیدی جائے گی، اب تک تو بحمد اللہ کبھی تاخیر نہیں ہوئی،

شذرات

افسوس ہو کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی شب کو قائد اعظم محمد علی جینا کا کراچی میں بہتر برس کی عمر میں انتقال ہوگیا، پاکستان، ہندوستان اور عالم اسلام نے اس حادثہ پر بڑا صدمہ محسوس کیا، دوسرے دن عصر کے وقت کئی لاکھ کے مجمع میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور تدفین عمل میں آئی، عام مسلمانوں میں اُن کو جو ہر دلعزیزی حاصل تھی اس کا اثر یہ ہو کہ ہندوستان اور اکثر اسلامی ملکوں، ریاستوں اور شہروں نے ان کا ماتم کیا، اور اُن کے لئے قرآن خوانی اور مغفرت کی دعا کی گئی،

مرحوم کے سیاسی کارنامے آفتاب کی طرح روشن ہیں، وہ بڑے قانون دان، بڑے مناظر، اور اجتماعیات کے بڑے نبض شناس تھے، اور اپنے پیروں پر بلا کا اثر رکھتے تھے، اُن کی بڑی خصوصیت اپنی بات پر جم کر دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قوت تھی، انھوں نے اپنی اس قوت کا مظاہرہ پاکستان کے مطالبہ میں پوری طرح کیا اور بالآخر کامیابی حاصل کی اور ایک ایسی حکومت قائم کی جس کا دعویٰ ہو کہ وہ اسوقت سب سے بڑی اسلامی حکومت ہو، اور آبادی کے لحاظ سے دنیا میں اس کا پانچواں درجہ ہو،

ہندوستان کی سیاست میں مرحوم کا بڑا حصہ ہو اور ۱۹۱۶ء سے لیکر جب لیگ اور کانگریس میں انکی کوشش سے مشہور پیکٹ ہوا تھا ۱۹۴۸ء تک سوائے ان چند سالوں کے جب وہ ترک موالات کی تحریک میں کانگریس سے الگ ہوگئے، ہمیشہ ایک لیڈر کی حیثیت سے ملک میں ممتاز رہے، اُن کی نسبت اُن کے دوست اور دشمن ایک بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ کبھی حکومتِ وقت سے ڈرے اور نہ جاہ و منصب کی کوئی حرص و طمع اُن کو اپنی جگہ سے ہلا سکی،

مرحوم پاکستان کے بانی اور یہ کہنا چاہئے کہ اس کی کشتی کے تنہا ملاح تھے، ایسے طوفانی حوادث کے موقع پر جب ہر ملک اندرونی و بیرونی خطروں سے گھرا ہوا ہے، اُن کی وفات صد درجہ افسوسناک ہے، یہ وہ وقت ہے جب پاکستان کے حکمراں اور رہنما صرف اپنی بے لوث خدمت، مخلصانہ کوشش، سادہ زندگی، ایثار، حب ملت، عاقبت اندیشی اور ذاتی اغراض سے بلند ہو کر باہمی اتحاد و باہمی اعتماد سے پورے ضبط و نظم کو قابو میں لا کر اپنی مملکت کو نشو و نما دے سکتے ہیں، اور تاریخ میں نئے شاندار کارناموں کا اضافہ کر سکتے ہیں ورنہ اُن کی ذرا سی غلطی اس نئے ملک کو ایسا سخت صدمہ پہنچا سکتی ہے جس سے مدتوں تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتی،

مرحوم سے میری ذاتی ملاقات کبھی نہیں ہوئی، البتہ چار دفعہ اُن کو دور سے اور ایک دفعہ نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، پہلی دفعہ میں نے انہیں اس وقت دیکھا جب ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس تھے، اور وہ پہلی دفعہ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں میں ظاہر ہوئے، سابق مہاراجہ محمود آباد کی سرکردگی میں لکھنؤ نے ان کا شاندار استقبال کیا تھا،

اس کے بعد دوسرے سال بمبئی میں لیگ و کانگریس کے اجلاس ہوئے، مسلم لیگ کے صدر مظہر الحق مرحوم تھے، اور جناح صاحب اس اجلاس کے بانی اور داعی تھے لیکن مسلم لیگ کا یہ جلسہ جیسا کہ اس وقت سمجھا گیا انگریزی حکومت کے چند کارندوں کی شرارت سے درہم برہم ہو گیا، یہ مرحوم قائد اعظم کے دیکھنے کا دوسرا موقع تھا،

تیسرا موقع یہ آیا کہ ۱۹۲۱ء میں خلافت کی تحریک کے زمانہ میں محمد علی مرحوم ایڈیٹر ہمدرد کے ساتھ جناح صاحب کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں ان دونوں لیڈروں میں اس وقت کے مسئلوں پر گفتگو ہوئی اور جس کا خاتمہ بالآخر ایک کی دوسرے سے علیحدگی پر ہوا،

اس کے بعد میں نے انہیں ناگپور کی کانگریس میں دیکھا جب ترک موالات کی تجویز کی مخالفت کے لئے وہ کھڑے ہوئے اور پورے جلسہ کی مخالفت کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑے رہے، اور اس کے بعد وہ کانگریس کے اجلاس بلکہ کانگریس سے نکل گئے اور پھر اس میں شریک

علیحدہ ہوئے سالہا سال کے بعد ابھی دو سال ہوئے جامعہ ملیہ کی جوبلی میں انھیں دیکھا اور اُن کی تقریر سُنی،

ایک بات زبان پر آ کر رکتی نہیں کسی کو پسند ہو یا ناپسند ہو اب یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کا برِ اعظم ایک بار پھر دو مملکتوں میں بٹ گیا، اب ان دونوں مملکتوں کی بقا اُن کے درمیان صلح و آشتی ہی سے ہو سکتی ہے، ان دونوں مملکتوں میں ہزارہا خاندانوں کے لاکھوں افراد بکھر گئے ہیں ان کی سلامتی ان دونوں مملکتوں کی سلامتی و خیرخواہی ہی میں ہے اس لئے ان دونوں میں جتنا زیادہ باہمی اتحاد اور اعتماد بڑھے اتنا ہی انسانیت اور دنیا کے امن کے لئے مفید ہے،

حیدرآباد کا معاملہ جس صورت میں ختم ہوا اس پر افسوس ہے یعنی اس سے پہلے فریقین میں مصالحت کی جو تجویزیں جس جس طرح سے بار بار پیش ہوتی رہیں اگر ان میں سے کسی ایک تجویز پر بھی فیصلہ ہو جاتا، تو دونوں کے لئے بہتر ہوتا اور دونوں کی آبرو قائم رہتی مگر ہندوستان کو معاملہ سلجھانے کے لئے "فوجکشی" کرنی پڑی، جس سے بقول مسٹر پنڈت لوگوں کو دنیا میں ہندوستان کے بدنام کرنے کا موقع ہاتھ آیا اور ادھر حیدرآباد کو زبانِ خلق سے بدتدبیری اور ناعاقبت اندیشی کا طعنہ سننا پڑا تاہم حیدرآباد کے اس آخری فیصلہ پر پورے ہندوستان نے اطمینان کی سانس لی اور ایک آتی ہوئی بلا سر سے ٹل گئی خدا کرے کہ یہ اس ملک کی آخری بلا ہو اور اب ملک میں امن و امان کا دور دورہ ہو،

زبان کے معاملہ میں کانگریس کے بعض تنگ نظر ممبروں کی رائے سے مرعوب ہو کر حکومت صوبۂ متحدہ کا جلد بازی کا فیصلہ افسوس کے قابل ہے اس صوبہ میں جو زبان عام و خاص بولتے ہیں اس کو ہندی اور وہ بھی سنسکرتی ہندی کہنا اور دفاتر واقعات کا اس کو لازم کرنا ہے اور اس طرح اکثریت کا اقلیت پر جابرانہ حکم نافذ کرنا اس دستور کے خلاف ہے جس پر نیا ہندوستان اپنی حکومت کی بنیاد قائم کرنا چاہتا ہے اور اس مجوزہ کے خلاف ہے جو گاندھی جی نے اپنی آخیر زندگی میں برملا ظاہر کیا تھا کہ ہماری آواز پر تو کان نہ دھرا گیا اور ہندوستانی حکومت کے بجائے ہندو حکومت کا خواب دیکھنے والوں کو منانے کے لئے صحیح سیاست و تدبر کا خون کیا جا رہا ہے لیکن ہندوستان سے زیادہ کس کو یہ معلوم ہے کہ کسی تاریخ کا باب ایک دن میں ختم نہیں ہو جاتا ع بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے،
کیا عجب ہے کہ کل کانگریس ہی کے اندر سے کوئی طاقت سچائی کی حمایت کے لئے کھڑی ہو جائے،

مقالات

تصوف و سلوک کی تجدیدات

از

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

(۲)

تصوف سے توحش کی وجہ اسلامی تصوف کی اس حقیقت واجبیت کے باوصف کہ وہ عین دین اور کمال اسلام کے سوا کچھ نہیں جس سے دور ہو کر مسلمان بحیثیت مسلمان حسنۂ دنیا سے بھی دور سے دور تر ہوتے جا رہے ہیں پھر بھی اہل دنیا ہی کو نہیں، بلکہ اُن سے بھی بڑھ کر بعض اکابر دین تک کو تصوف کے غیر دین یا طریقت کے خلاف شریعت ہونے، اور اس کی بدولت اس سے انکار و توحش کا بہت بڑا منشا یہ ہوتا ہے، کہ حضرات صوفیہ کے بہت سے حقائق و معارف، اذکار و اشغال، مجاہدات و مراقبات، احوال و کیفیات، توجہ و تصرفات، کشف و کرامات، ترک لذات و تعلقات، بیعت و نسبت اور رسوم و عادات وغیرہ کی خاص خاص صورتوں کا ان حضرات کو کتاب و سنت کی عام و منصوص تعلیمات میں بظاہر نام و نشان نہیں ملتا، اور مغالطہ یہ ہو گیا ہے کہ تصوف و طریقت کی اصل و حقیقت یہی امور ہیں۔

سو تصوف کی اصل حقیقت کی نسبت تو حضرت مجدد کی تحریر [illegible]

فرمایا [illegible]

عرفی و اصطلاحی نام ہے، جو ظاہر کے فقہی احکام کی طرح خود قرآن و حدیث میں منصوص ہیں، اور اس طرح تصوف مُلّا پن کے سوا کچھ نہیں، کسی موقع پر اس عرف و اصطلاح کے جھگڑے سے بیزار ہو کر فرما دیا کہ

"ہم نہیں جانتے درویشی کیا چیز ہے، یہاں تو مُلّا پن ہے، طالب علم ہیں، صاحب علم بھی نہیں، بس قرآن و حدیث پر عمل بتاتے ہیں، پھر اسی میں جو کچھ کسی کو ملنا ہوتا ہے مل جاتا ہے، اور ایسا ملتا ہے کہ مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر من امثالنا یعنی جو ہم جیسوں میں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا، نہ کسی قلب میں اس کا خطرہ تک گزرا، مگر ظاہر میں کچھ نہیں، نہ ہو حق، نہ حال وقال، نہ وجد و کیف، نہ کشف و کرامت، پھیکا پھا کا طرز ہے، جیسے سمندر کی مچھلی کہ نمک خود اس کے اندر ہوتا ہے، اوپر سے ڈالنے کی ضرورت نہیں لیکن کھلتا پکنے کے بعد ہے، بس یہاں بھی اوپر کا نمک نہیں اندر کا ہے، جو پکنے کے بعد کھلتا ہے"[1]

رہے اذکار و اشغال، مجاہدات و مراقبات وغیرہ کے ایسے صوفیانہ طریقے، جو بظاہر قرآن و حدیث میں مذکور یا اُن سے ماخوذ نہیں معلوم ہوتے، تو اس بارے میں حضرت مجدد کی تجدید و تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف کے دوست و دشمن، معتقد و منکر دونوں ایک مشترک غلطی میں پڑ گئے، کہ ان چیزوں کو تصوف کے مقاصد و غایات سمجھ لیا، حالانکہ اُن کی اصل حیثیت تدابیر و مقدمات یا آثار و ثمرات کی ہے، مقاصد تصوف یہ چیزیں قطعاً نہیں، اس لئے ان کو بدعات کہنا سرے سے بے معنی ہے، بدعت نام ہے "احداث فی الدین" کا یعنی دین میں دین کا مقصد جان کر کسی نئی چیز کا اضافہ کرنا، نہ کہ احداث للدین یعنی مقاصد دین کے حصول کے لئے تجربہ کی بنا پر کسی نئی تدبیر کا اختیار کرنا، جیسے طب میں صحت کے حصول و حفاظت کے لئے نئی نئی تدابیر و ادویہ کا تجربہ اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ . . . .

. . . . یا خود دین میں، مثلاً علوم دین کی حفاظت و اشاعت کے لئے مدرسے کھولنا، کتب خانے قائم کرنا، بضرورت ایسے کتابیں چھاپنا، درس و تدریس کے لئے نصاب تعلیم کی نئی

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ دوم ص ۱۲۶۔

صورتیں تجویز نا امتحانی شدہ ہیں ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں نئی یا احداث ہیں لیکن چونکہ احداث للدین ہیں اس لئے
نہ بدعات ہیں، نہ ان کو کتاب و سنت میں ڈھونڈنے کی ضرورت ہے،

مثلاً نماز میں خشوع (وَهُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ) اور حضور قلب (لا صلوٰۃ الا بحضور القلب)
مقصود و مامور ہے، اور تجربہ سے ذکر و شغل یا مراقبہ وغیرہ کی کوئی خاص صورت و ہیئت اس مقصود کے حصول
میں معین معلوم ہوئی جس میں کوئی شرعی ممانعت یا قباحت بھی نہیں تو اس کا خود ایجاد و اختیار کر لینا،
یا غیر مسلموں اور دین کے دشمنوں تک سے اخذ و قبول کر لینا ایسا ہی ہے، جیسے جہاد کے لئے تیر و تفنگ کے
بجائے بندوق اور مشین گن کا ان سے سیکھ بلکہ چھین لینا۔

صوفیہ میں ایک خاص شغل پاس انفاس کا ہے، جو بہت عام ہے، اس کی نسبت کسی طالب کے سوال
کے جواب میں فرمایا کہ

"یہ اشغال میں سے ہے، اس سے یکسوئی ہوتی ہے اور خطرات دفع ہوتے ہیں، اسی طرح ذکر
کے مختلف طریق ہیں جن میں جس کو جمعیت ہو اختیار کرنا چاہئے، کیونکہ جمعیت گو خود مقصود نہیں،
لیکن مقدمہ ہے حصول مقصود کا، اور مقدمات کا مقصود میں بہت دخل ہوتا ہے، اس لئے
مشائخ نے مقاصد کے لئے کچھ مقدمات تجویز کئے ہیں، اور اُن کو عملاً ایسی ہی اہمیت دی
ہے جیسی مقاصد کو،"

لیکن ان مقاصد کے اصل ہونے کے بجائے مقدمات ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے، کہ مقاصد کی طرح
ان مقدمات میں سے کسی خاص مقدمہ کو اختیار کرنا ہی لازم و واجب نہیں، اس لئے ارشاد ہے کہ

"رہا یہ سوال کہ مختلف مقدمات میں سے کس کو اختیار کیا جائے، اس کا خود ہی فیصلہ کر لیجئے یعنی
جس میں جمعیت و دلچسپی زیادہ ہو وہی زیادہ نافع ہوگا اور یہ مسئلہ کہ جمعیت مطلوب و نافع ہے
تو ہر فن نیز تجربہ سے تو پہلے معلوم تھا ہی لیکن جی چاہتا تھا کہ اس باب میں کوئی نص بھی مل جائے"[۱]

---

۱ الافاضات الیومیہ حصہ ۴ ص ۱۰۹

اللہ کا شکر ہے کہ آج ہی کل میں اس کی دلیل شرعی بھی ذہن میں آگئی، حدیث میں ہے کہ اگر کھانا تیار ہو اور نماز بھی تیار ہو یعنی جب بھوک کا تقاضا ہو تو پہلے کھانا کھالے پھر نماز پڑھے، سو اس کی علت صرف یہ ہے کہ اگر پہلے نماز پڑھی تو طبیعت مشوش رہے گی، نماز میں جمعیت حاصل نہ ہوگی، اور اس کے عکس میں نماز تو جمعیت کے ساتھ ہوگی، اور کھانا تشویش کی حالت میں (کیونکہ نماز میں جی لگا رہے گا) حضرت امام ابوحنیفہ نے یہی وجہ عجیب عنوان سے بیان فرمائی ہے، کہ لان یکون اکلی کلہ صلوٰۃ خیر من ان یکون صلوٰتی کلہا اکلا، یعنی میرا کھانا اگر نماز بن جائے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ میری نماز کھانا بن جائے ہمارے حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس اصل پر ایک تفریع فرمایا کرتے تھے، اگر کوئی ہجرت کرکے مکہ معظمہ میں قیام کرنا چاہتا اور حضرت کو فراست سے اس کا یہ مذاق معلوم ہوجاتا، کہ اس کو مکہ معظمہ میں ویسی جمعیت نہ ہوگی جیسی ہندوستان میں ہے، تو اس کو ہجرت کی اجازت نہیں دیتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ اگر ہندوستان میں جسم ہو اور مکہ میں قلب تو یہ اس سے اچھا ہے کہ مکہ میں جسم ہو اور ہندوستان میں قلب[1]،

سبحان اللہ کیا کہنا! واقعی جو محقق صوفی ہیں اُن کی نگاہ قرآن وحدیث کے مغز وتہ تک جاتی ہے

غرض جتنے اشغال ہیں، وہ جمع خواطر ہی کے لئے ہیں، مقصود بالذات نہیں، اور اس میں مشائخ نے یہاں تک وسعت کی ہے، کہ بعض اشغال جوگیوں تک سے لئے ہیں، مثلاً حبس دم جو جوگیوں کے ہاں کا شغل ہے، مگر چونکہ یہ ان کا مذہبی یا قومی شعار نہیں، اور خطرات کے دفع کے لئے نافع ہے، اس لئے اس کو بھی اپنے ہاں لے لیا ہے، اور اس میں کچھ حرج نہیں نہ اس میں تشبہ ممنوع ہے، کیونکہ جو چیز کسی دوسرے فرقہ کا نہ قومی شعار ہو نہ مذہبی، محض تدبیر

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۲۴۰

کے وجہ سے اس کو تدبیر کی حیثیت سے کسی غرض کے لئے اختیار کرنے میں کوئی محذور شرعی نہیں ہے چونکہ جس دم بھی دفع خواطر کی محض ایک طبعی تدبیر ہے اس لئے اس کا استعمال جائز ہے کیونکہ یہ اخذ محض تدبیر میں ہے نہ کسی مذہبی یا قومی شعار میں،

اور اس کے جواز کی دلیل خندق کا واقعہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کو چاروں طرف سے محدود و محفوظ فرمانا چاہتے تھے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں فارس میں شہر کے گرد خندق کھودتے ہیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیدیا کہ خندق کھودی جائے اور خود بھی بنفس نفیس کھودنے میں شریک ہوئے، تو یہ انتظام و تدبیر فارسیوں کا کوئی قومی یا مذہبی شعار نہ تھا، محض ایک تدبیر تھی، اس لئے حضور نے اس کی اجازت دیدی[1]،

کثرت ذکر باقی نفس ذکر جس کی کثرت و دوام پر تصوف میں اتنا زور ہے، کہ خود حضرت علیہ الرحمہ نے قصد السبیل میں تصوف کے دو مرتبے ٹھہرا کر دوسرے یا اعلیٰ مرتبہ کا (ظاہر کی مندوب و مستحب طاعات کے ساتھ) دوسرا جزء باطن کو دوام ذکر میں مشغول رکھنا ہی قرار دیا ہے، ذکر کی یہ کثرت و دوام خود قرآن و حدیث میں منصوص و متواتر ہے، اذکروا اللہ ذکراً کثیراً وغیرہ کے علاوہ الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم کی مشہور آیت ہی سے نہ صرف کثرت بلکہ دوام بھی ثابت ہے، اس لئے کہ آدمی کی کل تین ہی حالتیں ہو سکتی ہیں، یا کھڑا رہے گا یا بیٹھا یا لیٹا، اور ان تینوں حالتوں میں ذاکر رہنے کے معنی سوتے جاگتے ہمہ وقت اور ہر حال میں ذاکر رہنے ہی کے ہو سکتے ہیں، محاورہ میں بھی کسی بات کا دھیان اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے رہنے کے معنی کثرت و دوام ہی کے ہوتے ہیں،

نیز اس آیت سے ذکر قلب کا بھی استنباط فرمایا ہے، اس لئے کہ کھڑے بیٹھے لیٹے آدمی بہت سے دوسرے کاموں یا باتوں میں لگا رہتا ہے جن کے ساتھ لسانی کے بجائے قلبی ہی ذکر ممکن ہے خصوصاً لیٹے

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۲۰۳

ین جب کہ اس مین سونے کی حالت بھی داخل ہو، نیز لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ نے ذکر قلب کی خصوصیت کو اور بھی واضح فرما دیا ہے، اس لئے کہ تجارت اور کاروبار کی مصروفیت کے اوقات مین بھی ذکر سے غافل نہ ہونا، قلبی ذکر ہی کی صورت مین ہو سکتا ہے،

راقم احقر کی فہم احقر مین تو جو ذکر قرآن وحدیث مین مامور ومنصوص ہے، وہ دراصل ذکرِ قلب ہی ہے، جس کے بغیر ذکر کی لغوی ومعنوی حقیقت متحقق نہیں ہو سکتی، ذکر کے لفظی ولغوی معنی یاد یا یادداشت کے ہین اور کسی شی کو جب یاد کیا جاتا ہے، یا خود یاد آجاتی ہے، تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے، کہ ذہن کو اس کی جانب متوجہ کیا گیا یا از خود متوجہ ہو گیا، جب آدمی کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کرنا چاہتا ہے تو اسکی حقیقت اس کے سوا کیا ہوتی یا ہو سکتی ہو کہ اسکی جانب ذہنی یا قلبی توجہ والتفات سے کام لے رہا ہے بلکہ از بان سے اس کا نام لینا سرے سے ضروری نہین ہوتا، لہذا یاد یا ذکر دراصل نام ہے، مذکور کو دل سے یاد کرنے یا اس کی طرف قلبی توجہ کا نہ کہ محض لسانی تلفظ کا، البتہ زبان سے نام لینا یا لسانی تلفظ قلبی توجہ کا عام وآسان ذریعہ ہے، اسی لئے کسی بھولے بسرے یا مرے ہوے دوست وعزیز کا نام ہمارے سامنے لیا جائے تو اسکی اور اس کے تعلقات کی یاد دل مین تازہ ہو جاتی ہے، یعنی قلب ان بھولی ہوئی باتون کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، احادیث مین اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، رنج وراحت، بیماری وصحت، عیادت وتعزیت دعوت ورخصت سواری وسفر وغیرہ غرض زندگی کے تمام چھوٹے بڑے احوال ومواقع پر اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت نعمت ومشیت وغیرہ کی یاد دہانی کے لئے جو اذکار مامور وماثور ہیں، اُن کا منشا یہی ہے، کہ دن رات ہر حال اور ہر موقع کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے خاص تعلق کی یاد دل مین تازہ ہوتی رہے، مثلاً کھانے کے بعد یہ دعا کہ الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین اور پہنتے وقت یہ دعا کہ الحمد للہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی واتجمل بہ فی حیاتی کا مدعا اس کے سوا اور کیا ہے، کہ ہم دل سے یہ سمجھین کہ کھلانے پلانے پہنانے اوڑھانے والا رازق ورزق عطا فرمانے والا حقیقۃً اللہ ہی ہے، ظاہری اسباب تمام تر محض ظاہری ہین

ایک طالب نے متعارف ذکر و شغل سے اپنی مناسبت کے ساتھ عرض کیا، کہ "البتہ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و احسان ہے کہ زندگی کے تمام چھوٹے بڑے کاموں میں، اس کے فعل و قدرت حکمت و مشیت وغیرہ کا کسی نہ کسی طرح ادراک و استحضار رہتا ہے، اور اگر اس کی رویت کا بھی کچھ استحضار رہتا ہے، تو اس سے قلب و جوارح سب کے اعمال میں بہت نفع محسوس ہوتا ہے"، جواب میں تحریر فرمایا،

"کیا یہ تھوڑا انعام ہے یہی تو مقصود اعظم ہے، اذکار و اشغال متعارفہ اسی کا تو مقدمہ ہیں، اس کے ہوتے ہوئے مقدمات کی کاوش کی مثال بعینہٖ ایسی ہے، کہ کسی کو پکی پکائی روٹی مل گئی، اور وہ پھر بھی تمنا کرتا ہے، کہ خود پکاؤں" (تربیت السالک النور صفر ۱۳۵۶ھ)

نیز قصد السبیل میں باطن کو دوام ذکر میں مشغول رکھنا تصوف کے اعلیٰ مرتبہ کا لازم جزء ٹھہرایا ہے اس سے مراد بھی دل ہی کی یادداشت اور توجہ ہے یعنی حق تعالیٰ کی یاد دل میں اس طرح بس جائے کہ زندگی کی ہر حرکت و سکون میں اس کی رضا و ناراضی، اس کی محبت و عظمت، اس کی سزا و جزا، عذاب و ثواب پیش نظر ہو، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بجز بشری سہو و خطا یا غفلت کے دیدہ و دانستہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی یا چھوٹے بڑے معاصی کے قریب جانا اس کے لئے عملاً ناممکن ہوگا، اکبر الاعمال نام ایک وعظ میں ذکر کو سب سے بڑا عمل قرار دے کر ذکر کی اس حقیقت و علامت کو واضح فرمایا گیا ہے، کہ ذکر حقیقی سارے معاصی سے بچنے اور تمام اوامر کے بجالانے کو مستلزم ہے،

"لوگ سو لاکھ مرتبہ اللہ اللہ کہنے کو ذکر اللہ سمجھتے ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ذکر نہیں، صورت ذکر ہے، اور ذکر کے آثار سے ہے، ورنہ اگر اس کو حقیقت ذکر حاصل ہوتی، تو یہ شخص دوسرے اعمال کا تارک نہ ہو سکتا، حالانکہ بعضے سو لاکھ دفعہ اللہ اللہ کرنے والے بھی دوسرے اعمال سے معرا ہیں"

تصوف کی نسبت یہ علمی و عملی ایسی عام غلطی ہے کہ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا، خود عام غیر محقق متوسم حکما اسی میں مبتلا ہیں، کہ کثرت و دوام ذکر محض اسی لفظی و لسانی یا زیادہ سے زیادہ مطلق قلبی ذکر

کر سمجھ لیا ہے، جس کو قلب کا جاری ہونا کہتے ہیں، اس لئے ذکر کی اصل حقیقت سمجھا دینا بہت تفصیل سے ان کا بتانا ضروری ہے، اسی وعظ میں فرماتے ہیں کہ

ذکر کی حقیقت | بتلاتا ہوں، اس کو ایک مقدمہ سے سمجھئے وہ یہ کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مرتبہ شریف آدمی کے دل میں بعض جرائم کا تقاضا ہوتا ہے، جیسے چوری وغیرہ، چنانچہ بعضے شریف آدمی بھی چوری کرنے لگتے ہیں، محض اسی وجہ سے کہ طبیعت کا تقاضا ہے اور یہ تقاضا اس وجہ سے نہیں کہ ان کا پیشہ چوری کرنا ہے، بلکہ محض احتیاج کی وجہ سے کیونکہ احتیاج بری بلا ہے، یہ انسان کو بری سے بری جگہ لیجاتی ہے، ایک تو یہ منظر ہے اس کو سامنے رکھئے،

اب اس کے مقابل دوسری جماعت کو دیکھئے، کہ باوجود تقاضا و افلاس کے چوری نہیں کرتے، چوری تو کیا کرتے، سرکاری مالگذاری کو بھی نہیں ٹالتے، بلکہ اپنی زمین اور جانور بیچ کر مالگذاری ادا کرتے ہیں اگر گھر میں فاقہ ہو جائے، اس میں غور کیجئے کہ پہلی جماعت چوری پر کیوں اقدام کرتی ہے، اور دوسری جماعت مالگذاری تک کیوں ادا کرتی ہے، حالانکہ احتیاج و افلاس میں دونوں برابر ہیں،

وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ ان کو ایک چیز یاد آتی جو پہلی جماعت کو یاد نہیں آتی یعنی سزا و قید وغیرہ کی رسوائی، اور بس، اب سمجھو کہ ذکر کی حقیقت بھی یہی ہے، اور یاد بھی اسی کو کہتے ہیں، محض علم کا نام یاد نہیں، کیونکہ چوری پر سزائے قید و سزائے تازیانہ کا مرتب ہونا پہلی جماعت کو بھی معلوم تھا، مگر یہ سزا و قید اس کے پیش نظر و مستحضر نہ تھی، اس لئے وہ جرائم سے نہ رک سکی، اور دوسری جماعت کے پیش نظر اور پوری طرح مستحضر تھی، اس لئے وہ اقدام نہ کر سکی،

بہت بڑی غلطی | ایک اور بہت بڑی غلطی کا ازالہ فرمایا گیا ہے، کہ جنت و جہنم کی یاد کو حقیقی ذکر سمجھا جاتا ہے اکثر لوگ

حقیقی تصوف کے درجہ سے اس کو فروتر خیال کیا جاتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا جنت و جہنم پر نظر ہو حالانکہ یہ عین عبدیت ہے، اور انبیاء علیہم السلام تک اس کی یاد اور رغبت و رہبت سے بے نیاز نہ تھے، البتہ غلبۂ حال سے معذوری ہے، یہ ایک شبہ کے ازالہ کے لئے ارشاد ہوا کہ

"اس پر شاید یہ سوال ہو کہ اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ جنت و دوزخ کی یاد ذکر اللہ ہے، حالانکہ یہ تو ذکر جنت و نار کا ہوا، اللہ کی یاد نہ ہوئی، جواب یہ ہے کہ ثواب کی یاد اللہ ہی کی یاد ہے، جیسے کہا جاتا ہے، کہ قانون کو یاد کرو، اس کا بھی مطلب ہی ہے کہ قانون کا یاد کرنا ہی ہتکڑی اور جیل کا یاد کرنا ہے،

ذکر اللہ کے مراتب ہیں | ہاں یہ ضرور ہے کہ ذکر اللہ کے مراتب ہیں بعض کو محض ذات حاکم کی یاد کافی ہوتی ہے، اور جرائم سے بچنے کے لئے سزائے جیل وغیرہ کی یاد کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ بعض کو یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ تم جو چاہے کرو تم کو سزا نہ ہوگی، پھر بھی اس کو حاکم سے ایسا خاص تعلق ہوتا ہے کہ مخالفت نہیں کر سکتا، پھر بعض تو ایسے وقت میں ناراضی کے اندیشے سے مخالفت نہیں کرتے، اور بعض کو یہ اندیشہ بھی نہیں ہوتا، بلکہ حیا و شرم مانع ہوتی ہے، اور بعض کو یہ مانع بھی نہیں ہوتا یعنی حیا و شرم پر بھی التفات نہیں ہوتا اس تعلق کا نام کچھ نہیں

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

یا اس کا نام اگر کچھ ہے، تو تعلق ذات، بہرحال مراتب ذکر میں تدریج ضرور ہے، اب ہم کو دیکھنا چاہئے، کہ ہم کو کس قسم کا تعلق ہے، جیسا تعلق ہو اسی کے مناسب ذکر میں مشغول ہونا چاہئے،

فرق مراتب پر قرآن سے استشہاد | آگے ذکر کے اس فرق مراتب پر قرآن سے استشہاد ہے، جس سے ایک تفسیری مشکل بھی کیسی حل ہو جاتی ہے فرماتے ہیں کہ

"اور یہ فرق مراتب ہی تو ہے جس کی وجہ سے حق تعالیٰ نے ذکر کی تاکید فرماتے ہوئے کہیں تو

ذکر اپنی ذات سے متعلق کیا ہے، جیسے ولذکر اللہ اکبر، اور کہیں اسمائے حسنیٰ سے متعلق فرمایا ہے، واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا، یہاں مفسرین نے لفظ اسم کو مقحم کہا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ زائد کہنے کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ تغیر عنوان مراتب ذاکرین کے اعتبار سے ہے،

مولانا ذکر کے اس فرق مراتب پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

اے ز ہو قانع شدہ بر نام ہو	مست و لایعقل نہٗ از جام ہو

اس میں تنبیہ ہے کہ ذکر کا ایک درجہ وہ ہے جو ذکر اسمی سے ارفع و اعلیٰ ہے، مگر دوسری جگہ بتلاتے ہیں کہ ذکر اسمی بھی بے کار نہیں، بلکہ نافع و مفید ہے، جس کو پہلا درجہ حاصل نہ ہو اسی کو غنیمت سمجھے[1]

از صفت وز نام چہ زاید خیال	و آن خیالش ہست دلال وصال

"یہاں سے سمجھ میں آجائے گا کہ ذکر لسانی بھی بیکار نہیں، گو دل متوجہ نہ ہو، اور یہ جو کسی نے کہا کہ

برزبان تسبیح و در دل گاؤ خر	این چنین تسبیح کے دارد اثر

یہ غلط ہے میں نے اس کے رد میں کہا کہ

این چنین تسبیح ہم دارد اثر

صاحبو! غضب یہ ہے کہ کھٹائی مٹھائی کا نام لینے سے تو اثر ہو کہ نام لینے سے منہ میں پانی بھر آئے اور خدا کے نام میں اثر نہ ہو،" (ص ۲۳ و ۲۴)

صوفیہ کا اصطلاحی ذکر قلبی | پھر آگے صوفیہ کے اصطلاحی ذکر قلبی کا ذکر ہے کہ

"ایک بات اور کہتا ہوں وہ یہ کہ متاخرین صوفیہ نے محض ذکر قلبی تجویز کیا ہے وہ بہت اچھی چیز ہے، مگر زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتا، دل ادھر ادھر چلا جاتا ہے، اس لئے ذکر کو جھٹکا

---

[1] اور کمال جامعیت یہ ہے کہ اپنے اپنے موقع اور محل کے اعتبار سے تمام مراتب حاصل ہوں، جیسے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام یا ان کے اقرب و اکمل غیر مطلوب الحال متبعین کو،

کہ میں ذکر میں مشغول ہوں اسلئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ذکر لسانی کرنا چاہئے، اور اس میں توجہ قلبی رکھنا چاہئے، اگر کچھ دیر ذکر قلبی نہ رہے گا، تو لسانی تو باقی رہے گا، اور وقت ضائع نہ ہوگا، خصوصاً میری اس تحقیق کے بعد کہ جو عمل خاص نیت سے شروع ہو، اس کی برکت و انوار مستمر رہتے ہیں، گو وہ نیت مستحضر نہ رہے، اور گو توجہ باقی نہ رہے، اب جو ہم لوگوں کے ذکر میں انوار نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو توجہ اور حصول نور کا قصد بھی نہیں، اگر قصد ہو تو انوار ضرور حاصل ہوں، پس اب یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ این چنین تسبیح کے وارد اثر یعنی جب حصول اثر کا قصد ہو، (ص ۲۲)

ذکر کے درجات | خلاصہ یہ کہ ذکر کا ایک درجہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کو یاد کرو، دوسرا درجہ یہ ہے کہ بواسطہ نام کے ذات کو یاد کرو، تیسرا درجہ یہ ہے کہ نام کا واسطہ بھی نہ رہے محض ذات کے ذکر پر قائم ہو جائے، اسی طرح تعلق کا ایک درجہ یہ ہے کہ اگر اس سے یوں بھی کہدیا جائے کہ تم کو کسی گناہ پر سزا نہ ہوگی، جو چاہو کرو جب بھی احکام کی مخالفت نہ کرے، نیز اگر یوں کہدیا جائے کہ تیرا خاتمہ کفر پر ہوگا جب بھی اعمال میں کوتاہی نہ کرے، چنانچہ ایک بزرگ کو ذکر میں آواز آئی کہ جو چاہے کر تو کافر ہو کر مرے گا، وہ پریشان ہو گئے، مگر ذکر اور نماز وغیرہ نہیں چھوڑی، بلکہ شیخ سے جا کر عرض کیا، شیخ نے کہا کام میں لگے رہو، اس آواز سے پریشان نہ ہو، یہ دشنام محبت ہے،

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

محبت کا ایک رنگ | یہ بھی محبت کا ایک رنگ ہے،

ما بہ بدیم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما

میرے والد صاحب بچوں کو گود میں کم لیتے تھے، جب زیادہ محبت کا جوش اٹھتا تو بچوں کے گلے پکڑ کر دبا دیتے، جس سے بچے رو پڑتے، مشتاقات کے بعد یہ تھا عجیب محبت کا

بچوں کو گود میں لینا، کھلانا، ان پر شفقت آنا، بس رونا ملتا ہے، مگر اُن کو اسی میں لطف آتا تھا، بچوں

بھی بچوں سے مذاق کا شوق ہے جس میں بعض دفعہ اُن کو غصہ بھی آتا ہے، اُن کی یہ

ادا بھی پسند آتی ہیں، ایسے ہی بلا تشبیہ یوں سمجھئے کہ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ محبت کی

وجہ سے طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں، ان کا رلانا چلانا ان کو پسند ہے، کسی کا ہنسنا

پسند ہے، اس کو ہنساتے ہیں، کسی کا رونا پسند ہے اُس کو رلاتے ہیں،

ذوق ما دارم بہ پا بہائے تو ۔ خوش نماید گریۂ شبہائے تو

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است ۔ بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

اس تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جنت و دوزخ، عذاب و ثواب کو یاد کرنا

بھی اللہ ہی کی یاد ہے، کیونکہ ذکر کے مراتب مختلف ہیں، پس ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ

جیسے بعض لوگ باوجود تقاضا کے چوری نہیں کرتے، مالگذاری ادا کرنے میں سستی نہیں

کرتے، کیونکہ ان کو ایک چیز یاد آتی ہے یعنی سزا و قید وغیرہ، اسی طرح ایسی چیز کو

یاد رکھنا جو معاصی (نافرمانی) سے روکے اور اطاعات (فرمانبرداری) پر برانگیختہ کرے تو ذکر اللہ یا اللہ

کی یاد ہے، اب اگر کسی کو جنت و دوزخ کی یاد معاصی سے روکے اس کے لئے یہی ذکر اللہ ہے اور کسی کو اللہ اللہ کرنا معاصی

سے روکے اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے اور جس کو مراقبۂ ذات معاصی سے روکے اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے

اور جب کہ یہ چیزیں معاصی سے نہ روکیں اس کے لئے یہ حقیقی ذکر اللہ نہ ہوں گی، بلکہ

ذکر کی صورت ہوں گی، اس کو اپنے مناسب حال حقیقی ذکر کسی محقق سے تجویز کرانا چاہیے

مثلاً جنون کے لئے نفس پر مالی جرمانہ معاصی سے مانع ہوتا ہے، ان کے واسطے یہی ذکر

جو حقیقت ہے ذکر کی، اور یہی جڑ ہے تمام طریق کی، بلکہ تمام شریعت کی،

ذکر ہی جڑ ہے تمام شریعت و طریقت کی | اس کے ثبوت میں مثلاً چند آیات مذکور ہیں،

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں، اقم الصلوٰۃ لذکری اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ سے مقصود ذکر ہے، حج کے بارے میں ارشاد ہے فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام واذکروا اللہ فی ایام معدودات اور فاذکروا اسم اللہ علیہا صواف اور اگر غور کیا جائے تو تمام اعمال میں ذکر موجود ملے گا، یہ تو اعمال ظاہر کی چند مثالیں تھیں اب اعمال باطنہ میں غور کیجئے، تو وہاں بھی ذکر موجود ہے، چنانچہ ارشاد ہے، اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم آیاتہ زادتھم ایمانًا۔ جس سے معلوم ہوا، کہ خوف وخشیت وہی معتبر ہے جس کا منشا، ذکر اللہ ہو، یہ مقامات کا بیان تھا، کیونکہ اعمال ہی کو مقامات کہا جاتا ہے، اب احوال میں غور کیا جائے، تو ان میں بھی ذکر کو دخل ہے، چنانچہ ارشاد ہے، الا بذکر اللہ تطمئن القلوب[1] کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے، اطمینان کے دو درجے ہیں، ایک تو مقام ہے، جو تصدیق واذعان کا درجہ ہے، اور ایک حال ہے، جس کو سکون دائمی سے تعبیر کیا جاتا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق اطمینان کے لئے ذکر اللہ کو سبب بتلایا ہے، اس لئے اس کے عموم میں مقام وحال دونوں داخل ہیں، اگر عموم سے استدلال نہو، تو مشاہدہ خود اس کی دلیل ہے، کیونکہ واقعی دل کو راحت اور چین ذکر اللہ ہی سے نصیب ہوتا ہے،

گر گریزی بر امید راحتے ہم ازاں جا پیشت آید آفتے
ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

خلوت گاہ حق سے مراد اللہ کے ساتھ تعلق ہے، جو ذکر کی اعلیٰ فرد ہے

ذکر کی حقیقت وصورت میں فرق وتمیز کے متعلق حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی تمہید وتحقیق کی تفصیل

---

[1] اس دفعہ کے مضمون میں ذکر سے متعلق اور بھی بہت سی آیات نقل فرمائی گئی ہیں،

باوجود کسی قدر تطویل کے ضروری وا ہم تھی، اس لئے کہ غیر محقق درویشوں نے اسی ابو کا ذ یا بعض صورت ذکر پر اتنا زور دیا ہے، کہ ذکر کی حقیقت گم ہو کر رہ گئی، ماحصل حضرت کی اس مجددانہ تحقیق کا یہ نکلا کہ حقیقی ذکر وہ ہے جس میں بلا واسطہ (یا بواسطہ عذاب وثواب جنت ودوزخ وغیرہ) مذکور کا استحضار رہو، احقر نے اسی کو ابتدا میں یوں عرض کیا تھا، کہ ذکر (یاد) کے معنی یہ ہیں، کہ مذکور یعنی جس کی یاد آئے، یا جس کو یاد کیا جائے، قلب یا ذہن اس کی طرف متوجہ ہو،

اور اللہ تعالیٰ کی اس حقیقی یاد و ذکر یا مذکور کی طرف توجہ اور اس کے استحضار کی علامت بلکہ لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے، کہ دیدہ و دانستہ نافرمانی یا معصیت کا ارتکاب یا فرمانبرداری وطاعت میں کوتاہی عقلاً ناممکن ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، رضا و ناراضی یا عذاب وثواب ہمارے پیش نظر ہو، اور پھر ہم اس کی پروانہ کریں، اس حقیقی یاد یا ذکر ہی کا نام حدیث میں احسان ہے جو محققین کے اسلامی تصوف کا مخصوص نام ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طرح بجالاؤ، کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو، تو وہ تو دیکھ ہی رہا ہے، ظاہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی یاد نصیب ہو جائے کہ گویا یہ ہمہ وقت اس کے سامنے اور حضوری میں ہے، یا کم از کم اس کی رضا و ناراضی عذاب وثواب ہی کا تصور ہے، تو بشری بھول چوک کے علاوہ کسی چھوٹی بڑی نافرمانی کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے،

اسی آیت میں جس پر اکبر الاعمال کا یہ وعظ ہے، ولذکر اللہ اکبر کے بعد ہی دوسرا ٹکڑا وَاللّٰہُ یعلم ما تصنعون ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد بہت بڑی چیز ہے، اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ جانتا ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد حقیقی معنی میں ہو، تو کم از کم اتنا تو پیش نظر رہنا ہی چاہئے کہ ہمارا ہر فعل و عمل اللہ کے علم میں ہے، اور وہ جان اور دیکھ رہا ہے، (وھی فانہ یراک) نیز ذکر اللہ کی حقیقت کے حاصل کرنے کا اصل طریقہ یہی ہے کہ اس کے حاضر و ناظر یا عالم ودانا ہونے کا مراقبہ رہے، اسی وعظ کے آخری ضمیمہ میں ہے کہ

ذکر اللہ کے حصول کا طریقہ اس جملہ میں ذکر اللہ کی تحصیل کا طریقہ بتلایا گیا ہے، کہ اس مضمون کو پیش نظر رکھا جائے، کہ اللہ تعالیٰ کو میرے ہر عمل کا علم ہے، اس مراقبہ سے ذکر اللہ بسہولت حاصل ہو جائے گا، اور تمام اعمال کی تکمیل ہو جائے گی، کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی کوتاہی کا سبب یہی ہے، کہ ہم اعمال کو بدون سوچے سمجھے ادا کرتے ہیں، اگر یہ سوچ کر عمل کریں کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے عمل کا علم ہو رہا ہے، کہ ہم کیسے ادا کر رہے ہیں، تو عمل اچھی طرح ہو، اور اگر یہ مراقبہ راسخ ہو جائے، تو معاصی سے اجتناب آسان ہو جائے، یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی حقیقت محض زبانی ذکر نہیں، بلکہ وہ دوسری چیز ہے، جو مراقبۂ علم سے مثلاً حاصل ہوتی ہے، پھر خواہ مراقبۂ علم اس طرح ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ہر عمل کو جانتے ہیں، اگر کوتاہی ہوگی، تو عذاب ہوگا، یا اس طرح ہو کہ محبوب کو میری عبادت کا علم ہے، وہ مجھ سے اس حالت میں ناراض ہوگا، وغیرہ وغیرہ" (ص ۳۶)

غرض اگر حقیقی تصوف کا حقیقی ذکر میسر ہو تو مومن و مسلم کی زندگی کی ہر ہر حرکت اور ہر ہر سکون اور ساری زندگی ذکر ہی ذکر اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہی یاد ہے خواہ یہ یاد کسی درجہ اور کسی پیرایہ میں ہو، خواہ اس کے ثواب و عقاب کی یاد ہو، خواہ اس کی رضا و ناراضی کی یاد ہو، خواہ اس کی ذات کی یاد ہو،

باقی حضرات صوفیہ کے ہاں ذکر لسانی کا جو اتنا اہتمام ہے اس کا بڑا مقصد بھی یہی ہے کہ اس ذریعہ سے قلب میں مذکور کی یاد رچ اور بس جائے، یہ نہ بھی ہو تو ادھر ادھر کی لغو و فضول باتوں اور گپ زنیوں کے بجائے نفس زبان ہی کا ذاکر رہنا کیا کم دولت ہے، اس کے علاوہ اگر لسانی ذکر کے ساتھ قلب مسلسل نہ بھی متوجہ رہے، تو بھی اگر صوفیانہ طریقوں سے قلبی توجہ کے ساتھ ذکر لسانی کی مشق کی گئی ہے، تو دنیا کے دھندوں میں انہماک کے باوجود زبان کی یاد کے ساتھ وقتاً فوقتاً قلب بھی ضرور کچھ نہ کچھ متوجہ ہوتا رہتا ہے، دن بھی اگر کسی کا نام زبان ہی سے ہر وقت اٹھتے بیٹھتے لیتے رہو تو دوسری مصروفیتوں کے باوجود دنیا میں

درمیان دل میں بھی اس کا خیال آتا ہی رہے گا، اسی بنا پر حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ صوفیہ کے متعارف ذکر قلبی کے مقابلہ میں (جس کے قلب کے ذہول یا عدم توجہ کا اندیشہ رہتا ہے) ذکر لسانی کی ترجیح و فضیلت کے قائل تھے،

ذکر قلبی افضل ہے یا لسانی | ایک مولوی صاحب نے بعینہ یہی سوال پیش کیا، کہ ذکر قلبی افضل ہے یا لسانی ؟

" فرمایا کہ ذکر کے متعلق مختلف احکام ہیں بعض لفظ کے ساتھ متعلق ہیں، ان میں ذکر لسانی افضل ہے، باقی جو ذکر زبان سے نہ کیا جائے اجر اس پر بھی ہے، یہ ذکر قلبی ہے جس سے ہر وقت قلب میں یاد ہے، مگر اس میں قوی اندیشہ رہتا ہے، قلب سے ذہول کا، اور ذکر لسانی میں یہ اندیشہ نہیں، اسی اعتبار سے قلبی سے لسانی افضل ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگر صرف قلب سے ذکر کرے گا، تو زبان خالی رہے گی، اور اگر زبان سے ذکر کرے گا تو اس کے ساتھ قلب بھی ادنیٰ توجہ کے ساتھ متوجہ رہے گا[1] "

یہاں ذکر قلبی سے مراد صوفیہ کا وہی متعارف و اصطلاحی ذکر ہے، جس کو قلب کا جاری ہونا کہا جاتا ہے، اور جو اس طرح مشق سے ہو جاتا ہے، کہ قلب کی طرف متوجہ ہو کر مثلاً یہ تصور کیا جائے کہ اس کی حرکات کے ساتھ اللہ اللہ یا لا الہ الا اللہ نکل رہا ہے، تو کچھ عرصہ کی مشق کے بعد قلب کی طرف توجہ سے ایسا ہی سنائی دینے لگتا ہے، لیکن یہ اکثر خصوصاً دماغی مصروفیت کی حالت میں جاری نہیں رہ سکتا، چنانچہ کسی طالب نے لکھا تھا کہ

" ذکر قلبی اکثر اوقات بآسانی جاری رہتا ہے، مشغولی کار کے ساتھ بھی جاری رہتا ہے، لیکن اکثر دماغی مصروفیت کے وقت بند ہو جاتا ہے، کوشش کرتا ہوں کہ ایسے وقت بھی بے تکلف جاری رہ سکے،

---

[1] الافاضات الیومیہ ص ۹۵ حصہ ہفتم،

جواب میں تحریر فرمایا کہ

"نہیں رہ سکتا، کیونکہ ایک آن میں دو طرف توجہ نہیں ہو سکتی لیکن اس جاری نہ رہنے سے کچھ ضرر نہیں، باقی ذکر قلبی سو اگر اس وقت ذکر لسانی دشوار ہو تو اس پر اکتفا کا مضائقہ نہیں، ورنہ محض قلبی پر اکتفا نہ کیا جائے، لسانی بھی اس کے ساتھ ضرور ہے، خواہ قلبی میں اس سے کچھ کمی ہو جائے"[۵]

یہ وہی اصطلاحی ذکر قلبی ہے، کہ چونکہ اس کا دار و مدار تصور پر ہے، کہ قلب کی حرکت یا دھڑکن سے فلاں آواز نکل رہی ہے، اس لئے جب دماغ دوسرے تصورات میں مصروف ہوتا ہے، تو یہ جاری نہیں رہ سکتا، بخلاف لسانی کے کہ وہ اس صورت میں بھی جاری رہ سکتا ہے،

"ایک شخص شاہ ولی اللہ صاحب کے پاس آیا، اور عرض کیا کہ حضرت میرا قلب جاری ہو گیا، آپ نے فرمایا کہ دل دھڑکنے کو قلب کا جاری ہونا نہیں کہتے، قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت خدا وند تعالیٰ کی یاد دل پر حاضر رہے، اکثر لوگ کہا کرتے ہیں، کہ فلاں بزرگ کی بوٹیاں تھرکتی ہیں، یہ بہت کامل ہیں، اور جن لوگوں میں یہ باتیں نہیں ہوتیں، اُن کی نسبت کہتے ہیں کہ نیک بخت ہیں یعنی ان میں کمالات باطنی نہیں، حالانکہ کمالاتِ باطنی بالکل مخفی ہیں، ان کو بوٹیوں کے تھرکنے سے کچھ تعلق نہیں، (الرفیق سوء الطریق ص ۲۰)

ذکر کے باب میں ایک بڑی خطرناک غلطی | جس میں بعضوں کو ابتلا ہے یہ کہ نفس ذکر ہی کو تمام اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے کافی جانتے ہیں، اور استدلال اس ابتلاء سے بھی عجیب تر ہے، کہ "انا جلیس من ذکرنی" سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اور اللہ سے قریب رہ کر اللہ کی نافرمانی یا معاصی میں کیسے مبتلا ہوگا، لہٰذا اور تدابیر کی ضرورت نہیں،

---

[۵] اشرف السوانح حصہ سوم ص ۱۵۴،

"حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، کیونکہ ذکر نفی میں خود تدابیر اصلاح بھی داخل ہیں، تو بدون معالجہ امراض کے ذکر ہی متحقق نہ ہوگا، دیکھو حصن حصین میں ہے: من کل مطیع اللہ فھو ذاکر۔ دوسرے ذکر کے معنی ہیں یاد، تو یاد تو سب طریقہ سے ہوتی ہے، نہ کہ محض زبان ہی سے نام لیتے گیا، یہ یاد ہے کہ جس کی یاد کا دعویٰ ہو، نہ اس سے بات کرے، نہ اس کے خط کا جواب دے، نہ اس سے ملے، نہ اس کا کہنا مانے، یہ ہرگز یاد نہیں تو جو ذکر بدون اصلاح کے ہو، وہ ایسی یاد ہے[1]"

یہ غلطی اچھے اچھے مشائخ میں اتنی عام ہے کہ مرید کر کے بس کچھ اذکار کی تعلیم فرما کر فارغ ہو جاتے ہیں، اعمال و اخلاق کی کوتاہیوں یا امراض پر نہ کوئی روک ٹوک، نہ علاج و تدبیر، بلکہ طالب اگر کسی مرض کو بیان کرے، تو اس کے لئے بھی اکثر کوئی ذکر یا وظیفہ ہی اور تجویز فرما دیا جاتا ہے، حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی رائج الوقت عامیانہ تصوف میں درحقیقت یہ بڑی اہم تجدید و اصلاح تھی، کہ اعمال و اخلاق کے مواخذہ و معالجہ کے مقابلہ میں مروجہ اذکار و اشغال اوراد و وظائف کی حیثیت بالکل دوسرے اور تیسرے درجہ کی تھی، ان کا ذکر مجلس میں شاذ و نادر آتا، لیکن اعمال و اخلاق پر روک دن رات رہتی،

"ایک صاحب نے اپنے خط میں کوئی آسان وظیفہ یا طریقہ پوچھا جس سے طاعات میں ترقی اور معاصی سے اجتناب میسر ہو۔ جواب میں تحریر فرمایا کہ طاعات و معاصی دونوں امور اختیاریہ ہیں جن میں وظیفہ کو کچھ دخل نہیں، طریقہ، سو امور اختیاریہ کا طریقہ استعمال اختیار کے سوا اور کچھ نہیں،"

کسی اور موقع پر فرمایا کہ:

"نرا وظیفہ اصلاح کے لئے ہرگز کافی نہیں، نرے وظیفہ والے پیروں سے واللہ ثم واللہ جو کبھی اصلاح ہو، اصلاح تو ہوتی ہے، اصلاح کے طریقہ سے،"

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۱۹۵ و ۱۹۶ (اشرف السوانح حصہ دوم)

غرض ذکر کی جو اصل حقیقت ہے یعنی مذکور کی دل سے یاد اور اس سے غافل نہ ہونا، یہ تو شریعت کا عین مقصود، بلکہ عبادت و طاعت کا اعلیٰ ترین مقام احسان ہے، کہ وہ مذکور کے اس طرح استحضار کیساتھ ادا ہوگا، کہ گویا ہم اس کے سامنے حاضر ہیں، اس کو دیکھ رہے ہیں یا وہ ہم کو دیکھ رہا ہے، مسلمان کی ساری زندگی بندگی ہے، اسلام کے معنی ہی بالکلیہ اطاعت یا سر افگندگی و سپردگی کے ہیں، اور حضرت مجدد کی تجدید تصوف کا خلاصہ بھی یہی دو باتیں ہیں، طاعت کا اہتمام، اور دوام ذکر یا معصیت و غفلت سے اجتناب تام، اور تصوف یعنی خدا کی اس کمال بندگی یا عبدیت خالصہ کی راہ کے قصد یا قصد السبیل الی المولیٰ الجلیل کے نام سے جو دستور العمل مرتب فرمایا گیا ہے، اس میں تفصیلی تفہیم کے بعد ارشاد ہے کہ

خلاصۂ طریق طاعت و ذکر | میزانِ کل، اور خلاصہ طریق الی اللہ کا کل دو چیزیں ہیں طاعت اور ذکر، معصیت سے طاعت فوت ہو جاتی ہے، اور غفلت سے ذکر مختل ہو جاتا ہے، اس لئے اپنا اصلی کام طاعت و ذکر پر دوام رکھنے اور معصیت و غفلت سے بچنے کو سمجھے۔

سالک کے چار طبقات | باقی اشغال و مراقبات، احوال و کیفیات، کشف و کرامات، بیعت و نسبت وغیرہ کی جو حیثیت و حقیقت تصوف کے متین دستور العمل (یا ٹکسٹ بک) میں واضح فرمائی گئی ہے، اس کا اندازہ صرف اس سے فرمایا جا سکتا ہے، کہ اس راہ کا قصد کرنے کو چار طبقات عامی مشغول، عامی فارغ، عالم مشغول، عالم فارغ میں تقسیم فرما کر عامی مشغول و فارغ دونوں کے لئے اشغال کی سرے سے ممانعت فرمائی ہے، کہ

اس میں طرح طرح کے خطرات ہیں جن کا تحمل عامی سے نہیں ہو سکتا[۱] ص ۱۰

عالم مشغول تک کے دستور العمل میں یہ قید ہے کہ

شیخ سے دریافت کر شغل نہ کریں، البتہ چند سے شیخ کے حضور میں اگر یہ کام کیا ہو، اور وہ اب

---

[۱] قصد السبیل الی المولیٰ الجلیل ص ۱۰۔

بھی اس کی تجویز کرے، تو مضائقہ نہیں۔

ورنہ تصوف کے اس تجدیدی دستور العمل کی رو سے متعارف صوفی بننے کی اجازت صرف عالم فارغ یعنی ایسے علماء ہی کو ہے، جو ایک طرف دین و شریعت کا پورا علم رکھتے ہیں، اور دوسری طرف فکر معاش سے فارغ ہیں تاکہ نہ جاہل صوفیوں کے خلاف شرع رسوم و بدعات کا شکار ہو سکیں، اور نہ اشغال و مراقبات یا ان کے ثمرات و کیفیات وغیرہ کے عدم تحمل کی وجہ سے حدود سے تجاوز کر سکیں، چنانچہ عالم فارغ کے دستور العمل میں ان چیزوں کی حسب ضرورت اجازت کے باوجود ان کی محدود حیثیت پر پوری طرح متنبہ فرمادیا گیا ہے، مثلاً ذکر میں جہر و ضرب کی نسبت ارشاد ہے کہ

> جہر مقصود بالذات اور قربت فی نفسہا نہیں، ایسا اعتقاد کرنا بدعت ہے اور حدیث میں جو وارد ہے کہ اربعوا علی انفسکم انکم لا تدعون اصم ولا غائبا میرے نزدیک اسی اعتقاد کی نہی پر محمول ہے، اور بعض نے اس کو جہر مفرط پر محمول کیا ہے، جس سے دوسرے متاذی ہوں مثلاً سونے والوں کو تشویش ہو، اور امام ابو حنیفہ کے منع فرمانے کی بھی یہی توجیہات ہیں، ورنہ جہر فی نفسہ جائز ہے جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے رفع الصوت بالتکبیر کا علامت انصراف عن الصلوٰۃ ہونا عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور سنن میں وتر کے بعد سبحان الملک القدوس مروی ہے
>
> وہ حکمت جہر میں یہ سمجھی گئی ہے، کہ اس میں وساوس و خطرات کم آتے ہیں، کیونکہ اپنی آواز جو کان میں آتی رہتی ہے، قلب آسانی سے ادھر متوجہ رہ سکتا ہے، سو یہ فائدہ خفیف جہر سے بھی حاصل ہے،
>
> اسی طرح ضرب میں بھی قربت نہیں، اس میں بھی ایسی ہی طبی حکمت ہے، وہ یہ کہ حرکت عنیفہ سے حرارت پیدا ہوتی ہے، اور حرارت سے رقت اور رقت سے تاثر اور تاثر معین ہوتا ہے اطاعت اور محبت میں جو مقاصد میں ہیں، پس ضرب ذریعہ مقصود ہونے کی بنا پر مقصود بالغیر ہے، لیکن زیادہ [illegible]

قلب میں خفقان پیدا ہونے کا ڈر ہے، لہٰذا اعتدال سے تجاوز نہ کرے،

"یہ تو اس کے متعلق تحقیق علمی تھی، ایک اور عمل اس میں قابلِ تنبیہ ہے، کہ اکثر کتبِ فن میں اس ذکر کے ساتھ گردن کو داہنے بائیں لیجانے کو لکھا ہے، سو جان لینا چاہئے کہ پہلے لوگوں کے مزاج و دماغ قوی تھے، اس کے متحمل ہوتے تھے، بلکہ بوجہ قوتِ مزاج بدون اس کے متاثر نہ ہوتے تھے، اس لئے اُن کو اس کی ضرورت تھی، اب خود ہی ضعف غالب ہے، تھوڑے مشاغل سے قلب متاثر ہو سکتا ہے، اس لئے ایسا نہ کیا جائے، ورنہ دماغ کے ماؤف ہونے کا اندیشہ ہے"[1]

خاطر فارغ کے لئے اس دستور العمل میں جو مراقبہ تجویز فرمایا گیا ہے، وہ مراقبۂ موت ہے، یعنی موت کے بعد سے حساب وکتاب وغیرہ کے واقعات کا اس طرح تصور کرنا کہ گویا وہ ہم کو پیش آرہے ہیں، اس کی بھی حکمت وغایت یہ ہو کہ کثرت ذکر سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس مراقبہ سے دنیا کی نفرت پیدا ہوگی، یہی حب وبغض اس کا م بنا دینے کے لئے ان شاء اللہ کافی ہونگے،

"بس تقویٰ کا التزام اور یہ ذکر اور یہ مراقبہ کافی ہے، عمر بھر اس پر مداومت رکھے، تو آخرت میں تو ثمرہ یقینی ہے، اور اس وعدہ وعید سے ثمرات کا آخرت ہی میں ہے لیکن دنیا میں بھی اگر انشاء اللہ منظور ہوگا، تو اس کے قلب پر علوم عجیبہ و معارف جن کے باب میں مولانا کا ارشاد ہے،

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب وبے معید و اوستا

اور واردات غریبہ و مواجید مثل ذوق و شوق، محبت و انس و ہیبت و انکشاف اسرار احکام و حسن معاملہ فیما بینہ وبین اللہ وغیرہ فائض ہوں گے، جن کی لذت کے سامنے ہفت اقلیم

---

[1] قصد السبیل الی المولیٰ الجلیل ص ۱۰ و ۱۱

کی سلطنت گرو ہے، اور یہ امور حالات کہلاتے ہیں، یہی علوم کشف الٰہی کہلاتے ہیں کشف کرنی

نہ لذت میں اس کی گرد کو پہنچتا ہے، نہ قرب میں اس کو اس کا سا دخل ہو، ص ۱۲

اصل میں تو تقویٰ وطاعت کے اہتمام کے ساتھ منصوص و ماثور کثرت ودوام ذکر ہی کو کافی قرار دیا گیا ہے لیکن بعضوں کو مدت تک ذکر کرنے کے باوجود حضور قلب ویکسوئی میسر نہیں ہوتی، ان کے لئے کسی مناسب شغل میں مضائقہ نہیں، مثلاً ایک سہل شغل اسحد ہے جس میں کچھ لذیذ آواز سنائی دیتی ہے،

بلکہ بعض اوقات نہایت دلربا ودلفریب آوازیں پیدا ہوتی ہیں، جو شاغل کو محو کر دیتی ہیں، اور محسوس ولذیذ چیز کی طرف متوجہ ہونے سے طبعاً دوسرے خطرات کم ہو جاتے ہیں، تو اس سے ذہن کو ایک طرف پوری توجہ کرنے کی عادت ہو جاتی ہے،

لیکن چونکہ شغل خود مقصود نہیں ہوتا، اس لئے جب یہ عادت ہو جاتی ہے، تو اس کو چھڑا کر توجہ کی عادت کو حقیقی مقصود کی طرف پھیر دیتے ہیں جس کی طرف اوّلاً توجہ اس کے غائب عن الحواس ہونے کے متوجہ ہونا مشکل ہوتا تھا، ساتھ ہی اس سلسلہ میں ایک اور بڑے خطرناک دھوکے پر تنبیہ فرمایا گیا ہے کہ اس شغل میں جو آواز سنائی دیتی ہے، وہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی کوئی صفت ہے، جیسا کہ بعضوں کو دھوکا ہو گیا ہے، بلکہ عالم غیب میں سے کسی مخلوق کی بھی کوئی صفت نہیں، صرف اس کے دماغ میں ہوا بند ہو کر متموج ہونے لگتی ہے، اشغال وغیرہ کے اس قسم کے آثار کو جو محض اپنے دماغ ہی کے آفریدہ وتخیلات ہوتے ہیں، جاہل صوفیہ یا اشراقیہ ضرا جانے کیا کیا سمجھنے لگتے ہیں، کہ عالم غیب کے اسرار اُن پر کھل گئے ہیں، اور انھیں مقصود بلکہ معبود بنا لیتے ہیں،

حالانکہ جس طرح اس آواز کا محل تو دماغ ہو اسی طرح کبھی دوسرے اشغال یا اذکار میں بھی مختلف الوان کے انوار جو نظر آنے لگتے ہیں، وہ اکثر اپنے ہی دماغ کی صورتیں ہوتی ہیں چنانچہ غیر شاغل بھی اگر اسی طرح آنکھیں بند کر کے دیکھے تو بعض اوقات اس کو بھی مختلف رنگ نظر آیا کرتے ہیں، اور اس سے کبھی دھوکا نہ کھانا چاہئے،[۱]

[۱] تصفیۃ السبیل ص ۱۲،

کی طرف التفات کرو بلکہ اگر واقعی عالم غیب کی چیزوں کا کشف ہونے لگے جیسا کہ کبھی کبھی یکسوئی میں ہو بھی جاتا ہے تب بھی ہرگز ادھر متوجہ نہ ہو نہ اس سے لذت حاصل کرے، خواہ وہ مکشوفات ناسوت کے ہوں یا ملکوت کے لیکن ہیں سب غیر مطلوب حتی کہ حسب ارشاد حضرت مرشد (حاجی امداد اللہ) علیہ الرحمۃ حجاب ظلمانی سے حجاب نورانی اشد ہے، طالب کو اس کی نفی کرنا اور اس مضمون پر نظر رکھنا چاہئے ۔

عشق آں شعلہ است چوں بر فروخت ۔ ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

تیغ لا در قتل غیر حق براند ۔ در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ سوخت ۔ مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت (ص ۱۴)

یہی نہیں کہ اشغال و مراقبات تصوف کے مقاصد نہیں، بلکہ چونکہ محض تدابیر ہیں، اس لئے جن اشغال و مراقبات میں مضرت کا احتمال ہے، ان کو سرے سے عوام کیا خواص کے لئے ممنوع و متروک قرار دیا ہے، مثلاً اشغال میں شغل رابطہ و تصور شیخ اور مراقبات میں مراقبۂ وحدت الوجود بوجہ اس کے کہ اکثر خواص کو بھی مضر ہوتا ہے، متروک ہے، کما قال اللہ تعالیٰ فی الخمر والمیسر اذ کانا حلالین "اثمھما اکبر من نفعھما" (ص ۱۵)

تجدید تصوف کے دو اصل اصول | باقی حضرت کے تجدیدی و اصلاحی تصوف کی اصل الاصول دو ہی باتیں ہیں جن سے بچنے کا ہر وقت اہتمام ضروری ہے، ایک غفلت جس کا علاج ذکر ہے، جس کا اوپر بیان ہوا، دوسرے معصیت، البتہ معاصی میں چونکہ عام دیندار اور علمائے ظاہر زیادہ تر کبائر اور وہ بھی جوارح کے معاصی ہی کو معاصی خیال کرتے ہیں، صغائر اور قلب یا باطن کے معاصی کی بالکل یا چنداں پروا نہیں کرتے اور صوفی کا خاص مقام احسان و حضور ہے، وہ صغائر و کبائر ظاہر و باطن ہر حال میں اور ہر جگہ حق تعالیٰ کو حاضر و ناظر اپنی و مرئی مشاہدہ کرتا ہے، اس لئے معصیت صغیرہ ہو یا کبیرہ، قلب سے ہو یا زبان سے یا ہاتھ پاؤں آنکھ کان سے سب سے بچنے کی کوشش کرتا ہے ۔

غفلت سے قلب کی نورانیت برباد ہوجاتی ہے، اور معصیت کے علاوہ نور قلب فوت ہونے سے
مقبولیت عند اللہ بھی زائل ہوجاتی ہے، اور یہ بڑا خسارہ ہے،
لہذا اس کے اہتمام کی بہت زیادہ تاکید فرمائی گئی ہے، کہ
اگر احیاناً غفلت سے یا نفس کی شرارت سے کوئی قولی یا فعلی معصیت سرزد ہوجائے، فوراً
نہایت ندامت وعاجزی سے استغفار وتوبہ کرے، بالخصوص بعض معاصی خصوصیت سے زیادہ مضر
ہیں، ان سے بچنے کا اور زیادہ اہتمام رکھے، ایک ریا دوسرے کبر، اور اسی سے تکاثر تفاخر وکبر
پیدا ہوتا ہے، خواہ کمال دنیوی پر ہو یا کمال دینی پر، تیسرے زبان سے کسی کی غیبت وشکایت
یا کسی پر طعن واعتراض، بلکہ اکثر فضول کلام بھی نورانیت قلب کو مضر ہوتا ہے، اس لئے طالب حق
کو لوگوں سے زیادہ میل جول نہ کرنا چاہئے، مگر بضرورت، چوتھے محل نامشروع میں رغبت وشہوت
سے کسی کی طرف توجہ کرنا خواہ آنکھ سے یا دل کے خیال سے، پانچویں بے جا اعتدال سے زیادہ
غصہ کرنا، یا بدخلقی وسختی کے ساتھ پیش آنا، (قصد السبیل ص ۲)،

خالی اشغال و مراقبات کو تصوف اور مقصود تصوف سمجھنے والے صوفیہ اور محض ظاہری اور بڑے
بڑے گناہوں کو گناہ سمجھنے والے دیندار علماء دونوں کا حال پیش نظر رکھ کر پھر ایک مرتبہ اوپر کی سطریں
پڑھو تو معلوم ہوگا، کہ تصوف کے معتقد و منکر دونوں نے طریقت کو بیگانۂ شریعت کر، (باقی)

عرب ریاستوں کے حالات

جن لوگوں کو عربوں اور یہودیوں کی جنگ سے دلچسپی ہے، ان کے لئے شام، فلسطین، شرق اردن اور
دوسری عرب ریاستوں کے حالات اور فلسطین میں یہودیوں کی جدید تاریخ اور ان واقعات کا جاننا ضروری ہے
جن کا نتیجہ موجودہ جنگ ہے، یہ حالات کتاب **عرب کی موجودہ حکومتیں** میں ملیں گے،

بغداد اور اس کا تمدن

از

شاہ معین الدین احمد ندوی،

مسلمانوں کی تمدنی تاریخ میں ظاہری نفاست و لطافت اور حسن و دلآویزی کے اعتبار سے عباسیوں کا تمدن نہایت بلند تھا، اور محاضرات کی مشہور و معروف کتاب الف لیلہ و لیلہ میں اس کی جو تصویریں نظر آتی ہیں، اُن کو اگرچہ تاریخی اعتبار و استناد کا درجہ حاصل نہیں ہے، اور اس میں بہت سے افسانے اور خرافات بھی شامل ہیں، لیکن ان سے قطع نظر خالص تمدنی اور معاشرتی مرقعے بڑی حد تک صحیح ہیں، تاریخ بنی عباس کے تمدنی حصہ کی تدوین کے سلسلہ میں مستند تاریخوں میں بھی بعض دلفریب مرقعے نظر سے گذرے، ان کے لطف میں ناظرین معارف کو بھی شریک کرنا مناسب معلوم ہوا

لیکن اس سے پہلے یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ

اسلام ایک فطری اور سادہ مذہب اور اس کا دامن بے جا تمدنی تکلفات سے پاک ہے، اور گو جائز حدود کے اندر شریعت نے عیش و تنعم کی اجازت دی ہے، لیکن ہر وہ شے جو سادگی اور عبدیت کے خلاف ہو، وہ اسلامی روح کے منافی ہے، اسلام کی یہ سادگی خلافت راشدہ کے عہد تک قائم رہی، اور گو اس زمانہ میں فتوحات کی کثرت اور مال غنیمت کی فراوانی سے صحرائے عرب میں سونے چاندی کے مینہ برسنے لگے تھے، اور ایران و روم کے خزانے کھنچ کھنچ کر مدینہ کی گلیوں میں آگئے تھے، لیکن اس سے مسلمانوں کی سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا، امیر خلیفۃ المسلمین کے جسم پر وہی پیوند لگا کپڑا اور غذا میں جو کی روٹی ۔

رد محفوظ نہ رہا،

لیکن دولت کی فراوانی اور مختلف تمدنون اور قومون کے اختلاط کے اثرات طبعی ہین جس سے کوئی قوم نہین بچ سکتی، اور یہ اختلاط حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ سے جب اسلام نے جزیرۃ العرب سے نکل کر ایران و روم کی سرزمین مین قدم رکھا، شروع ہو گیا تھا، لیکن اس وقت تک مسلمانون مین اسلامی روح پوری طرح موجود تھی، خود حضرت عمرؓ کو اسلامی سادگی کے تحفظ مین بڑا اہتمام تھا، اسلام کے محافظ و نگہبان صحابۂ کرام موجود تھے، جو کسی بیرونی اثر کو گوارا نہین کر سکتے تھے، اس لئے اس دور مین دوسری قومون کے اختلاط کے اثرات ظاہر نہین ہونے پائے لیکن جس قدر زمانہ گذرتا گیا، اور مذکورہ بالا اثرات کم ہوتے گئے، اتنے ہی مسلمانون مین دوسری قومون کے اثرات پھیلتے گئے، اور خلافتِ راشدہ کے خاتمہ اور صحابہ کرام کے اٹھنے کے بعد اموی دور مین اس کا اثر نمایان ہونے لگا، بنی امیہ کا پایۂ تخت دمشق (شام) رومیون کا ملک تھا، اس لئے مسلمان پہلے اسی سے متاثر ہوئے، مگر شام کا علاقہ مختلف حیثیتون سے عرب سے ملتا جلتا ہوا ہے، یہان ان کی ہم نسل سامی قومین بھی آباد تھین، پھر بنی امیہ مین گو خلفاے راشدین کی طرح اسلامی روح نہ تھی، لیکن عربون کی خصوصیات کے تحفظ مین انہین بھی اہتمام تھا، اور ان مین عربی عصبیت پوری طرح موجود تھی، اور اموی حکومت بعض معاشرتی تکلفات کو چھوڑ کر خالص عربی تھی، اس لئے ان کے زمانہ مین غیر عربی عنصر اور اس کے تمدن کا غلبہ نہین ہونے پایا، اور عربی خصوصیات بڑی حد تک محفوظ رہین،

مگر جب بنی عباس نے اُن کی جگہ لی تو اس کے زمین و آسمان بالکل بدل گئے، اور عباسی خلافت مذہب کے سوا زندگی کے تمام شعبون مین عجمی رنگ مین رنگ گئی، اور اس کی حکومت و سیاست تہذیب معاشرت، علوم و فنون قریب قریب پورا کا پورا عجمی قالب مین ڈھل گیا، اس کے مختلف اسباب تھے،

سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ تھا کہ عہدِ رسالت کے بعد سے مسلمانون مین رفتہ رفتہ مذہبی روح کمزور ہوتی گئی تھی، دوسرے عباسی خلافت تمامتر عجمیون کے بل پر قائم ہوئی تھی، اس کا بانی ابو مسلم خراسانی

عجمی تھا، اور عباسی دعوت کو عجم ہی کی سرزمین میں فروغ حاصل ہوا، اور یہیں اس کی بنیاد پڑی جس کے اثرات ناگزیر تھے، پھر قیام حکومت کے بعد دولتِ عباسیہ کے تمام بڑے بڑے عہدہ دار عجمی ہوئے، برمکی خاندان کی شہرت و عظمت اور خلافتِ عباسیہ میں اس کا غلبہ و اقتدار محتاج بیان نہیں، تیسرے خلافتِ عباسیہ کا پایۂ تخت بابل اور نینوا کے کھنڈر پر تعمیر ہوا تھا جس کی آب و ہوا میں عجمی اثرات سرایت کئے ہوئے تھے، اور اہل عجم ایک قدیم متمدن قوم اور ایک ترقی یافتہ اور بلند تہذیب کے مالک تھے، ان کا تمدن نہایت دلکش اور نظر فریب تھا، اور خلفا میں اسلامی روح باقی نہ رہ گئی تھی، ان اسباب کی بنا پر عباسیوں میں عجمی تمدن پھیل گیا، لیکن عربی اور اسلامی تمدن نے بھی اس کو متاثر کیا، اور دونوں کی آمیزش سے ایسا دلکش اور بوقلمون تمدن پیدا ہوا، جو مسلمانوں کا معیاری تمدن قرار پایا، اور رفتہ رفتہ سارے مشرقی ملکوں میں پھیل گیا، تیموری تمدن بھی جسے ہم آج ہندوستانی تمدن کہتے ہیں، اسی کی یادگار ہے، اس میں فطری طور پر ہندو تمدن کے عناصر بھی شامل ہوگئے ہیں۔

خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اس تمدن کے حسن و قبح پر بحث نہیں، اس بارہ میں اسلام کا نقطۂ نظر وہی ہے، جو اوپر مذکور ہوا، اسلام کسی ایسے نقش کو گوارا نہیں کرتا، جو اسلامی روح کے منافی ہو، لیکن خالص دنیاوی اور مادی حیثیت سے یہ دو آتشہ تمدن ایک معیاری تمدن تھا، اس مضمون میں اسی تمدن کے بعض دلکش رخوں کو دکھانا مقصود ہے، تمدن کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس میں حکومت و سیاست، تہذیب و معاشرت، علوم و فنون، اجتماعی زندگی کے تمام شعبے آجاتے ہیں، لیکن ان سب کی تفصیل نہایت طویل ہے، اور ہمارا مقصود اس کے صرف ایک پہلو یعنی تمدنی نفاستوں کو دکھانا ہے، لیکن یہ موضوع جس قدر دلکش ہے، اسی قدر دشوار بھی ہے، عربی تاریخوں کا دائرۂ بحث اس دور کے مذاق کے مطابق عموماً سیاسی واقعات و حوادث اور جنگ و فتوحات کے حالات تک محدود ہے، ان میں تمدنی واقعات محض ضمناً آجاتے ہیں، محاضرات کی کتابوں میں البتہ تمدنی واقعات ملتے ہیں، لیکن ان کو تاریخی حیثیت

کا مرجع حاصل نہیں اس لئے معتبر تاریخون سے اس عہد کے تمدن و معاشرت کی تصویر دکھانا بہت مشکل اور کوہ کندن وکاہ برآوردن سے کم نہیں تاہم اس مضمون مین اسی سنگلاخ زمین سے جوئے شیر نکالنے، اور اسی خارستان سے تمدن کا مرقع سجانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کو عباسی تمدن کی کامل تصویر تو نہین کہا جا سکتا لیکن اس سے اس کا اجمالی اندازہ ہو جائے گا،

قومون کے تمدن کا ایک بڑا مظہر اس کی تعمیرات ہین، ان کا شکوہ و تجمل، بانیون کی شوکت و عظمت کا نشان اور اس کے نقش و نگاران کے ذوق جمال کی تحریرین ہین، جن سے ان کی تمدنی تاریخ پڑھی جا سکتی ہے، آج بھی گذشتہ قومون کی عظمت و جلال کی سب سے بڑی نشانیان اُن کی عمارتون کے کھنڈر ہین،

از نقش و نگارے در و دیوار شکستہ آثار پدیداست صنادید عرب را

اسلامی اندلس کی تاریخ مین مسلمانون کے عروج کے سب سے بڑے شاہد الزہرا کے کھنڈر اور الحمرا کے در و دیوار ہین، ہندوستان مین تیموریون کی عظمت کی شہادت تاج محل، لال قلعہ، جامع مسجد اور فتح پور سیکری کی عمارتون سے ملتی ہے، اسی طرح عباسی تمدن کی شوکت و عظمت کا سب سے بڑا نشان اور اس کا مرکز بغداد تھا، اور عباسیون کے تمدن سے واقفیت کے لئے اس کی عظمت و شان سے واقفیت ضروری ہے لیکن عباسیون کے دور زوال ہی مین اس پر ایسے مسلسل و پیہم انقلابات طاری ہوئے، کہ وہ اسی زمانہ مین گویا ویران ہو چکا تھا، اور جو کچھ یادگارین رہ گئی تھین، وہ تاتاریون کے سیلاب کی نذر ہو گئین، اور بغداد کی عظمت گذشتہ پر آنسو بہانے والے کھنڈر بھی باقی نہ رہ گئے،

صبح تک تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادِ صبا
یادگارِ شمع تھی کل تک جو پروانے کی خاک

اور اب بغداد مین اس کے پرانے شکستہ مقابر کے علاوہ اس کا کوئی مرثیہ خوان باقی نہیں ہے، یا کتابون کے

اوراق سے اس کا پتہ چلتا ہے، بغداد کے حالات میں مستقل کتابیں لکھی گئیں ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر کمیاب ہیں، تاریخ خصوصاً جغرافیہ کی کتابوں میں بھی کافی حالات ملتے ہیں، آیندہ سطروں میں انہی سے بغداد عظمت رفتہ کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کیجائے گی،

بغداد کی تعمیر بغداد کو دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے ۱۳۶ھ میں آباد کیا، اس کی تعمیر اس عہد کا عظیم الشان تعمیری کارنامہ ہے، تاریخوں میں اس کی تعمیر کی بڑی طویل تفصیل ہے اس کا خلاصہ یہ ہے،

یہ عظیم الشان شہر ارض بابل و نینوا کے ایک خوش سواد قطعہ میں دجلہ کے ساحل پر آباد کیا گیا تھا، اس کی تعمیر سے پہلے منصور نے ماہر مہندسین سے اس کا نقشہ بنوایا، اور مختلف ملکوں سے تعمیر کا سامان ماہر معمار، نجار اور دوسرے صناع و کاریگر اکٹھا کئے تھے، اسکی تعمیر ۱۴۰ھ میں شروع ہوئی، ایک لاکھ مزدور اور کاریگر روزانہ کام کرتے[1]،

بغداد کا نقشہ مدور تھا، یعقوبی کے بیان کے مطابق یہ دنیا کا پہلا مدور شہر تھا، لیکن صحیح یہ ہے کہ دنیا کا نہیں البتہ مسلمانوں کا پہلا مدور شہر تھا، شہر کے وسط میں ایوان شاہی کی عمارت تھی، جو قصر الذہب کے نام سے موسوم تھی، اس کے درمیانی ہال پر اسی گز بلند گنبد تھا، جو قبۃ الخضراء کہلاتا تھا، اس کی چوٹی پر ایک اسپ سوار مجسمہ نصب تھا، یہ گنبد بغداد کے ہر حصہ سے نظر آتا تھا[2]،

پھر جب بغداد میں آبادی کی کثرت ہوگئی، تو ۱۵۸ھ میں منصور نے شہر سے باہر دجلہ کے ساحل پر ایک محل تعمیر کرایا، جو اپنی خوبصورتی اور زینت و آرائش کے لحاظ سے قصر خلد کہلاتا تھا[3]،

قصر الذہب سے شہر پناہ کے چاروں پھاٹکوں تک جن کا ذکر آگے آتا ہے، چار وسیع و کشادہ سڑکیں نکالی گئی تھیں، پھر ان بڑی سڑکوں سے بہت سی چھوٹی چھوٹی سڑکیں نکلی تھیں، ان کے دونوں کناروں

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج اول ص ۶۷، و کتاب البلدان یعقوبی ص ۲۳۸، [2] خطیب ج اول ص ۷۳،
[3] تاریخ خطیب ج اول ص ۷۵ و ۷۶،

پھر ترتیب کے ساتھ مکانات تھے۔[1]

آبادی کی ترتیب یہ تھی کہ وسط شہر میں قصر الذہب کی عمارت اور جامع مسجد تھی، اس کے آس پاس دور تک پولیس اور حفاظتی سپاہ کی چوکی کے علاوہ اور کوئی آبادی نہ تھی، شاہی ایوان کے بعد شاہزادوں کے محلات اور اُن کے خدام و متوسلین کے مکانات تھے، ان کے بعد سرکاری دفاتر کی حسب ذیل عمارتیں تھیں،

بیت المال (خزانہ) خزانۃ السلاح (اسلحہ خانہ) دیوان الرسائل (دفتر مراسلات) دیوان الخراج (دفتر خراج) دیوان الخاتم (خاتم خلافت جہاں فرامین و احکام شاہی پر مہر لگائی جاتی تھی) دیوان الحوائج (شاہی ضروریات کا سامان) دیوان الاحشام (خدم و حشم شاہی کا دفتر) دیوان النفقات (شعبۂ اخراجات کا دفتر) مطبخ عامہ (باورچی خانہ عام)[2]

ان عمارتوں کے بعد امرائے دولت اور ارکانِ حکومت کے مکانات تھے، آخر میں عام آبادی اور بازار تھے، ہر طبقہ اور تمام اہل حرفہ کے محلے الگ الگ اور اُن کے باشندوں یا اس محلہ کے ممتاز اشخاص کے نام سے موسوم تھے، مثلاً رحبۂ فلاں، یا قطیعہ فلاں وغیرہ[3]، ہر چیز کے بازار جدا تھے[4]، ہر محلہ بازار اور آبادی سے متعلق اتنی مسجدیں تھیں، جو ان کے لئے کافی ہوں[5]، بڑی بڑی سڑکیں پچاس پچاس گز، اور چھوٹی سڑکیں اور گلیاں سولہ سولہ گز چوڑی تھیں، اور تمام سڑکیں اور گلیاں ممتاز اشخاص یا آبادی کے طبقات کے نام سے موسوم تھیں[6]، سڑکوں کے کنارے نہریں رواں تھیں، اور سارے شہر میں ان کا جال پھیلا ہوا تھا[7]،

شہر کے گرد دوہری سنگین شہر پناہ تھی، اس کے آثار نوے گز اور بالائی حصہ پچیس گز چوڑا تھا اور

---

[1] تاریخ الاسلام السیاسی والثقافی حسن ابراہیم حسن ج ۲ نیز تاریخ جامعہ فواد مصر جلد ۲ ص ۲۰ [2] کتاب البلدان یعقوبی ص ۲۴۰ [3] تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب [4] اول ص ۵۰۰، ۵۰۰۵ [5] ایضاً ص ۵۰، [6] کتاب البلدان ص ۲۰۲ [7] ایضاً ص ۲۴۰ و ص ۲۴۴ [8] ایضاً ص ۵۰، ۱۱۱ و ما بعد،

بلندی پچاس گز تھی، بیرونی فصیل کے اوپر بڑے بڑے برج بنے ہوئے تھے، اس فصیل کے بعد چوڑی خندق تھی، جس میں پانی بھرا رہتا تھا،[1] شہر پناہ کے چاروں سمت چار بڑے پھاٹک تھے جن سے اسپ سوار مع علم کے گذر سکتا تھا، پھاٹکوں کے نام باب الکوفہ، باب البصرہ، باب خراسان اور باب الشام تھے ان پھاٹکوں میں اتنے وزنی دروازے لگے تھے، کہ ان کو جنبش دینے کے لئے ایک پوری جماعت کی ضرورت ہوتی تھی،[2]

کرخ کی تعمیر ۱۵۷ھ میں منصور نے بغداد سے باہر لیکن اس سے متصل کرخ کے نام سے ایک نئی آبادی قائم کی، بغداد کی تعمیر کے وقت بازار شہر کے اندر تھے، اس لئے ہر قسم کے لوگ بلا روک ٹوک شہر میں آتے جاتے تھے، اس زمانہ میں ایک رومی بطریق منصور کے دربار میں آیا، منصور نے اسے شہر دکھانے کا حکم دیا، دیکھنے کے بعد منصور نے شہر کے بارہ میں اس کی رائے پوچھی، اس نے کہا نہایت خوبصورت اور مستحکم شہر ہے، لیکن یہ بڑا عیب ہے کہ آپکے دشمن آپ کے ساتھ رہتے ہیں، منصور نے پوچھا وہ کیسے، بطریق نے کہا بازار شہر کے اندر ہیں، اس لئے جاسوس تاجروں کے بھیس میں آسانی کے ساتھ حکومت کی خبریں باہر بھیج سکتے ہیں، منصور یہ سن کر خاموش رہا،[3] خطیب کے بیان کے مطابق بطریق نے کہا تھا کہ آپ کی رعایا ہر وقت آپ کے پاس رہتی ہے، اور جب رعایا بادشاہ سے قریب رہے گی، تو اس کا راز فاش ہو جائے گا، منصور نے اس وقت تو یہ کہکر ٹال دیا، کہ میری رعایا اور میرے درمیان کوئی راز ہی نہیں ہے[4] لیکن بطریق کی بات اس کے دل میں لگ گئی، اس کی واپسی کے بعد اس نے بغداد سے باہر اور اس سے متصل کرخ کے نام سے ایک نئی آبادی بسائی، بغداد کی پہلی آبادی کی طرح اس میں بھی ہر چیز کے بازار جدا جدا تھے اس کی تعمیر کے بعد بغداد کے تمام بازار اور عام آبادی کرخ میں منتقل کر دی اور ایک جامع مسجد بھی علحدہ تعمیر کرا دی (خطیب ج اول ص ۸۰، معجم البلدان ج ۲، ص ۲۴۳)

---

[1] کتاب البلدان ص ۲۳۹ [2] ایضاً [3] معجم البلدان ج ۲ ص ۲۴۳ [4] تاریخ خطیب جلد اول صفحہ ۷۹

کرخ کی تعمیر کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بغداد میں عام آبادی کی وجہ سے دھوئیں کی بڑی کثرت ہوگئی تھی، جس سے عمارتیں بھی سیاہ ہوجاتی تھیں اور لوگوں کو بھی تکلیف پہنچتی تھی[۱] اس کے اس کے علاوہ اسباب بھی بیان کئے گئے ہیں،

رصافہ کی تعمیر | بغداد کی تعمیر کے بعد ہی منصور نے اپنے ولی عہد مہدی کے لئے بغداد کے مشرقی جانب ایک وسیع محل مع جملہ لوازم مہدیہ کے نام سے تعمیر کرایا، اس کی مستقل شہر پناہ و خندق تھی،[۲] فوجیں بھی یہاں منتقل کردی تھیں، اس لئے مہدیہ عسکر مہدی بھی کہلاتا تھا،[۳] اور ہارون رشید نے اپنے زمانہ میں یہاں رصافہ کے نام کا ایک محل تعمیر کرایا تھا جس کی بنا پر آیندہ رصافہ بھی کہلانے لگا تھا،

منصور نے اپنے دوسرے لڑکوں امرا، اور فوجی افسروں کو بھی بغداد کی طرح رصافہ میں زمین کے قطعے دیدئے تھے، جنھوں نے خود اپنے اپنے محلات بنوائے تھے، بغداد میں جگہ کی بڑی قلت تھی، اور رصافہ کا رقبہ نہایت وسیع تھا، اور لوگوں کو مہدی سے بڑی محبت تھی، اس لئے یہاں لوگ بکثرت آباد ہوگئے، اس کی آبادی بھی بغداد کی طرح مرتب تھی، ہر طبقہ کے محلے اور ہر چیز کے بازار جدا تھے، چند دنوں میں یہ شہر بڑی تجارتی منڈی اور صنعت و حرفت کا بڑا مرکز بن گیا،[۴] اور منصور ہی کے زمانہ میں اتنا بڑا شہر ہوگیا، اور اس کی آبادی اتنی بڑھ گئی، کہ اس کی سڑکوں اور گلیوں کی تعداد چار ہزار مسجدوں کی چند ہزار اور حماموں کی پانچ ہزار تک پہنچ گئی تھی، بازاروں کے کرایہ کی آمدنی بیس لاکھ درہم سالانہ ہوتی تھی،[۵]

مہدی نے اپنے زمانہ میں رصافہ کی آبادی میں اور اضافہ کیا اور یہاں جامع منصور سے بھی بڑی جامع مسجد تعمیر کرائی، (مراصد الاطلاع ج اول ص ۴۲۷) اور چند دنوں میں رصافہ بغداد کی ہمسری کرنے لگا، پھر ہارون رشید خصوصاً اس کے وزراء برامکہ نے بڑے شاندار محل تعمیر کرائے، ہارون نے دجلہ کے

---

[۱] معجم البلدان ج ۷، ص ۲۳۳ [۲] تاریخ خطیب ج اول ص ۸۲ [۳] معجم البلدان ذکر رصافہ [۴] کتاب البلدان
[۵] ایضاً ص ۲۵۲،

ساحل پر شماسیہ کے نام سے ایک محل تعمیر کرایا، برامکہ کے محل فن تعمیر کا بہترین نمونہ تھے، اس زمانہ میں تعمیرات میں اتنا اضافہ ہوا کہ شہر کا طول چار فرسخ تک پہنچ گیا[1]

برامکہ کے محلوں کی عظمت وشان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض بعض محلوں کی تعمیر پر دو دو کروڑ درہم صرف ہوئے تھے[2]،

ہارون رشید کی لڑکی ام حبیب نے ایک محل بنوایا تھا، جو اس کے نام سے قصر ام حبیب مشہور تھا، برامکہ کے محلوں میں "قصر یحییٰ برمکی" قصر دار الخلافہ" زیادہ مشہور تھے، قصر دار الخلافہ قصر حسنی بھی کہلاتا تھا، یہ محل ویران ہو گیا تھا، مامون کے وزیر حسن بن سہیل نے دوبارہ اس کو آباد کرایا، اس میں وزیر مذکور کی لڑکی، مامون کی بیوی بوران رہتی تھی، پھر معتضد باللہ نے اپنے زمانہ میں اس سے لے کر اس کو جملہ ضروری سامانوں سے آراستہ کیا، اور اس کی عمارت میں توسیع کرائی (تاریخ خطیب ج اول ص ۱۰۹) قصر بغداد کے تمام محلوں میں سب سے عظیم الشان تھا اس کی چھت اور دیواریں جواہرات اور قیمتی پتھروں سے آراستہ تھیں،

ہارونی عہد میں بغداد انتہائی عروج پر پہنچ گیا، خطیب کا بیان ہے، کہ عمارتوں آبادی کی کثرت امن و رفاہیت کے اعتبار سے بغداد ہارونی عہد میں اوج شباب پر پہنچ گیا، اس کے دور میں ملک سبز و شاداب، آسودہ حال اور رعایا فارغ البال تھی[3]،

سامرا کی آبادی | پھر معتصم نے اپنے زمانہ میں بغداد سے قریب ایک شہر سامرا آباد کرایا، اس کا سبب یہ ہوا کہ معتصم نے ایرانیوں کا زور توڑنے اور ان کا اقتدار گھٹانے کے لئے جو مامون کے زمانہ سے خطرناک حد تک پہنچ گیا تھا، ترکوں کو آگے بڑھانا شروع کیا، اور سمرقند، فرغانہ، اور اشروسنہ سے ہزاروں ترکی غلام خرید کر بلائے، اور انھیں دیبا کی زرق برق وردیوں اور زیورات سے آراستہ کیا[4]، اور بڑے بڑے

---

[1] الفخری ص ۱۹۷ [2] ابن اثیر ج ۶ ص ۱۰۵ [3] خطیب ج اول ذکر بغداد [4] تاریخ الخلفاء ص ۳۳۴،

ذہبی مناصب پر قابض ہو گیا، اس سے ایرانیوں کا اقتدار تو گھٹ گیا، لیکن خود ترکوں کا اقتدار بہت بڑھ گیا، وہ بڑے وحشی اور تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے، اس لئے اہل بغداد ان کی وجہ سے بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے، وہ سڑکوں پر بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے تھے، عورتیں بوڑھے بچے کچل جاتے تھے، اور ترک کوئی پروا نہ کرتے تھے، بغدادیوں نے معتصم سے اس کی فریاد کی، اس نے انھیں بغداد سے الگ رکھنے کے لئے اس سے قریب ایک شہر سامرا آباد کرایا، اور اسکی تعمیر کے بعد خود بھی وہیں منتقل ہو گیا،[1]

سامرا بغداد کے شمال جانب اس سے تیس میل کی مسافت پر تھا، آبادی سے پہلے یہ مقام بالکل ویران تھا، عیسائیوں کی ایک خانقاہ کے علاوہ اور کوئی آبادی نہ تھی، منصور نے بغداد کی آبادی میں جو اہتمام کیا تھا، معتصم نے اسی اہتمام سے سامرا کو بسایا، اور اسی کے نقشہ کے مطابق اس کو تعمیر کرایا، تمام ممالک محروسہ سے صناع و کاریگر، ساکھو، ساگون، اور دوسری چوب عمارتی، بصرہ، علاقہ سواد، انطاکیہ اور شام کے ساحلی علاقوں سے منگائیں، اور سنگ مرمر اور سنگ تراش لاذقیہ سے جو اس کا بڑا مرکز تھا، منگایا،

ترکوں کی آبادی اہل شہر سے بالکل الگ رکھی، اور امراء و عمائد سلطنت کو زمین کے قطعات دیدیئے انھوں نے اپنے اپنے محل بنوائے، بغداد کی طرح سامرا میں بھی ہر طبقہ اور ہر قبیلہ کے محلے الگ اور ہر چیز کے بازار جدا جدا تھے، پیشہ وروں اور اہل حرفہ کی آبادی ایک سلسلہ میں تھی، ہر آبادی یا محلہ اس کے باشندوں یا وہاں کے کسی ممتاز امیر کے نام سے موسوم تھا، مکانات بغداد کی عمارتوں سے زیادہ وسیع اور سڑکیں اس کی سڑکوں سے زیادہ کشادہ تھیں،

تمام سڑکیں مختلف ناموں سے موسوم تھیں، ہر آبادی کے لئے مسجدیں اور حمام جدا جدا تھے، وسط شہر میں جامع مسجد اور اس کے چاروں طرف بازار تھے، معتصم کے کئی محل اور باغات تھے، ہر باغ کے وسط میں ایک عمارت نشست گاہ تھی، اور کئی سبزہ زار تھے، دربار عام کے لئے ایک مستقل عمارت تھی [illegible]

---

[1] مروج الذہب مسعودی ج ۲، ص ۱۴۳، و تمدن تاریخ اسلام ص ۲۰۴،

معتصم دوشنبہ اور جمعہ کو دربار کرتا تھا، اس سے متصل خزائن عامہ و خزائن خاصہ کی عمارتین تھین،

سامرا کی زمین بالکل بنجر تھی، پانی کمیاب تھا، معتصم نے اس کو زرخیز اور شاداب بنانے کے تمام ممالک محروسہ سے آبی زمین شناخت کرنے اور اس کو نکالنے والے مہندسین اور کھیتی اور باغبانی اور زمین کو زرخیز بنانے والے ماہرین جمع کرکے نہرین نکلوائین، اور بکثرت باغات لگوائے، اس کے علاوہ مختلف حصون کو زرخیز بنانے کا کام بڑے بڑے ترکی امرار کے علحدہ سپرد کیا، اور بغداد، بصرہ، اور علاقہ سواد سے کھجور کے درخت اور جزیرۂ شام، عراق، خراسان، رے وغیرہ سے پھل پھول کے درخت اور سبزیون اور ترکاریون کے بیج منگا کر لگائے، ان کوششون سے یہ بنجر علاقہ نہایت سرسبز و شاداب ہو گیا، اور باغون اور پھلون میوون اور ترکاریون کی اتنی کثرت ہو گئی، کہ خاص سامرا اور اس کے نواح کے بعض مواضعات کے باغات کی آمدنی چار لاکھ اشرفی سالانہ تھی،

سامرا کے دارالخلافہ بن جانے اور اس کی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے یہان اس کثرت سے لوگ آباد ہونے لگے کہ اس کی زمین سونے کے بھاؤ ہو گئی،[۱]

معتصم کے بعد واثق نے سامرا کی عمارتون مین اور اضافہ کیا، اور لب دجلہ قصر ہارونی کے نام سے ایک محل بنوایا، سامرا کے بازارون کو وسیع کرایا، عام لوگون نے بھی عمارتین بنوائین، واثق کے بعد متوکل نے قصر ہارونی مین قیام کیا، اور شہر مین دو نئی سڑکین شارع العسکر اور شارع الجدید کے نام سے نکالین، شہر سے باہر ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کرائی، اس مین فوارہ لگوایا، مسجد کے تین سمتون مین اتنی چوڑی سڑکین نکلوائین، کہ مع خدم و حشم کے آسانی سے ساتھ گذر سکے، سڑکون کے دو رویہ دکانین اور اس کے بعد کاتبون، فوجی افسرون اور ہاشمی امرا کے مکانات تھے، اپنے لڑکون منتصر کو قصر عروس مین مؤید کو مطیرہ مین اور معتز کو بلکوارا مین جو سامرا سے فاصلہ پر تھا، رہنے کا حکم دیا، اس سے سامرا سے لے کر بلکوارا تک مسلسل

---

[۱] یعقوبی نے سامرا کی آبادی کی بڑی مفصل تفصیل لکھی ہے ہم نے اس کا خلاصہ نقل کیا ہو دیکھو کتاب البلدان [illegible]

آبادی ہو گئی،[1]

یاقوت کا بیان ہے، کہ متوکل نے سامرا میں جیسی عظیم الشان عمارتیں بنوائیں ویسی کسی خلیفہ نے نہ بنوائی تھیں، اس نے سات لاکھ اشرفیاں ان عمارتوں پر صرف کیں، ان محلوں کے نام یہ تھے، عروس، وحید، جعفری، غریب، شیدان، برج، صبح، ملیح، بستان، تل، برکوان، جوسق، قلائد، غرد، قصر متوکلیہ، بہو، اور لولو، ہر محل کی تعمیر پر شعراء کو ان کی تعریف میں قصیدہ کہنے کا حکم تھا، یاقوت نے بعض قصیدے نقل کئے ہیں[2]

یعقوبی نے محلوں کے یہ نام لکھے ہیں، شاہ، عروس، شبداز بدیع، غریب اور برج، برج کی تعمیر پر بروایت یعقوبی ستر لاکھ اشرفیاں صرف ہوئی تھیں، جو مبالغہ معلوم ہوتا ہے،[3]

قصر جعفری ایک مستقل شہر کی حیثیت رکھتا تھا، یہ محل بغداد کے محلہ کرخ سے تین فرسخ کی مسافت پر مقام ماحوزہ میں آباد کیا تھا، اور دجلہ سے جو دس میل کے فاصلہ پر تھا، پندرہ لاکھ روپیہ کے صرف سے ایک بڑی نہر شہر میں لائی گئی تھی، جس کے دونوں جانب آبادی تھی، متوکل کے لڑکوں، افسران فوج، کاتبوں اور دوسرے عہدہ داروں کے مکانات ایک سلسلہ میں تھے، متوکل کے محل کے تین عظیم الشان پھاٹک تھے جن سے اسپ سوار مع نیزہ کے گذر سکتا تھا، اور شہر کو تین میل لمبی اور چالیس گز چوڑی سڑک کے ذریعہ کرخ سے ملا دیا گیا تھا، اور شہر کے دونوں جانب بڑی نہر سے اس کی شاخیں نکالی گئی تھیں، عام بازار آبادی سے بالکل الگ تھے، اور ہر محلہ کے متعلق بھی ایک ایک بازار تھا، اس شہر کی تعمیر سے سامرا اور کرخ تک مسلسل آبادی ہو گئی تھی، درمیان میں کوئی جگہ خالی نہ تھی، محرم ۲۴۶ھ میں متوکل یہاں منتقل ہو گیا، اس تقریب میں عمال حکومت کو انعام و اکرام سے نوازا، اور حکومت کے دفاتر بھی یہاں منتقل ہو گئے،[4]

یاقوت کا بیان ہے، کہ یہ شہر سامرا سے زیادہ آباد اور بارونق تھا،[5]

---

[1] کتاب البلدان یعقوبی ص ۲۶۵ [2] معجم البلدان ج ۵ ص ۱۵ و ۱۶ [3] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۴۹۱ [4] کتاب البلدان ص ۲۶۶ [5] معجم البلدان ج ۵ ص ۱۱۳

متوکل نے عمارتوں میں بعض جدتیں بھی کی تھیں، مسعودی کا بیان ہے، کہ اوس نے ایک خاص قسم کی عمارتیں بنوائی تھیں، جو حیری، کمین اور آستین کہلاتی تھیں، یہ عمارتیں میدانِ جنگ کے نقشہ کے مطابق تھیں، صدر عمارت میں جو رواق کہلاتی تھی نشست گاہ سلطانی تھی، اس کے دائیں بائیں جو کمین کہلاتے تھے، میمنہ اور میسرہ کی عمارتیں تھیں، ان میں خلیفہ کے مقربین اور خواص رہتے تھے، اس کے داہنے جانب توشہ خانہ، اور شمال میں آبدار خانہ تھا، اس کی تقلید میں اور شائقین نے بھی اس قسم کی عمارتیں بنوائیں،[1]

اس طریقہ سے ہر خلیفہ کے زمانہ میں اس کے ذوق کے مطابق عمارتوں میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا،

معتضد نے مشرقی حصہ میں قصر التاج کے نام سے ایک محل بنوایا، اس کی تکمیل اس کے لڑکے مکتفی کے زمانہ میں ہوئی، اس کے گنبد اور ہال عجیب غریب تھے، اور اس کو ایک زمین دوز راستہ کے ذریعہ سے قصر حسنی سے جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، ملا دیا گیا، جس سے حرم کی خواتین آتی جاتی تھیں، شعراء نے اس قصر کی شان میں قصیدے کہے، ایک شعر یہ ہے،

حللت الثریا خیر دار و منزل   فلا زال معموراً و بورک فی القصر

ایک قصر دار الشجرہ کے نام سے موسوم تھا، اس کے عجائبات کا ذکر آیندہ آئے گا، خلافتِ بغداد پر دیالمہ کے تسلط کے بعد دیلمی سلاطین نے علحدہ اپنے محل بنوائے، معز الدولہ کا محل بغداد کے بہترین محلات میں تھا (مناقب بغداد ابن جوزی ص ۳۲) عضد الدولہ دیلمی نے پرانی عمارتوں کی مرمت پر پچاس لاکھ درہم صرف کئے (معجم البلدان)

مذکورۂ بالا محل بغداد کے مشرقی حصہ میں تھے، ان کے علاوہ مغربی حصہ میں بھی محلات کا ایک سلسلہ تھا، ان میں سے دار العزیہ، دار ابی ملک، حریم طاہری، دار الامیر حسن بن اسحٰق، دار النقابۃ الشاطیہ، دار ابن الجعبہ کے نام سے ملتے ہیں، آخر الذکر محل میں وزیروں کو خلعت وزارت دیا جاتا تھا، اور خلفاء عید کی مبارکباد

---

[1] مروج الذہب ج ۵ ص ۱۹۲ و ۱۹۳

پینے کے لئے یہین دربار کرتے تھے،

باغات | عباسی تمدن کی ساری نیرنگیان عجمی تھین، اور سرزمین عجم سراپا باغ و بہار ہے، اس لئے خلفا، اور امرا کو آبِ روان، باغات اور سبزہ زار سے بھی بڑا ذوق تھا، اوپر معلوم ہو چکا ہے، کہ بغداد کی گلی گلی مین نہرین روان تھین، معتصم نے سامرا کی بنجر زمین کو لہلہاتا ہوا سبزہ زار بنا دیا تھا، افسوس ہے، کہ مورخین نے باغات کی تفصیل نہین لکھی ہے، تاہم کہین کہین ضمناً اُن کا ذکر آجاتا ہے، جس سے ان کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے، یعقوبی نے بغداد کی نہرون کی کثرت کے سلسلہ مین لکھا ہے، کہ اہل بغداد نے بصرہ اور کوفہ کے کھجور یہان لگائے، اس کی زمین کی خوبی اور زرخیزی کی وجہ سے بصرہ اور کوفہ سے زیادہ کھجور یہان ہونے لگے، اس کے علاوہ انھون نے مختلف قسم کے درخت لگائے، اور عجیب و غریب قسم کے پھل پیدا کئے، اور بغداد مین پانی کی کثرت کی وجہ سے بکثرت باغ و چمن ہو گئے،[1]

سرمن رائے کی بنجر زمین کو معتصم نے جس طرح سرسبز و شاداب اور باغ و چمن بنایا تھا، اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اس نے متعدد مستقل باغ لگوائے اور ہر باغ مین نشست کے لئے عمارات اور تفریح کیلئے حوض، تالاب اور کھلے میدان تھے،[2] اس کے علاوہ مختلف خلفاء نے باغات لگوائے، کتابون مین ان کے حسب ذیل نام ملتے ہین، قصور شماسیہ، رقہ، قصر احمری، عیسیٰ آباد، اور روضۃ الریاض، یہ باغات غالباً بغداد کے باہر تھے، اور خلفاء گرمی کے موسم مین یہان رہا کرتے تھے،

بعض خلفاء نے باغات کی آرایش مین بڑی جدتین پیدا کین، اس کی تفصیل آیندہ آئے گی، عضد الدولہ دیلمی نے بغداد مین ایک باغ لگوایا تھا، جو بستان مخرم کے نام سے موسوم تھا، اس کی تعمیر پر پچاس لاکھ درہم صرف ہوئے تھے،[3]

امیر اسمٰعیل نے لاکھون روپیے کے صرف سے ایک باغ لگوایا تھا، ایک باغ بستان ظاہر بغداد کے

---

[1] کتاب البلدان ص ۲۵۱ [2] ایضاً ص ۲۶۴ [3] تاریخ خطیب جلد اول ص ۱۰۰،

مشہور باغوں میں تھا، یہ وسط شہر میں تھا اور دو سو جریب کے وسیع رقبہ میں پھیلا ہوا تھا، بغداد سے باہر اور اس سے متصل ایک نہر کے کنارے کنارے باغوں کا وسیع سلسلہ تھا، اور اس نہر کے ایک پل کا نام ہی قنطرۃ البستان پڑ گیا تھا،

بغداد کی وسعت تاریخوں میں بغداد کی وسعت اور اس کی آبادی کی کثرت کے حالات بظاہر مبالغہ آمیز معلوم ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت ان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے، اس لئے کہ بغداد ایک نہیں بلکہ کئی شہروں کا مجموعہ تھا جن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اور ان میں سے ہر شہر جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، نہایت عظیم الشان تھا بلکہ ان کا ایک ایک محلہ ایک ایک شہر کے برابر تھا، ابوالوفا ابن طفیل کا بیان ہے کہ مجھ سے ایک معزز خراسانی نے بغداد کا حال پوچھا، میں نے کہا میں نہ بتاؤں گا، اس لئے کہ تم اس کو مبالغہ سمجھو گے بس اتنا سمجھ لو کہ اس کا ایک ایک محلہ شام کے بڑے سے بڑے شہر کے برابر ہے[۱]،

مختصر یہ ہے کہ بغداد بجائے خود ایک عالم تھا، رقبہ کی وسعت، آبادی کی کثرت، علم و فن، صنعت و حرفت و تجارت، اخلاق و تہذیب، جملہ مادی اور اخلاقی اوصاف و کمالات میں اس زمانہ کا دنیا کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس کی آبادی مختلف حالات و اسباب کی بنا پر مختلف زمانوں میں گھٹتی بڑھتی رہی، اس لئے اس کے صحیح اعداد و شمار نہیں بتائے جا سکتے، تاریخوں میں اس کی مختلف چیزوں کے جو اعداد ملتے ہیں ان سے اُس کی وسعت و آبادی کی کثرت کا اندازہ ہوتا ہے بغداد کے دو حصے تھے، مغربی اور مشرقی، دونوں کا مجموعی رقبہ ۵۳۷۵۰ جریب تھا (سیر الملوک ادبی ۵۵) ایک جریب ۳۶۰ گز کی ہوتی ہے، مغربی جانب کی سڑکوں اور گلیوں کی تعداد چھ ہزار اور مشرقی سمت کی چار ہزار تھی[۲]، مسجدوں کی تعداد تیس ہزار اور حماموں کی دس ہزار تھی[۳]، لیکن مختلف زمانوں میں یہ تعداد گھٹتی بڑھتی رہی، مقتدر کے زمانہ میں حماموں کی تعداد ستر ہزار تک پہنچ گئی تھی[۴]، بعض روایتوں کے مطابق تو مساجد اور حماموں

۱؎ مقدسی جلد ۲ ص ۱۲۰ ۲؎ تاریخ خطیب جلد اول ص ۷۰ ۳؎ کتاب البلدان ص ۲۵۰ ۴؎ خطیب جلد اول ص ۱۱۸

کی تعداد مبالغہ آمیز حد تک پہنچ جاتی ہے،

دجلہ پر متعدد پل تھے، اُن کے باوجود مشرقی اور مغربی دونوں سمتوں میں آمد و رفت کے لئے تین ہزار کشتیاں چلتی تھیں، اور ملاحوں کی آمدنی نوے ہزار درہم روزانہ تھی[1]، بازاروں کا کرایہ بارہ کرور درہم سالانہ تھا، (مناقب بغداد ص ۱۱)

قاضی ابو الحسن کا بیان ہے، کہ ۳۴۵ھ میں جب محمد بن احمد نے موضع باذرویا کا ٹھیکہ لیا، تو اس زمانہ میں نواح بغداد کے مواضعات میں صرف کا ہو (یہ اہل بغداد کی مرغوب ترکاری تھی) کی کاشت دو ہزار جریب تھی، جس کی قیمت پچاس ہزار اشرفی ہوتی تھی، یہ سارا کا ہو بغداد میں صرف ہوتا تھا، جس شہر میں پچاس ہزار اشرفی سالانہ کی صرف ایک ترکاری صرف ہوتی ہو، اس کی آبادی کی کثرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

اسی طریقہ سے حمص کا ستو جس کو صرف ادنیٰ درجہ کے معمولی لوگ کھاتے تھے، اور وہ بھی سال کے دو مہینوں میں جب بغداد میں پھل کی کمی ہوتی تھی، صرف ایک بازار میں اوسطاً ایک سو چالیس گُر صرف ہوتا تھا[2]،

ابن جبیر اندلسی کا بیان | مشہور سیاح ابن جبیر اندلسی نے چھٹی صدی کے آخر میں جب بغداد مسلسل انقلابات سے ویران ہو چکا تھا، بغداد کا سفر کیا تھا، اور اپنے سفرنامے میں اس کے حالات لکھے ہیں، یہ بیان عروس البلاد کا گویا مرثیہ ہے، تاہم اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس اُجڑی ہوئی حالت میں بھی وہ کس پایہ کا شہر تھا، وہ لکھتا ہے،

یہ پرانا شہر گو ہمیشہ سے عباسی خلافت کا پایۂ تخت اور قریشی و ہاشمی امامت کا مرکز رہا ہے، اس کی گذشتہ عظمت کے مقابلہ میں اب اس کی حیثیت ایک کھنڈر ایک مٹے ہوئے نشان کی ہے

---

[1] خطیب ج اول ص ۱۱، [2] نشوار المحاضرہ ص ۷۷،

ایک خیالی حصہ دی گئی ہے، موجودہ شہر دو حصوں میں تقسیم ہے، ایک دجلہ کے مشرقی سمت میں
دوسرا مغربی سمت، مغربی حصہ کسی زمانہ میں بہت آباد تھا، لیکن اب ویران ہو چکا ہے اور مشرقی
حصہ نو آباد ہے، یہ شہر ویرانی کے باوجود سات محلوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر محلہ اپنی وسعت و
آبادی کی کثرت کے لحاظ سے مستقل شہر کی حیثیت رکھتا ہے، ہر محلہ میں کئی کئی حمام ہیں، آٹھ
حمام جامع مسجدوں میں ہیں، سب سے بڑے محلہ کا نام قریہ ہے، جس میں ہم ٹھہرے تھے، یہ محلہ
دجلہ کے ساحل پر ہے، یہاں پہلے پل تھا، جو سیلاب میں بہ گیا ہے، اب کشتیوں کے ذریعہ آمد و رفت
ہوتی ہے، کشتیاں بے شمار ہیں، اور رات دن لوگوں کے ہجوم سے میلہ سا لگا رہتا ہے،
معمولاً ہر جگہ دو پل ہیں، ایک شاہی محلات سے متصل، دوسرا ان سے الگ، لیکن آمد و رفت
کے لئے یہ پل ناکافی ہیں، ہر وقت کشتیاں چلتی رہتی ہیں، دوسرا محلہ کرخ ہے، اس کے گرد مستقل
شہر پناہ ہے، تیسرا محلہ باب البصرہ ہے، یہ بھی ایک مستقل شہر کی حیثیت رکھتا ہے، یہیں وہ عظیم الشان
جامع مسجد ہے، جو جامع منصور کے نام سے موسوم ہے، چوتھا محلہ شارع ہے، یہ بھی گویا ایک شہر ہے،
یہ چاروں بڑے محلے ہیں، محلہ شارع اور باب البصرہ کے درمیان ایک محلہ سوق المارستان ہے
اس کی حیثیت ایک چھوٹے سے شہر کی ہے، بغداد کا مشہور و معروف شفاخانہ اس محلہ میں ہے،
اس میں مریضوں کے علاج، اور اُن کی دیکھ بھال کے لئے باون اطبا اور معالجین ہیں، مریضوں
کی جملہ ضروریات کا انتظام شفاخانہ کی جانب سے ہوتا ہے، اطبا کے علاوہ مریضوں کی تیمارداری
اور دوا و غذا وغیرہ کی تیاری کے لئے علٰحدہ ملازمین ہیں، شفاخانہ کی عمارت ایک عالیشان
محل کی سی ہے، جس میں بہت سے کمرے ہیں، اور اس کا ساز و سامان شاہانہ ہے، شفاخانہ میں
دجلہ سے پانی آتا ہے، سب محلوں کا تذکرہ طویل ہوگا، مثلاً ایک محلہ [illegible] ہے جو دجلہ
اور فرات کی ایک شاخ کے درمیان آباد ہے، اس کے ذریعہ سامنے [illegible]

بغداد (تتمہ)

ایک محلہ عتابیہ ہے، یہان بغداد کا مشہور عتابی کپڑا جو مختلف الالوان ریشم اور سوت سے بنایا جاتا ہے، تیار ہوتا ہے، ایک محلہ حربیہ ہے، اس کے بعد بغداد کی آبادی ختم ہو جاتی ہے،

مغربی حصہ تمام تر باغات اور چمنستان پر مشتمل ہے، یہان سے مشرقی حصہ مین میوے جاتے ہین، آجکل دار الخلافۃ اسی حصہ مین ہے، شاہی محلات شہر کے چوتھائی بلکہ اس سے زیادہ حصہ کو گھیرے ہوئے ہین، عباسی خاندان کے نظر بند ارکان ان محلون مین رہتے ہین، اُن کے لئے ہر طرح کی سہولتین مہیا ہین، صرف احاطہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہین ہے،

مغربی حصہ مین عالیشان شاہی محلات، دلفریب باغات اور بڑے بڑے مرتب بازار ہین، اُن مین ہر وقت آدمیون کا اتنا ہجوم رہتا ہے، کہ ان کا شمار مشکل ہے، تین بڑی جامع مسجدین ہین، خلیفہ کی جامع مسجد اس کے محل کے قریب ہے، یہ بڑی وسیع مسجد ہے، اس مین بڑے بڑے حوض اور سقادے ہین، اور ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ ہے، دوسری جامع سلطان کے نام سے موسوم ہے، یہ مسجد ان سلاطین[1] کے محلون کی جانب منسوب ہے، جو موجودہ خلیفہ کے اجداد کے زمانہ سے، خلافت عباسیہ کے منتظم ہو گئے ہین، تیسری جامع رصافہ ہے، رصافہ مین عباسی خلفا کی قبرین ہین، بغداد کی مسجدون مین گیارہ مین جمعہ ہوتا ہے، اس حصہ مین حمامون کی تعداد بے شمار ہے، مجھ سے ایک معتبر آدمی نے بیان کیا، کہ دونون حصون مین دو ہزار کے قریب حمام ہون گے، اُن کی دیوارون اور فرش پر سیاہ رنگ کا ایسا چمکدار روغن ہے، کہ دیکھنے والون کو سیاہ سنگ رخام کا دھوکا ہوتا ہے،...... مسجدون کی اتنی کثرت ہے کہ ان کا شمار کیا اندازہ بھی نہین کیا جا سکتا، تیس مدرسے ہین، اور ہر مدرسہ کی عمارت ایسی عالی شان ہے، کہ بڑے بڑے محلون کو شرماتی ہے، ان مین سب سے بڑا مدرسہ نظام الملک کا قائم کیا ہوا نظامیہ ہے، جسکی ۵۰۴ھ مین اس کی

---

[1] سلاطین سے مراد وہ بادشاہ ہین، جو خلفائے عباسیہ کے زوال کے بعد اُن کے متولی ہوگئے تھے، مثلاً دیالمہ اور اُن کے بعد سلجوقی،

دوبارہ تجدید ہوئی تھی، ان مدارس پر بڑی بڑی جائدادیں وقف ہیں، جن سے فقہاء و مدرسین کو تنخواہیں اور طلبہ کو وظیفے ملتے ہیں، دوسرے اخراجات چلتے ہیں، ان اوقاف کو اس قسم کے مدارس اور شفاخانوں کے قیام میں بڑا شرف اور غیر فانی فخر حاصل ہے،

مشرقی حصہ کے چار پھاٹک ہیں، باب السلطان، باب الظفریہ، باب الحلبہ اور باب البصلیہ، یہ پھاٹک شہر پناہ میں ہیں جو نصف مستطیل دائرہ کی شکل میں شہر کو گھیرے ہوئے ہے، شہر پناہ کے اندر بازاروں کے بکثرت پھاٹک ہیں، غرض اس گئی گذری ہوئی حالت میں بھی اس شہر کی شان و عظمت تعریف و توصیف سے بالاتر ہے[1]،

بغداد تنہا رقبہ کی وسعت، آبادی کی کثرت اور عمارتوں کے شان و شکوہ میں ممتاز نہ تھا، بلکہ دنیا کی ساری بھلائیوں کا مخزن تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری نعمتیں اس میں جمع کر دی تھیں، مورخین نے اس کے مختلف اوصاف و خصوصیات کا حال لکھا ہے، یعقوبی لکھتا ہے کہ

رقبہ کی وسعت، آبادی کی کثرت، پانی کی فراوانی، آب و ہوا کی خوبی میں مشرق و مغرب کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، یہاں مختلف شہروں اور ملکوں کے مختلف طبقوں کے لوگ آباد ہیں، اور دور دراز کے باشندوں نے اپنے وطنوں کو چھوڑ کر یہاں سکونت اختیار کر لی ہے، کوئی شہر ایسا نہیں ہے، جہاں باشندوں کے محلے تجارت اور کاروبار یہاں نہ ہو، اس لئے یہاں ساری دنیا کی نعمتیں جمع ہو گئی ہیں، جو دنیا کے کسی اور شہر کو نصیب نہیں، یہاں دو بڑے دریا دجلہ اور فرات ہیں، اس سے خشکی اور تری دونوں راستوں سے نہایت آسانی کے ساتھ ہر طرح کا تجارتی سامان آتا ہے، اور ہندوستان، سندھ، چین، تبت، ترک، دیلم، خزر، حبشہ وغیرہ، مشرق و مغرب کے تمام اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کا سامان، اُن کی پیداوار اور مصنوعات، جس کثرت، سہولت اور آسانی سے یہاں ملتی ہیں، اتنی سہولت سے خود ان ملکوں میں نہیں ملتیں، سارے روئے زمین کی پیداوار کھنچ کھنچ کر یہاں

---

[1] رحلۃ ابن جبیر ص ۲۲۵ تا ۲۲۸ یہ ابن جبیر کے بیان کا صرف خلاصہ ہے [illegible]

ذخیرہ ہے، دنیا کے سارے تحفے یہاں جمع ہو گئے ہیں، اور سارے عالم کی برکتیں اسی پر تمام ہو گئی ہیں
ریاضی کے حساب سے اقلیم رابع میں ہے، جو معتدل اقلیم ہے، اس لئے اس کی آب و ہوا ہر
موسم میں معتدل رہتی ہے، گرمیوں میں تیز گرمی پڑتی ہے، اور جاڑوں میں تیز ٹھنڈک، خریف اور ربیع
دونوں میں موسم اعتدال پر رہتا ہے، اور تحویل کے موسم میں آب و ہوا میں کوئی بڑا تغیر نہیں ہوتا،
اس لئے یہاں کی آب و ہوا معتدل، مٹی اچھی اور پانی شیریں ہے، درختوں کی بالیدگی اور نشو و نما اچھی
ہوتی ہے، پھل خوش ذائقہ اور کھیتی سرسبز و شاداب ہوتی ہے، کھیتی میں زیادہ مشقت نہیں اٹھانا پڑتی، جس سے
پیداوار کی کثرت ہے، ہوا کے اعتدال زمین کی خوبی اور پانی کی شیرینی کی وجہ سے یہاں کے باشندوں کے
اخلاق پسندیدہ، چہرے شاداب اور ذہن تیز و رسا ہوتا ہے، اور وہ عقل و دانش فہم و ذکا، علم و ادب،
ژرف نگاہی، قوت امتیاز، اور تجارت و صنعت و حرفت وغیرہ میں ساری دنیا میں فائق، اور ہر فن اور
ہر پیشہ کے ماہر ہوتے ہیں، یہاں کے عالموں سے بڑھکر فاضل، یہاں کے راویوں سے بڑے راوی، یہاں
کے متکلموں سے زیادہ مناظر، یہاں کے نحویوں سے زیادہ صحیح الاعراب، یہاں کے قاریوں سے زیادہ صحیح القرأت،
یہاں کے طبیبوں سے زیادہ حاذق، یہاں کے گویوں سے بڑے مغنی، یہاں کے صناع و کاریگروں سے
زیادہ چابک دست، یہاں کے کاتبوں سے زیادہ ادیب و خوشنویس، یہاں کے منطقیوں سے زیادہ لسان
اور گویا، یہاں کے عابدوں سے بڑے عابد، یہاں کے زاہدوں سے بڑے متورع، یہاں کے فقیہوں سے
زیادہ فقیہ، یہاں کے خطیبوں سے زیادہ زبان آور، یہاں کے شاعروں سے بڑے سخنور، حتی کہ یہاں کے
رندوں سے بڑھ کر جری اور بے باک کہیں کے رند نہیں، ہر فن کے لوگ اپنے اپنے فن میں طاق ہیں[1]

مورخ خطیب بروایت ابو الحسین کہتے ہیں کہ

بغداد کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کے تمام شہروں [illegible]

---

[1] کتاب البلدان ص ۲۳۳، تا ۲۳۵۔

اس کو حاصل ہے جہان یہان کے باشندون کے اخلاق حمیدہ اور خصائل پسندیدہ ہین، پانی شیرین اور میوون کی کثرت ہے، ہر فن اور پیشہ کے ماہر موجود اور ہر ضرورت کا سامان مہیا ہے، بدعات سے امن ہے، علما و طلبہ فضلا و طالبین فقہا اکابر متکلمین، حساب و نحو کے ماہرین، قادر الکلام شعرا، انساب و اخبار کے راویون کی کثرت ہے، ہر نادر چیز یہان موجود ہے، اور ہر فصل کے میوے ہر وقت اور ہر موسم مین بغداد کے علاوہ کسی شہر مین نہین مل سکتے، خصوصاً خزان کے موسم مین مسلمانون کی کثرت ہے، اگر کسی کو کسی سبب سے کوئی محلہ یا گلی پسند نہ ہو تو اس کو آسانی کے ساتھ بدل سکتا ہے، اور اوس کو اس کی پسند کا وسیع و کشادہ مکان سہولت سے مل جائے گا، وہ دشمن سے خوف زدہ لوگون کے لئے جاے پناہ ہے، بڑے بڑے ملک التجار، باعظمت سلاطین اور خاندانی اور صاحب وجاہت اشراف و معززین ہر ہر محلہ مین موجود ہین جن کے جود و کرم کا چشمہ غربا اور اہل حاجت کے لئے ہر وقت جاری رہتا ہے، بغداد اللہ تعالیٰ کا ایسا بے کران خزانہ ہے جس کی حقیقت سے اس کے علاوہ اور کوئی پوری طرح آگاہ نہین[1]۔

ایک دوسری روایت مین لکھتے ہین، کہ جلالت و عظمت، علما و اعلام کی کثرت، خواص و عوام کی تہذیب و شایستگی، رقبہ کی وسعت، مکانات، محلون، گلیون، پھاٹک، بند کوچون، سڑکون، بازارون، مسجدون، حمامون، اور سراؤن کی کثرت، آب و ہوا کی خوبی، پانی کی شیرینی، درختون کی چھاؤن، ان کی ٹھنڈک، سردی و گرمی کے اعتدال، ربیع و خریف کی صحت، آبادی کی خارج از شمار کثرت مین دنیا کا کوئی شہر بغداد کا مقابلہ نہین کر سکتا، اس کی آبادی اور رونق کے عروج کا زمانہ ہارون رشید کا عہد تھا، اس کے بعد مسلسل انقلابات نے اس کو ویران کر دیا[2]۔

بشاری مقدسی لکھتا ہے:۔

بغداد اسلام کا سب سے بڑا شہر اور مدینۃ السلام ہے، اس یہان کے باشندے مجموعۂ محاسن، خوش طبع، ذہین

---

[1] تاریخ خطیب [illegible] ص ۷۰، [2] [illegible] ص ۱۱۱،

ذکی اور لطیف المزاج ہیں، ہوا نہایت ہلکی اور لطیف اور علم نہایت گہرا ہے، بغداد ہر عمدہ چیز اور ہر خوبی کا مخزن، اور ہر فن کے ماہرین کا مرکز ہے، ہر دل اس کی جانب کھنچتا ہے، وہ جمال و کمال کی بنا پر رشک و رقابت کی کشمکش اور حمایت و مدافعت کی رزمگاہ ہے، اس کی شہرت توصیف سے مستغنی اور اس کی خوبی حد توصیف سے خارج، اور مدح و ستایش کے درجہ سے بلند ہے،[1]

بعض اہل نظر نے اس کے محاسن پر یہ جامع تبصرہ کیا ہے،

وہ جنت ارضی سلامتی کا شہر قبۃ الاسلام، اصحاب کمال کا مرکز، قدردانی شہروں کا سرتاج، عراق کی آنکھ کا تارا، مستقر خلافت، محاسن و طیبات کا مرکز، لطائف و ظرائف کا معدن ہے، یہاں ہر فن کے کاملین اور ہر جنس کے ماہر موجود ہیں،[2]

اس زمانہ کے ایک بڑے سیاح ابو القاسم دیلمی کا بیان ہے کہ

میں نے سمرقند سے لے کر قیروان تک اور سرندیپ سے لے کر روم تک کا سفر کیا، مگر بغداد سے بہتر اور پاکیزہ شہر نہیں دیکھا، عراق سے نکلنے کے بعد ساری دنیا دیہات معلوم ہوتی ہے، مشہور ادیب جاحظ کا بیان ہے کہ میں نے شام اور روم اور دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے خوبصورت شہر دیکھے، مگر بغداد سے زیادہ بلند عمارتوں اس سے زیادہ مدور شاندار و سیع و کشادہ پھاٹکوں اور مضبوط فصیل کا شہر نہیں دیکھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا شہر ڈھلا ہوا ہے، (خطیب ج اول ص ۷۷)

مشہور فلسفی اور ادیب ابو العلاء معری کہا کرتا تھا، کہ بغداد بہت بڑا شہر ہے، یہاں تم ہر دن نئے نئے اصحاب فضل و کمال پاؤ گے، جس کو اس سے پہلے دن نہ پایا تھا،[3]

شیخ ابو اسحٰق فیروز آبادی کا مقولہ تھا کہ جو سلیم العقل اور صحیح المذاق ایک مرتبہ بھی بغداد آجائے گا وہ یہاں سے مر کر نکلے گا، یا یہاں مرنے کی تمنا دل میں لے جائے گا،[4]

---

[1] احسن التقاسیم بشاری ص ۱۲۰، [2] معجم البلدان ج ۲ ص ۲۳۴، [3] و [4] تاریخ خطیب ج اول ص ۴۶ و ۴۷

بغداد کی آبادی اتنی مرتب اور اس کی عمارتیں اتنی خوبصورت تھیں، کہ دوسرے ملکوں کے فرمانروا اس کا نقشہ منگواتے تھے، خطیب نے یہ روایت نقل کی ہے، کہ قیصر روم نے بغداد کے بازاروں، محلوں مشرقی و مغربی حصوں کا نقشہ منگوایا تھا، مشرقی حصے کی ترتیب خصوصاً شارع المیدان، اور شارع سویقہ نصر ابن مالک الخزاعی، اور اس کے بازاروں اور سڑکوں کی عمارتیں، جو قنطرۃ البردان تک چلی گئی تھیں، اس کو بہت پسند تھیں، وہ شراب نوشی کے وقت اس نقشہ کو سامنے رکھتا تھا، اور کہتا تھا، کہ میں نے اس سے زیادہ خوبصورت عمارتیں نہیں دیکھیں[1]،

اس قسم کے سیکڑوں واقعات و اقوال بغداد کی تعریف میں زبان زد خاص و عام تھے، یہ اس زمانہ کا مشہور مقولہ تھا، کہ بغداد کے علاوہ ساری دنیا دیہات ہے، اور جس نے بغداد نہیں دیکھا، اس نے دنیا نہیں دیکھی،

بغداد کے عوام اور اہلِ حرفہ ایسے مہذب اور شایستہ ہوتے تھے، کہ ان سے بڑے بڑے لوگ تہذیب و شایستگی کا سبق سیکھتے تھے، مشہور صوفی حضرت ذو النون مصری فرماتے تھے، کہ جس کو خلق و مروت سیکھنا ہو وہ بغداد کے بہشتیوں سے سیکھے، مجھکو جب بجولان بغداد لے جایا گیا[2]، تو میرے سامنے سے ایک سقا گذرا، وہ مندیل کا تہمد اور دبیقی کا عمامہ باندھے تھا، ہاتھ میں نازک نازک مٹی کے آبخورے، اور شیشے کے ترشے ہوے گلاس تھے، اس وضع قطع میں دیکھ کر میں سمجھا کہ شاہی سقا ہے، معلوم ہوا شاہی نہیں عام بہشتی ہے، میں نے اس سے پانی مانگا، اس نے بڑھ کر کورے آبخورے میں پانی دیا، جس سے مشک کی خوشبو آرہی تھی، میں نے اپنے ساتھی سے ایک دینار دینے کا اشارہ کیا، سقا نے لینے سے انکار کیا، اور کہا قیدی سے کچھ لینا اخلاق و مروت کے خلاف ہے[3]، (باقی)

---

[1] تاریخ خطیب ج ۱ ص ۷۹ [2] متوکل علی اللہ کے زمانہ میں آپ پر الحاد و زندقہ کا الزام لگایا گیا تھا، معتصد کی تحقیقات کے لئے وہ پابجولاں بغداد لائے گئے تھے لیکن تحقیق سے یہ الزام غلط ثابت ہوا اور آپ رہا کر دئے گئے متوکل آپ کا معتقد ہو گیا، [3] خطیب ج ۱ ص ۱۰۵

اسلامی حکمرانون سے مسلمانون کی
ایک بیجا شکایت

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(۳)

بلاشبہہ تبلیغ و دعوت جیسے ہر مسلمان کے فرائض مین داخل ہے، ہمارے سلاطین و امراء پر بھی یہ فرض عائد ہوتا تھا، لیکن ہر عامی مسلمان مین اسی فرض کا کیا بہت سے دوسرے اسلامی فرائض و واجبات کا احساس جیسے مردہ ہو جاتا ہے، اسی طرح اسلامی حکمرانون کے متعلق بھی یہ دعوی نہین کیا جا سکتا، کہ سب میں اس فرض کا احساس زندہ تھا، تاہم اس زمانہ کے مفروضہ اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھکر نہین بلکہ دین کی اشاعت کا جو واقعی مقصد خود دین کے لانے والے نے بتایا ہے، اس کو سامنے رکھ کر یہ واقعہ ہے، کہ ہر دور مین ہم حکمرانون کے طبقات مین بھی اس جذبہ کو زندہ اور بیدار پاتے ہین،

نبوت کے منہاج اور طریقہ کی پابندی کرتے ہوئے جنھون نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانشینی اور خلافت کی ذمہ داریون سے عہدہ برآ ہونے مین کامیابی حاصل فرمائی یعنی حضرات خلفاے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم انھون نے اس راہ مین جو کچھ کیا، اس سے تو خیر دنیا واقف ہے، خلافت راشدہ کے اس عہد مین سچی بات تو یہی ہے کہ دین اور دین کی تبلیغ و اشاعت کے سوا کوئی دوسرا کام اسلامی حکومت کے سامنے تھا ہی نہین، اس مسئلہ مین ان حضرات کے استغراق و غلو کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے

روم و ایران کے علاقے جو فتح ہوئے، اور جن دفاتر سے ان علاقوں کی حکمرانی وابستہ تھی، کون نہیں جانتا کہ ان دفتروں کی زبان اور خط تک کے بدلنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی، ایرانی علاقوں میں فارسی زبان و خط، اور رومی علاقوں میں رومی زبان اور خط ہی کا رواج بنی امیہ کے ابتدائی عہد تک باقی رہا۔[1] بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے، سکہ جسے ہر زمانہ میں حکومتوں نے اپنا خصوصی شعار اور حکمرانی کی علامت قرار دیا ہے، لیکن ایشیا اور افریقہ کے بہت بڑے حصہ پر قابض ہو جانے کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خلفائے راشدین کی خصوصی توجہ ٹکسال بنانے کی طرف متوجہ نہ ہوئی، جس کی وجہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اُن کے سامنے دین کے سوا کوئی دوسری چیز تھی ہی نہیں، ساری نسل انسانی تک پہنچانے کے لئے خدا کی طرف سے آخری دینی پیغام اُن کے سپرد ہوا تھا، اسی پیغام کو وطنی، نسلی، لونی، لسانی وغیرہ وغیرہ خود ساختہ قومی خصوصیات سے قطع نظر کر کے ہر اس شخص تک پہنچا دینے کی ایک ہی دھن تھی، جس میں وہ ہمہ تن ڈوبے

---

[1] البلاذری نے لکھا ہے کہ امیر معاویہ اور یزید پھر مروان بنی امیہ کے ان حکمرانوں کے زمانہ تک اسلامی علاقہ کے سارے سرکاری دفاتر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ سے رومی زبان اور خط ہی میں رہے، عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں دفتر کے ایک رومی میرمنشی کے متعلق عبدالملک تک یہ خبر پہنچائی گئی، کہ دوات میں پانی ڈالنے کی ضرورت تھی رومی میرمنشی نے بجائے پانی کے اس میں پیشاب کر دیا، مقدمہ کی تحقیقات کی گئی، اور مجرم کی سزا ہوئی، اسی کے بعد عبدالملک نے سلیمان بن سعد کو بلا کر حکم دیا، کہ دفتر کو عربی زبان میں منتقل کر دیا جائے، سال بھی پورا ہونے نہ پایا کہ شامی علاقے کے سارے دفاتر کی زبان عربی ہو گئی، مگر لطف یہ ہے کہ ایرانی علاقے میں دفتر کی زبان پھر بھی فارسی ہی باقی رہی تا آنکہ حجاج کے زمانہ میں صالح بن عبدالرحمٰن نے اس کو بھی عربی میں منتقل کیا، یہی حال سکے کا بھی نظر آتا ہے، بظاہر دارالضرب کا سلسلہ بھی عبدالملک ہی کے زمانہ میں قائم ہوئی، قصہ جس کا طویل ہے، مصری کپڑوں پر رومی زبان میں خاص قسم کا طغرا بنتا تھا، عبدالملک نے منع کر دیا، اور عربی میں طغرے کا ڈھنے کا حکم دیا، قسطنطنیہ کے قیصر کو جب اس کی خبر ملی تو عبدالملک کو اس نے لکھا کہ تمہارے ملک میں ہمارے ہاں کا چلتا ہی ہے، ہم ہر سکہ پر تمہارے پیغمبر کے نام کو ایسا چھاپنے کا حکم دیں گے کہ ... عبدالملک بہت پریشان ہوا کیونکہ [illegible] ہی میں بنتا تھا، اور سکتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو [illegible] پیغمبر [illegible] یہی بات اس کی وجہ سے ہوئی [illegible] (ص [illegible])

ہوئے تھے، نظر کی اسی وسعت کا اقتضاء تھا کہ ہر ملک کو وہ اپنا ملک، ہر قوم کو اپنی قوم خیال کرتے تھے، تفصیل دوسروں کے دفاتر کی زبان کیا ہے، اور لین دین لوگ کس حکومت کے سکے سے کر رہے ہیں، ان چیزوں کی کوئی اہمیت ہی ان بزرگوں کی نگاہ میں نہ تھی، اسی لئے میری گفتگو کا تعلق خلافت راشدہ کے حکمرانوں سے ہی نہیں، بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں، کہ اس عہد کے بعد ہزار بارہ سو صدیوں تک دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی جو حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں، اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خلافت راشدہ کی دینی خصوصیتوں سے ان پچھلے حکمرانوں کی حکومتیں آیندہ زمانوں میں بتدریج عموماً محروم ہوتی چلی گئیں، تاہم آپ ابھی مجھ ہی سے کچھ دیر پہلے سن چکے کہ دولت عباسیہ کے دوسرے فرمانروا ابو جعفر منصور نے اپنے عیسائی طبیب جورجیس کے سامنے اپنی جس آخری آرزو کا اظہار کیا تھا، وہ یہی تھی، کہ جورجیس! تم اسلام قبول کر لو، میں جنت کی ضمانت تمہارے لئے لیتا ہوں۔

اسی ابو جعفر منصور کے پوتے یعنی ہارون الرشید نے قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کے نام ایک مبسوط و مفصل تبلیغی مراسلہ جو بھیجا تھا تاریخوں میں اسکی نقل آج تک محفوظ ہے جس سے صرف اسی کا اندازہ نہیں ہوتا ہے، کہ دوسری قوموں اور امتوں تک اسلامی دین کے پہونچانے کا شوق ہارون پر کس درجہ مسلط تھا، بلکہ اسلام کے اصولی مقاصد و اغراض اور بنیادی روح کی یافت اور پھر اس کی تعبیر میں اس کا مقام کتنا بلند تھا[۱]، (دیکھو کتاب عصر المامون عربی)

عباسی خلفا کے تبلیغی جذبہ ہی کا نتیجہ یہ تھا، کہ مامون الرشید اپنے دربار میں دوسرے ادیان و مذاہب کے پیشواؤں کو بلا کر علماء اسلام سے تحقیق حق کے لئے مباحثہ اور مناظرے کی مجلسیں منعقد کیا کرتا تھا، اسی سلسلہ میں فرقہ مانویہ کے پیشوا یزدان بخت کا قصہ مشہور ہے، کہ آزادی کے ساتھ بحث و مباحثہ

---

[۱] تبلیغی مکتوب مستحق ہے، کہ عربی سے اردو میں اس کا ترجمہ کر دیا جائے کئی مولویوں سے کہا لیکن متوجہ نہ ہوئے، خدا نے فرصت دی تو انشاء اللہ تعالیٰ خاکسار ہی اس کام کو انجام دیگا۔ (انشاء اللہ)

کر چکے تھے یزدان بخت خاموش ہو گیا تب مامون نے کہا کہ

"یزدان بخت دیکھو اب اسلام کے قبول کرنے میں تیرے لئے کیا عذر باقی رہا"

یزدان بخت جس کا چہرہ شکست کی ذلت کی وجہ سے زرد تھا، اس نے مامون سے کہا:-

"امیرالمومنین! آپ کی بات میں نے سن لی لیکن اسی کے ساتھ میں یہ جانتا ہوں کہ آپ اُن

لوگوں میں نہیں ہیں جو دین کے معاملہ میں جبر سے کام لیتے ہوں"

بات اسی پر ختم ہو گئی، مامون نے یہ سن کر یزدان بخت کو کچھ نہیں کہا، بلکہ حکم دیا کہ وطن تک

فوجی نگرانی میں اس کے پہنچانے کا نظم کر دیا جائے ایسا نہ ہو کہ کسی متعصب آدمی سے بیچارے کو کوئی نقصان

پہونچ جائے۔[1]

بہرحال بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے اسلامی حکمرانوں نے مختلف ممالک و امصار اور مختلف زمانوں

میں دوسروں تک اسلامی پیغام کے پہونچانے میں جو کوششیں کی ہیں، کوئی چاہے تو صرف ان کوششوں

کی داستان پر ایک ضخیم کتاب تیار کر سکتا ہے، ہارون و مامون وغیرہ تو پھر بھی عہد قدیم کے حکمران ہیں

اور خلافت راشدہ سے ان کا زمانہ زیادہ دور نہیں ہوا تھا، لیکن خیال تو کیجئے اسی ہندوستان میں اس

وقت جب مغل حکومت کا چراغ بجھنے کے لئے جھلملا رہا تھا، لیکن اس زمانہ میں بھی بانی سلطنت آصفیہ

حضرت آصف جاہ اول تغمدہ اللہ بغفرانہ کے متعلق، اُن کے دربار کے ثقہ عالم مولانا غلام علی یہ روایت

---

[1] دیکھو کتاب الفہرست لابن ندیم ص ۴۲۳، مامون عموماً اس قسم کے مسلمانوں کے متعلق جو محض دنیا کے لالچ میں مسلمان ہو گئے ہیں، شدید نفرت کا اظہار کیا کرتا تھا، کہتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین کا جو حال تھا مجھے تو کچھ اسی قسم کا حال ان لوگوں کا بھی معلوم ہوتا ہے، پھر جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے معاملہ کو خدا کے سپرد کر دیا تھا، میں بھی دنیا کے لالچ سے مسلمان ہونے والوں کے معاملہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ (رسالہ عبداللہ بن اسماعیل الہاشمی الی عبدالمسیح بن اسحاق الکندی (ص ۱۱ - ۳۴)

سنانے ہیں کہ جب کوئی نیا آدمی اسلام میں داخل ہوتا تو آصف جاہ کا حکم تھا کہ بیعت اسلام کے لئے خود اُن کی حضوری میں پیش کیا جائے حضرت آصف جاہ براہ راست اپنے دست حق پرست پر اس کی بیعت لیتے اور کلمہ تلقین فرماتے، پھر خود ہی اس کا نام بھی تجویز فرما دیتے، (دیکھو سرو آزاد ص ۱۹۶)

اور یہ قصہ تو پھر بھی سترہویں صدی عیسوی کا ہے، انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ کی مذہبی تاریخ نے اس ملک میں حقارت و اہانت کے جس مقام تک مذہب اور اس کے ذکر کو پہنچا دیا ہے یہ شاعری نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ کسی مہذب سوسائٹی کے غیر مہذب بلکہ کسی شایستہ انسان کے غیر شایستہ بن جانے یا بنا دیئے جانے کے لئے یہ کافی ہے اگر اس سوسائٹی میں مذہب یا دین کا ذکر کسی حیثیت سے آگیا ہے مگر اسی بیسویں صدی کے اسلامی حکمران کے جذبۂ تبلیغ اور دعوت دین کے ذوق کو ملاحظہ فرمائیے، امیر شکیب ارسلان نے منیف پاشا کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ سلطان عبد الحمید کے زمانہ میں سلطنت ترکی کے یہ ناظم معارف (یعنی ناظم تعلیمات) تھے، خود اپنا تاثر منیف پاشا کے متعلق امیر کا یہ تھا کہ گو بظاہر دین سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتے تھے، مگر آدمی بڑے سچے تھے، یوں ہی بے بنیاد سُنی سُنائی روایتوں کے نقل کرنے کے عادی نہ تھے، بہرحال اُن کے کردار اور راست بازی کی تعریف کرنے کے بعد امیر نے لکھا ہے، کہ منیف پاشا نے براہ راست مجھ سے یہ روایت نقل کی، کہ سلطان عبد الحمید خان مرحوم کے زمانہ میں جاپان کا ایک امیر جاپانی حکومت کی طرف سے ترکی آیا تھا، سلطان عبد الحمید خان مرحوم سے اس جاپانی امیر کی جب ملاقات ہوئی تو گفتگو کے سلسلہ میں سلطان نے جاپانی امیر سے دریافت کیا، کہ

"مجھے معلوم ہوا ہے، کہ آج کل جاپان کے لوگ کسی مذہب کی جستجو میں سرگرداں ہیں،"

پھر سلطان نے اس کے بعد فرمایا کہ

"اگر یہ واقعہ ہے تو میں آپ لوگوں کو دین اسلام کے قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں"

جاپانی امیر نے اس کے جواب میں کہا کہ

نجا لتاب کو جو خبر پہنچائی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے بلکہ ہم لوگ اپنے قدیم دین ہی پر قائم ہیں اور اسی کے ساتھ وابستہ رہنا چاہتے ہیں" (حاشیہ حاضر العالم الاسلامی ص ۱۴۶)

اور بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے، لوتھر اسٹوڈرڈ جو The new World of Islam کے مصنف ہیں، عربی میں اسی کا ترجمہ "حاضر العالم الاسلامی" کے نام سے شائع ہوا ہے، اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ

"سلطان عبد الحمید نے ایک تبلیغی وفد حکومت کے جنگی جہاز پر جاپان روانہ بھی کیا تھا"

یہ خبر بھی اسی کتاب میں درج ہے کہ مسلمانوں کا یہ تبلیغی وفد جب جاپان پہنچا تو حکومت جاپان کی طرف سے اس کو خوش آمدید کہا گیا، اور ارکانِ وفد کی ملک کے اکثر حصوں میں بڑی آؤ بھگت ہوئی اگرچہ اسلام کے پیغام کو جاپانی حکومت نے قبول نہیں کیا۔ (حاضر العالم الاسلامی ج ۱ ص ۱۴۱)

بہرحال خلفاء راشدین کے بعد بھی یہ دعویٰ کسی حیثیت سے صحیح نہیں ہو سکتا کہ بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے اسلامی سلاطین اور فرمانرواؤں پر دین کی تبلیغ و دعوت کا جو فرض عائد ہوتا تھا، اس فرض کے احساس سے ہر زمانہ میں ہر ایک خالی تھا، مذکورۂ بالا چند مثالیں جو اسلام کی ابتدائی زمانہ سے بیسویں صدی عیسوی تک کے نمونوں پر مشتمل ہیں، غالباً اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے کافی ہو سکتی ہیں،

مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ صرف چند سرسری نمونے ہیں، جو آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں ورنہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اگر کوئی کرنا چاہے تو بلا مبالغہ ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب ہی اسلامی سلاطین کی تبلیغی جد و جہد پر تیار ہو سکتی ہے[۱]

---

[۱] مفید و بہت مواد اس سلسلہ میں آپ کو آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام میں بھی مل سکتا ہے، خصوصاً علاء الدین خلجی و فیروز تغلق وغیرہ سلاطین کی تبلیغی دلچسپیوں کی تاریخی شہادتیں جو اس نے پیش کی ہیں لیکن مطالعہ سے چاہا جائے تو ایک کافی ضخیم کتاب اس سلسلہ میں لکھی جا سکتی ہے،

اور سچ تو یہ ہے کہ اصطلاحاً تبلیغ دعوت کے الفاظ سے جو کچھ سمجھا جاتا ہے یعنی تقریری یا تحریری شکل میں غیر مسلم اقوام کے آگے دین کو پیش کرنا، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کلیتہً اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے مگر اسی کے ساتھ کم از کم میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ قلم اور زبان کی تبلیغ سے زیادہ اور بہت زیادہ ہمیشہ ثابت ہوا ہے کہ موثر ترین ذریعہ دین کی دعوت کا عمل ہے،

اسلام کے قبول کرنے میں بھی اور مسلمانوں سے نفرت و عداوت کے بڑھانے میں بھی زیادہ تر دخل مسلمانوں کے طرز عمل ہی کو رہا ہے، جس زمانہ میں اور جس علاقے میں صحیح اسلامی زندگی کی پابندی مسلمانوں نے کی ہے، تو میں ان کے عملی نمونوں کو دیکھ بھال کر خود ان کی طرف مائل ہوئی ہیں، اور اسلامی تعلیمات سے مسلمان جس حد تک بے تعلق ہوئے ہیں، میں پاتا ہوں کہ قوموں کے قلوب بھی اُن سے ٹوٹتے چلے گئے ہیں، بلکہ اسی قسم کے مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی نے خود اسلام سے لوگوں کو بسا اوقات دور کر دیا ہے، صرف خوبصورت تعبیروں، یا تقریری خوش نوائیوں، انشائی دلآویزیوں سے عملی زندگی کے اس نظام کو بنی آدم پر مسلط کرنا آسان نہیں ہے، جس کی بنیاد چند ٹھوس غیر فانی صداقتوں کے یقین پر قائم ہے جب لوگوں کا عمل ان کے علمی نظریات کا مسلسل مضحکہ اڑا رہا ہو آپ خیال کر سکتے ہیں، کہ ان ہی نظریات یا معلومات و عقائد کے یقین کو دوسروں تک منتقل کرنے میں وہ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں عمل کی حیثیت ظاہر ہے کہ اس باطنی اعتماد اور بھروسے کی دلیل کی ہے، جس کا دعوی اپنے دینی نظریات و مسلمات کے متعلق آپ کرتے ہیں، پھر اپنے دعوے کی دلیلوں کی جو دلیل خود تردید کر رہا ہو، فیصلہ کرنے والے اس دلیل کے دعوں کے متعلق جو فیصلہ کریں گے، وہ ظاہر ہے،

اور جیسے عام مسلمانوں کے متعلق قوموں کی محبت و عداوت کا مذکورۂ بالا تجربہ مسلسل ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے، بجنسہ اسی تجربہ کا مشاہدہ مسلمانوں کی حکومتوں اور اُن کے حکمرانوں کے متعلق بھی گذشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں کیا گیا ہے،

یہ سوچنے کی بات ہو کہ بیت المقدس پہونچنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق عام تاریخوں میں اس واقعہ کا جو ذکر کیا گیا ہو کہ کنیسۃ القمامۃ میں نماز کا وقت آگیا بطریق سے آپ نے فرمایا کہ نماز پڑھنے کی کوئی جگہ بتاؤ، بطریق یعنی گرجا کا پادری جس کا نام صفرونیوس تھا، اس نے گرجے کے اندر کسی جگہ کی طرف اشارہ کرکے عرض کیا کہ آپ یہاں نماز پڑھ سکتے ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ

"آج یہاں میں نے نماز اگر پڑھ لی تو کل اس کا خطرہ ہے کہ مسلمان اسی کو دلیل بنا کرکہ عمرؓ نے یہاں نماز پڑھی ہے، تمہارے گرجے پہ دعویٰ نہ کر بیٹھیں"۔

یہ فرما کر گرجے سے باہر ہو کر آپ نے نماز ادا کی، کیا عیسائیوں کے دل میں اسلامی عدل و انصاف کا وزن اس واقعہ سے پیدا ہو سکتا تھا، یا اس سے کہ زبردستی حضرت عمرؓ اس گرجے میں نماز پڑھنے پہ اصرار فرماتے۔

اسی سفر میں کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام کے جابیہ نامی مقام میں فروکش تھے، اتنے میں ایک عیسائی یا یہودی دوڑتا ہوا آیا، اور آکر اس نے عرض کیا کہ دیکھئے آپ کی فوج کے سپاہی میرے تاکستان پہ ٹوٹے پڑتے ہیں، اور توڑ توڑ کر انگور کھا رہے ہیں، سننے کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ آپے سے باہر ہو گئے، خیمہ سے نکل پڑے، سامنے ایک سپاہی کو دیکھا کہ انگور کے خوشے اپنی ڈھال میں ڈالے چلا جا رہا ہے، پکار کر آپ نے روکا اور فرمایا کہ

"کیا تم نے بھی ایسا کیا؟"

سپاہی نے جواب میں کہا کہ ہم لوگوں پر بھوک کا غلبہ ہوا، کھانے کی کوئی چیز فوراً ملی نہیں، سامنے انگور کا کھیت تھا، اسی سے ہم نے خوشے توڑ لئے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی وقت ایک آدمی کو اس عیسائی کے ساتھ کر دیا اور حکم دیا کہ اس کے نقصان کا صحیح اندازہ کرکے مجھے خبر دو، تخمینہ دام کا لگایا گیا ہے کہ

عنبہ (کنز العمال بحوالہ ابو عبید ج ۲ ص ۹۹) کے ذاتی گزارا کر دیا تھا۔

اور یہ تو ایک شخصی تاکستان کا قصہ ہے کون واقف نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں غیر مسلم اقوام کی زمینوں پر جو لگان عائد کیا گیا تھا، اس میں کتنی رعایت اُن کے ساتھ کی گئی تھی، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں یہ روایت نقل کی ہے کہ عراق کے سواد (یعنی دجلہ و فرات اور ان سے نکالی ہوئی نہروں سے جو زمین سیراب ہوتی تھی) اس زمین کی پیمائش کے بعد جب حضرت عمرؓ کے نمایندوں نے اس لگان یعنی خراج کی رپورٹ آپ کے سامنے پیش کی تو آپ نے فرمایا کہ

"کاشتکاروں پر تم لوگوں نے اتنا بوجھ تو نہیں لاد دیا ہے جسے وہ اٹھا نہ سکتے ہوں"

یہ دو نمایندے تھے اور سواد کے مختلف حصوں کی پیمائش کر کے مختلف زرعی پیداواروں کے لحاظ سے لگان لگایا تھا، دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے، ان میں سے ایک صاحب یعنی حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ

لقد ترکت فضلاً — میں نے کاشتکاروں کے حصہ میں زیادہ چھوڑ دیا ہے

اور دوسرے صاحب جن کا نام عثمان بن حنیف تھا، قاضی ابو یوسف نے جن کے متعلق لکھا ہے کہ جیسے ریشم کا تھان ناپا جاتا ہے زمین کی پیمائش اسی احتیاط سے انھوں نے کی تھی، اور اس فن کے وہ ماہر تھے، بہرحال عثمان بن حنیف نے کہا

لقد ترکت الضعف[1]، — میں نے جتنا لگان لگایا ہے اس کا دونا کاشتکاروں کے لئے چھوڑ دیا ہے،

(کتاب الخراج ص ۳۷)

---

[1] عثمان بن حنیف کا یہ بیان اگر صحیح ہے اور ان کا بیان اگر صحیح نہ ہوگا تو کس کا ہوگا، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں خلفا کے زمانہ میں حکومت کے ذمہ دارانہ خدمات آپ کے سپرد رہے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی ہیں، بہرحال آپ کے اس بیان کا مطلب یہی ہوا کہ پیداوار کا دو تہائی حصہ کاشتکاروں کو دے دیا گیا تھا۔

مگر پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اطمینان نہ ہوا، اور حکم دیا کہ ہر علاقہ کے دہقان (یعنی قانون و پادش کمہ) کو میرے پاس ترجمان کے ساتھ روانہ کیا جائے، یہی کیا گیا، آپ نے دونوں سے اسی لگان کے مسئلہ پر پوچھ گچھ کی، مطلب یہ تھا کہ بیچاروں پر برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے،

اور یہ طرز عمل تو اس طبقہ کے ساتھ اختیار کیا گیا تھا جو حکومت کے وفادار اور معاہدہ کے دفعات کے پابند تھے، لیکن جن لوگوں نے معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کی، اور خطرہ پیدا ہوا، کو دشمنوں کو ان سے مدد ملے گی، بلکہ مختلف نازک موقعوں پر مسلمانوں کی دشمن حکومت یعنی رومیوں کی شام کے بعض علاقوں میں ان لوگوں نے مدد بھی کی، یہ عربسوس نامی خطے کے باشندے تھے، مگر جانتے ہو غدر و بغاوت کے اس جرم کی پاداش میں ان لوگوں کو اسلامی حدود سے باہر نکل جانے کا حکم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے جب دیا گیا، تو اسی کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰۰) ایک تہائی حصہ حکومت کے لئے لیا گیا، ایک طرف اس واقعہ کو رکھئے اور اسی ارض سواد جو ایرانیوں سے منتقل ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی تھی اسی کے متعلق شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس توجیہ کو بھی پیش نظر رکھئے، وہ فرماتے ہیں اُن کی عربی عبارت کا ترجمہ انا لتہ اختصار سے کر رہا ہوں :-

"میرے نزدیک حضرت عمرؓ کے اس عمل کی توجیہ (یعنی بعض صحابیوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ عراق کے اس زرعی علاقہ کو جاگیر بنا کر ان لوگوں کے حوالہ کر دیا جائے جنہوں نے اس علاقہ کو فتح کیا ہے، مگر حضرت عمرؓ اور آپ کے ساتھ حضرت عثمانؓ و علیؓ گویا نیز انصار کے بھی سربرآوردہ حضرات تھے ان سب کی رائے یہ تھی کہ ان مفتوحہ علاقوں کو قومی ملک بنا کر خالصہ کر لیا جائے یعنی حکومت ان پر قبضہ کر لے، اور انفرادی جاگیروں کی شکل میں ان کو تقسیم نہ کیا جائے، بہرحال شاہ صاحب حضرت عمرؓ کے فعل کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایران اور روم کے لوگوں نے زمین کے حقیقی مالکوں پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا اور اُن سے وہ لگان وصول کیا کرتے تھے، حالانکہ یہ جاگیردار نہ زمین کے مالک تھے نہ اسکی کاشت کرتے تھے، اور نہ اپنے آبا و اجداد کے دور ثت میں یہ زمین ان کو ملی تھی، مسلمانوں نے ان پر زبردستی غاصبانہ قبضہ کرنے والے جاگیرداروں سے جنگ کی اور شام و عراق کی زرعی زمینوں سے اُن کو مار بھگایا، اب زمین تھی اور زمین کے حقیقی مالک یعنی

ان سے کیا کہا گیا تھا؟ البلاذری نے نقل کیا ہے کہ

"ہر چیز جسے وہ چھوڑ کر جائیں گے اس کا دونا بدلہ ان کو دیا جائے گا، مثلاً ایک بکری کے معاوضہ میں دو بکریاں، ایک گائے کے بدلہ میں دو گائیں، الغرض ہر ایک چیز کے مقابلہ میں دو چیزیں ان کو اسلامی حکومت عطا کرے گی (ص ۱۶۳)

کیا یہ یا اسی قسم کے بیسیوں واقعات جن کا تماشا خلافت راشدہ کے عہد میں ہر طرف پیش ہو رہا تھا، ان کو دیکھ کر یہ سوال کوئی مشکل یا لاینحل سوال باقی رہ جاتا ہے، کہ دین اللہ میں "افواجاً" کی شکل میں لوگ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰۱) کسانوں کی وہ جماعت رہ گئی تھی، جو اس میں زراعت کرتی تھی، اور اسی علاقہ میں تھی پشت پشت سے ان کے باپ داداؤں سے یہ زمینیں وراثۃً یہ علاقہ منتقل ہوتا ہوا ان تک پہنچا تھا، جب مسلمانوں نے روم و ایران کے زبردستی قبضہ کرنے والے جاگیرداروں کو مار بھگایا، تو ان کسانوں کی اکثریت نے مسلمانوں سے صلح کرلی، اور لگان یعنی خراج ادا کرنے پر راضی ہوگئے، لیکن ان کسانوں میں کچھ لوگ روم اور ایران کا ساتھ دے کر مسلمانوں سے لڑے بھی تھے، در اصل اسی چیز نے ان زرعی علاقوں کے مسئلہ میں اشتباہ پیدا کر دیا، عوام نے تو یہ سمجھا کہ بزورِ شمشیر ان زمینوں کو ہم نے فتح کیا ہے، لیکن خواص صحابہ جانتے تھے، کہ جنگ ان کسانوں (علوج) سے نہ تھی، بلکہ ان جاگیرداروں سے تھی جنھوں نے زبردستی ان زمینوں پر قبضہ کر رکھا تھا، ورنہ زمین کے جو واقعی مالک اور کاشتکار تھے، اُن کی اکثریت نے تو مسلمانوں کی حکومت سے صلح کرلی تھی، اس لئے اس کا حکم فئی کا ہوا، (ص ۱۲۹، ازالۃ الخفاء جلد ۲)

آگے شاہ صاحب نے فئی وغیرہ کی قانونی بحث کی ہے، میری غرض اس عبارت کے پیش کرنے سے یہ تھی کہ عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رپورٹ میں ایک تہائی لگان [illegible] گئی ہے، اور شاہ صاحب کا یہ خیال کہ رومی و ایرانی جاگیرداروں کو مار بھگا کر زمین کے اصل کاشتکاروں اور مالکوں کے حوالہ مسلمانوں نے ان زمینوں کو کر دیا، ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ آج غریب کسانوں کے جن حقوق کا ماتم کیا جا رہا ہے، ان حقوق کو عملاً اسلام تیرہ صدی پہلے کسانوں تک پہنچا چکا تھا، میں تو نہیں جانتا کہ لگان کے مسئلہ میں اتنی فیاضی کسانوں کے ساتھ کسی زمانہ میں بھی کی گئی ہو، اشتراکی حکومتوں کے متعلق اگر دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ کسانوں و مزدوروں کے فلاح و بہبود کے لئے قائم ہوتی ہیں لیکن کسانوں کی ساری کمائی پر قوم کے نام سے حکومت کے وہ نمایندے قبضہ کر لیتے ہیں جن کے ہاتھ میں حکومت ہوتی ہے، اور غریب کسانوں کو یتیم خانوں کے یتیموں کی طرح صرف کھانا کپڑا اور لابدی ضروریات پر قناعت کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔

جو داخل ہوتے چلے جا رہے تھے اس کا سبب کیا تھا؟ انسانی فطرت بہرحال انسانی فطرت ہے، اس میں قدرۃً حق و باطل کے امتیاز کی صلاحیت پائی جاتی ہے، مگر حق کو واقعہ کی شکل میں پیش بھی تو کیا جائے، تقریروں اور تحریروں میں تو صرف بڑے بڑے دعوے پیش ہوتے ہیں، مگر آزمی تو وہ عمل کا رسیا ہے دعوی فقط خشک دعوے، ان پر چڑھانے والے جس قسم کے حسین و دلکش الفاظ کے خول چڑھا رہے ہوں سننے کی حد تک تو لوگ سن لیتے ہیں، بلکہ خول چڑھانے کی مہارت کی تعریف بھی ممکن ہے، تھوڑی دیر کے لئے کر دیں، لیکن جو کچھ کہا گیا وہ کیا بھی جاتا ہے یا نہیں، شعوری و غیر شعوری طور پر حقیقی فیصلہ صرف اسی سوال کے جواب کے ساتھ وابستہ رہتا ہے، دوسرا گال بھی اس کے آگے پیش کر دو جس نے تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارا اور جو تم سے کرتا چھینتا ہو، دھوتی بھی اس کے حوالہ کر دو، بے گاری میں ایک میل چلنے پر تمہیں اگر کوئی مجبور کرے، تو بجائے ایک میل کے دو میل چل کر اس کے سامان کو پہنچا دو،

عدم تشدد یا اہنسا کے ان انجیلی اصولوں کا لوگ جب ذکر کرتے ہیں، تو کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کی موجودہ جہنمی زندگی اچانک نظر آتی ہے، کہ بہشتی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی، لیکن ان ہی انجیلی اصولوں کے منادی کرنے والوں کو ان اصولوں کے سننے والے جب دیکھتے ہیں، کہ مارنا تو خیر دور کی بات ہے، کسی کے گال پر تھپڑ کا خیال بھی جن کے دلوں میں نہ تھا، ان کی گردنیں کندھوں سے اتار رہے ہیں، جنہوں نے کسی کے کپڑے کے دھاگے کو بھی بدنیتی سے نہیں دیکھا تھا، بلکہ اپنے کپڑے مصیبت کے دنوں میں جن لوگوں کو اتار اتار کر پہنائے تھے، ان ہی محسنوں سے کپڑے ہی نہیں چھین رہے ہیں، بلکہ بچوں کو ان کی گودیوں سے اتار اتار کر ذبح کر رہے ہیں،

سوچا جا سکتا ہے کہ انجیلی اصولوں کے واعظوں کے عمل اور فعل کا جب یہ حال ہو تو سہانے الفاظ کے خالی ڈھول کی آوازوں کو کب تک متاثر رکھ سکتی ہے،

گمنامی کے مقابلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا مشہور واقعہ جلالی

حکومت کی طرف سے تجارتی محصول (کروڑگیری یا چنگی) کے وصول کرنے کی سرحدی علاقون پر جب تنظیم ہوئی فرات کی آبی راہ پر بھی چوکی قائم ہوئی، دریا پر ایک رسّہ پھینک دیا جاتا تھا، تجارتی کشتیان اسی رسّہ سے آکر اٹک جاتی تھین اور محصول وصول کرنے والے تجارتی سامان کا تخمینہ کرکے محصول وصول کرتے تھے، شروع زمانہ مین یہ صورت پیش آئی، کہ ایک عیسائی سوداگر اسی راہ سے اپنا تجارتی مال لے کر گذر رہا تھا، زیاد بن حدیر جو اس چوکی کے امین تھے، انھون نے محصول وصول کر لیا، کچھ دن بعد پھر عیسائی تاجر کاروبار سے فارغ ہو کر اسی راہ سے واپس ہو رہا تھا، زیاد بن حدیر امین کروڑگیری نے اس کے مال کا پھر جائزہ لینا چاہا، عیسائی سوداگر نے کہا کہ ایک دفعہ مین محصول ادا کر چکا ہون، کیا مجھ ہی سے دوبارہ تم محصول وصول کروگے، چونکہ ابتدائی زمانہ تھا، سابقہ حکومت کے رواج کی بنیاد پر یا اپنے اجتہاد سے زیاد نے فیصلہ کیا کہ ہان! پھر تمھین محصول ادا کرنا پڑے گا،

عیسائی سوداگر اور زیاد مین بات بڑھی، اس نے سامان کو اپنے آدمیون کے سپرد کرکے زیاد سے کہا کہ مین خود امیر المومنین یعنی حضرت عمرؓ کے پاس جاتا ہون، اس زمانے مین حضرت عمرؓ مکہ آئے ہوئے تھے عیسائی سوداگر مکہ پہنچا، حضرت عمرؓ کی خدمت مین حاضر ہو کر یہ کہتے ہوئے کہ مین ایک عیسائی سوداگر ہون اپنا قصہ اس نے سنایا، حضرت عمرؓ نے اس کی روداد سن کر صرف ایک عربی لفظ یعنی "کفیت" فرمایا، جس کا مطلب یہی تھا کہ تیرا کام پورا کر دیا جائے گا، لیکن عیسائی سوداگر اس مختصر لفظ سے مطمئن نہ ہوا خود اسی کا بیان ہے کہ مین مکہ سے مایوس واپس لوٹ رہا تھا، دل مین طے کر چکا تھا کہ زیاد کے مطالبہ کی تکمیل کر دون گا، مگر وہی کہتا ہے کہ جب مین فرات کی اس چوکی پر پہنچا، تو اس خبر نے مجھے حیرت مین ڈال دیا کہ

کتاب عمر قد سبق الیہ — زیاد بن حدیر (امین چوکی) کے پاس حضرت عمرؓ کا فرمان اس کے پہنچنے سے پہلے وصول ہو چکا تھا

اس فرمان مین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زیاد کو یہ حکم دیا تھا کہ جب ایک دفعہ اس کے تجارتی

جان سے تم محصول وصول کر چکے تو دوبارہ پھر اسی مال سے وصول کا حق تم کو نہیں ہے، عیسائی سوداگر کا بیان ہے کہ اس خبر نے مجھے بے چین کر دیا، اور اسی وقت زیاد کو خطاب کر کے اُس نے اعلان کیا،

انی اشهد الله انی بری من النصرانیة	میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ عیسائی مذہب سے
فانی علی دین الرجل الذی کتب الیک	میں کنارہ کش ہوتا ہوں اور اب اس شخص کے دین پر
هذا الکتاب (کتاب الخراج لابی یوسف ۱۳۶)	ہوں جس نے تمہارے نام یہ مراسلہ بھیجا ہے

ایک معمولی عیسائی سوداگر کی چنگی کے محصول کے ساتھ اس عہد میں روئے زمین کی جو سب سے بڑی حکمران طاقت تھی، یعنی حضرت عمرؓ کا متوجہ ہونا اور مالی نقصان سے اس بڈھے عیسائی کو بچا لینے کے لئے اتنی مستعدی کہ شاہی فرمان اس کے پہونچنے سے پہلے این کردرگیری کے ہاتھ میں پہونچ چکا تھا، درحقیقت یہ واقعہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تھا ہی اتنا دل دوز کہ جو نتیجہ اس کا ہوا اس کے سوا کسی دوسرے نتیجہ کی بھلا ایسی صورت میں توقع ہی کیا ہوسکتی ہے ؟ خصوصًا اس زمانہ میں تاجروں کے ساتھ یہ معاملہ جو زیاد نے اختیار کرنا چاہا تھا حکومتوں کا عام دستور تھا،

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ بولنے کی حد تک تو حضرت عمرؓ کی زبان مبارک سے صرف "کفیت" کا ایک ہی لفظ نکلا، لیکن قول جس کا اتنا مختصر تھا، آپ دیکھ رہے ہیں، اس کے فعل اور عمل کی وسعت دامانیوں کو کہ عرب سے عراق تک یا مکہ سے ساحل فرات تک زلزلہ برپا ہوگیا، اور یہی حکومت کا مطلب اور اس کا صحیح

سلہ قاضی ابو یوسف ہی نے اسی عیسائی سوداگر کے متعلق یہ قصہ بھی نقل کیا ہے، کہ کچھ دن بعد حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنا تعارف کراتے ہوئے اس نے کہا کہ میں وہی بڈھا عیسائی ہوں جس نے آپ کے این کردہ گیر زیاد کے متعلق رپورٹ کی تھی، حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا کہ میں بھی تو وہی بڈھا حنیفی (الشیخ الحنیفی) ہوں جس نے تیری ضرورت پوری کی تھی، ص ۱۳۶، حنیفی سے مطلب حضرت عمرؓ کا یہی تھا، کہ ابراہیم حنیف کی ملت کا پیرو ہوں جس کی پیروی کی ترغیب عیسائیوں کو تورات سے ان کو حکم دیا گیا ہے،

نصب العین ہے، کہ اکثریت ہو یا اقلیت، دین و مذہب مسلک و مشرب کسی کا کچھ بھی ہو لیکن حکومت کی دائرۂ حفاظت میں جو آچکے ہوں اُن کو مطمئن کر دیا جائے کہ اُن کا ہر حق خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی اجتماعی ہو یا انفرادی بالکلیہ محفوظ ہے، یہ اس دجالی عہد کا نیا نظریہ ہے، کہ حکومت صرف ان لوگوں کے حقوق کی ذمہ دار ہے، جو کسی نہ کسی وجہ سے یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں، کہ ملک میں ان ہی کو عددی برتری حاصل ہے، جس جماعت کے افراد کی تعداد پچاس ہے، ان کی قطعاً پروا اس جماعت کے مقابلہ میں نہیں کیجائے گی، جس نے گنوانے کے وقت مردم شماری کے کارندوں سے یہ لکھوا لینے میں کامیابی حاصل کی ہو، کہ بجائے پچاس کے اکیاون منڈیوں پر یہ جماعت مشتمل ہے، ممکن ہے کہ کہنے کی حد تک یہ نہ کہا جاتا ہو لیکن یقیناً یہی کیا جا رہا ہے، اور اسی کا قرون وسطیٰ کی ظالمانہ حکومتوں کے مقابلہ میں جمہوری حکومت نام رکھ دیا گیا ہے، کانوں کو یہ سنا سنا کر بہرا بنا دیا گیا ہے کہ انسانی حقوق کی کلی ضمانت کا جو راز حکومت کے اس جدید انوکھے طرز سے بنی آدم پر منکشف ہوا ہے، اس کی نظیر تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی، مالکم کیف تحکمون،

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض یہ کر رہا تھا کہ اسلامی حکمرانوں نے قول سے زیادہ اسلام کی اشاعت میں اپنے عمل سے کام لیا ہے، اور یہ واقعہ ہے، کہ عمل کے کمانوں سے نکل نکل کر جو تیر قلوب میں اثر کر رہے تھے، کیا ان سیدھے تیروں کے نشانوں کو کوئی خطا کر سکتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانہ میں ذرا غور تو کیجئے حمص میں وہ صورت جو پیش آئی، یعنی ہرقل اپنی آخری فوجی قوت کو فراہم کر کے شام کو مسلمانوں سے چھیننے کے لئے جب یلغار کرتا ہوا مسلمانوں کی فوج کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا، تو مسلمانوں نے یہ محسوس کر کے کہ ہرقل کے اس فوجی حملہ کی مدافعت میں ہم لوگ جس وقت مشغول ہوں گے، حمص کے شہر اور اس کے باشندوں کی حفاظت کی ذمہ داری جیسی کہ چاہئے ہم سے ممکن نہ ہو سکے گی، مشہور واقعہ ہے کہ حمص کے غیر مسلم باشندوں سے ان کی حفاظت کے مصارف کے لئے خراج کی رقم جو وصول ہو چکی تھی، یہ کہتے ہوئے یہ پوری رقم واپس کر دی گئی کہ

قد شغلنا عن نصرتکم و الدفع — تم لوگوں کی امداد اور تمہاری طرف سے مدافعت

عنکم (البلاذری ص ۱۴۳) — کا موقع ہمارے لئے باقی نہ رہا۔

مورخین نے اس واقعہ کو نقل کرکے اگر یہ لکھا ہے کہ حمص کے یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے اس عجیب وغریب طرز عمل کو دیکھ کر کہنے لگے کہ

"آپ لوگوں کی حکومت آپ کا عدل و انصاف ہمیں رومی حکومت کے ظلم وستم سے زیادہ محبوب ہے، آپ کے عامل (حاکم شہر حمص) کے ساتھ مل کر ہم رومیوں کا مقابلہ کریں گے۔"

یہ تو عیسائیوں نے کہا حالانکہ رومی حکومت خود عیسائی حکومت تھی، اسی طرح حمص کے یہودیوں نے جمع ہوکر اعلان کیا کہ

"قسم ہے تورات کی کہ شہر میں ہرقل کا والی اور نمائندہ اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم لڑکر مغلوب اور درماندہ نہ ہوجائیں۔ (البلاذری ص ۱۴۳)

مسلمانوں کے ساتھ جو وعدہ عیسائیوں اور یہودیوں نے اس واقعہ کے بعد کیا تھا، وہ پورا کیا گیا، اور یرموک ندی کے ساحل پر ہرقل کی فوج کو آخری تاریخی شکست جب نصیب ہوئی، تو لکھا ہے کہ

"شام کے شہروں، اور قصبوں کے یہودی اور نصرانی ڈھول بجاتے ہوئے باہر نکل آئے اور مسلمانوں کے آگے کھیلتے کودتے اپنے شہروں میں ان کو لے گئے"

یہی یرموک کی فوج جسے ہرقل نے عیسائیوں کے مرتد بادشاہ جبلہ بن ایہم کی سرکردگی میں اس لئے روانہ کیا تھا، کہ عرب کے ان قبائل کی امداد بھی اس تدبیر سے میسر آسکتی ہے، جو رومیوں کی اس باجگذار عربی حکومت یعنی غسانیوں سے تعلق رکھتے تھے، اور اس میں شک نہیں کہ جبلہ کی وجہ سے یرموک کی اس جنگ کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی، لیکن کون نہیں جانتا کہ جبلہ جیسی مادی قوت کی امداد

سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دست بردار ہوگئے تھے، کہ اتفاقاً جبلہ کے دوشالے کا کسی

گوشہ پر ایک غریب بدو کا پاؤں اس وقت پڑ گیا تھا، جب جبلہ مسلمان ہو کر کعبہ کے طواف میں مشغول

تھا، بادشاہی کے جاہلی خیال نے جبلہ کو بے خود کر دیا، اور غریب بدو کے منہ پر اس زور سے اس نے تھپڑ رسید

کیا کہ اس کی ایک آنکھ بہہ گئی، اس کی خبر حضرت عمر کو ہوئی جبلہ کی طلبی کے بعد آپ نے فرمایا، کہ بدو کی آنکھ کے بدلہ میں تمہاری

آنکھ پھوڑی جائے گی، سننے کے ساتھ ہی غسانی حکومت کے فرمانروا جبلہ کے ہوش اڑ گئے، کہنے لگا

کیا اس بدو کی آنکھ میری آنکھ کے برابر ہے؟ او عینہ مثل عینی (بلاذری ص ۱۴۲)

اس نے جواب کے لئے مہلت طلب کی اور اسی حیلہ سے شباشب اسلامی علاقہ سے بھاگ کر رومیوں

کے علاقہ میں پہنچ گیا، اور اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی دین اس نے قبول کر لیا، کہتے ہیں کہ جبلہ کے ساتھ عربی

قبائل کے تیس ہزار سپاہی جو اس کی فوج کے ملازم تھے، رومیوں میں جا کر مل گئے، لیکن ایک بدوی کی آنکھ

کا انصافاً جو حق تھا، اس حق کی حفاظت میں یہ سارے مادّی نقصانات اسلامی حکومت نے برداشت کر لئے،

اور بدو کی آنکھ تو پھر بھی آدمی کی آنکھ تھی، حضرت عمرو بن عاص صحابی جو مصر کے حاکم تھے، ان کے حالات

میں لکھا ہے کہ ایک مسلمان سپاہی نے مصر کے کسی غیر مسلم باشندے کے بت کی آنکھ توڑ دی عمرو بن العاص کے

سامنے مقدمہ پیش ہوا، بیان کیا جاتا ہے، کہ بت کی آنکھ کے توڑنے والے سپاہی کی آنکھ تو بھی توڑ سکتا ہے'

قبطی کو عمرو بن عاص کی طرف سے یہی فیصلہ سنایا گیا، وہ سناٹے میں آ گیا، مسلمان سپاہی نے اس قبطی سے

کہا کہ میری آنکھ توڑ کر تو کیا کرے گا، میں تیرے بت کی آنکھ کے معاوضہ میں جو رقم بھی منظور کرے پیش کرنے

کو تیار ہوں، آخر تاوان ہی پر راضی ہو گیا، اور مسلمان سپاہی کی آنکھ بچ گئی؛[1]

مصر جو ابتداے اسلام میں تقریباً ایک عیسائی ملک تھا، لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ وہاں کے

عیسائی کیا ہوئے ؟

---

[1] دیکھو کتاب رحمۃ للعالمین ج ۲، ص ۱۱۷

کیونکہ جو ایک اقلیت قبیلہ کے مصر کی ساری آبادی صدیوں سے مسلمان ہے۔

لیکن غور نہیں کرتے کہ اسی مصر میں جہاں آئے دن اسلامی حکومت کی طرف سے عدل و انصاف کی مذکورۂ بالا مثالیں پیش ہوتی تھیں، ساتویں صدی عیسوی کا عیسائی مورخ یحییٰ نکیو جو مصری عیسائیوں کا بطریق تھا، اور مصر کی اس نے تاریخ بھی لکھی ہے، اسی کا بیان ہے کہ

"عمرو بن عاص نے گرجاؤں پر عیسائیوں کے قبضہ کو بحال رکھا، اور عیسائیوں کو دینی معاملات میں خود مختار بنا دیا، عمرو کی فوج نے کسی گرجے کے مال اور خزائن پر دست اندازی نہ کی، اور نہ لوٹ و غارتگری سے کام لیا" (ص ۵۸۴)

اسی کے مقابلہ میں اسی مصر کے ان ہی یعقوبی عیسائیوں یعنی قبطیوں پر قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ جسٹی نین نے محض اس قصور میں کہ رومی کلیسا کو مصر کے قبطی عیسائی تسلیم نہیں کرتے تھے، یہ ظلم توڑا کہ آج بھی اس کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، واٹسن ٹی. بی. کی کتاب "مصر کی موجودہ حالت" میں یہ تاریخی شہادت درج ہے کہ

"جسٹی نین (شاہ قسطنطنیہ) نے دو لاکھ قبطیوں کو اسکندریہ میں قتل کرایا، اور اس کے جانشینوں نے اتنے مظالم ان عیسائیوں پر توڑے کہ اکثر قبطیوں نے صحرائے اعظم میں جا کر پناہ لی" (کتاب مذکور ص ۱۱ مطبوعہ لندن [illegible])

عیسائی حکومت کا خود عیسائیوں کے ساتھ تو یہ برتاؤ تھا، اسی کے مقابلہ میں مسلمان حکمرانوں کو انھوں نے جب دیکھا کہ پتھر کی مورتیوں کی آنکھوں کے بدلہ میں زندہ مسلمان کی آنکھ تک کے توڑنے پر آمادہ ہیں، تو اسلام کو اُن کے قلوب میں گھسنے سے سوچنا چاہیے کہ اب کونسی طاقت روک سکتی تھی، ساتویں

[illegible]

مصری عیسوں کے اسی بطریق یحییٰ نکیو کے حوالہ سے آرنلڈ نے نقل کیا ہے، کہ

"مسلمانوں کی فتح مصر میں ابھی مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی اسکندریہ ابھی مقابلہ پر تھا، کہ اکثر قبطیوں نے اسلام قبول کر لیا" (پریچنگ آف اسلام ص ۱۱۶)

عمرو بن العاص جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے، کہ سیاسی مصالح کا ان کے فیصلوں میں کافی اثر نمایاں تھا، جب اُن کا حال یہ بیان کیا جاتا ہے، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ جن بزرگوں نے دینی مصالح کے مقابلہ میں سیاسی مصالح کی کبھی پروا نہ کی، ان کا برتاؤ اسلامی قلمرو کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ کیا ہو گا؟ مالگذاری وصول کرنے میں ایرانیوں اور رومیوں کے جو یہ طریقے تھے کہ لوگوں کو باندھ کر دھوپ میں لٹا دیا جاتا تھا، اور اُن کے سر پر غالباً گرم تیل ڈالا جاتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر شام کے سفر میں وصول مالگذاری کے اس رومی طریقہ پر جس وقت پڑی تو اسی وقت آپ نے حکم دیا، کہ

"لوگوں کی برداشت سے زیادہ ان پر بار نہ ڈالا جائے، اور نہ مالگذاری کے وصول کرنے میں دکھ پہونچایا جائے[1]"

اسی طرح جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کا زمانہ آیا، تو ایک صاحب جن کو آپ نے ایرانی علاقے کسی مقام کی طرف جس کا نام بندرج سابور[2] تھا، مالگذاری کی تحصیل و وصول کے لئے روانہ کرنا چاہا جب وہ چلنے لگے تو مرتضیٰ علیہ السلام نے اُن کو وصیت شروع کی،

"دیکھو! ایک درم کے وصول کرنے میں بھی کسی کو تازیانے کی سزا نہ دینا، اور نہ ان کے روزی کی خوراک کے ذخیرے کو نیلام کرنا، اسی طرح گرما اور سرما کے لباس کو بھی اُن کے ہاتھ نہ لگانا، اور جن مواشیوں سے وہ کاشتکاری میں کام لیتے ہیں، اُن کو بھی فروخت نہ کرنا، اور نہ تحصیل

[1] کتاب الخراج ابی یوسف ص ۱۲۵ [2] عراق کے ایک قدیم قصبہ کا یہ پرانا نام ہے، کہتے ہیں کہ بعد کو اسی آبادی کا نام عکبرا مشہور ہوا، بغداد سے تیس میل کے فاصلہ پر ہے،

وصول کے وقت کسی کو کھڑے رہنے پر مجبور کرنا؛

حضرت علیؓ کی ان ناصحانہ وصیتوں کو سن کر تحصیل دار نے کہا کہ

"امیر المومنین پھر تو جناب کی خدمت سے جس حال میں جا رہا ہوں، اسی حال میں مجھے واپس ہونا پڑے گا"

حضرت نے تحصیل دار کی بات سن کر فرمایا،

"ہاں! جیسے گئے تھے، اسی حال میں واپس ہی کیوں نہ آ پڑے،

اس کے بعد اسی کو خطاب کرکے آپ فرمانے لگے،

تجھ پر افسوس ہے (دیکھ) ہمیں اُن سے صرف العفو یعنی فضل (ضرورت سے جو بچ گیا ہو)

اسی سے لینے کا حکم دیا گیا ہے" (ص ۵، کتاب الخراج لابی یوسف)

اور ان بزرگوں کے متعلق تو خیر اس قسم کی باتیں چنداں تعجب انگیز نہیں ہیں، مگر ان ہی کے مقابلہ میں امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حال میں بھی ہم جب یہ پڑھتے ہیں، کہ رومیوں اور حضرت معاویہؓ کے درمیان یہ طے ہوا تھا، کہ سالانہ اتنی رقم ادا کیا کریں گے، رومیوں نے اطمینان کے لئے اپنے یہاں کی چند ممتاز ہستیوں کو امیر معاویہؓ کے پاس بطور یرغمال کے رکھوا دیا تھا، کہ اگر مقررہ رقم رومی حکومت نہ ادا کرے، تو آپ ان لوگوں کو قتل کر سکتے ہیں، البلاذری نے نقل کیا ہے، کہ کچھ دن بعد رومیوں نے عہد شکنی کی، معاہدے کے رو سے امیر معاویہؓ کو حق تھا کہ یرغمال والے رومیوں کو قتل کر دیں، مگر مسلمانوں سے مشورہ کرنے کے بعد امیر معاویہؓ نے یہی طے کیا کہ

"اُن کو قتل نہ کیا جائے بلکہ چھوڑ دیا جائے"

یہی کیا گیا، مسلمانوں نے یہ کہتے ہوئے کہ

وفاءٌ بغدرٍ خیرٌ من غدرٍ بغدرٍ

عہد شکنی کے جواب میں عہد شکنی سے بہتر ہے کہ ہم عہد توڑنے والوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی کریں

(البلاذری ص ۱۶۳)

پر خیال والے ان دیوتاؤں کو جو کعبہ میں رکھے گئے تھے، دور کر دیا،

بہرحال مخلوقات کی پرستش اور پوجا پاٹ جن عبادتگاہوں میں ہوتی ہے، ان کو پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہٗ ہی کی عبادت کے لئے مختص کرانے کے نصب العین میں کامیابی کی صحیح تدبیر یہ قطعاً نہیں ہو کہ جن عبادتگاہوں میں مخلوقات کی عبادت کیجاتی ہے، اُن کو ڈھا دیا جائے، گرا دیا جائے[1]، جلا دیا جائے، انسانی نفسیات کی خصوصیتوں سے تھوڑی بہت بھی واقفیت جو رکھتے ہیں، وہ اندازہ کر سکتے ہیں، کہ اس قسم کے اعمال سے انتقام اور غصہ کے جذبات میں آدمی ڈوب کر تہ و بالا ہونے لگتا ہو، ان ہی اشتعالی جذبات کے تلاطم اور ہنگاموں میں حقیقت نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جاتی ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، کہ جس مصر میں آج ازہر اور مسجد ابن طولون وغیرہ کی بے نظیر عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں یہ وہی ملک ہے جس کے ان گرجوں کو مسلمانوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا جن میں (العیاذ باللہ) خدا کے بیٹے اور خدا کے بیٹے کی ماں کی پوجا ہوتی تھی، (باقی)

---

[1] خود کعبہ کی عبادتگاہ جو تین چار صدیوں سے مخلوقات کی پوجا پاٹ کا مرکز بنی تھی اللہ کے آخری رسول نے خالق کی عبادت کے اس پہلے گھر کا تعلق پھر خالق ہی سے قائم کر دینے میں جو کامیابی حاصل کی تو اس وقت بھی اس کے سوا اور کیا گیا کہ مخلوقات کے پوجنے والوں کو خالق کا پرستار بنا لیا گیا، ان ہی نے بجائے مخلوقات کے کعبہ کو خالق کی عبادت کا مرکزی مقام بنا دیا، مسلمانوں پر بعض عبادتگاہوں کی علامتوں کی بنیاد پر یہ الزام لگایا جاتا ہے، کہ زبردستی دوسری قوموں کی عبادتگاہوں کو انھوں نے مسجد بنا لیا تھا، ممکن ہو کہ بعض ناواقف مسلمانوں نے دین کے احکام سے جہالت کی وجہ سے کبھی ایسا کیا ہو لیکن جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے ایسی معلوم ہوا کہ کعبہ کے ساتھ جو صورت پیش آئی ایسی صورت عموماً ان عبادتگاہوں کی بھی ہے یعنی وہی لوگ جو مخلوقات کی عبادت ان مکانوں میں کرتے تھے، خالق کی عبادت اُن میں کرنے لگے،

باب المراسلہ

حیاتِ شبلی کے معلومات میں کچھ اضافے

از

مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب فریدی ہستی پوری صدر مدرس شمس العلوم بداؤن

جنابِ مکرم :- السلام علیکم،

اس ہفتہ مین مجھے حیاتِ شبلی کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، چند باتین حضرتِ والا کے گوش گذار کرنا مناسب سمجھا لہٰذا یہ معروضہ حاضرِ خدمت ہے، امید کہ شرفِ قبول سے بار آور ہوگا،

۱- حیاتِ شبلی ص ۴۲ :- بچون کے فارسی ابتدائی رسالہ "آمدنامہ" کو مولانا فضل امام خیرآبادی کی تالیف بتایا ہے، یہ سہوِ قلم ہوا، یہ رسالہ مولوی مصطفیٰ خان صاحب ولد حاجی روشن خان مالک مطبع مصطفائی محمود نگر لکھنؤ کی تالیف ہے،

مولانا فضل امام کا "آمدنامہ" تذکرۂ علماء مین ہے جس مین قاضی مبارک وغیرہ علماء گوپامئو اور دیگر فضلاء کا ذکر ہے، فنِ منطق مین البتہ ابتدائی رسالہ مولانا کی تالیف ہے جو تقریباً ہر عربی درسگاہ مین داخلِ درس ہے، جس کا نام "مرقات" ہے، اس کی فارسی اور عربی مین شرح ہین،

۲- مولانا محمد کامل ولید پوری قدس سرہ کی ولادت ۱۲۳۰ھ کی ہے، علمائے فرنگی محل سے نقلیہ اور عقلیہ علوم کی تکمیل کی حضرت سید شاہ عبدالعلیم لوہاری قدس سرہ متوفی ۱۲۶۷ھ مدفون بھوپال جہانگیرآباد

کے مرید تھے، جنکا سلسلۂ بیعت قادریہ مجددیہ جو بواسطہ حضرت خواجہ سید آدم بنوری امام ربانی مجدد الف ثانی تک پہنچتا ہے تعلیماً و سلوکاً نقشبندیہ ہے۔

حضرت سید شاہ عبد العلیم لوہاری (ضلع مظفر نگر) حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی قدس سرہٗ متوفی ۱۲۵۹ھ شیخ طریقت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکہ کے سلسلۂ قادریہ کے پیر بھائی تھے، اسی سلسلہ کو "قادریہ مجددیہ آبادانیہ" لکھتے ہیں، اس خانوادہ کی خانقاہیں صوبہ بہار، آرہ، دربھنگہ، مونگیر، کشنگنج وغیرہ میں ہیں۔

یہ دونوں بزرگ یعنی حضرت شاہ صاحب و میاں صاحب جلال آباد (جو لوہاری سے تین کوس پر ضلع مظفر نگر میں واقع ہے) میں بعد نماز مغرب حضرت امام الزاہدین حافظ شاہ احسان علی فریدی پاکپٹنی سے مرید ہوئے اور نسبت قادریہ اور تعلیمات مجددیہ آبادانیہ حاصل کیں، پھر تکمیل سلوک حضرت حاجی عبد الرحیم سے کی اور اجازت و خلافت سے بہرہ اندوز ہوئے، میانجی علیہ الرحمہ کو خلافت بذریعہ خط ملی جس کی نقل بیاض و کلکتا میں مرقوم ہے۔

مولانا حاجی نصر اللہ خان خورجوی متوفی ۱۲۹۹ھ شارح رباعیات یوسفی تلمیذ خاص مولانا احمد علی چڑیا کوٹی خلیفہ حضرت سید شاہ عبد العلیم لوہاری جب حضرت میانجی صاحب سے ملنے گئے، تو ارشاد فرمایا،

"تا وقتیکہ اشغال فرمودۂ حضرت شاہ احسان علی رحمۃ اللہ علیہ را نمی کنم طبعم درست و خوش نمی شود"

حضرت میانجی قدس سرہ کے اپنے بھتیجے میاں عبد العزیز کو اپنے حکم سے مولانا نصر اللہ خان خورجوی علیہ الرحمہ سے مرید کرایا، اور تعلیم سلسلۂ قادریہ مجددیہ آبادانیہ ہو دلائی اور وہ منزل مقصود کو پہنچے اس کا مفصل تذکرہ میانجی صاحب کا مرید ہونا اور خلافت پانا وغیرہ میانجی صاحب کے خطوط بیاض و کلکتا (فارسی) مولفہ مولانا نصر اللہ خاں خورجوی میں مذکور ہے، نیز آئینہ مبارک مطبوعہ مؤلفہ مولوی سید حسن رضوی ساکن سرہدی بہار جو مولوی حافظ محمد حسین صاحب ساکن بستہ بکھیرا کے تربیت کردہ ہیں۔

۳- مولانا تھانوی کو "تعلیم الدین" میں سہو ہو گیا کہ حضرت میانجی قدس سرہ کو مرید حضرت شاہ رحم علی کا لکھا، حضرت شاہ رحم علی امام الزاہدین حافظ شاہ احسان علی کے مرید و مجاز تھے جو میانجی صاحب کے پیر بھائی ہوئے، شاہ رحم علی موضع علی پورا ضلع سہارنپور کے ساکن تھے، علی پور سے سرگن پور سے غرب کی جانب تین کوس پر ہے، امام الزاہدین کو بیعت حضرت قطب

ملہ معارف: "تعلیم الدین" میں حضرت میانجی کو شاہ رحم علی کا مرید نہیں لکھا ہے، خود مضمون نگار سے سہو ہوا ہے۔

ثانی حضرت شاہ نابانی سیالکوٹی متوفی ۱۲۲۳ھ مدفون دہلی آپکی تھی، پنجاب کے میدان میں جہاں اب گرجا اسکول ہے جہاں حضرت کی خانقاہ اور کاغذی محلہ تھا، آپ کا مزار ہے امام الزاہدین کو شہادہ میں کئی سال رہے یہاں عوام و خواص مستفیض ہوئے، اور صبح و شام حلقہ ہوا کرتا تھا اسکی شہرت حضرت سید احمد بریلوی کو ہوئی تو جہاد کی دعوت دی آپ نے عذر قبول نہیں کیا،

مولینا محمد کامل ۱۲۳۱ھ میں سید شاہ عبد العظیم سے مرید ہوئے اور اپنے پیر بھائی حاجی وحید الدین غازی پوری، اور قاضی عنایت حسین چریا کوٹی سے اخذ فیض کیا،

۴۔ مولانا تھانوی نے اپنے وعظ و ملفوظ میں ذیل کا شعر ایک بزرگ کے عالم سکرات الموت میں زبان پر جاری ہونا لکھا ہے، اور نام کی تصریح نہیں فرمائی ہے،

وقت آن آمد کہ من عریان شوم جسم بگذارم سراسر جان شوم

یہ مولانا نواب سید امجد علی صاحب رضوی لکھنوی متوفی ۱۳۴۲ھ مدفون لکھنؤ ہیوٹ اسٹریٹ مقبول گنج بیٹیا مسجد کلاں کا واقعہ ہے جو حضرت شاہ احسان علی پاکپٹنی کے پیر بھائی تھے، نور القلوب تالیف ہے لیکن ابتک طبع نہیں ہوئی،

اسی طرح اس سلسلہ کے ایک بزرگ قاضی عنایت حسین چریا کوٹی متوفی ۱۳۱۵ھ کے بوقت نزع یہ مصرعہ جاری تھا،

"من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی"

مولانا محمد کامل کے خلیفہ آپکے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ میں سید اسمٰعیل صاحب تھے، جو سب انسپکٹر تھے،

۵۔ مناظرہ جو رامپور میں ہوا وہ مابین مولانا فضل حق رامپوری و مولانا حفیظ اللہ مجتبیٰ تصریح کے ہوا تھا، نہ مولانا عبد الحق خیرآبادی سے، ہاں مولانا عبد الحق خیرآبادی اور مولانا سید محمد طیب عرب شریک تھے، اس وقت مدرسہ عالیہ رامپور میں محمد طیب عرب صدر مدرس تھے،

۶۔ شیخ حبیب اللہ مرحوم والد علامہ شبلی کے پیر مرشد کا صحیح نام الٰہی بخش ہے،

اگر قبول افتد زہے عز و شرف والسلام مع الاکرام

ادبیات

شمع تمدن کی آخری ضو

از جناب یحییٰ اعظمی

جو ملک میں کل تک تھے نگہبانِ تمدن ۔۔۔ ڈھاتے ہیں وہی آج خود ایوانِ تمدن

کلچر کی حفاظت کا تھا دعویٰ جنہیں کل تک ۔۔۔ صد حیف مٹاتے ہیں وہی شانِ تمدن

برباد ہے صدیوں کی متاعِ ہنر و علم ۔۔۔ پامال ہے ہر سو سر و سامانِ تمدن

تہذیب ہے رخصت تو ثقافت ہے روانہ ۔۔۔ ہوں مرثیہ خواں کیوں نہ ہوا خواہانِ تمدن

ہے طرفہ ستم یہ کہ ہے مبغوض وہی شے ۔۔۔ فی الواقعہ جو ملک میں ہے جانِ تمدن

ہے سب سے زیادہ ہدفِ شیوۂ بیداد ۔۔۔ اردو کہ ہے سرچشمۂ فیضانِ تمدن

ہنگامے ہیں جس شے کے مٹانے کیلئے آج ۔۔۔ سچ پوچھئے تو ہے وہی عنوانِ تمدن

آنکھیں ہوں تو دیکھو کہ ہیں منقوش ابھی تک ۔۔۔ اس ملک کے ہر ذرہ پہ احسانِ تمدن

افسوس کہ ہے اب خس و خاشاک سے لبریز ۔۔۔ پھولوں سے تھا معمور جو دامانِ تمدن

دیکھو تو ہے سرتا بہ قدم وقفِ خزاں آج ۔۔۔ کل تک تھا گل افشاں جو خیابانِ تمدن

آزادی جمہور کے اس دور میں صد حیف ۔۔۔ یہ طرزِ سیاست نہیں شایانِ تمدن

گلشن کی فضا یکسر نہیں راس نہ ہم آہنگ ۔۔۔ ہیں نغمہ سرا زمزمہ سنجانِ تمدن

صدیوں سے تھی جو ہند کی محفل میں ضیا بار ۔۔۔ بجھنے کو ہے وہ شمعِ شبستانِ تمدن

مطبوعات جدیدہ

نزھۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر جلد اوّل مؤلفہ مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۵ صفحے کاغذ اور ٹائپ عمدہ قیمت ۵ ر

پتہ:- مکتبہ اسلام گوئن روڈ، لکھنؤ

اسلامی ہند کی ہزار سالہ تاریخ میں سرزمین ہندوستان میں بڑے بڑے سلاطین و کشور کشا وزراء و امراء مشائخ و صوفیہ، ادباء و شعراء ہر فن کے علماء و فضلاء اور ہر صنف کے اصحاب کمال پیدا ہوئے، لیکن ان کا کوئی جامع تذکرہ نہیں ہے، اور اُن کی خاصی تعداد ایسی ہے جن سے بہتیرے خواص اور اہل علم تک ناواقف ہیں، اُن کے حالات سیکڑوں کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، اس لئے اُن کا استقصا بھی آسان کام نہیں ہے، مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامع العلوم تھے، خصوصاً شعر و ادب، تاریخ و جغرافیہ، سیر و سوانح اور طبقات و تراجم پر ان کی نگاہ نہایت وسیع اور گہری تھی، اردو و عربی ادب و انشاء پر اُن کو یکساں قدرت حاصل تھی، اردو میں تذکرہ گل رعنا اور عربی میں ہندوستان کا جغرافیہ اور اسلامی ہند کی تاریخ جنۃ المشرق و مطلع النور المشرق اس کی شاہد ہیں، اس لئے انھوں نے اس قسم یا تاریخ کام کی ہمت کی اور سالہا سال کی محنت و عرقریزی کے بعد عربی میں نزہتہ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر کے نام سے آٹھ جلدوں میں ہندوستان کے علماء و مشاہیر کا تذکرہ لکھا، اس کی دوسری جلد جو ساتویں صدی ہجری کے اواخر تک کے حالات پر مشتمل ہے، عرصہ ہوا دائرۃ المعارف حیدرآباد کے ساتھ اس کے ذیل کے

[illegible]

اس میں پہلی صدی سے لیکر ساتوین صدی تک کے اعیان و اکابر کے حالات ہین، باقی چھ جلدین چھٹی صدی سے لے کر چودھوین صدی تک، ہر جلد ایک ایک صدی کے علماء و عمائد کے حالات پر مشتمل ہے، اس کام کی اہمیت اور مصنف کی وسعت نظر و تلاش و جستجو کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اس کتاب کی تالیف مین عربی و فارسی کی تین سو مطبوعہ اور قلمی کتابون سے مدد لی گئی ہے، کوئی قابل ذکر شخصیت چھوٹنے نہین پائی ہے، اور ساڑھے چار ہزار اشخاص سے زیادہ کے حالات قلمبند کئے گئے ہین، کتاب کے شروع مین مصنف مرحوم کے خلف الصدق جناب مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے اس مین مصنف کے مختصر حالات اور کتاب کی خصوصیات پر تبصرہ ہے، اس مین آٹھون جلدون کا اجمالی خاکہ آگیا ہے، کتاب کی زبان قدماء کے طرز کی نہایت فصیح و سلیس ہے، یہ کتاب اسلامی ہند کی علمی و سیاسی تاریخ اور عربی طبقات و تراجم مین نہایت بیش قیمت اضافہ ہے، امید ہے کہ اہل علم کے حلقہ مین اس کے شایان شان قدردانی کیجائے گی،

اردو زبان اور اس کا رسم الخط } جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے، تقطیع بڑی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ:۔ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

یہ مصنف کا وہ خطبۂ صدارت ہے، جو انھون نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس ناگپور ۱۹۴۶ء مین بحیثیت صدر شعبۂ اردو پڑھا تھا، اس مین جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اردو ہندی اور ان کے رسم الخط کے پرانے قضیہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے، خطبہ کے دو حصے ہین، پہلے مین اردو زبان کی مختصر تاریخ اس کی لسانی اہمیت اور علمی و ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ہندی کی حمایت مین اردو زبان پر جو اعتراضات کئے جاتے ہین، اور اس کی مخالفت مین جو دلائل دیئے جاتے ہین، سب کے جوابات اور اردو زبان و ادب کی ترقی کے متعلق بعض مفید عملی مشورے ہین، دوسرے حصہ مین اردو

رسم الخط کے جو صوتی و تحریری نقائص اور ہندی رسم الخط کے جو محاسن بیان کئے جاتے ہیں، اُن کی مفصّل تردید ہے، اس زمانہ میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ اردو ہندی کے بجائے رومن رسم الخط اختیار کرلیا جائے، اس سلسلے آخر میں اس کے نقائص اور دشواریاں بھی دکھائی گئی ہیں، غرض آج کل ہندی زبان، اور اس کے رسم الخط کی حمایت اور اردو کی مخالفت میں جو کچھ بھی کہا جاتا ہے، ان سب کا پورا جواب اس خطبہ میں موجود ہے لیکن واقعات و حقائق اور منطق و دلائل تو اس کے لئے ہیں جو ان کو فیصلہ کا معیار مانتا ہو، لیکن جہاں سب سے بڑی دلیل حکومت کی قوت ہو، وہاں سارے دلائل بے کار ہیں،

مسلمانوں کی اصلی طاقت اور اُن کے عروج و زوال کے حقیقی اسباب | از مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی استاذ تفسیر ندوۃ العلماء لکھنؤ تقطیع بڑی، ضخامت ۴۰ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸ر، پتہ دفتر الفرقان گوئن روڈ، لکھنؤ،

دنیا کی تمام قوموں کے عروج و زوال میں مادی وسائل کے ساتھ اخلاقی قدروں کو بھی بڑا دخل ہو، اور مسلمانوں کی ترقی و تنزل کا تو دار و مدار اسی پر ہے، آغاز اسلام میں تعداد کی کثرت اور مادی سر و سامان کے لحاظ سے اس عہد کی دوسری بڑی قوموں اور حکومتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا کوئی شمار ہی نہ تھا لیکن خدا پر ایمان، اس کے وعدوں اور نصرت پر اعتماد، اسلام کی حقانیت و صداقت کا یقین اور اس کی تعلیمات پر عمل نے اُن میں وہ روح پیدا کر دی تھی، کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اور اسلامی تعلیم کا ایسا عملی نمونہ اور اسلامی اخلاق کی ایسی تصویر تھے کہ ان کو دیکھ کر دشمن تک مسخر ہو جاتے تھے، ان اوصاف کی بنا پر وہ ایک صدی کے اندر اندر دنیا کے بڑے حصّہ پر چھا گئے، اور اس کے گوشہ گوشہ میں اسلام کی روشنی پھیل گئی، لیکن جب سے اسلام کا سر رشتہ اُن کے ہاتھ سے چھوٹا، اور وہ دنیا کو صحیح راستہ پر لگانے کے بجائے خود گمراہی میں مبتلا ہو گئے، اسی وقت سے ان پر ادبار

[illegible]

کے عروج و زوال پر تبصرہ کیا ہے، مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کی ساری مادی تدبیریں آزمائی جا چکیں، سب ناکام رہیں، اور آج بھی اُن کی فلاح و ترقی انہی اعمال کے ذریعہ ہو سکتی ہے، جن سے تیرہ صدی پہلے ہو چکی ہے، آج جب کہ ہندوستان کے مسلمان بڑے نازک دور سے گذر رہے ہیں، اُن کی صحیح رہنمائی کے لئے اس قسم کی کتابوں کی بڑی ضرورت ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اُن کا مطالعہ کرنا چاہئے،

ہم اور تم، از محترمہ آمنہ نازلی صاحبہ تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ/، پتہ:- دفتر رسالہ عصمت کراچی، نمبر ۳،

لائق مصنفہ رسالہ عصمت کی مشہور اور مشاق مضمون نگار ہیں، اُن کی متعدد ادبی تصانیف، اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ہم اور تم ہو مختصر افسانوں کا نیا مجموعہ ہے، انکے دوسرے افسانوں کی طرح ان افسانوں میں بھی، انسانی فطرت کے مختلف رخوں اور ہندوستانی معاشرت اور گھریلو زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نہایت عجیب و دلکش تصویریں ہیں، جن سے لطف و تفریح کے ساتھ سبق بھی حاصل ہوتا ہے، ظرافت کی لطیف آمیزش اور زبان کی نفاست و پاکیزگی نے افسانوں کے لطف کو اور دوبالا کر دیا ہے،

قواعد الولدان فی تیسیر القرآن | از مولوی حکیم محمد احمد صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۳۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۶ر

پتہ:- مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڈھ

مصنف مدرسۃ الاصلاح میں مدرس رہ چکے ہیں، اُن کو تعلیم کا عملی تجربہ ہے، اس تجربہ کی روشنی میں انھوں نے بچوں کی قرآن مجید کی تعلیم میں سہولت کے لئے بغدادی قاعدہ کے طرز پر یہ نیا قاعدہ لکھا ہے، جو اس مقصد کے لئے مفید ہے،

"م"

تابعین

مرتبہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم وعمل اور مذہب واخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی نسل نو کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہری، امام ربیعۃ الرائی، امام مکحول شامی، قاضی شریحؒ، وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے۔

ضخامت:- ۵۰۰ صفحے۔

قیمت:- [illegible] روپے۔

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: چھ روپے سالانہ

مطبع دار المصنفین اعظم گڑھ

دار المصنفین کی نئی کتاب

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سندھ میں اترا تھا، اور ان کی پہلی حکومت یہیں قائم ہوئی تھی، اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہاں حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے ان کے آثار نمایاں ہیں، لیکن اس کے باوجود اردو میں اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ موجود نہیں تھی، دار المصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ میں یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس میں سندھ کا جغرافیہ مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا، ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت میں شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہاں ایک نئی حکومت کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے،

قیمت:- پانچ روپیے،

منیجر

جلد ۶۲ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۴۸ء عدد ۵

مضامین

مقالات

ایک غلط راہ

ہندوستان میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد اور خصوصاً مشرقی پنجاب اور دہلی کے غیر متوقع واقعات سے مسلمانوں پر ایک حیرت سی چھاگئی ہے، ان کو اپنے نئے ہندوستان کی اس نئی دنیا میں عزت کی کوئی راہ نظر نہیں آتی، بہتیرے دماغ تو سوچنے اور سمجھنے سے معذور ہو گئے ہیں، اور وہ نہیں جانتے، کہ نئے احوال سے وہ اپنے کو کیسے مطابق کریں، بعضوں نے اب سوچنا شروع کیا، تو ان کو یہ بات نظر آتا ہے کہ وہ محکوم ہیں، اور ہندو ان کے حاکم ہو گئے ہیں، اس لئے مسلمانوں کے لئے عزت کی زندگی کا راستہ یہ ہے کہ محکوم قوم حاکم قوم کیساتھ محکومانہ وفاداری کا تعلق پیدا کرے اور اس کے علوم و فنون اور زبان کو اپنائے اور اس کے طور و طریق اور تمدن و تہذیب کو اختیار کرنے، چنانچہ اس وقت جتنے اخبارات نئے پیغاموں کے ساتھ نکلنے لگے ہیں، وہ کبھی صراحۃً اور کبھی اشارۃً اس قسم کے خیالات پھیلا رہے ہیں، افسوس کہ یہ مقصد سرتاسر غلط ہے، اور یہ غلط رہنما مسلمانوں کی خودکشی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں،

صحیح صورت یہ ہے کہ کانگریس کا اعلان اور حکومت وقت کا منظور کردہ دستور اساسی ظاہر کرتا ہے کہ ملک ہندوستان اس ملک کے سارے باشندوں کی متحدہ جمہوری حکومت ہے جس میں اس ملک کی ہر قوم برابر کی شریک و سہیم ہے، البتہ نمایندگی اور تقسیم ملازمت میں قوموں اور فرقوں کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ہوگی اور لازماً اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس قوم کی تعداد بڑی ہوگی، اس کو اکثریت کی قوت حاصل ہوگی، مگر اس کا نتیجہ اقلیت والے گروہ کی محکومی نہیں، بلکہ ہندوستان کے ہر فرقہ اور گروہ اور اہل مذہب کو اپنے دین، زبان، تمدن، تہذیب اور طریق معاشرت

کی پوری آزادی کا احساس یا حق حاصل ہے، اور اُس وقت تک کوئی قوم ہے صحیح معنی میں زندگی نہیں، جب تک وہ اپنی
قومیت کے عناصر کی پوری طرح حفاظت نہ کرے، اور اس کے لئے پوری جد وجہد نہ کرے، اور اس راہ میں جانی و
مالی خدمت و ایثار کے جذبات سے اپنی خود مختاری کا ثبوت نہ دے،

جب جناح و گاندھی کی بمبئی والی گفتگو میں یک قومی اور دو قومی نظریہ پیدا ہوا ہے بار بار یہ سوال سامنے
آتا ہے کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں یا دو قوم، دونوں طرف دو گروہ ہیں اور ہر قسم کی معیبت کا سبب اپنی
نظریوں کو بتایا جا رہا ہے، مگر غلطیاں دونوں طرف ہیں،

ایک یا دو قوم کے نظریہ کو زبان پر لانے سے پہلے اس کا فیصلہ کیجئے، کہ قوم سے آپ کا مقصود کیا ہے، اگر یہ ہے
کہ ایک ملک کے سارے رہنے والے ایک قوم ہیں تو بلاشبہ اس ملک کے رہنے والے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور اگر اس سے مقصود اُن
عناصر کی وحدت ہے جن پر ان دونوں قوموں کے مذہبی اصول، خیالات، جذبات، رجحانات کی بنیاد ہے تو ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو
ہی قومیں نہیں، بلکہ بیسیوں قومیں ہیں جس طرح ہندو مذہب ایک مذہب نہیں، بلکہ بیسیوں مذہبی تصورات اور
رسوم کا مجموعہ ہے اور ہر ایک دوسرے سے الگ ہے پھر بھی وہ ایک مذہب ہے اور ان کو ایک قوم سمجھا جاتا ہے اسی طرح
ہندو اور مسلمان اپنے مذہبی عقائد و عبادات اور تمدنی و تہذیبی عناصر میں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں، پھر بھی
وطنی حیثیت سے ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم ہیں،

ہندو مہاسبھائی اور بعض کانگریس کے بھیس میں ہندو مہاسبھائی جو یہ خیال کرتے ہیں، کہ ہندوستان کی
ترقی کے لئے ضروری ہے کہ تمام ہندوستانی قوموں کے امتیازی عناصر و اوصاف
کو مٹا کر ایک واحد ہندوستانی قوم بنائیں، وہ بڑی بھول میں ہیں، ہندوستان
کی پچھلی تاریخ گواہ ہے، کہ جب جب ہندو قوم کی اس تنگ خیالی نے ظہور کیا ہے، ملک غلامی میں مبتلا ہوگیا
ہے، میں نے بمبئی کی تقریر میں پی ان اے سلمے کے جشن جوبلی میں یہ کہا تھا، کہ ہندوستان سینکڑوں قوموں کے رنگ
برنگ کے موتیوں کی مالا ہے جو لوگ ان کو زبردستی ایک بنانا چاہتے ہیں، وہ ان رنگ برنگ کے بیش قیمت موتیوں

گوگورنمنٹ کو ایک سفوف بنانا چاہتے ہیں، یہ سفوف تو تیار ہو سکتا ہے، مگر پھر ان میں سے کسی بڑے یا چھوٹے موتی کی اپنی اصلی قدر و قیمت باقی نہیں رہ سکتی

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا، کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے یا بیگانے جو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی ممتاز ہستی کو چھوڑ کر اکثریت میں مدغم ہو جائیں، وہ مسلمانوں کو خودکشی کی دعوت دے رہے ہیں، میرے نزدیک ملک کی پوری وفاداری اور اکثریت کیساتھ مصالحانہ حسن تعلق رکھنے کے باوجود مسلمان مسلمان رہ سکتے ہیں اور مسلمانوں کو مسلمان رہنے کی دعوت دیجا سکتی ہے، اور ان کی امتیازی حیثیت کو باقی رکھا جا سکتا ہے، اور اُن کے دین، تہذیب، زبان اور علوم کو جو ان کی اپنی قومیت کے عناصر ہیں، نہ صرف باقی رکھا جا سکتا ہے، بلکہ اُن کے باقی رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے، اور مسلمان قوم ہندوؤں کے ساتھ وطنی وحدت قائم رکھنے کے باوجود اپنی مذہبی و تہذیبی ہستی کو برقرار رکھ سکتی ہے، ان کو اس ملک میں زندہ رہنے کے لئے یہ تعلیم کیوں دی جائے، کہ اب ہندوستان کی وحدت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام امتیازی اوصاف و خصائص کو خود چھوڑ دیں، یا اُن سے زبردستی چھڑا دیا جائے، جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں وہ مسلمانوں کو غلط راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں، اور پوری قوم کی قوم کو ہلاک و برباد کرنا چاہتے ہیں،

بیشک ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو صداقت کے نہیں، بلکہ قوت کے پرستار ہیں، جو کل انگریزوں کی طاقت کے عہد میں انگریز کی غلامی کو اپنا فخر سمجھتے تھے، آج وہ ہندو اکثریت کی طاقت کے عہد میں ہندو کی غلامی کو اپنا فخر سمجھیں گے، مگر ایسے بہروپیے کبھی بھی اعتبار کے قابل نہیں،

مسلمانو! اٹھو اور تم اپنے کو ہندوستان کی سلطنت کا حصہ دار سمجھو، اور ملک کی وفاداری اور اہل ملک سے دوستی کے ساتھ اپنے مذہبی و تہذیبی امتیازات کے قیام و تحفظ و بقا کے لئے مردانہ وار جد و جہد کرو اور اسی کو اپنی زندگی کا راز سمجھو، ع

درکفے جام شریعت درکفے سندانِ عشق

مقالات

تصوّف و سلوک کی تجدیدات

از

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

(۳)

نسبتِ باطن | جس کو اس کے دعویداروں نے ایسا چھپایا، کہ خود ان سے بھی چھپ گئی، اس کی حقیقت و علامت بھی سن لیجئے، کہ یہ ذکر و طاعت کے کمال کے سوا کچھ نہیں،

"نسبتِ باطن کے حصول کی علامت دو امر ہیں، ایک یہ کہ ذکر اور یادداشت کا ملکہ ایسا ہو جائے کہ کسی وقت غفلت و ذہول نہ ہو، اور اس میں زیادہ تکلف نہ کرنا پڑے، دوسرے یہ کہ اطاعت حق یعنی اتباع احکام شرعیہ کی عبادات و معاملات، اقوال و افعال اور اخلاق میں ایسی رغبت اور منہیات سے ایسی نفرت ہو جاوے جیسی کہ مرغوبات و مکروہات طبعیہ کی ہوتی ہے، اور دنیا کی حرص قلب سے نکل جائے، کان خلقہ القرآن، اس کی شان بن جائے، البتہ عارضی کسل یا وسوسہ جس کے مقتضی پر عمل نہ ہو اس رغبت و نفرت کے منافی نہیں"

لیکن خالی ملکۂ یادداشت بھی نسبت کا اصل جزو نہیں، یہ ملکہ تو معصیت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے، اصل چیز حق تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی رضا ہے، رضا بھی وہ معتبر ہے جو جانبین سے ہو، یعنی گو ہم بھی خدا سے

راضی نہ ہوں، بلکہ خدا بھی ہم سے راضی ہو، جس کا ذریعہ ظاہر ہے کہ اطاعت وفرمانبرداری ہی ہو سکتا ہے،

ارشاد ہے کہ

"آج کل لوگ ملکۂ یادداشت کو نسبت سمجھتے ہیں، جو صرف ذاکر کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے، اور جو معصیت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتی ہے، حالانکہ نسبتِ مطلوبہ نام ہے اس لگاؤ اور تعلق کا جو جانبین سے ہو، یعنی عبد کی طرف سے حق تعالیٰ کے ساتھ اطاعت و ذکر کا تعلق اور حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے ساتھ رضا کا تعلق یہ ہے نسبتِ مطلوبہ[1]"

کسی طالب کے استفسار پر نسبت کی حقیقت یہ تحریر فرمائی کہ

"نسبت کے لغوی معنی ہیں لگاؤ اور تعلق کے، اور اصطلاحی معنی ہیں بندہ کا حق تعالیٰ سے خاص قسم کا تعلق یعنی اطاعت اور ذکر غالب کا، اور حق تعالیٰ کا بندہ سے خاص قسم کا تعلق یعنی قبول و رضا جیسا کہ عاشق مطیع اور وفادار معشوق میں ہوتا ہے،...... جب نسبت کے یہ معنی معلوم ہو گئے، تو ظاہر ہو گیا کہ فاسق و کافر صاحبِ نسبت نہیں ہو سکتا، بعضے لوگ غلطی سے نسبت کے معنی خاص کیفیات کو سمجھتے ہیں، جو ریاضت و مجاہدہ کا ثمرہ ہوتی ہیں، مگر یہ اصطلاح جہلا کی ہوتی ہے[2]"

ایک بے معنی بات یہ مشہور ہو گئی ہے، کہ نسبت سلب کر لی جا سکتی ہے، اس کے متعلق ایک ملفوظ میں ہے کہ

"ایک کام کی بات یاد آئی، یہ جو مشہور ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں بزرگ کی نسبت سلب کر لی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب (گنگوہی) نے فرمایا کہ نسبت قربِ الٰہی کا نام ہے، اسکو کوئی سلب نہیں کر سکتا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو چیز حق تعالیٰ بندہ کو عطا فرمائیں، دوسرا کون ہے جو اس کو سلب کرے، حقیقت اس سلب کی صرف یہ ہو کہ کسی تصرف سے کسی کیفیت نفسانیہ

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۲۵۔ [2] اشرف السوانح حصہ دوم ص ۱۵۲

تو عمل کر دے جس سے نفساً اس کی جگہ عبادت ہو جاوے۔ مگر اس کا دو مقابلہ کر سکتا ہو لیکن اگر مقابلہ نہ کیا تو عمل میں خلل پڑنے سے اس کا اثر نسبت تک پہنچ سکتا ہے[1]

خالق کے ساتھ نسبت و تعلق درست کئے بغیر خدمت خلق درست نہیں

اسی نسبت کی بحث و تحقیق کے سلسلہ میں مسلمان صوفی بننے بنانے کے دستور العمل بنام قصد السبیل میں، ایک اور ایسی ہدایت فرمائی ہے، جس کو دنیوی قومیات و سیاسیات حاضرہ کے اکھاڑے والے عوام و خواص لیڈر و ایڈیٹر تو کیا معنی، خالص دینی مدارس و ادارات والے علماء دین تک قبول کرنا کیا سننا بھی مشکل سے گوارا فرمائیں گے۔ بالخلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ نسبت و تعلق کچھ پختہ و مستحکم نہ ہو جائے، اُس وقت تک قومی و سیاسی اکھاڑے میں کودنا تو الگ رہا، درس و تدریس، وعظ و ارشاد، تالیف و تصنیف کی دینی خدمات تک کی فارغ البال و مستند عالم تک کو بھی اجازت نہیں، فرمایا کہ

"منجملہ اس دستور العمل کے امر یہ بھی ہے، کہ جب تک ایسے شخص کو جس میں کلام ہو رہا ہے کسی قدر رسوخ و استحکام کے ساتھ نسبت باطنی نصیب نہ ہو جائے، جب تک نہ تو افادۂ ظاہری میں مشغول ہو نہ افادۂ باطنی پر اقدام کرے یعنی نہ طلبہ کو پڑھاوے، نہ عوام میں وعظ کہے، نہ مطب کرے، نہ تعویذ گنڈے کرنے لگے، بالکل زاویۂ خمول میں پڑا رہے، الا ان یضطر الی شیٔ من ذالک" .... البتہ بعد حصول نسبت کے درس و وعظ یا تصنیف و تالیف کا مضائقہ نہیں، بلکہ یہ خدمت علم دین افضل عبادات ہے، اور اگر شیخ تعلیم و تلقین و بیعت کی بھی اجازت دیدے تو بندگان خدا سے اس افادہ میں بھی دریغ نہ کرے، اور اگر وہ اجازت نہ دے تو ہرگز ایسی جرأت نہ کرے۔ (ص ۱۴)

باقی جن "قومیات و سیاسیات" کا نام آج کل خدمت خلق رکھا گیا ہے، ان میں پڑنے کا اندازہ

---

[1] الافاضات ۱۹ شعبان ۱۳۵۰ھ

تو اس سے فرمایئے کہ

"حضرت والا کے ایک صاحب اجازت کو لوگوں نے زبردستی میونسپلٹی کا ممبر تجویز کر دیا، انہیں بہت وحشت ہوئی، بالآخر یہ طے ہوا کہ اپنے پیر و مرشد سے پوچھ لو...... حضرت نے تجویز فرمایا کہ جب تک نسبت مع الخالق راسخ نہ ہو تعلق مع الخلق بلا ضرورت سراسر مضرت ہے، اور یہ غلطی سمجھی جاتی ہے کہ ادائے حق خلق ہے، وہ حق خلق بھی جب ہی ادا ہوتا ہے، کہ نسبت مع الخالق راسخ ہو جائے' ورنہ خالق کا حق ادا ہوتا ہے، نہ خلق کا، یہ تجربہ ہے اور ایک کا نہیں، بلکہ ہزاروں اہل بصیرت کا، ہم سے اور آپ سے زیادہ اہل تمکین نے ایسے تعلقات کو چھوڑ دیا ہے، حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی و حضرت شاہ شجاع کرمانی کے واقعات معلوم ہیں، اور حضرات خلفائے راشدین پر اپنے کو قیاس نہ کیا جائے ع

کار پاکان را قیاس از خود مگیر[1]

ان حضرات کی نسبت مع الخالق کے رسوخ کی گرد کو بھی کون پا سکتا ہے،

مگر ہمارے اس زمانہ میں خصوصاً دینی قومیات و سیاسیات والوں کی نقالی میں یہ فتنہ و ابتلا کچھ ایسا عام و عالمگیر ہو گیا ہے، کہ خود اپنی اور اہل و عیال کی صلاح و اصلاح سے پہلے ساری خلق و خدائی کی اصلاح و خدمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' دوسروں کا تو ذکر ہی کیا، خود حضرت علیہ الرحمہ کے بعض صاحب علم اچھے اچھے مجازین و معتقدین تک کو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس ہدایت کی صحت ہی میں کلام ہے، یا سرے سے اس کو ناقابل عمل تصور فرمایا جاتا ہے، کہ کئی کئی دینی و علمی ادارات سے راعی و رعایا کی مسئولیت کا تعلق ہے اور ان کے علاوہ بھی بہت سی ایسی رائج الوقت خدمات خلق کا بوجھ اپنے دوش پر قبول فرما رکھا ہے، کہ جن کے حقوق کا پورا کرنا کیسا ان کے معاملات سے ضروری آگاہی کی بھی فرصت نہیں،

---

[1] اشرف السوانح حصہ دوم ص ۱۲۰

اس قسم کے تلخ تجربوں کی تلخ نوائی محض یہ واضح کرنے کے لئے ہو کر ہمارے جماعتی کاموں میں جو ہر جگہ فساد ہی فساد نظر آتا ہے، اس کا سبب سب سے بڑا یہی ہے، کہ خلق کا یہ حق جب ہی ادا ہو سکتا ہے، جب خالق کے ساتھ نسبت و تعلق کچھ درست و راسخ ہو، اور عند اللہ مسئولیت کا خوف و خیال دل پر غالب ہو، ان عہدوں اور ذمہ داریوں کو آج کل کی طرح زیادہ تر جاہی و مالی منافع کے لئے نہ قبول کیا جائے،

مجاہدہ | ذکر اس کا تھا کہ اشغال و مراقبات وغیرہ تصوف کے مقاصد نہیں تدابیر ہیں، یہی حال مجاہدات اور ترک تعلقات کا بھی ہے، کہ وہ مقصود، مامور اعمال و طاعات یا قرب و رضا کی راہ کی جد و جہد کی تدابیر کا نام ہیں، خود مقصود نہیں، مجاہدہ کی حقیقت نفس کی مخالفت کی مشق و عادت ہے، کہ حق کی رضا و طاعت کے مقابلہ میں نفس کی جانی و مالی اور جاہی خواہشات و مرغوبات کو مغلوب رکھا جا سکے، جس کی قرآن نے جامع تعبیر جہاد بالنفس والاموال" سے فرمائی ہے، اور اسی مجاہدہ پر ہدایت کا قطعی وعدہ ہے، الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا، اور حضرت جامع المجددین کے جامع الفاظ میں اس مجاہدہ کی تجدید و تحقیق یہ ہے کہ

"نفس کے مطالبات دو قسم کے ہیں، حقوق اور حظوظ، حقوق وہ جن سے قوام بدن اور بقائے حیات ہے، اور حظوظ وہ جو اُن سے زائد ہوں، بس مجاہدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق کو باقی رکھے اور حظوظ کو فنا کرے،

اس میں جس طرح ایک طرف افراط کی بے اعتدالی یہ ہو کہ ساری زندگی حظ نفس کی نذر کر دی جاتی ہے، اسی طرح تفریط کی بے اعتدالی یہ ہے کہ بہتوں نے مجاہدہ کا مطلب جوگیوں اشراقیوں کی طرح یہ سمجھ رکھا ہے کہ حقوق نفس کو بھی فنا کر دیا جائے، بلکہ روحانی نجات نام اسی کا رکھ لیا ہے کہ اس مادی و جسمانی زندگی میں مادی و جسمانی حاجات سے نجات حاصل کر لی جائے،

"آج کل صوفی بھی اکثر اس میں مبتلا ہیں، کہ جس قدر نفس کی مخالفت ہو گی، اتنا زیادہ ترقی

ہو ن گے، اگرچہ وہ مخالفت نفس شریعت کے خلاف بھی ہو، چنانچہ بعضوں کو خبط ہو گیا ہے کہ انھو نے اوپر گوشت حرام کر لیتے ہیں، اسی طرح بعضے سرد پانی نہیں پیتے، بعضے چارپائی پر نہیں سوتے، اور بعضے جن کو دولتِ اسلام نصیب نہیں یہان تک بڑھ گئے، کہ اپنے اعضا تک سکھلا دیتے ہیں، میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ گرمی کے ایام میں چارون طرف سے آگ جلا رکھی ہے، اور بیچ میں خود بیٹھا ہے، یہ سب جہل کی باتیں ہیں،

لیکن اس سے ان لوگون پر شبہہ نہ کیا جائے، جنھون نے نفس کی اصلاح کے لئے بڑے بڑے مجاہدے کئے ہیں، اوّل تو وہ حضرات حدِ اباحت سے تجاوز نہ کرتے تھے، پھر وہ بھی بطور علاج کرتے تھے، عبادت و ذریعۂ قرب نہیں سمجھتے تھے، جیسے کوئی شخص کسی مرض کی وجہ سے چند کھانے برا سے چندے چھوڑ دے، کہ وہ اس کو عبادت نہیں سمجھتا، بلکہ ذریعۂ حصول صحت سمجھتا ہے، اگر کوئی اوس کو ثواب سمجھ کر کرے، تو وہ یقیناً گنہگار ہو گا، کہ اس نے قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا، اور بدعت کے قبح کا یہی راز ہے، لیکن ان حضرات نے صرف بطور علاج کے ترک کیا، بخلاف جہلا کے کہ اس کو دین و عبادت اور ذریعہ قرب سمجھ کر کرتے ہیں،

بہرحال نفس کو راحت پہنچانا اور اس کے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے، اس لئے شریعت مطہرہ نے ہر چیز کی حد مقرر کر دی ہے، حضرت ابو درداؓ صحابی رات کو بہت جاگتے تھے، حضرت سلمانؓ نے ان کو روکا، آخر مقدمہ جناب نبوی میں گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان سچ کہتے ہیں، اور یہ ارشاد فرمایا، انّ لنفسك عليك حقًّا الخ،

(الرفیق فی سواء الطریق ص ۲۳ و ۲۴)

" افسوس تصوف کا ناس کر دیا ان جاہل صوفیون نے اور فقیری کو ہا و بنا رکھا ہے؛ کہتے ہیں، بچے کھینچو، بیوی کو طلاق دیدو، اولاد کو عاق کر دو، دروازہ کو تیغا کر دو چالیس چلے

دکھلاؤ، اور ایک چپاتی وغیرہ کی ڈبہ روٹی اس کے اصل فقیری تو یہ ہے، یہ مانگتا ہوں و الشہ دو شالہ میں
یہ مگر سے تکیوں میں، سلطنت میں، عرض غذاؤں میں فقیری ملتی ہے، مگر گھر میں نہیں شیخ کامل کی
خدمت میں (اشرف السوانح حصہ دوم ص ۱۱۳)

اور فرمایا کہ درویش کے لئے کمبل اور گدڑی کی ضرورت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ دے تو دو شالہ اور شاہی
میں بھی درویشی حاصل ہو سکتی ہے، بشرطیکہ طریقہ سے حاصل کیا جائے،

واقعی کسی حقیقت شناس نے خوب ہی کہا ہے کہ حضرت کا سلوک تو شاہی سلوک ہے، نہ ریاضات
کراتے ہیں نہ مجاہدات، نہ ترک تعلقات کراتے ہیں، نہ ترک لذات و مباحات بلکہ فرماتے ہیں خوب راحت
آرام سے رہو تا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا ہو، اور طبیعت میں نشاط رہے، جو معین عبادت ہو البتہ معصیت
کے پاس نہ پھٹکو، اور نفس کی ہر وقت نگرانی رکھو، نہ کم کھانے کی ضرورت، نہ کم سونے کی، یہ دونوں مجاہدے آجکل
متروک ہیں، کیونکہ طبائع میں پہلے ہی سے ضعف غالب ہے، البتہ کم بولنا اور کم ملنا جلنا ضروری ہے لیکن وہ
اتنا کہ جس سے قلب میں انقباض پیدا ہو جائے، یہی نہیں، بلکہ یہ شاہی سلوک سڑک بھی ہے، جس پر ہر خاص
و عام بے کھٹکے چل سکتا ہو، کیا عالم کیا امی، کیا فارغ کیا مشغول، کیا تندرست کیا بیمار، کیا قوی کیا ضعیف، کیا
امیر کیا غریب، اور یہی اصل معنی ہیں دین کے یسر کے، اس لئے کہ اس میں انفرادی وسعت و استطاعت سے
ایک ذرہ زائد کی تکلیف نہیں، نہ ملکی آزادی پر مضر نہ حکومت الٰہیہ پر،

بلا ضرورت مشقت مجاہدہ نہیں | غرض مجاہدہ کے معنی نفس کو اس کے حقوق تک سے محروم کرکے خواہ مخواہ مصیبت
میں ڈالنے کے بالکل نہیں، بلکہ جہاں تک ہو سکے بلا ضرورت نفس کو مشقت میں ڈالنے کے بجائے سہولت و راحت
کا راستہ اختیار کرنا چاہئے، فرمایا

بطریق ہمہ مقصود حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک مشکل، ایک سہل، تو سہل کو کیوں نہ

سلہ سوانح حصہ ۲ ص ۲۲۲

اختیار کیا جاتا ہے، ایک صاحب نے عرض کیا، کہ کچھ مجاہدہ بھی مقصود ہے، فرمایا مجاہدہ مقصود تو تھوڑا ہی ہے، کہ مشقت یا سختی میں پڑو، ایک کنواں یہاں مدرسہ میں ہے، ایک جلال آباد میں جو دو ڈھائی میل ہے، تو کیا آپ اس کو افضل سمجھیں گے، کہ مثلاً وضو کے لئے پانی وہاں سے لایا کریں، مجاہدات و ریاضات مقصود بالذات تھوڑا ہی ہیں، ہاں مقصود کے معین ہیں، اصل چیز تو مقصود تک پہنچ جانا ہے۔[۵]

جس کے لئے ترک لذات بھی ضروری نہیں صرف تقلیل لذات کافی ہے،

زہد کی حقیقت | "ایک اہل علم نے سوال کیا کہ زہد کی بڑی فضیلت ہے فرمایا زہد ترک لذات کا نام نہیں محض تقلیل لذات کافی ہے، یعنی لذات میں انہماک نہ ہو، کہ رات دن اسی فکر میں رہے، کہ یہ چیز پکنی چاہئے، وہ چیز منگانی چاہئے، کہیں کے چاول اچھے ہیں تو وہاں سے چاول آرہے ہیں کہیں کی بالائی مشہور ہے تو کہہ رہے ہیں کہ بھائی وہاں سے بالائی لیتے آنا، نفیس نفیس کھانوں، اور کپڑوں ہی کی فکر میں لگے رہنا، یہ البتہ زہد کے منافی ہے، ورنہ اگر بلا تکلف اور بلا اہتمام خاص کے لذات میسر آجائیں، تو یہ حق تعالیٰ کی نعمت ہے شکر کرنا چاہئے،

خاص مشہور مجاہدات اربعہ یہ ہیں، قلت طعام، قلت منام، قلت کلام، قلت اختلاط مع الانام، ان میں بھی اول تو مقصود تقلیل ہی ہے، وہ بھی بشرط ضرورت اور بقدر ضرورت، ورنہ

"بہت کم کھانا بھی زہد نہیں، نہ یہ مقصود ہے، کیونکہ ہمارے کم کھانے سے نعوذ باللہ کوئی خدا تعالیٰ کے خزانہ میں توفیر تھوڑا ہی ہوجائے گی،...... ہاں اتنا بھی نہ کھائے کہ پیٹ میں درد ہوجائے، ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا مذاق تو یہ تھا، کہ نفس کو خوب آرام سے رکھے لیکن اس سے کام بھی خوب لے، میرا تو خیال ہے کہ مزدور خوش دل کند کار بیش، جیسے روح طعام

[۵] الافاضات الیومیہ کم رمضان ۱۳۵۰ھ،

ہوتا ہے کہ کوئی اچھی چیز کی ہے، اس دن کام کرتے وقت یہ خوشی رہتی ہے کہ کام ختم ہو کر اچھی چیز کھانے کو ملے گی، نفس کے واسطے کوئی ابھارنے والی چیز ضرور ہونی چاہئے، حضرت حاجی صاحب نے ایک روز فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی ہمیشہ ٹھنڈا پینا چاہئے، کہ ہر بُن مو سے الحمد للہ نکلے، ورنہ گرم پانی پی کر زبان تو الحمد للہ کہے گی، دل شریک نہ ہو گا[1]

تقلیل سے بھی مراد حضرت کے ہاں شیخ کامل کی تعلیم کے موافق ان چار چیزوں میں محض توسعا و اعتدال ہے کہ "نہ اس قدر کثرت کرے جس سے غفلت و قساوت و کاہلی پیدا ہو، نہ اس قدر قلت جس سے صحت و قوت زائل ہو جائے[2] بڑی دولت اس طریق میں قلب کو جمعیت و یکسوئی ہے، اس لئے قلب کو تشویش و پریشانی سے بچانا بہت ضروری ہے، جس کا ایک بڑا سبب خود اپنی بے عنوانیوں سے صحت کو خراب کر لینا بھی ہے"

"اس لئے صحت کی بہت حفاظت کرے، دماغ اور قلب کی تفریح و تقویت ہمیشہ غذا و دوا کرتا رہے، غذا میں نہ اتنی کمی کرے، کہ ضعف و یبوست ہو جائے، نہ اس قدر افراط کہ ہضم میں فتور ہو جائے،...... جب تک صادق رغبت نہ ہو کھانا نہ کھائے، اور ایک آدھ لقمہ کی اشتہاء باقی رہنے پر چھوڑ دے،...... اسی طرح سونے میں اعتدال رکھے، نہ بہت زیادہ سوئے کہ کسل ہو، نہ بہت کمی کرے کہ یبوست ہو جائے"

اور خلط مع الانام میں، جس طرح لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا اور دوستی بڑھانا مضر ہے، اسی طرح خواہ مخواہ دشمنی خریدنا بھی بُرا ہے کہ

"دوست تو اس پر ہجوم کر کے اس کے وقت کو مشوش کریں گے، اور دشمن ایذا میں پہنچا کر پریشانی میں ڈالیں گے...... البتہ اگر کوئی تشویش بلا اس کے اکتساب و ارتکاب کے پیش آ جائے مثلاً کسی نے کسی شرعی ضرورت سے کام کیا، اس میں تشویش پیش آ گئی، مثلاً سو خود حصہ لینے

---

[1] شرف السوانح ص ۱۰۱ [2] تعلیم الدین ص ۱۶۲

سے انکار کیا، اور وہ دشمن ہو گیا، تو یہ مضر نہیں، نہ اس میں مضطر ہو، حق تعالیٰ پر نظر و توکل رکھے

وہ مدد فرمائیں گے، اور اگر کچھ تکلیف ہی پہنچے، تو حکمتِ الٰہیہ سمجھ کر راضی رہے، وہ اس کے لئے

زیادہ موجبِ قرب ہے، (تعلیم الدین ص ۱۹)

اسی سلسلہ میں ایک بات اور بھی یاد رکھنے کی ہے کہ

مال کی حرص اور اس کے جمع کرنے کی فکر میں یا موجودہ ذخیرہ کو اسراف کرکے اڑا دان،

دونوں کا انجام تشویش قلب ہے، حریص تو ہر وقت اسی دھن میں لگا رہے گا، اور مسرف

ذخیرہ ختم ہونے کے بعد آخر پریشانی میں مبتلا ہوگا، یا پرائے مال پر نگاہ ڈالے گا،

(تعلیم الدین صفحہ ۱۸)

غیر اختیاری مجاہدہ | مجاہدہ کے باب میں ایک بڑے فائدہ کی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ مجاہدہ صرف اس مخالفت

نفس کا نام نہیں، جو قصد و اختیار سے یا صوفیانہ مروج طریقوں سے کیا جائے، بلکہ دنیا میں بلا ہمارے قصد

اختیار کے ہمارے نفس کے خلاف جو دن رات واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اور ان سے ہم کو جو رنج و غم

واضطراب طبعًا لاحق ہوتا رہتا ہے، وہ سب سے بڑا مجاہدہ ہے،

"سالکانِ طریق نے حزن و غم کو اعلیٰ درجہ کا مجاہدہ قرار دیا ہے، کہ اس سے نفس کو پستی و

شکستگی حاصل ہوتی ہے، جو کہ آثارِ عبدیت سے ہے ؎

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

" ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، صاحب الحزن یقطع من طریق اللہ تعالیٰ

مالا یقطع من فقد حزنہ سنینًا یعنی حزن و غم والا اللہ تعالیٰ کی وہ راہ طے کر جاتا ہے جو

اس سے محروم سالہا سال میں نہیں طے کر پاتا،[1]

---

[1] قصد السبیل ص ۱۸،

مجاہدہ سے استیصال رذائل نہیں ہوتا | اسی طرح مجاہدہ و ریاضت کے متعلق یہ بھی خوب سمجھ لینے کی بات ہے کہ اس سے یہ امید رکھنا چاہئے، کہ نفس کی مخالفت کرکے رذائل نفس کی جڑ ہی کٹ جائے گی، یا اُن کا بالکلیہ ازالہ ہوجائیگا، محض اُن کا رُخ بدل جاتا ہے،

"ریاضت سے اخلاقِ ذمیمہ کے اصول کا ازالہ نہیں ہوتا، بلکہ ان کی تہذیب ہوجاتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ان اصول کے آثار کا ازالہ ہوجاتا، یعنی ان اخلاق کا مصرف بدل جاتا ہے مثلاً کسی میں بخل و غضب موجود ہے تو ریاضت سے اس کی جڑ نہیں جاتی کہ سرے سے غضب اور بخل ہی نہ رہے، بلکہ تہذیب اس طرح ہوجاتی ہے کہ پہلے مواقع خیر میں بخل، اور نیک لوگوں پر غصہ کرتا تھا، اب نامشروع جگہ بخل کرے گا، اور مبغوضانِ الٰہی اور اپنے نفس پر غصہ کرے گا، اس طرح جو بُعد کے اسباب تھے، وہ قرب کا سبب بن گئے، اور اس سے اس اختلاف کا بھی فیصلہ ہوگیا کہ ریاضت سے تبدیلِ اخلاق ہوسکتی ہے یا نہیں، معلوم ہوگیا کہ تبدیلِ اصول تو نہیں ہوسکتی، جیسا کہ حدیث میں ہے، اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوا واذا سمعتم برجل زال عن جبلتہ فلا تصدقوا (اختصار)۔ البتہ تبدیل آثار و مصارف ہوسکتی ہے، اس لئے مجاہدہ و ریاضت کا حکم ہے"؛

نفس میلان و خواہش کے ازالہ کی خواہش ایسی ہی ہے، جیسے کوئی اکلِ حرام سے بچنے کے لئے یہ خواہش کرے، کہ اس کو سرے سے بھوک ہی نہ لگا کرے،

"کسی نے خواہشِ نفسانی سے نجات پانے کا علاج پوچھا، تحریر فرمایا کہ کل کو حرام غذا سے توبہ کرکے یہ دعا کرنا کہ بھوک ہی سے نجات ہوجائے" (سوانح دوم ص ۱۳۱)

ایک ضروری تنبیہ | یہ فرمائی گئی ہے کہ مجاہدہ و ریاضت کے اس حکم کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے پابند ہیں، بغیر اس کے کبھی کچھ عطا نہیں فرماتے، بلکہ یہ قید پابندی صرف بندہ کے لئے ہے،

"بیشک ریاضت و مجاہدہ کی بدولت روحانی حیات حاصل ہوتی ہے اور اس کی قید بندہ

کے لئے ہے جس کی اس کی کوشش کرنا چاہئے، لیکن حق تعالیٰ اس کے مقید نہیں، وہ تو محض اپنے
کبھی ایسا بھی کر دیتے ہیں، کہ بدون مجاہدہ و ریاضت کے محض اپنے فضل سے دولت باطنی و
حیات روحانی عطا فرما دیتے ہیں، وہ بے چون و چگون ہیں، اُن کے کاموں کی کیفیت و طریقہ
کون متعین کرسکتا ہے، کہ اسی طرح ہوتا ہے،

"اس مقام پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے، کہ کبھی پہلے ریاضت ہوتی ہے، پھر وصول الی اللہ میسر ہوتا ہے،
اس کو طریق سلوک کہتے ہیں، اور کبھی وصول الی اللہ پہلے ہو جاتا ہے، پھر عبادت و ریاضت کا شوق
ہو جاتا ہے، اس کو طریق جذب کہتے ہیں، کہ اول کسی کامل کی صحبت یا کسی بزرگ کی حکایت سننے سے
یا بلا کسی ظاہری وجہ کے قلب میں ایک قسم کی کشش و کیفیت حق تعالیٰ کے ساتھ پیدا ہو گئی، پھر بتدریج
سلوک کی تکمیل کرتا رہا"

تفصیلی سلوک و ریاضت | کا مطلب یہ ہے کہ توبہ، صبر و شکر، خوف و رجا، زہد و توکل، توحید، محبت و شوق، اخلاص
و صدق وغیرہ کے مقامات کو ایک ایک کر کے مختلف ریاضات، مجاہدات سے حاصل کیا جائے اور شہوت و
غضب، حقد، حسد، بخل و حرص، عجب و ریا، کبر و غرور، حب دنیا، حب جاہ، آفاتِ لسانی وغیرہ مختلف رذائل
کو مختلف مجاہدات و معالجات سے دور کیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ کتنا دور دراز اور وقت طلب راستہ ہے،
خصوصاً اس کم ہمتی و کم فرصتی کے زمانہ میں تو حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی یہ بڑی ہی اہم تجدید ہے، کہ
"اس تفصیلی علاج میں ہر وقت تین سوہان روح تیار ہیں، ماضی کی حسرت، حال کے شبہات
مستقبل کا خوف، جب محققین مجددین و مجتہدین (رضی اللہ عنہم اکملہم مرشدی رحمۃ اللہ علیہ)
نے دیکھا، بلکہ حق تعالیٰ نے انہیں ان کو دکھلایا، کہ اس طریق سے بعض اوقات ع

تا تو بمن می رسی من بخدا می رسم

کا معاملہ ہو جاتا ہے، پھر اہل زمانہ کی توتیں ضعیف، ہمتیں قاصر، تو ان حضرات نے نظر کر کے ایک

دوسری ترتیب یہ ارشاد فرمایا کہ ماضی و مستقبل سب ہی حق تعالیٰ نے اپنے
مشاہدہ کے لئے پیدا کیا ہے، نہ کہ ماضی و مستقبل کے مطالعہ کے لئے ولنعم ما قال الرومی
ماضی و مستقبلت پردۂ خدا، البتہ توبہ کی غرض سے ماضی پر اور عزم کی ضرورت سے مستقبل پر نظر ضروری تھی
لیکن ضروری ہے کہ بقدر ضرورت آنا کافی ہے، اگر گذشتہ گناہوں سے موافق شرائط توبہ
توبہ کرکے پھر بار بار دل میں ان کا سبق نہ دہراتا رہے، اور مستقبل کے لئے اللہ پر بھروسہ کرکے
اس کا قصد کرے کہ انشاء اللہ پھر یہ گناہ نہ کروں گا، اس کے بعد ہر وقت اس قصہ
میں نہ لگا رہے،

اس سے زیادہ دوسرا کام ہے جس کو حدیث میں ان لفظوں میں تعبیر فرمایا گیا ہے،
احفظ اللہ تجدہ تجاھک (اللہ کا دھیان رکھو اس کو اپنے سامنے پاؤ گے) بس اس کام
میں لگ جانا چاہئے، یعنی ذکر و فکر اور عمل کے وقت عمل میں کرنا بھی ذکر میں داخل ہے، خلاصہ
یہ کہ قرب کو مقصود سمجھے اور جو طریق اس کے لئے مقرر ہے یعنی عقائد کی تصحیح کے بعد اعمال اختیاریہ
کہ جس وقت کا جو عمل ہو، خواہ ظاہری مثل صلوٰۃ و زکوٰۃ، خواہ باطنی جیسے خوف و رجا، شکر
و صبر وغیرہ بس اسی میں مشغول رہے، اور بعد کے اسباب ہیں یعنی ظاہری و باطنی معصیت ان سے
مجتنب رہے، لہٰذا اس کی ضرورت ہے کہ اسباب قرب میں ملکہ پیدا کرنے کی فکر کرے، نہ اس کی
حاجت کہ اسباب بعد کے نفس ہی کو منقطع کرے،

پس امور اختیاریہ میں جس میں کوتاہی ہو جائے، اس کو مضر و مہتم بالشان سمجھے، اور اس
کی اصلاح کرے، اور امور غیر اختیاریہ کے وجود و عدم پر التفات بھی نہ کرے، اور اصلاح
میں بھی زیادہ کاوش نہ کرے، مثلاً اگر کسی ضروری عمل میں خلل ہو گیا، اس کی قضا یا تلافی
کرے، اگر کوئی امر خلاف شریعت ہو گیا، اس سے استغفار کرے، اور پھر اپنے کام میں لگ جائے

اس ایک بات کے پیچھے پڑ جائے، کہ اچھا یہ کام مجھ سے کیوں نہیں ہوا، یا یہ کام کیوں نہیں ہوا، یہ غلو و مبالغہ ہے جس سے کتاب و سنت میں منع فرمایا ہے، لا تغلوا فی دینکم من شاق شاق اللہ علیہ، سددوا وقاربوا واستقیموا، حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں

ع سخت میگیرد جہان بر مردمانِ سخت گیر

اور اسی غلو و مبالغہ کا اثر خصوصاً اس وقت کے قُویٰ اور مزاجوں پر یہ ہوتا ہے، کہ بہت جلد مایوسی اپنا رنگ لاتی، اور سالک کو معطل کر دیتی ہے، اور کبھی جان پر کبھی ایمان پر اس کا اثر پہنچتا ہے، جان پر تو یہ کہ صحت خراب ہو جاتی ہے، اور ایمان پر یہ کہ باوجود عمل و علاج میں اتنی شدید کوشش کے جب وہ کامیابی نہیں میسر ہوتی جس کو ہم نے کامیابی فرض کر لیا ہے یعنی شفائے مطلق یا اس میں تاخیر ہوتی ہے تو حق تعالیٰ سے تنگی و شکایت پیدا ہو کر کراہیت و ناراضی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کہ ہم کو اتنے دن مجاہدہ میں سر مارتے ہو گئے، مگر والذین جاھدوا کے وعدے خدا جانے کہاں گئے،

"ایک اور مرض لگ جاتا ہے کہ اپنے عمل کو بالغ، اور اپنی سعی کو بالغ سمجھ کر ہر وقت ثمرات کا منتظر رہتا ہے پس اپنے عمل کا پلہ حق تعالیٰ کی عطا سے بڑھا ہوا سمجھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی اپنے کو کامیاب نہیں سمجھتا، اس لئے ناشکری میں مبتلا رہتا ہے، اور اگر بزعم خود کامیاب بھی ہو گیا، اور پھر وہ کامیابی زائل ہو گئی، کیونکہ ایسے انقلابات عمر بھر رہتے ہیں، تو پھر وہی تنگی و پریشانی شروع ہو جاتی ہے، اس طرح یہ سلسلہ عمر بھر منقطع نہیں ہوتا، اور خود اس کا نفس یا اس کو دیکھ کر دوسروں کا نفس کہتا ہے، کہ اس راہ خدا سے خدا کی پناہ جس میں بجز مصیبت کے راحت کا نام نہیں؛[1]

---

[1] اصول الوصول ص ۲۰، بحوالہ التکشف عن مہمات التصوف ... [illegible]

اس کی مفاسد و خطرات نفس کی بنا پر نہ دیتا کیونکہ سلف کا ادب یا ہیبت فرمائی گئی ہے کہ … غلو و مبالغہ
اعمال و ترقیات و تعلقات میں ہرگز ہرگز نہ پڑے حتی کہ

"اگر کوئی محمود وارد آوے، تو نہ اس کو کمال سمجھے، نہ اس کے بقا کی تمنا کرے، نہ اس کے فوت پر حسرت، اسی طرح اگر کوئی وسوسہ پیدا ہو، اس کے دفع میں بھی تن دہی نہ کرے، بس ذکر کی طرف وہ بھی سرسری طور پر متوجہ ہو جائے، کہ نہ دفع ہونے سہی یعنی ذکر قرب کے قصد سے کرے، نہ کہ وسوسہ دفع کرنے کے قصد سے، خلاصہ یہ کہ حق کی رضا کا طالب اور ناراضی سے ہارب رہے، یہ رضا و ناراضی منحصر ہے، اوامر کے عمل، اور نواہی کے اجتناب پر، عمل اگر فوت ہو، تو قضا کرے، اور نہی کا ارتکاب ہو تو استغفار کرے، نہ اپنے کو خواص میں سمجھے، کہ مایوسوں کی سی اپنی حالت سے گھبرائے، اور نہ دنیا میں ثمرات کا، اور نہ آخرت میں مراتب عالیہ کا طالب رہے، بس اس کی دعا کرتا رہے، کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اعمال کی توفیق اور آخرت میں جنت عطا فرمائیں، اور دوزخ سے نجات بخشیں، بس ہو گیا مسنون سلوک"

ایک شبہ اب اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر محض وسوسہ یا معصیت کا محض میلان مضر نہیں، ان پر عمل مضر ہے تو اس کے لئے مجاہدہ کی کیا ضرورت،

"جواب یہ ہے کہ واقعی اس کے لئے مجاہدہ فرض و واجب نہیں، صرف یہ نفع ہے کہ معصیت کے میلان کا مقابلہ کرنے میں زیادہ تعب و تکلیف نہیں ہوتی بآسانی سے آدمی نفس پر غالب آجاتا ہے، اور بغیر مجاہدہ دشواری ہے، بس یہ فائدہ ہے مجاہدہ میں، یہ نہیں کہ سرے سے میلان جاتا رہتا ہے، اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ گھوڑا شائستہ ہو کر بھی کبھی کبھی شرارت و شوخی کرتا ہے مگر وہ جلد سدھ جاتا ہے بخلاف غیر شائستہ کے کہ اس کے تدارک میں بہت مشکل لاحق ہوتی ہے"

تنبیہ: بالا سے ان مجاہدات، ریاضات کی حقیقت، مقصد اور ان کے فائدے خود بخود پوری طرح واضح ہو گئے، جن کو بہت سے مسلمان ناسمجھ صوفیہ نے بھی اشراقیوں اور جوگیوں کی طرح احسان کے بجائے اسلامی تصوف کا بھی اصلی مقصود بنا رکھا ہے۔

مجاہدہ کا اصل ثمرہ کیفیات نہیں

اب ذرا ان واردات و کیفیات، توجہ و تصرفات، کشف و کرامات، مواجید و لذات کی بھی حیثیت و حقیقت غور سے سن لیں جن کو ان مجاہدات و ریاضات کے اصلی ثمرات قرار دے لیا گیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح مجاہدات بذاتِ خود مقصود نہیں، اسی طرح ان کے یہ ثمرات بھی نہ مقصود بالذات ہیں، اور نہ ان کا مجاہدات پر مرتب ہونا لازم ہے، اور جس طرح مجاہدہ و ریاضت کی حیثیت تدبیر و علاج کی تھی، اسی طرح ان ثمرات کی حیثیت صحت کی ہے، کہ صحت سے بھی اصل مقصود مقاصدِ زندگی کی تکمیل یا نشاط و سہولت کے ساتھ تکمیل ہے، جیسے مرچ کہ وہ غذا نہیں، مگر غذا میں اس سے لذت پیدا ہو جاتی ہے،

"فرمایا آج کل لوگ کیفیات کے پیچھے پڑے ہیں، جو کہ غیر مقصود ہیں، گو یہ کیفیات غیر مقصود لذیذ ہوتی ہیں، جیسے مرچ کہ غذا میں غیر مقصود ہے، مگر لذیذ ہے، اور اب تو لوگ ان کیفیات ہی کو مقصود سمجھ کر گویا نری مرچوں کا ہی سالن کھاتے ہیں، بالکل ایسی مثال ہے کہ اگر روپیہ کا سکہ خوبصورت نہ ہو، پھر بھی چونکہ وہ روپیہ ہی ہے چلے گا، اور سیسہ یا رانگہ کا ٹکڑا گو بہت چمکدار اور خوبصورت ہو، مگر بازار میں نہ چلے گا، اسی طرح باقی آخرت میں کیفیات بالذات جو حقیقت کے اعتبار سے جیسے سیسہ یا رانگے کے ٹکڑے ہیں وہاں نہ چلیں گے۔"[1]

"واردات غیبیہ یا ذوق و شوق اصل ثمرہ نہیں، تربیت کا محض ایک ذریعہ ہے، وہ بھی بعض کے لئے قیمتی طور پر، اور دوسرا ذریعہ ترتیب کا یا مواہب کا صرف ہمت سے کام لینا ہے۔"[2]

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ اول ص ۳۰ [2] الاصول الوصول ص ۳۰۔

تصوف کی حقیقت دو جملوں میں | یہ واردات کیفیات دراصل انفعالات ہیں، اور طرق میں انفعال مقصود نہیں، انفعالات تھیں حضرت علیہ الرحمہ نے ایک مولوی صاحب کو انہی دو جملوں میں تصوف کی حقیقت بتلادی تھی، مگر انھوں نے قدر نہ کی، آخر مولوی صاحب تھے، جن لوگوں میں تاثر و انفعال زیادہ ہوتا ہے، قدرۃً ان میں کیفیات بھی زیادہ ہوتی ہیں، یہاں تک کہ بعضوں میں یہ تاثر و انفعال محویت و استغراق تک پہنچ جاتا ہے، اور لوگ

"استغراق کو بڑی چیز سمجھتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں، کہ جب تک ہم بے عقل و مدہوش نہ ہوئے تو کمال ہی کیا ہے، صاحبو! اللہ تعالیٰ کا نام ہوش بڑھانے کے لئے لیا جاتا ہے، نہ کہ کھونے کے لئے...... خواجہ عبید اللہ احرارؒ فرماتے ہیں، کہ استغراق میں قرب نہیں بڑھتا، کیونکہ اس میں عمل نہیں ہوتا، جو مدار قرب ہے"[1]

پھران کیفیات پر دھوکا ہو جاتا ہے روحانی کیفیات کا، حالانکہ اکثر صورتوں میں وہ محض نفسانی کیفیات ہوتی ہیں، اوران میں تمیز کاملین ہی کا کام ہے، بلکہ

"حقیقت میں جو ذی استعداد کامل ہیں، اُن پر نفسانی کیفیات طاری ہی نہیں ہوتیں، ہاں روحانی جن کا اثر روح پر ہوتا ہے، کاملین پر طاری ہوتی ہیں، جن کا عوام کو پتہ بھی نہیں، اوران دونوں میں فرق جیسے گڑ اور فیرنی کی شیرینی میں ہوتا ہے، چار کسی کی بے گار میں گئے، اس نے فیرنی کھلائی، تو ناک مار کر کھاتو لی، مگر چودھری کہتا ہے یہ تھوک سا کیا ہے، اس کو مٹھائی معلوم ہی نہیں ہوتی، اس نے کبھی فیرنی کی بو بھی نہیں سونگھی تھی، اس کے نزدیک تو مٹھائی بس گڑ تھا، تو واقعی جو سالکین کیفیات کے متمنی ہیں، وہ دیہاتی گنوار ہیں، میں تو کہتا ہوں کام میں لگو، کیفیات کی ہوس چھوڑ دو، پھر دیکھئے کہ ایک دن وہ

---

[1] وعظ دوا العیق،

کیفیات تو آئیں گی، کہ لا عین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر......

غرض کیفیاتِ روحانیہ تو ضرور ہوتی ہیں، مگر کیفیاتِ نفسانیہ ضرور نہیں، کسی کو ہوتی ہیں، کسی کو نہیں۔[1]

اصل میں یہ کیفیات بھی راستہ کی دلچسپیاں ہیں، جن کا نفع فقط اتنا ہے، کہ سفر زیادہ دلچسپی سے قطع ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی بڑا خطرہ بھی ہے، کہ اکثر کم حوصلہ راستہ کی ان دلچسپیوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں، اور سبب اس غلطی کا یہ ہے، کہ لوگ کیفیات کو مطلوب سمجھتے ہیں، کہ اگر ہم خدا کے مقبول نہ ہوتے، تو ہم پر یہ کیفیات کیوں طاری ہوتیں، حالانکہ یہ تو کفار پر بھی طاری ہوتی ہیں۔

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو مجتہد فن اور مجدد وقت تھے، فرمایا کرتے تھے کہ انوار و کیفیات حجاب نورانی ہیں، اور حجاب نورانی حجاب ظلمانی سے اشد ہے، سالک کو یہ سب حجابات پس پشت ڈالنا چاہئے، ان کی طرف ہرگز التفات نہ کرے، کیونکہ جس شخص کو بادشاہ سے ملنا ہے، وہ نہ بھنگیوں کے مکان پر ٹھہرتا ہے، نہ عطاروں کی دوکان پر، سیدھا تختِ شاہی پر پہنچنا چاہتا ہے، حجابِ ظلمانی بھنگیوں کے مکانات ہیں، اور حجاب نورانی عطاروں کی دوکانات، سالک کو کسی پر نہ ٹھہرنا چاہئے، آگے چلتا رہنا چاہئے، مقصود دربار الٰہی ہے۔

اے برادر بے نہایت درگہیست   آنچہ بروے می رسی بروے مایست"[2]

کشف و کرامات کی حقیقت احوال و کیفیات کے اس حال و حقیقت کے بعد کشف و کرامت، تصرف و توجہ کی بھی حقیقت معلوم کر لیجئے،

"فرمایا کہ لوگ کشف کو بڑا کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کو قرب میں کچھ بھی دخل نہیں، بعضوں کو کشف سے فطری مناسبت ہوتی ہے، بعضوں کو نہیں، جیسے بعضوں کی فطرت پیدائشی

---

[1] وعظ دوا العیوب ص ۵ [2] وعظ تفصیل الکلام ص ۱۴

طور پر دور بین ہوتی ہے، بعضون کی نزدیک بین، سہیک ستا رہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا
کہ فرض کیجئے ایک شخص کی نظر صرف ستارہ ہی تک پہنچتی ہے، اور ایک کی باہر سڑک تک تو
کیا جس کی نظر سڑک تک پہنچتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ مقرب ہوگا، یہ تو محض
نظر کی ایک قسم ہے، اس کو قرب سے کیا علاقہ، بعضون کو کشف سے فطرۃً مناسبت نہیں ہوتی،
لاکھ مجاہدہ و ریاضت کرین، عمر بھر کشف نہیں ہوتا، اصل چیز تو عبدیت ہے، واللہ اگر کسی
کو لاکھ کشف ہون، اور پھر وہ اپنے وجدان کی طرف رجوع کرے، تو محسوس کرے گا کہ
ذرہ برابر ترقی نہیں ہوئی، برخلاف اس کے اگر وہ دو چار مرتبہ بھی سبحان اللہ سبحان اللہ
پڑھ کر اپنے وجدان کو دیکھئے، تو صاف محسوس ہوگا کہ کچھ نہ کچھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب
بڑھ گیا، اہلِ ذوق جب چاہیں اس کا تجربہ کرلیں[1]۔

کشف قرب و ولایت کی دلیل کیا ہوتا، اس کے لئے تو مومن ہونا بھی شرط نہیں، مومن، کافر
ملحد، دہری سب ہی کو ہو سکتا ہے، جس طرح کچھ جسمانی غیر معمولی قوتیں مشق و ورزش سے پیدا ہو جاتی، یا بڑھ
جاتی ہیں، اسی طرح مجاہدہ و ریاضت سے نفس میں کچھ خاص قوت پیدا ہو جاتی، یا بڑھ جاتی ہیں جس سے
آج کل کے علمائے نفسیات، یا عمل تنویم (ہپناٹزم) وغیرہ کے عامل خوب واقف ہیں،

"غرض کشف کوئی بڑا کمال نہیں، اگر کافر بھی مجاہدہ و ریاضت کرے، تو اس کو
بھی ہونے لگتا ہے، نیز مجانین کو بھی کشف ہوتا ہے، صاحب شرح اسباب نے لکھا ہے کہ
مجنون کو کشف ہوتا ہے، میں نے خود دیکھا کہ ایک مجنونہ کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں
کو بھی نہیں ہوتا، لیکن اس کا مسہل ہوا تو مادہ کے ساتھ ہی کشف بھی نکل گیا[2]،

اس لئے شریعت میں کشفی علوم کوئی حجت نہیں، اگر کوئی کشف قواعد شرعیہ کے موافق ہے تو

---

[1] سوانح جلد دوم ص ۸۸ [2] ایضاً

قابلِ عمل ہوگا، ورنہ واجب الترک ہے، (تعلیم الدین ص ۱۰۰) کشف ہی کی طرح اور بھی کسی خارق یا خلاف عادت امر کا کسی میں پایا جانا قرب و ولایت کی دلیل یا لازمہ نہیں،

"خوارق کا ہونا ولایت کے لئے ضروری نہیں بعض صحابہ سے عمر بھر میں ایک خرقِ عادت بھی واقع نہیں ہوا، خوارق اکثر جوگیوں سے واقع ہوتے ہیں، یہ ثمرہ ریاضت کا ہے خرقِ عادت کا مرتبہ ذکر قلبی سے بھی کم ہے، صاحبِ عوارف نے غیر اہل خوارق کو اہلِ خوارق سے افضل لکھا ہے، عارفین کی بڑی کرامت یہ ہے، کہ شریعت پر مستقیم ہوں اور بڑا کشف یہ ہے کہ طالبانِ حق کی استعداد معلوم کرکے اس کے موافق اُن کی تربیت کریں، شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ بعض اہلِ کرامت نے مرنے کے وقت تمنا کی کہ کاش ہم سے کرامتیں ظاہر نہ ہوتیں،

(تعلیم الدین ص ۱۰۰)

"بعض صاحب گو حضرات کا فیصلہ ہے کہ الکرامات حیض الرجال یعنی جیسے عورت حیض سے شرماتی ہے، اور اس کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے، اسی طرح اہل اللہ اپنی کرامتوں سے شرماتے ہیں، بہت سے اہلِ کرامت بزرگوں نے تمنا کی کہ کاش ہم سے کرامت کا صدور نہ ہوتا، وجہ یہ کہ انھوں نے بقدر اپنی کرامت کے اپنے درجاتِ آخرت میں کمی محسوس کی، کیونکہ غیر اہلِ کرامت کو آخرت میں کرامت کا حصہ بھی عطا ہوگا، البتہ ماذون حضرات مستثنیٰ ہیں[1]،

کرامت کے متعلق رسالہ کرامات امدادیہ میں مستقل بحث فرمائی ہے، جس میں ارشاد ہے کہ

"کرامت اس امر کو کہتے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی متبع کامل سے صادر ہو اور قانونِ عادت سے خارج ہو، اگر وہ امر خلاف عادت نہیں، تو کرامت نہیں، اور جس سے

---

[1] الرفیق فی سواء الطریق ص ۱۳۳،

وہ امر صادر ہوا ہے، اگر وہ کسی نبی کا اپنے کو متبع نہیں کہتا وہ بھی کرامت نہیں، جیسے جوگیوں

ساحروں وغیرہ سے ایسے امور سرزد ہوجاتے ہیں، اور اگر اتباع کا مدعی تو ہے، مگر واقع

میں متبع نہیں، خواہ اصول میں خلاف کرتا ہو، جیسے اہل بدعت یا فروع میں جیسے فاسق

فاجر، اس سے بھی اگر ایسا امر صادر ہو وہ بھی کرامت نہیں استدراج ہے،

"بس کرامت وہ کہلائے گی، جب ایسے فعل کا صدور مومن متبع کامل التقوی سے ہو"

اب ہمارے زمانہ میں جس شخص سے کوئی عجیب فعل سرزد ہوجاتا ہے اس کو غوث قطب قرار

دیدیتے ہیں، خواہ اس کے عقائد و اعمال کیسے ہی ہوں، بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے

کہ اگر کسی کو ہوا میں اڑتا دیکھو یا پانی پر چلتا، مگر شریعت کا پابند نہ ہو تو اس کو بالکل

ہیچ سمجھو"

اور بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اپنی کرامت کا اخفا واجب ہے، مگر جہاں ضرورت ہو، یا غیب

سے اذن ہو یا حالت اس قدر غالب ہو کہ قصد و اختیار باقی نہ رہے، یا کسی طالب حق وغیرہ

کے یقین کو قوی کرنا مقصود ہو، وہاں جائز ہے،

توجہ و تصرف بھی نہ کوئی مقصود و مامور امر ہے، نہ فی نفسہ کوئی کمال و قرب اور نہ ولایت و مقبولیت

کی کوئی علامت، بلکہ نفس و خیال کی ایک قوت ہے، جو خیال و توجہ میں یکسوئی کی مشق سے مقبول کیا

مردود سے مردود شخص حاصل کرسکتا ہے، پرانے زمانہ میں سحر یا جادوگری اور آج کل کے مسمریزم

اور عمل تنویم (ہپناٹزم) کا بڑا مدار یہی ہے، اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر کوئی اثر ڈالنے کا نام

صوفیوں کی اصطلاح میں توجہ و تصرف یا ہمت ہے، حضرت علیہ الرحمۃ نے مستقل ایک چھوٹا سا رسالہ

عربی میں بنام رسالۃ التعرف فی تحقیق التصرف تحریر فرمادیا ہے، جس کا خلاصہ ایدنا ہ بروح

القدس کی آیت سے استدلال فرماکر ایک قسم کی تائید قرار دیا ہے،

"اور حقیقت اس تائید کی یہ ہے کہ خاص محمود و پسندیدہ کیفیات کو کسی دوسرے پر فائض یا طاری کیا جائے جس سے اس میں خاص آثار پیدا ہو جائیں، یہ آثار مقاصد و اغراض کے اختلاف کی بنا پر مختلف قسم و رنگ کے ہوتے ہیں، اور اس تائید کو اہل تصوف کی اصطلاح میں تصرف، توجہ، ہمت اور جمع خواطر کہتے ہیں،

"اور یہ قوت تصرف مشائخ میں اکثر مجاہدات و ریاضات نفسانیہ سے پیدا ہوتی ہے جیسے کشتی لڑنے کی قوت جسمانی ریاضت یا ورزش سے پیدا ہوتی ہے، بعضوں میں فطرۃً بھی یہ قوت ہوتی ہے، مگر یہ صورت بہت کم ہوتی ہے"،

"اس قوت کا استعمال اگر کسی محمود یا اچھی غرض کے لئے ہو، جیسا کہ مشائخ کا معمول ہے، تو اس غرض کے تحت اس تصرف کو بھی محمود سمجھا جائے گا، اور اگر مقصود مذموم بُرا ہے، تو یہ تصرف بھی مذموم ہوگا،

لیکن یہ قوت کوئی دینی کمال بہر حال نہیں، نہ مقبول و مقرب ہونے کی علامت ہے، ہر فاسق و فاجر بھی مشق سے اپنے اندر یہ قوت پیدا کر لے سکتا ہے، بس جیسے ہاتھ پاؤں وغیرہ دوسری بدنی قوتوں کے استعمال کا حکم وحال ہے، وہی اس کا بھی ہے[1]،

نیز اس کے استعمال میں بعض دینی و دنیوی مضرتیں بھی ہیں، خصوصًا اس زمانہ میں حضرت مجدد علیہ الرحمہ کا مشورہ اس کے ترک ہی کا ہے،

"دنیوی مضرت تو اس میں یہ ہے کہ اس کے استعمال کی کثرت سے عامل کے دماغی و قلبی قوی ضعیف و مضمحل ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سے امراض پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے، اور دینی مضرت یہ ہے کہ عوام اس کو ولایت و بزرگی کی علامت سمجھتے ہیں"

---

[1] بوادر النوادر ص ۲۲۲،

جو اعتقاد کا فرض ہے، اور مریدوں کا مرض یہ ہے کہ وہ اکثر اسی پر قناعت کر بیٹھتے ہیں، اور اصلاح کا اہتمام چھوڑ دیتے ہیں، جو عملی فرض ہے،

"انہی مضرتوں کی وجہ سے محققین طریق نے اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے، سلف کے زمانہ میں یہ مضرتیں قوی کی مضبوطی، فطرت کی سلامتی، اور خوش فہمی کے سبب[1] موجود نہ تھیں (یا بہت کم تھیں)"

اس کے علاوہ جو لوگ محض شیخ کی توجہ و تصرف پر قناعت کر لیتے ہیں، تو اس تصرف سے جو کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں، نہ تو اُن کا کچھ نفع ہوتا ہے، اور نہ ان کو بقا نصیب ہوتا ہے، اصل نفع و بقا اپنی ہی محنت و مشقت کی چیزوں میں ہے،

"یاد رکھو کہ پیر صرف رستہ بتلانے کے لئے ہیں، کام کرنے کے لئے نہیں، کام تم کو خود کرنا چاہئے، کوئی شخص طبیب کے پاس جا کر اپنے امراض بیان کرے، اور جب وہ نسخہ تجویز کرے تو اس سے کہے کہ حکیم صاحب میری طرف سے آپ ہی پی لیں، تو ظاہر ہے کہ اس شخص کو ساری دنیا احمق کہے گی، بس یہی حالت طالبین توجہ کی ہے، کہ مریض تو یہ مگر توجہ کریں بزرگ"

بزرگوں سے جو لوگ خالی دعا و توجہ چاہا کرتے ہیں، اس سلسلہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی حضرت نے ایک بڑی ہی دلچسپ سبق آموز اور عارفانہ حکایت نقل فرمائی ہے، کہ

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ جب بمبئی تشریف لے گئے، تو ایک سوداگر نے عرض کیا، کہ حضور دعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ مجھے حج نصیب کرے، فرمایا کہ ایک شرط سے دعا کروں گا کہ جس دن جانا چاہے اُس دن مجھے اپنے اوپر پورا اختیار دیدو، کہ میں تمہارا

---

[1] بوادر النوادر ص ۳۲۲،

ہاتھ پکڑ کر جہاز میں بٹھلا دونگا، اور وہ تم کو لے کر روانہ ہو جائے، جب تک یہ نہ ہو صرف میری دعا سے کیا کام چل سکتا ہے،

"خیال کیجئے ابو طالب جو کہ رسول مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حقیقی چچا ہیں، اور بہت بڑے آپ کے محب کہ جب تمام قریش نے مخالفت کی اور دشمن ہو گئے، اس موقع پر بھی ابو طالب نے ساتھ دیا، ساتھ ہی خود حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بھی اُن سے بہت محبت تھی، اور آپ نے بیحد کوشش ان کے مسلمان ہونے کی فرمائی لیکن محض اس وجہ سے کہ اُنھوں نے خود ارادہ[۱] نہیں کیا، حضورؐ کی کوشش و محبت کچھ بھی اُن کے کام نہ آئی[۲]"

ایک اور دقیق و نافع بات

"اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو ہے، مگر بالکل غلط ہے، تمنّا دوسری چیز ہے، اور ارادہ دوسری چیز، ایک مرتبہ دو شخص حج کو جانے کا تذکرہ کر رہے تھے، ایک نے کہا بھائی ارادہ تو ہر مسلمان کا ہے، میں نے کہا کہ یہ بالکل غلط ہے، اگر ارادہ ہر مسلمان کا ہوتا، تو ضرور سب کے سب حج کر آتے، ہاں یوں کہئے کہ تمنّا ہر مسلمان کی ہے، سو نری تمنا سے کام نہیں چلتا ارادہ کہتے ہیں سامان کے مہیا کرنے کو مثلاً ایک شخص زراعت تو کرنا چاہتا ہو مگر اس کا سامان مہیا نہیں کرتا، اور ایک شخص سامان بھی جمع کر رہا ہے، تو پہلے کو متمنی، دوسرے کو مرید کہیں گے، اسی طرح دو شخص جامع مسجد میں پہنچنا چاہتے ہیں، مگر ایک اپنی جگہ بیٹھا تمنّا ظاہر کئے جائے اور دوسرا چلنا شروع کر دے، تو دوسرے کو مرید کہیں گے، اور پہلے کو متمنی، جب ارادہ

---

[۱] ارادہ کی یہ اور آگے مثالوں سے جو تحقیق و توضیح فرمائی گئی ہے، یہ وہی ہے جس پر کسی مُلّا نے نہیں عہد حاضر کے بہت بڑے نامور عالم نفسیات ولیم جیمس نے ارادۂ ایمان (Will To Believe) کے نام سے ایک پوری کتاب لکھ ڈالی ہے [۲] الرفیق فی سواء الطریق ص ۵۳،

ہوتا ہے کام بھی ضرور پیدا ہو جاتا ہے، اگر کسی وجہ سے خود قدرت نہیں ہوتی تو کوئی رہبر مل جاتا ہے جو معین ہو کر کام پورا کر دیتا ہے، اسی لئے کہتے ہیں، السعی منی والاتمام من اللہ،

"بعض مرتبہ مرشد کی وجہ سے طالب کے قلب میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو خود محنت کرنے سے نہیں پیدا ہوتی، مگر صرف اس کیفیت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اگر خود کچھ نہ کیا جائے تو یہ کیفیت باقی نہیں رہتی، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے آگ کے سامنے بیٹھنے سے بدن گرم ہو جاتا ہے لیکن گرمی باقی نہیں رہتی، جہاں سامنے سے ہٹ کر ہوا لگی، کہ بدن میں ٹھنڈک پیدا ہو گئی، اسی طرح اس کیفیت میں بھی پیر سے جدا ہوتے ہی (یا توجہ کا اثر کم ہوتے ہی) کورے کے کورے رہ جاتے ہیں،

"اس کے علاوہ اپنی کمائی کی قدر بھی خوب ہوتی ہے، اور مفت کی چیز کی قدر نہیں ہوتی، مشہور ہے کہ ایک شخص ادھوڑی کا جوتا دوشالے سے جھاڑ رہا تھا، لوگوں نے پوچھا یہ کیا؟ تو کہا دوشالہ تو میرے والد کی کمائی کا ہے اور جوتا میری کمائی کا،

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد

گوہرے طفلے بقرص نان دہد

"اور جو لوگ اپنے بوتے پر کام کرتے ہیں، ان کی حالت ساری عمر یکساں رہتی ہے، البتہ ان میں شورو غل اور چہل کود نہیں ہوتی، اور نہ یہ مطلوب ہے،[1]

چنانچہ بزرگی کا معیار لوگوں نے یہ تصرف بھی تراش رکھا ہے، کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کر دے، اٹھا کر زمین پر پٹک دے، وہ بڑا بزرگ ہے، حالانکہ یہ بالکل لغو ہے، اگر یہ بزرگی ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ضرور اس کو برتنا چاہئے تھا،

---

[1] الرفیق فی سواء الطریق ص ۴۴ ۵۔

پھر کیا وجہ ہے کہ جب کفار نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو آپ اُس غار سے منتظر رہے کہ یہ لوگ غافل ہوں تو میں نکل جاؤں، کیوں نہ آپ نے ایک ہی نگاہ میں سب کو مدہوش کردیا،

بلکہ حضورؐ نے ایسے اوقات میں بھی جو کچھ کیا، وہ اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ شانِ عبدیت کی دعا تھی، نہ کوئی توجہ و تصرف جیسا کہ سراقہ کے مشہور واقعہ میں جو آپ کی تلاش و تعاقب میں چلا آرہا تھا،

آپ نے اس وقت بھی خدائے تعالیٰ سے دعا فرمائی، اللھم اکفنا شرّہ، چنانچہ اس کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا، سراقہ نے کہا کہ غالباً آپ نے میرے لئے بددعا کی، درخواست کرتا ہوں کہ آپ خدائے تعالیٰ سے دعا کریں کہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے، اور وعدہ کرتا ہوں کہ قریش کو آپ کا پتہ نہ دونگا، چنانچہ آپ نے دعا فرمائی، اور اس کا گھوڑا زمین سے نکل آیا،

صاحبو! بزرگی کا معیار یہ ہے کہ جتنی درویشی میں ترقی ہوجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت بڑھتی جائے، کیونکہ ولایت مستفنی عن النبوت ہے، افسوس کہ یہ لوگ علماء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اس لئے بہت سی غلطیوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں[1] (باقی)

[1] بخاری [illegible]

اعلان

ملک کے فسادات اور تقسیم ہندوستان اور بعض اور وجوہ سے بعض خریدارانِ معارف اپنے مستقر کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہوگئے ہیں اس لئے معارف کے بہت کافی پرچے واپس آرہے ہیں اس لئے گذارش ہو کہ خریدارانِ معارف اپنے موجودہ پتہ سے دفتر کو جلد از جلد مطلع کردیں نیز اپنی ڈاک کی حفاظت کا انتظام کریں تاکہ دفتر کو دوبارہ پرچہ بھیجنے کی دشواری نہ ہو، **معارف** ڈاکخانہ کے قاعدہ کے مطابق ہر مہینہ کی ۵ تاریخ کو نہایت پابندی سے شائع ہوجاتا ہے اگر خدانخواستہ اس کے خلاف کبھی ہو تو خریداروں کو بذریعہ کارڈ اسکی اطلاع دیدی جائے گی، اب تک تو بحمد اللہ کبھی تاخیر نہیں ہوئی،

"منیجر"

بغداد اور اسکا تمدن

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

اہل بغداد کا تمدن اور انکا حسن ذوق | گذشتہ بیانات سے بغداد کی شوکت و عظمت کا اندازہ ہوگیا ہوگا، اس کا تمدن بھی نہایت عظیم الشان اور بڑا دلکش و دلفریب تھا، آیندہ سطروں میں اس کے بعض رخوں کو دکھانے کی کوشش کیجائے گی، صاحب حضارۃ الاسلام نے اہل بغداد کے حسن ذوق اور اُن کے تمدنی تکلفات اور معاشرتی نفاستوں پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے،

"عموماً آسودہ حال طبقہ کے گھروں کے تین حصے ہوتے تھے، ایک مقاصیر حرم یعنی زنانخانہ، دوسرے مجالس السلام جسے دیوان خانہ کہہ سکتے ہیں، یہ حصہ ملاقات اور مہانوں کے لئے ہوتا تھا، تیسرے شاگرد پیشہ کے مکانات، ہر مکان کے متعلق پائین باغ ہوتا جس میں میووں اور پھل پھول کے درخت ہوتے تھے، اور اُن سب کے گرد چار دیواری ہوتی تھی، مکانوں کی چھتیں اور دیواریں عموماً سرسے اور رنگین نقش و نگار سے آراستہ ہوتی تھیں[1] سادہ دیواروں کو منقش کپڑوں سے منڈھتے تھے، اور دروازوں پر دیبا کے پردے آویزاں کرتے تھے،

باغوں کا اتنا شوق تھا کہ مختلف ملکوں سے درخت منگا کر لگاتے تھے، بعض باغوں کی لاگت

---

[1] حضارۃ الاسلام ص ۲۵، ۲۶،

دس دس ہزار اشرفی تک پہنچ جاتی تھی، ملازمون اور غلامون کے انتخاب مین اُن کے ظاہری حسن کے ساتھ خوش ذوقی اور زندہ دلی کا لحاظ رکھا جاتا تھا، کھانون مین تنوع، جدت اور شان امارت کا اتنا شوق غالب تھا کہ بے فصل کی چیزین مثلاً بے موسم کے میوے اور پرندون وغیرہ کا گوشت اس کے ہم وزن چاندی دے کر خریدتے تھے،

گرمیون مین ٹھنڈک اور پانی کا خاص اہتمام کرتے تھے، آرام گاہون مین مصنوعی طریقہ سے پانی لایا جاتا تھا، جو سنگ مرمر کے تراشے ہوئے درندون اور پرندون کے منہ سے فوارے کی شکل مین چھوٹتا تھا، اور اوپر سے پنکھا چلتا تھا اس سے گرم ہوا کے جھونکے نسیم سحری بن جاتے تھے، غرض لباس و زینت و آرائش حتیٰ کہ گھوڑون کی آرائش تک مین دیبا کی جھولون اور زیورات سے ایسی جدتین پیدا کی تھین کہ دنیا کی کوئی قوم اس درجہ کو نہ پہنچی تھی[1]

مکانون مین ٹھنڈک پیدا کرنے کے اور بہت سے طریقے رائج تھے، عام اور سادہ طریقہ یہ تھا کہ کچی چھت کے گھر بنائے جاتے تھے، ان پر کہگل ہوتی تھی، اور دیوار کی پشت، بانسون اور بید کے ٹھاٹھ سے منڈھ دی جاتی تھی، اور اس کے اور دیوار کے درمیان کے خلا مین برف کے تودے بھر دیئے جاتے تھے، پھر ایک شخص ایوب خوری نے ایک موٹا آب گیر کپڑا جو خیش کے نام سے موسوم تھا ایجاد کیا، اس کو تر کر کے آرام کے کمرہ کی دیوارون یا قبہ پر منڈھ دیا جاتا تھا، اس سے ٹھنڈک پیدا ہو جاتی تھی[2]

اس سے بھی زیادہ پرتکلف طریقہ یہ تھا کہ بڑے بڑے ہوادار کمرے دبیقی (ایک قسم کا کپڑا) سے منڈھ دیئے جاتے تھے، اور درمیان مین ایک قبہ یا چھوٹا حجرہ بنا دیا جاتا تھا، اس کے چارون طرف بانس کے کھپاچے اور بید کی ٹٹی ہوتی تھی، اور دبیقی کو گلاب کا فوارہ اور صندل کے عرق مین تر کر کے اس پر منڈھ دیا جاتا تھا، اور دروازون پر ہوادار اور روشندانون وغیرہ ہوا کے تمام راستون پر برف کے تودے

---

[1] خمارة الاسلام ص ۹۹ و [2] تاریخ الاسلام السیاسی والثقافی ج ۲ ص ۳۰۸

رکھ دیئے جاتے تھے، اور خدام انھیں بڑے بڑے پنکھون سے ہوا دیتے تھے، اس سے کمرون مین اتنی ٹھنڈک پیدا ہو جاتی تھی، کہ گرم کپڑا پہننے کی ضرورت پیش آجاتی تھی، لیکن یہ اہتمام صرف امراء کر سکتے تھے،[51]

سردیون مین گرمی پیدا کرنے کی صورت یہ تھی کہ بڑے بڑے مکانون مین چھوٹے چھوٹے لکڑی کے کمرے ہوتے تھے، اور اُن کے گرد لوہے اور لکڑی کے جنگلے بنے ہوتے تھے، ان کے درمیان آتش دانون اور انگیٹھیون مین آگ بھری رہتی تھی، اُن کو خدام دھونکنی سے برابر دہکاتے رہتے تھے، اور چوبی کمرے کے اندر چاندی کی انگیٹھیون مین عود جلتا رہتا تھا، اس سے پورا کمرہ گرم ہو جاتا تھا،[52]

کھانون کے اقسام | جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، اس دور مین کھانون مین بھی بڑے تکلفات پیدا ہوئے عباسیون کا دسترخوان الوانِ نعمت کا نعمت خانہ تھا، اُن کے نام تو کتابون مین ملتے ہین، لیکن آج اُس کی نوعیت بتانا مشکل ہے، اصحابِ لغت کی تشریح سے بھی اس کا صحیح اندازہ نہین ہوتا، اور بہت نام بھی لغت مین نہین ملتے، بعض اقسام یہ ہین،

مرغ اور پرندون کے گوشت کی مختلف قسمین تھین، جو مختلف طریقون سے پکائے جاتے تھے، اور ان سب کے علیحدہ علیحدہ نام تھے، بکری، برہ، بھیڑ، گائے، ہرن اور دوسرے مویشیون کے گوشت، اور ان کی مختلف قسمون کا طبقات الاطباء مین تذکرہ ہے، مگر اُن کی تشریح نہین کیجا سکتی،[53]

مچھلی کے گوشت کی بھی مختلف قسمین تھین، مثلاً چھوٹی بھنی ہوئی مچھلیان (دیکھو تاج العروس) مچھلی کی زبان کا سالن، اس پر بڑا صرف آتا تھا،[54]

ثرید، ہریسہ، اور خبیص، عرب کے آسودہ حال لوگون کے مرغوب پرانے کھانے ہین، جو عباسی عہد مین بھی تھے،

۱۲۹، ۱۳۰

[51] ابن ابی اصیبعہ نے انکی پوری تفصیل لکھی ہے، ہم نے صرف ضروری خلاصہ نقل کیا ہے، دیکھو طبقات الاطباء ج اول ص

[52] ایضاً، [53] ایضاً [54] مروج الذہب مسعودی ج ۷، ص ۳۵۰،

کشکی یا کشک، گیہوں، دودھ اور گوشت ملا کر پکایا جاتا تھا، (تاج العروس)
سکباج گوشت اور سرکہ سے پکتا تھا، خضیرہ ایک قسم کا شوربہ جو چقندر دودھ سے پکتا تھا،
عصیدہ آٹے چربی اور مکھن سے پکتا تھا، قلیہ خشک اور شوربے دار دونوں طرح کا ہوتا تھا، قطیفہ پتلے
شوربے کی ایک قسم، سنبوسہ، مشہور ہندوستانی سموسہ، فالوذج، یہ فالودہ کا معرب ہے لیکن ہمارے فالودہ
سے مختلف اور بہت ثقیل اور سنگین ہوتا تھا، اور اس کی حیثیت غذا کی تھی، لوزینج غالباً لوزات اور حلوہ جات،
خشکار، غالباً خشکہ کا معرب ہے، روٹیوں کی بہت سی قسمیں تھیں، فرنی اور تبدوق، جو غالباً شیرمال اور کلچہ
کے مشابہ تھیں، زیادہ مشہور تھیں، کھانے پر ترکاریاں اور میوے بھی ہوتے تھے،

امراء کے یہاں مکلف کھانوں کے لئے جو مرغ پکائے جاتے تھے، ان کو کچھ دنوں تک پہلے دانے
اور پانی کے بجائے خشک میوے کھلائے اور عرق گلاب پلایا جاتا تھا[1]

ہارون رشید کے دسترخوان پر ایک وقت میں تیس تیس قسموں کے کھانے ہوتے تھے، مطبخ کا خرچ دس ہزار
درہم روزانہ تھا[2]، مامون کا ذاتی خرچ چھ ہزار اشرفی یومیہ تھا جس کا بڑا حصہ باورچی خانہ پر صرف ہوتا تھا[3]،
مقتدر کے عام اور خاص مطبخ کا خرچ دس ہزار اشرفی ماہانہ تھا، باورچیوں کی تنخواہ ایک ہزار اشرفی ماہانہ
تھی[4]، قاہر کے دسترخوان پر تیس اشرفی روزانہ کے میوے ہوتے تھے[5]، ان کے امراء کا دسترخوان بھی بہت
پر تکلف اور وسیع تھا، وزیر ابوالحسن بن فرات کے باورچی خانہ میں تین سو اشرفی ماہانہ کا صرف مشک خرچ
ہوتا تھا[6]،

اس کے دو باورچی خانے تھے، ایک عام لنگر خانہ کے لئے دوسرا خاص، مطبخ عام میں نوے بکریاں، تیس
بڑے، دو سو مرغیاں، دو سو چوزے اور دو سو تیتر روزانہ خرچ ہوتے تھے، نان پز رات دن نان سمید

---

[1] طبقات الاطباء ج اول ص ۱۴۰، [2] تاریخ الاسلام السیاسی والثقافی ج ۲ ص ۲۰۷ [3] الفخری ص ۲۱۰،
[4] کتاب الوزراء صابی ص ۱۲، ۱۰۰ [5] طبری ج ۱۱ ص ۱۰۳ [6] کتاب الوزراء صابی ص ۲۵۲،

اور میٹھا بجانے میں مشغول رہتے تھے، آبدار خانہ میں ہر وقت برف کے پانی کا انتظام رہتا تھا، خدام
خاص ستھرے لباس میں ملبوس ہاتھوں میں تولیے اور آبخورے لئے موجود رہتے تھے، جو ہر آنے جانے والے
کو سکنجبین یا اور کوئی ہاضم چیز ملا ہوا پانی پلاتے تھے[1]،

تقریبات کے موقع پر رات دن میں پانچ پانسو من برف صرف ہوتی تھی[2]،

عباسی عہد کے ایک شاعر عمانی نے شاہی خاندان کے ایک رکن محمد بن سلیمان بن علی عباسی کے دسترخوان
کے کھانوں کے تنوع کو نظم کیا ہے،

جاؤا بفرنی لهم ملبون — بات يسقی خالص المصون
مصوّمع اکرم ذی غضون — قد حشيت بالسكر المطحون
ولولوا ما شئت من تلوين — من بارد الطعام والسخين
ومن شراسيت ومن طردين — ومن هلام ومصيص جون
ومن اوز فائق سمين — ومن دجاج لتّ با لعجين
فالشم فی الظهور والبطون — واتبعوا ذالك بالجوزين
وبالخبيص الرطب واللوزين — وفكهوا بعنب وتين
والرطب الازاذ والعيرون[3]

خطیب کی کتاب الطفیل میں بہت سے کھانوں کے نام ملتے ہیں،

دسترخوان کی آرایش اور کھانے کے آداب و طریقے

اونچے طبقہ میں دعوت اور تقریبات کے موقع پر تمام ظروف طلائی اور نقرئی
ہوتے تھے، صابی نے ابن فرات کی ایک محفل سرود کا ذکر کیا ہے اس میں بڑے

---

[1] کتاب الوزراء صابی ص ۲۰۳ [2] کتاب الوزراء صابی ص ۲۰۲
[3] ضحی الاسلام ج اول ص ۱۲۲

قیمتی طلائی اور نقرئی ظروف تھے[۱]

کھانے سے پہلے حاضرین کی فواکہات سے تواضع کیجاتی تھی، اور سب کے سامنے میوہ جات کا ایک ایک طبق پیش کیا جاتا، درمیان میں ایک کشتی میں علحدہ میوے بھر کر رکھ دیئے جاتے تھے، ہر طبق کے ساتھ میوہ کاٹنے کی چھری اور چھلکے اور گٹھلی رکھنے کے لئے شیشہ کی تشتری ہوتی تھی، میوہ خوری کے بعد طبق اٹھائے جاتے تھے، اور ہاتھ دھونے کے لئے سلابچی پیش کیجاتی تھی، ہاتھ دھونے کے بعد دسترخوان بچھتا تھا، اور سرپوش سے ڈھکے ہوئے کھانوں کے خوان آتے، اُن پر دیبا کے خوان پوش پڑے ہوتے تھے، اور اُن کے نیچے چمڑا بچھا ہوتا تھا، اور ہاتھ منہ صاف کرنے کے لئے رومال اور تولئے رکھے ہوتے تھے،

کھانے کی قسمیں یکے بعد دیگرے سامنے آتی تھین، اور اس کا سلسلہ دو گھنٹہ تک جاری رہتا، کھانے کے دوران میں میزبان لطف و مدارات کی باتین کرتا رہتا، دسترخوان اُٹھنے کے بعد آبدارخانہ میں جو کھانے کے کمرے کے متصل ہوتا تھا، ہاتھ منہ دھویا جاتا، خدام پانی ڈالتے، اور حقیقی تولیہ سے پانی پوچھنے کے بعد عرق گلاب کے شیشے پیش کئے جاتے تھے جو ہاتھ اور منہ پر ملا جاتا تھا،[۲]

نبیذ نوشی کے تکلفات | بنی عباس کے زمانہ مین نبیذ نوشی کا عام رواج تھا، اس موقع پر ایک غلط فہمی دور کر دینا ضروری ہے، عربی مین "شراب" مطلق پینے کی چیز کو کہتے ہیں، چنانچہ شربت کے لئے بھی شراب ہی کا لفظ ہے، اسی طریقہ سے "شرب" مطلق پینے کو کہتے ہین، خواہ وہ آب زمزم ہی کیون نہ ہو، اردو کی شراب کے لئے عربی مین خمر کا لفظ ہے، لیکن جو لوگ عربی سے واقف نہین ہین، اُن کو شرب یا شراب کے لفظ سے اردو کی شراب یعنی خمر کا دھوکا ہوتا ہے، جو صحیح نہین ہے، اور یہ دھوکا اچھے اچھون کو ہو جاتا ہے اور وہ نبیذ نوشی کو شراب نوشی سمجھ لیتے ہین، بعض عباسی خلفاء کے علاوہ جن کی بادہ نوشی مسلم ہے، باقی اکثر خلفاء بلکہ تقریباً کل اس ام الخبائث سے محترز رہے، البتہ نبیذ کی بعض ہلکی قسمین جو نشہ آور نہین بعض علماء عراق کے نزدیک جائز تھین جنکو قریب قریب

---

[۱] کتاب الوزراء صابی ص ۱۹۲ [۲] ایضاً ص ۲۴۰،

سب خلفا اور امرا بڑے اہتمام سے پیتے تھے، چینی نوشی کے جام و مینا دستانوں سے سازو سامان و لوازم اور ہوتے تھے جس کا تذکرہ بکثرت تاریخون مین ہے، موفق جب پینے کے لئے بیٹھتا تو چاندی کا تسلہ اور سونے کی کشتی مین بلور کے جام و مینا لاکر پیش کئے جاتے[۱]

خلفا و امرا نے چینی نوشی کی محفلون کی زیب و زینت مین بڑے تفنن پیدا کئے، بعض محفلون کا ذکر تاریخون مین بھی ملتا ہے، جس سے ان کی نفاست و لطافت اور تکلفات کا اندازہ ہوتا ہے، ابو جعفر بن حمدون کا بیان ہے، کہ ایک مرتبہ راضی باللہ نے ایک مقام کو فرش و فروش سے آراستہ اور گلاب و نیلوفر کے پھولون سے سجانے کا حکم دیا، اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی، محفل کی آراستگی کے بعد راضی آیا، اور پھولون کے انبار دیکھکر بولا، خالی پھول اچھے نہیں معلوم ہوتے، اور ان پر کافور چھڑکنے کا حکم دیا، خدام نے فوراً طلائی سینیون مین بھر بھر کر کافور کا سفوف چھڑکنا شروع کیا، اور اتنا چھڑکا کہ کافور کی سپیدی سے پھولون کی رنگت دب گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ روئی دھنک دی گئی ہے، یا کسی باغ پر برف باری ہوئی ہے، اندازاً ایک ہزار مثقال کافور چھڑکا گیا تھا، محفل برخاست ہونے کے بعد راضی نے کافور لوٹنے کا حکم دیا، اس حکم پر خدام نے کافور کے انبار جمع کر لئے[۲]

ایک مرتبہ متوکل کا دل چاہا کہ محفل شرب کی ہر چیز کا رنگ زرد ہونا چاہئے، اس کی اس طرح تعمیل کی گئی، کہ ایک حوض پر سونے سے مرصع صندل کی لکڑی کا ایک قبہ بنایا گیا، اور اس مین زرد دیبا کے پردے آویزان کئے گئے، اور اسی کا فرش بچھایا گیا، حوض کے چارون طرف چھوٹی چھوٹی نہرین روان تھیں، ان کے پانی مین زعفران گھولا گیا، اور متوکل کے سامنے زرد دستنبو (ایک قسم کی خوشبو) لیمون اور زرد رنگ کی چینی سونے کی کشتی مین لگا کر پیش کی گئی، اس مجلس مین جو لونڈیان شریک تھیں، ان کا لباس زرد کتان کا تھا، اس اہتمام مین کئی ہزار اشرفیان صرف ہوئین[۳]

۱؎ طبقات الاطباء جلد اول ص ۲۰۳ ۲؎ نشوار المحاضرۃ قاضی تنوخی ص ۱۴۴ و ۱۴۵ ۳؎ ایضاً ص ۱۴۶ و ۱۴۷

ایک مرتبہ خلیفہ مقتدر باللہ نے بھی اسی قسم کی ایک بزم طرب آراستہ کی تھی، جس میں دس دن کے اندر ایک ہزار دینار کے گلاب کے پھول اور عرق گلاب صرف کیا، عرق گلاب حوضوں میں بھرا جاتا تھا اور فواروں سے چھوٹتا تھا،

ابو عبداللہ بریدی والی بصرہ نے ایک مرتبہ اسی قسم کی ایک بزم نشاط کی ترتیب میں دی ایک قسم کی خوشبو اور کافور پچیس ہزار درہم صرف کئے[1]

لباس اونچے تمدن اور بلند معاشرت کا ایک مظہر لباس کا حسن اور اس کی لطافت بھی ہے، اس اعتبار سے اہل بغداد بڑے خوش لباس تھے، اور ان کی وضع قطع اور تراش و خراش دوسروں کے لئے معیار سمجھی جاتی تھی، بغداد ریشمی اور سوتی پارچہ بافی کی صنعت و تجارت کا بڑا مرکز تھا، اس کے ایک محلہ عتابیہ میں مختلف رنگ کے ریشمی اور سوتی کپڑے تیار ہوتے تھے، جو محلہ کے نام کی نسبت سے عتابی کہلاتے تھے[2]

ریشمی کپڑوں کی صنعت اور تجارت اتنی وسیع پیمانہ پر تھی اور اس کے ٹکس کی آمدنی اتنی تھی، کہ حکومت میں اس کا مستقل محکمہ قائم تھا، اور کارخانوں میں جس قدر تھان تیار ہوتے تھے، ان پر سرکاری مہر لگائی جاتی تھی[3] اس کے علاوہ مختلف اسلامی ممالک کے بہترین کپڑے بغداد آتے تھے، ابو الطیب محمد بن اسحاق المعروف بہ وشاء بغدادی نے خوش لباس طبقہ کے لباس اور کپڑوں کی تفصیل لکھی ہے، لیکن ان میں بہت سے کپڑوں اور لباسوں کے نام ایرانی ہیں جو موجودہ کتب لغت میں نہیں ملتے اور بعض کا ترجمہ نہیں ہو سکتا، تاہم ان سے لباس اور وضع و قطع وغیرہ کا اجمالی اندازہ ہو جاتا ہے، وشاء کے بیان کا خلاصہ یہ ہے، کہ خوش لباس عموماً باریک کپڑے کے چھوٹے کرتے، قہستان کے کپڑے کی نیمائیں، جرجان اور اسکندریہ کے زیرپوش، دبیقی اور جابہ کے اعلیٰ ریشم کے نرم اور خوش رنگ کتان کی قمیصیں، نیشاپور کے ملحم (ایک قسم کا کپڑا) دبیق کے ایک رنگے اور تونس کی طیلسان (چادریں) عدن کی ردائیں، کوئی خز اور قومس کی حاشیہ دار [illegible]

---

[1] ظہور المعتزہ ص ۲۰ و ۱۰۱ [2] سفرنامہ ابن جبیر ص ۲۲۹ [3] کتاب الخراج ص ۱۹۴

[illegible] رنگنے کی ہی سند کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، مغرب چادرین کی کتان اور دوسرے ایرانی لباس استعمال کرتے تھے،

زیادہ شوخ اور بھڑکیلے رنگ، مثلاً زعفران یا دوسرے شوخ رنگون مین رنگے ہوئے کپڑے عورتون لونڈیون، اور گانے والی عورتون کے ساتھ مخصوص تھے، مردون مین ان کا استعمال معیوب تھا، البتہ فصد لینے، علاج کے موقع پر بادہ نوشی کی محفلون اور خلوت کی صحبتون مین مشک مین رنگے ہوئے کپڑون، عنبر مین رنگی ہوئی قمیصون، رنگین چادرون، اور زعفرانی ازار کے استعمال مین مضائقہ نہ تھا، اس قسم کے لباس لطف و نشاط کی مجلسون اور بے تکلف صحبتون مین استعمال کئے جا سکتے تھے، انھین پہن کر گھر کے باہر نکلنا معیوب تھا، کپڑون مین تناسب کا لحاظ ضروری تھا، بے جوڑ کپڑے مثلاً ایک میلے کپڑے کے ساتھ دوسرا دھلا ہوا یا دھلے ہوئے کے ساتھ نیا کپڑا یا دیبا کے ساتھ خروی (ایک معمولی کپڑا) کا استعمال معیوب تھا، عمدہ لباس وہی سمجھا جاتا تھا، جو متناسب ہو،

مردون کا عام لباس چھوٹا کرتا یا لمبی قمیص، جبہ، موزہ اور عمامہ تھا، خواص زیادہ تر ایرانی لباس پہنتے تھے، جس کو منصور نے سرکاری لباس قرار دیا تھا،

ایرانیون کی تقلید مین اونچی ٹوپیون کا زیادہ رواج تھا، قاضیون کی ٹوپیاں بڑی لمبی لمبی ہوتی تھین، خلفاء ٹوپیون پر عمامہ باندھتے تھے، فقہاء قضاۃ، اعراب، حکام، اور عوام سب کا لباس جدا جدا تھا، سرکاری لباس سیاہ تھا، اور خلفاء کے دربار مین حضوری کے لئے سیاہ لباس ضروری تھا،

عورتین دغانی کپڑے کے کرتے، رشیدی چادرین، چھوٹی بوٹی کی دھوپ چھاؤن طرح کی چادرین، رنگین کتان، حریر، نیشاپوری مقنع، خراسانی کتان کے ازار، گریبان دار، گلوبند (جرابات النخا نقیہ) سپید ڈھیلے پاجامے، سربند استعمال کرتی تھین، سپید رنگ کے کپڑون کا استعمال سہاگنین

[illegible] اس زمانہ کی [illegible] سمجھا جاتا ہو [illegible] کتاب [illegible]
[illegible] سر اور پیشانی پر باندھتی [illegible] آج بھی عرب عورتون [illegible] ہے،

ناپسندیدہ تھا، اور وہ بیواؤں اور مطلقہ کا لباس سمجھا جاتا تھا، سہاگن عورتیں، رنگین لباس استعمال
کرتی تھیں، اور سپید کپڑوں کو مشک، عنبر، صندل، اور سنبل وغیرہ میں رنگ کر استعمال کرتی تھیں، شوخ
زرد، سبز، سیاہ، گلابی، اور سرخ رنگ کے رنگے ہوئے کپڑے زیادہ تر ادنیٰ درجہ کی نچلی عورتیں اور مغنیہ
استعمال کرتی تھیں، اور یہ رنگ معزز خواتین میں معیوب تھے، لیکن جن کپڑوں کا اصلی رنگ یہی ہوتا،
اُن کے استعمال میں مضائقہ نہ تھا، مثلاً نگین، لاذ، یا حریر اور خز وغیرہ،[1]

عیسائی عورتوں کے اثر سے مسلمان عورتوں میں زنار یعنی کردھنی یا کمر میں باندھنے کی ریشمی پٹیاں بھی
رائج ہو گئی تھیں، جو ہلکے رنگ کی سادہ اور منقش دونوں ہوتی تھیں، تاج نما ٹوپیاں بھی استعمال کرتی تھیں،
جن میں موتی اور نگینے وغیرہ جڑے ہوتے، اور پیشانی پر ریشم اور کلابتو کے کام کی پٹیاں باندھتی تھیں،

عطریات اور خوشبوئیں

عطریات اور خوشبوؤں سے بڑا ذوق تھا،
شوقین مزاج مشک اور گلاب کا محلول لونگ کے پانی میں بھگویا ہوا عنبر آمیز عود، سلطانی
(ایک قسم کی خوشبو) بحرین کا عنبر اور دوسری چھڑکنے والی خوشبوئیں استعمال کرتے تھے، مشک و
زعفران آمیز بریان کا فور کا بخور جلاتے تھے، عورتوں اور بچوں کی خوشبوئیں علیحدہ تھیں، اُن سے
مرد پرہیز کرتے تھے، (کتاب الموشی ص ۱۲۵ و ۱۲۶)

مکان کی فضا معطر کرنے کے لئے کھڑکیوں، روشن دانوں اور طاقچوں وغیرہ میں مختلف قسم کے
خوشبودار پھل پھول، کافور، صندل، گلاب، نخلہ، خلوق، اور ند وغیرہ خوشبودار چیزیں رکھدی جاتی
تھیں، جن سے سارا مکان مہک اٹھتا تھا،[2]

جب خلفاء باغ میں سیر و تفریح کے لئے جاتے تھے، تو کھاد کی بو دور کرنے کے لئے درختوں
کی جڑوں میں مشک چھڑک دیا جاتا تھا،[3]

---

[1] کتاب الموشی ص ۱۲۹، جن لباسوں کے معنی لغت میں نہ مل سکے ان کو چھوڑ دیا گیا ہے، [2] طبقات الاطباء ج اول ص ۱۴۳ [3] نشوار المحاضرہ ص ۴۴،

خلیفہ معتضد کی دن کے لئے ریشم کی جوتیاں بنی تھیں، اور اُن کی تہ مین مشک وغیرہ بچھا کر بنایا جاتا تھا، دس دن سے زیادہ ایک جوتی استعمال نہ کرتی تھی، اس کے بعد ملازمین مشک وغیرہ نکال لیتے تھے[1] یہانتک کہ بیت الخلاء تک میں خوشبو کا انتظام رہتا تھا، ہارون کے دور کے ایک مشہور اور نابینا عالم ابو معاویہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہارون حج کے لئے مکہ آیا، مین اوس سے ملنے گیا، تو مجھے بیت الخلاء جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، ہارون نے شہزادہ مامون اور امین سے کہا، کہ اپنے چچا کو بیت الخلاء پہنچا دو، انھون نے ہاتھ پکڑ کر پہنچا دیا، یہان نہایت عمدہ خوشبو آرہی تھی[2]، اس واقعہ سے جہان ہارون کے تعیش کا اندازہ ہوتا ہے، وہان اسکی علماء نوازی اور قدردانی کا بھی ثبوت ملتا ہے،

ذوقِ شعری | اُن کے ذوقِ شعری اور جذباتِ لطیفہ کے مظاہر اُن کے مختلف سامانون مین نظر آتے تھے، چنانچہ کپڑون، قمیص کے دامنون، چادر کے حاشیون، آستینون، عورتون کے پیشانی بند، طرے کی پیٹیون، دستانون، گلوبندون، جوتون، موزون، رومالون، فرش وفروش، تکیون، پردون، نشست کے چبوترون، جلسہ گاہون، مقصورون، قبون، گدون، پیالون، پیمانون، سونے چاندی اور چینی کے برتنون، آلاتِ موسیقی اور دوسرے مختلف سامانون پر اُن کے مناسب نہایت موزون اشعار تحریر ہوتے تھے، خصوصاً عورتون اور لونڈیون کے لباسون اور زیب وزینت کے سامانون پر نہایت عمدہ عاشقانہ اشعار لکھے جاتے تھے، لونڈیون کے رخسارون اور پیشانیون پر مشک، زعفران اور سنہرے رنگ سے نہایت دلکش اشعار لکھے جاتے تھے، محمد بن اسحٰق نے کتاب الموشی مین اسکی پوری تفصیل لکھی ہے اور اشعار بھی نقل کئے ہین،

تقریبات کی اولوالعزمیان | تقریبات مین اس اولوالعزمی اور حوصلہ سے کام لیتے تھے، کہ اسراف کی حد سے بھی بڑھ جاتا تھا، وزیر دولت حسن بن سہل کی لڑکی کی شادی مامون کے ساتھ جس شان وشوکت کیساتھ ہوئی، وہ تاریخ مین یادگار رہے گی، ابن خلکان کا بیان ہے کہ اس تقریب مین حسن نے جس حوصلہ سے ملازمت

---

[1] نشوار المحاضرہ ص ۳۳۳، [2] تاریخ خطیب ج ۵ ص ۲۴۳،

کی ولیمہ مقتدر نے جو سامان عطا کئے اس کی مثال گذشتہ زمانہ میں نہیں ملتی، ہاشمی امراء افسران فوج کاتبوں اور دوسرے بڑے عہدہ داروں میں مشک کی گولیاں لٹائی گئیں، ہر گولی میں کاغذ کا پرزہ لپٹا ہوا تھا جس میں زمین جائداد، لونڈی، غلام، گھوڑے، اور مختلف چیزیں لکھی ہوئی تھیں، جس کے ہاتھ جو گولی پڑی تھی، اس میں جو کچھ تحریر ہوتا تھا، اسی وقت مل جاتا تھا، عام لوگوں میں روپیہ پیسے اور مشک وغیرہ کے گولے لٹائے گئے، بارات میں بے شمار آدمی تھے، ان میں بڑے بڑے امراء اور افسروں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ملازمین تک کوئی بھی محروم نہیں رہا،

شادی کے بعد مامون مع بارات کے انیس دن سسرال میں رہا، حسن بن سہل نے اس پوری مدت میں بارات کی بڑی فیاضی سے مدارات کی، رخصتی کے وقت تمام امراء و عمائد کو علیحدہ انعامات دیئے مامون کیلئے سنہری کام کا فرش بچھایا گیا تھا، جیسے ہی اس نے اس پر قدم رکھا، اس کے اوپر بڑے بڑے موتی نچھاور کئے، شب عروسی کی روشنی میں چالیس من موم بتیاں سونے کی لگنوں میں روشن کی گئیں[1]

مقتدر کی ماں نے اپنے صغیر السن پوتے کی ایک تقریب میں چاندی کا ایک چھوٹا سا گاؤں بنوایا تھا جس کے مکانات، کھیت، فصلیں، درخت، پھل، تالاب، نہریں، گائے، بیل، گھوڑے، اونٹ اور دوسرے مویشی وغیرہ تمام چیزیں جو گاؤں میں ہوتی ہیں چاندی کی تھیں،[2]

اس تقریب میں مقتدر نے وزیر ابن فرات کو کھانے کے تین خوان بھیجے تھے، بڑا خوان پچاس بالشت کا تھا، اس کو کئی خادم اٹھائے ہوئے تھے، دو تھال طلائی کام چوبی کے، ایک تھال سبز اور تین سفید ریشمی کپڑوں کے، اور ایک سونے کی سینی میں دینار سرخ، اور سونے کے بنے ہوئے بادام، خرما، پستے اور دوسرے میوے تھے، جن کی قیمت پانچ ہزار اشرفی تھی،[3]

اس زمانہ میں سونے کے میووں اور پھلوں کے تحفے کا عام رواج تھا، صاحب استطاعت ذوق

---

[1] ابن خلکان ج اول ص ۳۰۷ و ۳۰۸ و [2] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۱۱ ص ۱۰، [3] کتاب الوزراء ص ۱۶۵

اُنہیں بھی اسی قسم کی فیاضیاں کرتے تھے، بصرہ کے ایک شخص کا بیان ہے کہ بغداد کا ایک دلال بڑا امیر تھا، ایک شب کو مجھے راستہ میں ملا، اس وقت وہ بغداد کی مشہور مغنیہ بدعہ کے یہاں جا رہا تھا، مجھکو اس کی آستین کے اندر کچھ بھرا ہوا معلوم ہوا، میں نے پوچھا کیا ہے؟ اُس نے کہا خراسان کی ندّ (ایک قسم کی خوشبو) ہے اسکو لیجا کر بدعہ پر تصدق کرونگا، میں نے کہا تھوڑی سی مجھے بھی دے دو، اوس نے تھوڑا سا نکالکر میری آستین میں ڈال دیا، میں بخور لیے ہوئے گھر چلا آیا، یہاں آکر دیکھا تو سونے کے بادام چاندی کی شکر عنبر کے بیج، اور ند کے منقی تھے، اس لیے دوسرے دن لیجاکر میں نے اوس کو واپس کرنا چاہا اس نے کہا یہ واپس کرنے کی کونسی چیز ہے میرے پاس جس قدر تھا سب بدعہ اور اسکی لونڈیوں میں تقسیم کر دیا۔[1]

مقتدر باللہ کا ایک دربار

قوموں اور حکومتوں کے دور زوال میں اُن کے تمدنی تکلفات عہد عروج سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں، یہی حال عباسی دور کا بھی تھا، گو سیاسی اور تمدنی دونوں حیثیتوں سے ہارون رشید کا زمانہ، دولت عباسیہ کا دور زریں شمار کیا جاتا ہے، لیکن دور زوال کے خلفاء کا ظاہری ٹھاٹھ اور زندگی کے تکلفات اس دور سے بھی زیادہ بڑھ گئے تھے، اور اوس کا سب سے بڑا نمونہ مقتدر باللہ (۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ) تھا، اس کی سیاسی قوت کا یہ حال تھا، کہ اس کا پورا زمانہ شورش و انقلاب میں گذرا، دو مرتبہ تخت سے اوتارا گیا، اور تیسری مرتبہ جان سے ہاتھ دھونا پڑا، لیکن ظاہری شان و شکوہ اور تمدنی تکلفات میں اوس نے ہارون کے عہد کو بھی ماند کر دیا تھا،

عباسی دور کے مشہور ادیب و کاتب ہلال بن محسن صابی نے کتاب الوزراء میں اس کی شان و شوکت کے نہایت مفصل حالات لکھے ہیں، مگر وہ بہت طویل ہیں، اس کے ایک دربار کا حال جو اس نے ۳۰۵ھ میں رومی سفیروں کی آمد کے سلسلہ میں منعقد کیا تھا، اکثر مورخوں نے تحریر کیا ہے، اس سے اس کی شان و شوکت اور تمدنی تکلفات کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اس لیے مورخ خطیب کے بیان سے

---

[1] نشوار المحاضرہ ص [illegible]

نقل کیا جاتا ہے، یہ معلوم ہو چکا ہے کہ بغداد میں بکثرت شاہی محلات تھے، اور مقتدر کے زمانہ میں
ان کی تعداد اور بڑھ گئی تھی، اس دربار کے موقع پر ۲۳ محل آراستہ کئے گئے تھے، اور ان کا کوئی گوشہ
اور بام و در زینت و آرایش سے خالی نہ تھا، فرش و فروش کی تعداد بائیس ہزار اور پردوں کی تعداد
جو دروازوں اور دوسرے مقاموں پر آویزان کئے گئے تھے، اڑتیس ہزار تھی، یہ تمام پردے کارچوبی
اور زرنگار تھے، جن پر مختلف حیوانات اور پرندوں کی تصویریں اور نقش و نگار کاڑھے ہوئے تھے،

محلوں کے باہر ایک لاکھ ساٹھ ہزار مسلح فوجیں صف بستہ تھیں، اور خاص قصر خلافت کے
دور و یہ پانچ پانچ سو زرین پوش سوار تھے، جن کے گھوڑوں کے ساز نقرئی و طلائی اور ان پر دیبا
کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں، ہر گھوڑے کی لگام ایک وردی پوش سائیس کے ہاتھ میں تھی، محلوں کے اندر
بارہ ہزار غلام اور خدام شاہی زرق برق وردیوں میں ملبوس، زریں پیٹیوں میں تلواریں لٹکائے جگہ جگہ
متعین تھے،

قصر جوسق سے متعلق ایک باغ تھا، اس میں ایک وسیع حوض تھا، جس کے چاروں طرف چھوٹی
چھوٹی نہریں نکلی تھیں، اس حوض اور نہروں میں پارے کی قلعی تھی، جس کی چمک سے پانی میں سیال
چاندی کا دھوکا ہوتا تھا، حوض میں ساز و سامان سے آراستہ چار چھوٹی چھوٹی کشتیاں تھیں، جن میں
دیبا کے زریں گدے لگے اور ان پر ریشمی کپڑے پڑے ہوتے تھے، باغ میں صرف کھجور کے پانسو درختوں کی چار
قطاریں تھیں، اور یہ سب درخت ایک قد کے تھے، اور ان کے تنوں پر منقش ساج کی لکڑی منڈھی
ہوئی تھی، ایک عمارۃ دار الشجرہ کے نام سے موسوم تھی، اس کے وسط میں ایک حوض تھا، حوض میں
ایک درخت نصب تھا، جس کی شاخیں سونے اور چاندی کی، اور پھول پتے مختلف الالوان جواہرات
کے تھے، شاخوں پر سونے کی چڑیاں بیٹھی تھیں، ان میں یہ صنعت رکھی گئی تھی، کہ شاخیں ہوا کی جنبش
سے اصلی شاخوں کی طرح جھومتی تھیں، اور چڑیاں ہوا بھرنے سے چہچہاتی تھیں،

اس سے متصل چند سو نیزہ بردار سواروں کے بالمقابل مجسمے تھے، جو مقناطیسی طریقے سے اس طرح حرکت کرتے تھے، کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا، کہ اپنے مقابل پر حملہ کر رہے ہیں،

قصر فردوس آرایش و زیبایش کے لحاظ سے اسم با مسمیٰ معلوم ہوتا تھا، اس میں سونے کے دس ہزار جوشن، خود، زرہیں، اور دوسرے اسلحہ آویزاں تھے، اس کے سامنے دجلہ میں رنگ برنگ کی کشتیاں اور بجرے رواں تھے،

شاہی محل سے متعلق ایک جانور خانہ تھا، اس کے وحشی چوپائے اس قدر سدھے ہوتے تھے، کہ قریب آکر ہاتھوں سے روٹی اور چارہ لیتے تھے، ایک سو درندے تھے، جن کی گردنوں میں زنجیریں پڑی تھیں،

ارکین و عمائد سلطنت کے محلات اتنے آراستہ و پیراستہ تھے کہ ان پر قصر خلافت کا دھوکا ہوتا تھا، چنانچہ جب رومی سفیر حاجب دو[...]ت نصر القشوری کے محل میں پہنچا تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر اس کو خلیفہ کا قصر سمجھا، اس کے بعد وزیر ابن فرات کے محل کی عظمت و شان اور زینت و آرایش کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ یہ ضرور خلیفہ کا محل ہو گا، مگر اسے یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ خلیفہ کا نہیں بلکہ وزیر کا محل ہے،

خود مقتدر دجلہ کے کنارے قصر التاج میں تھا، اس کی زینت و آرایش حد توصیف سے خارج تھی، وہ آبنوس کے مرصع تخت پر بیٹھا تھا، اس کے داہنے بائیں جواہرات کے اٹھارہ ہار آویزاں تھے، یہ جواہرات بڑے گرانبہا، اور سب ایک قد کے تھے، اُن کی جوت سے رات کو دن کا عالم نظر آتا تھا،[1]

خلفاء کی بیویوں کے تکلفات اور عیش و تنعم کے سامانوں کی کوئی انتہا نہ تھی، ہارون کی بیوی زبیدہ کے لئے دیبا کا ایک کارچوبی فرش تیار کیا گیا تھا جس میں یاقوت اور دوسرے قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے، اس کی قیمت دس لاکھ تھی،

---

[1] خطیب نے اس کی بڑی مفصل تفصیل لکھی ہے، ہم نے صرف ضروری خلاصہ نقل کیا ہے، تفصیل کیلئے دیکھو تاریخ بغداد جلد اول ص ۱۰۰ تا ۱۰۴،

اسی طریقہ سے مستعین کی ماں نے ایک فرش بنوایا تھا، اس میں سونے کے تارون سے جوانات اور طیور کی تصویرین کاڑھی گئی تھین اور اُن کی آنکھون مین یاقوت اور جواہرات جڑے تھے، اس کی قیمت کئی کروڑ روپیہ تھی" (المستطرف ج اول ص ۱۳۴)

اہل بغداد کی عام زندگی بغداد نہایت دولت مند اور اسی کے ساتھ بڑا ارزان شہر تھا، ایک غریب آدمی ایک پیسہ روز مین آسانی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا تھا، اس لئے فارغ البالی اور خوشحالی صرف طبقہ امراء کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ اپنی حیثیت و وسعت کے مطابق ہر طبقہ مطمئن اور مسرور زندگی بسر کرتا تھا، اور پورا بغداد گہوارہ عیش تھا،

ابن ہلال کا بیان ہے کہ مین اپنے گھر محلہ باب المراتب سے سوار ہو کر نکلتا، اور محلہ شماسیہ مین معز الدولہ کے محل تک چلا جاتا، اس طویل مسافت مین مسلسل بازار آباد محلے اور گھنے درختون کی چھاؤن تھی، یہی حال مغربی سمت کا تھا، دجلہ کے ساحل پر دور دور یہ عمارتین، مرتب باغات اور چھوٹی نہرون کا جال بچھا ہوا تھا، اور کوئی گھر موسیقی کے ترانون اور لطف و مسرت کے شادیانون سے خالی نہ ملتا تھا'

ابو الوفا ابن عقیل کا بیان ہے کہ ساحلی حصہ کی آبادی کے مکانون کے سامنے دجلہ لہرین مارتا تھا' گھرون کے سامنے کی چھوٹی نہرون مین بطین خوش فعلیان کرتی تھین، اور موسیقی کے ترانے دجلہ سے چلنے والی آبی چکیون اور چرخیون اور گھر کے لونڈی غلامون کی آوازین مل کر عجب لطف پیدا کرتی تھین،....... مجھے اکثر بجرے مین ان مکانون کے سامنے سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہے، باب الطاق سے لیکر باب المراتب تک ہر مکان مین موسیقی کے نغمے گونجا کرتے تھے، ساحلی مکانات مین ہر مکان کے سامنے صاحب خانہ کے خوبصورت بجرے تیرا کرتے تھے، اور خشکی کے رخ کے صدر دروازے پر ساز و سامان سے آراستہ سواری تیار رہتی تھی، ان کی پر لطف زندگی سے معلوم ہوتا تھا کہ ہر دن کوئی تقریب ہے اسی کے ساتھ ہر گھر مین قرأت کی مجلسین ہوتی تھین، اور خوش الحان قاری کرسیون پر بیٹھ کر

قرأت کرتے تھے۔[1]

عوام کی تفریحات اور دلچسپیاں جدا تھیں، اور وہ خواص کے مذاق کے ساتھ بدلتی رہتی تھیں، ان میں کشتی، کشتی رانی اور تیراکی کا عام مذاق تھا، اور وہ اسمیں طرح طرح کے کمالات دکھاتے تھے، مثلاً تیراک جلتی ہوئی انگیٹھی ہاتھ میں لے کر تیرتا تھا، اور اس پر ہانڈی میں گوشت پکتا رہتا تھا، اور اس وقت تک تیرتا رہتا جب تک گوشت نہ تیار ہو جاتا،[1] عوام میں مضحکات اور مسخرے پن کا بڑا مذاق تھا، اور ان کی مخصوص مجلسیں ہوتی تھیں، اس مذاق نے مسخروں کی ایک جماعت پیدا کردی، جو مضحکین کہلاتے تھے، اور اپنے مضحکات سے عوام کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتے تھے، ہارون رشید کے زمانہ میں ابن ابی مریم، منتصم کے عہد میں ابراہیم الخصی اور متوکل کے دور میں عبادۃ المخنث مشہور مسخرے تھے، اُن کے واقعات اغانی میں مذکور ہیں۔

آداب و تہذیب تہذیب و تمدن محض مادی سر و سامان اور تعیش و تنعم کے تکلفات کا نام نہیں، اس کی اصلی روح اخلاق کی تہذیب و شائستگی ہے، اس اعتبار سے بھی عباسی تہذیب نہایت بلند تھی، اور اخلاقی حیثیت سے اس کے خاص خاص آداب تھے، جس کی پابندی ہر مہذب شخص کے لئے ضروری تھی، اور یہ آداب محض رسمی تکلفات تک محدود نہ تھے، بلکہ اس میں اخلاقی عناصر بھی تھے، اس تہذیب کا مرکز بغداد تھا، اور اس کے لئے "تظرف" "ظرف" اور "ظریف" کی اصطلاح تھی، اس کے مفہوم میں تہذیب کے ظاہری آداب و معنوی خصوصیات سب داخل ہیں، ابو الطیب محمد بن اسحاق المعروف بہ وشاء نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب الموشی لکھی ہے، جس میں اس کے تمام اجزاء تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں، ان سب کو نقل کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، اس لئے آیندہ سطور میں اس کے ایک باب کا جس میں مہذب اور شائستہ انسانوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، خلاصہ نقل کیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

---

[1] مناقب بغداد ص ۲۰ [2] خلاصہ تاریخ العراق ص ۱۱۱

شایستہ انسان مکارم اخلاق اور بڑائی کے حصول مین صبر و استقامت سے کام لیتے ہین پست اور ادنی درجہ کی باتون سے بچتے، اور بلند اخلاق و پسندیدہ خصائل اختیار کرتے ہین، ذلیل باتون کو ترک اور اونچی باتون کو اختیار کرتے ہین، مہذب انسان کے لئے دوسرے کی بات مین دخل در معقولات کرنا، درمیان سے کسی کی بات کاٹنا، کسی کے بھید کی ٹوہ لگانا، پوشیدہ باتون کے متعلق سوال کرنا معیوب ہے، کسی دوسرے شخص کے سامنے اور مجمع مین ناک صاف کرنا، تھوکنا، جماہی لینا، ناک سٹرکنا ڈکار لینا، انگڑائی لینا، تالی بجانا، جسم کھجلانا، انگلیان چٹخانا، ناک چھونا ناپسندیدہ افعال ہین، مہذب انسان کسی کی نگاہ کے سامنے بیت الخلا نہین جاتے، اور نہ پیشاب کے لئے بیٹھتے ہین، اکڑ کر بیٹھنا، تیز چلنا، راستہ مین ادھر ادھر نگاہ ڈالنا معیوب ہے، وہ گندے مقامات پر پاؤن کی گرد نہین جھاڑتے مجلس مین ایسی جگہ نہین بیٹھتے، جہان سے اٹھائے جانے کا اندیشہ ہو، کسی دوکان، مسجد اور سبیل کا پانی نہین پیتے، نانبائی، ہریسہ، اور اس قسم کی دوسری دوکانون مین نہین جاتے، بازاری کھانے کی چیزین نہین استعمال کرتے، شارع عام، بازارون اور مسجدون مین نہین کھاتے، حمامون مین عام لوگون کی طرح نہین نہاتے، کسی شایستہ انسان کے لئے پاجامہ کے بغیر ازار مین باہر نکلنا، رومال کا، یا ڈھیلا لٹکا ہوا، ازار باندھنا، لین دین اور خرید و فروخت مین حجت کرنا، اہل حرفہ سے شرما پر مال لینا، کرایہ کے گدھے پر سوار ہونا، ادنی درجہ کے آدمیون سے اختلاط رکھنا، دوستون کو بُرا کہنا، غیبت کرنا، کسی کا برائی سے ذکر کرنا، کسی کا راز فاش کرنا، بدعہدی اور وعدہ خلافی کرنا، دو آدمیون مین فساد ڈلوانا، دوستون مین لڑانا، حکام سے چغلی کھانا، کسی شخص کی جانب اشارہ بازی کرنا، کسی کی بے حرمتی کرنا، چوری کرنا، جھوٹ بولنا، شک و شبہ مین ڈالنے والی باتین کرنا، فسق و فجور کا اعلان کرنا، فحش کلامی، دوست اور پڑوسی کی بے حرمتی کرنا، سخت معیوب ہے،

مہذب انسان کے لئے بدن کی صفائی، طہارت، خوش لباسی، اور عطر کا استعمال ضروری ہے،

ان کا کپڑا پھٹا میلا، گریبان چاک، ناخن اور بال بڑھے، جسم گندہ اور ہاتھ میلا نہ ہونا چاہئے، منہ ناک آنکھ، تھوک، ناک وکیچڑ سے صاف رہنا چاہئے،

دوستون کے ساتھ پابندی عہد، ایفاے وعدہ، وفاداری مین استواری، احباب کے ساتھ حسن سلوک، اُن کی مدد، عام ملنے والون سے کشادہ روئی، غیر حاضر احباب کی تلاش وجستجو، جسم اور مال سے اس کی مدد، بھائیون کے بار کی تخفیف، پڑوسیون کی حمایت، انکی جانب سے مدافعت، بڑون کی بُرائی سے عفو ودرگذر، نیکون کی بھلائی کی احسان شناسی، چھوٹون سے خوش اخلاقی، بڑون کی عزت وتکریم، تہذیب کی خصوصیات مین ہے،

تہذیب وشرافت محض لذت اندوزی، لطف وتفریح، اور فخر وحسب کا نام نہین، بلکہ ادب اور شرافت کے طریقون پر چلنے کا نام ہے، بعض علما رنے لوگون کو کھلانا پلانا، اُن کی تکلیفیں دور کرنا، داد ودہش، خندہ جبینی، پاکدامنی، بُری باتون سے پرہیز، ادب وتہذیب، پاکیزگی اخلاق، نااہل کی صحبت سے دوری، بلند نظری، بلند حوصلگی، بدسلوکی کرنے والون کے ساتھ احسان، سلوک، احسان کرنیوالون کیساتھ حسنِ معاوضہ، اہلِ حاجت کی حاجت برآری، مزاج کی لینت ونرمی، جملہ امور مین لطف ومدارات، اعتدال ومیانہ روی، اور خوش خلقی کو شرافت کے اوصاف قرار دیا ہے،

مہذب انسان اپنے اغراض ومقاصد اور پیش نظر کامون کا اظہار واعلان نہین کرتے، بلکہ اُن کو مخفی رکھتے ہین، اور حسنِ تدبیر اور مہذب طریقون سے اُن کو حاصل کرتے، اور تدبیر کو مناسب موقع ومحل پر استعمال کرتے ہین، اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہین،

اُن کے ہدایا وتحائف جو وہ ایک دوسرے کے پاس بھیجتے ہین، بظاہر حقیر معلوم ہوتے ہین، مثلاً سیب یا بہیون کا ایک دانہ، کوئی لطیف خوشبو، گلاب کی ایک شاخ، نرگس کا ایک پھول، تبرک کا ایک [illegible] کا ایک ٹکڑا، اور اسی قبیل کی چھوٹی چھوٹی مگر لطیف چیزین، اُن کا مرغوب اور پسندیدہ

تحفہ ہیں، یہ لوگ بڑے بڑے ہدیون کے بجائے چھوٹے اور لطیف ہدیے زیادہ پسند، اور ان کی زیادہ قدر کرتے ہین،

اُن کے خطوط اور تحریرین نہایت دلچسپ اور اس کے الفاظ دلفریب ہوتے ہین، تحریر کے عنوانون کو پرلطف مثالون اور نوادر و لطائف سے دلکش بناتے ہین، تحریر نہایت دلآویز، پرلطف شکوہ وشکایت حسن طلب اور سنجیدہ و مہذب مذاق پر مشتمل ہوتی ہے جس کے ذریعہ دور کے لوگ قریب ہو جاتے ہین، اور مشکلات آسان معلوم ہوتی ہین،

ان خطوط کو وہ بیش قیمت اور نفیس ریشمی رومالون پر لکھتے ہین، اور اس کو مشک وعنبر اور زعفران سے معطر کرتے، اور اس پر سنہری افشان چھڑکتے ہین، (کتاب الموشی ص ۱۵۷، تا ۱۰۲ ملخصاً)

دار المصنفین کی نئی کتاب

اقبال کامل

از

مولانا عبد السلام ندوی

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابین لکھی گئین، لیکن ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایان نہ ہوسکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اس مین اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری، پھر فارسی شاعری پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیان دکھلائی گئی ہین، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعون یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف یعنی عورت، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ضخامت چار سو صفحات، قیمت :- "منیجر"

اسلامی حکمرانون سے مسلمانون کی ایک بیجا شکایت

از
مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(۴)

دمشق کی مشہور تاریخی مسجد جامع بنی امیہ جو آج بھی اپنی پوری شان وشوکت عظمت وابہت کے ساتھ موجود ہے، عام تاریخون مین کس نے نہین پڑھا ہے، کہ مروانیون کے متعلق العنان فرمانروا عبد الملک نے اس مسجد کے لیے عیسائیون کے گرجا یوحنا نامی کے متعلق عیسائیون سے خواہش ظاہر کی کہ جتنی رقم بھی طلب کرو مین ادا کر دونگا، مجھے اجازت دو کہ اس گرجا کی زمین کو مین مسجد مین شریک کر دون، لیکن عیسائی راضی نہ ہوئے، عبد الملک بھی خاموش ہوگیا، پھر جب ولید بن عبد الملک نے اپنی حکومت کے زمانہ مین اسی خواہش کو عیسائیون کے سامنے پیش کیا، اور بہت زیادہ غیر معمولی معاوضہ ادا کرنے پر آمادہ ہوا، مگر عیسائیون نے حسب دستور جب انکار کیا، تو ولید کو غصہ آگیا، اور کہنے لگا کہ تم لوگ گویا اس پر مجبور کر رہے ہو کہ زبردستی مین اس گرجے کو منہدم کرا دون، البلاذری نے لکھا ہے کہ ولید کی اس دھمکی پر عیسائیون نے کہا کہ

ان من ھدم کنیسۃ جن او — گرجے کو جو ڈھاتا اس کو جنون ہو جاتا ہے
اصابتہ عاھۃ (ص ۱۳۲) — یا کسی سخت بیماری مین مبتلا ہو جاتا ہے،

عیسائیون کی اسی دھمکی نے ولید کی دھمکی کو جو صرف لفظی دھمکی تھی، خواہ مخواہ واقعہ کی شکل دے دی،

لکھا ہے کہ خود اپنے ہاتھ میں پھاوڑا لے کر گرجا کی دیوار پر ولید چلانے لگا، اور یوں یوحنا کا گرجا منہدم ہو گیا، اور اس کی زمین مسجد میں شریک کر دی گئی،

اب اس کو عیسائیوں کی غلط دھمکی کا نتیجہ قرار دیجیے، یا ولید کے راج ہٹ کا نتیجہ سمجھیے، یہ فعل اسلامی ضوابط کے لحاظ سے قطعاً غلط تھا، کچھ ہی دن بعد عمر بن عبد العزیز کے ہاتھ میں مروانی حکومت کی باگ جب آئی، تو آپ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کی اس مسجد میں گرجے کی جو زمین شریک ہو گئی ہے وہ عیسائیوں کو واپس دے دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے لاکھوں لاکھ روپیہ کا مالی نقصان ہی ... نہیں ہو رہا تھا، بلکہ دنیا کی تعمیری عجائبات میں جو عمارت اس وقت تک شمار ہوتی ہے اس کی صورت بھی بگڑ جاتی، ماسوا اس کے عام مسلمانوں کے لیے یہ خیال بھی سخت تکلیف دہ تھا، کہ

نهدم مسجدنا اذ نا فيه وصلينا فيه جمعة — کیا اپنی ایک ایسی مسجد کو ہم اپنے ہاتھوں ڈھا دیں جس میں ہم اذان دیتے رہے اور نمازیں پڑھتے رہے

مگر مسلمانوں کے دینی جذبات کی عمر بن عبد العزیز کی دینی عقل نے قطعاً پروا نہ کی، اور گرجے کی زمین کی واپسی پر ان کا اصرار بہرحال باقی رہا، کوئی دوسری صورت مسلمانوں کے لیے اس کے سوا باقی نہ رہی کہ باوجود حاکم قوم ہونے کے اپنے محکوم عیسائیوں کی خوشامد درآمد کریں، یہی تدبیر آخر اختیار کی گئی، وقت کے علمائے اسلام جن کی قیادت سلیمان بن حبیب المحاربی نے کی عیسائیوں کے پاس پہنچے، اور منت و سماجت سے کسی نہ کسی طرح عیسائیوں کو راضی کر لیا گیا کہ اس مطالبہ سے دست بردار ہو جائیں، عیسائیوں نے علمائے اسلام کے اس وفد کی بات مان لی، عمر بن عبد العزیز کی خدمت میں عیسائیوں کا راضی نامہ جب پیش ہوا، تو

فسر بذلك وامضاه — وہ اس پر خوش ہوئے اور راضی نامہ کے مطابق فرمان جاری کیا،

اور یہ تو خیر ایک گرجا یا ایک مکان کا قصہ ہے، ذرا خیال تو کیجیے سمرقند جیسے عظیم شہر کا، مسلمانوں

کا مشہور سپہ سالار قتیبہ اس کو فتح کر چکا ہے، خراسان کے اس مشہور مرکزی شہر میں مسلمان آباد ہو چکے ہیں، مسجدوں اور مدرسوں[1] سے شہر معمور ہو چکا ہے، عمر بن عبدالعزیزؓ ہی کی خلافت کا زمانہ ہے، سمرقند کے غیر مسلم طبقہ کا ایک وفد خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ معروضہ پیش کرتا ہے، کہ

"غدر اور عہد شکنی سے کام لے کر قتیبہ نے ہمارے شہر پر قبضہ کیا، اور مسلمانوں کو اس شہر میں اوس نے آباد کیا ہے"؛

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے وفد کے اس معروضہ کو حاکم سمرقند کے پاس اس فرمان کے ساتھ واپس کیا کہ

"عدالت کے کسی قاضی کے سپرد سمرقند کا معاملہ کر دیا جائے، اور حکم دیا جائے، کہ واقعی ان لوگون کے ساتھ کیا صورت پیش آئی ہے، تحقیقات سے اگر ثابت ہو جائے، کہ وفد والون کا دعوی صحیح ہے، تو اسی وقت مسلمانون کو سمرقند چھوڑ دینے پر مجبور کیا جائے"،

اس فرمان کے ساتھ وفد حاکم سمرقند کے پاس واپس لوٹا، جمیع بن حاضر نامی قاضی کو بلا کر مقدمہ حاکم نے اُن کے سپرد کر دیا،

قاضی جمیع نے بھی ہر قسم کی جنبہ داری سے الگ ہو کر مقدمہ کی چھان بین شروع کی، شہادتون اور دوسرے دلائل کی روشنی میں وہ اسی نتیجہ تک پہونچے کہ واقعہ سمرقند والون کے ساتھ غدر کیا گیا ہے، اسی بنیاد پر انھون نے فیصلہ صادر کیا کہ

---

[1] البلاذری نے لکھا ہے کہ قتیبہ نے سمرقند میں جن مسلمانون کو آباد کیا تھا، ان ہی میں ضحاک بن مزاحم بھی تھے، اور ضحاک بن مزاحم کے متعلق اس واقعہ کا ذکر تو تقریباً اکثر مورخین نے کیا ہے، کہ ان کے مکتب خانون میں تعلیم پانیوالے طلبہ کی تعداد تین ہزار تھی، خچر پر سوار ہو کر طلبہ میں وہ گشت کرتے تھے، مگر حوالہ اس وقت محفوظ نہ رہا، کسی مستند کتاب میں میں نے پڑھا ہے، کہ تین ہزار طلبہ کے سوا پانسو تعداد طالبات یعنی تعلیم پانے والی بچیون کی بھی تھی یہ حال پہلی صدی ہجری کے وسطانی عہد کا تھا،

"مسلمان سمرقند کو چھوڑ کر فوراً باہر نکل جائیں، اور اس کے بعد سمرقند والوں کو آزادی دیجائے کہ مسلمانوں کے ساتھ جو معاملہ چاہیں" اختیار کریں، اسی طرح شہر سے نکل جانے کے بعد مسلمانوں کو بھی اختیار ہوگا، جو طرز عمل چاہیں، اختیار کریں"

الغرض شہر سے نکلنے کے بعد "منابذۃ علی السواء" کے اصول پر قاضی نے فیصلہ کیا، کہ عمل کیا جائے، سمرقند کے غیر مسلم باشندوں کے سامنے یہ فیصلہ جب پیش ہوا، تو انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ نکل جانے کے بعد مسلمانوں نے پھر شہر پر اگر حملہ کیا، تو خواہ مخواہ جنگ کے شعلوں میں ہم گھر جائیں گے، لکھا ہے کہ مشورے کے بعد حاکم کے سامنے ان لوگوں نے حاضر ہو کر اپنا یہ دعویٰ ان الفاظ میں پیش کیا کہ

"ہم جنگ کرنا نہیں چاہتے اور خوشی کے ساتھ سمرقند میں مسلمانوں کے قیام پر راضی ہیں"[1]

اور یوں بات ٹل گئی، ورنہ دنیا دیکھتی کہ سمرقند جیسے شہر میں آباد ہو جانے اور مساجد و مصلّے، مدارس و مکاتب کے قائم کر دینے کے بعد بھی معاہدے کی تکمیل کے لئے مسلمان محض اپنے دین کی وجہ سے باہر نکل آتے[2]، اور اس قسم کے قصے کچھ حضرت عمر بن عبد العزیز جیسے خلفاء کی حد تک محدود نہیں ہیں، اسی سمرقند ہی کے متعلق تاریخوں میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے، کہ خلیفہ معتصم باللہ عباسی کے زمانہ میں امام اور مؤذن کو خلیفہ کے حکم سے اٹھائے دُرّے لگائے گئے، کہ اسی سمرقند کے کسی آتش کدہ کو توڑ کر دونوں نے مسجد بنا دیا تھا[3]،

---

[1] البلاذری ص ۴۲۴ [2] آثار البلاد ص ۳۶۲ [3] دمشق کے گرجا یوحنا یا اریحا کے متعلق جیسے یہ صورت پیش آئی کہ عیسائیوں کی خواہ مخواہ دھمکی نے ولید کو آپے سے باہر کر دیا، البلاذری نے لکھا ہے، کہ سمرقند میں بھی لکڑی کے بنے ہوئے بتوں کے متعلق بھی قتیبہ کو یہی دھمکی دی گئی، کہ جو ان کو ہاتھ لگائے گا تباہ ہو جائے گا، قتیبہ نے، کہتے ہیں کہ ان کو جلا کر دکھا دیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے، میری غرض یہ ہے کہ دوسری قوموں کی عبادتگاہوں یا معبودوں کے متعلق جاہل مسلمانوں کی طرف سے ایسی غیر آئینی شکلیں اگر پیش آئی ہیں، تو تحقیق سے معلوم ہوگا، کہ اس قسم کے غلط دعووں نے خواہ مخواہ کی ضد پیدا کر کے نا واقفوں کو اس پر آمادہ کیا، ورنہ بُرا بھلا کہنے کی ممانعت غیر اقوام کے معبودوں کی قرآن میں جب کی گئی ہے، تو توڑنے پھوڑنے پر وہ کیسے راضی ہو سکتا ہے،

ممکن ہو کہ اب سمرقند میں ایسی کوئی عبادتگاہ نہ ملے جس میں بجائے خالق کے آگ جیسی مخلوق کی عبادت آدم کی اولاد کرتی ہو لیکن اس علاقے بلکہ ہمارے ایرانی علاقے کی عبادتگاہوں کے تعلقات میں یہ تبدیلی یعنی مخلوق سے اُن کا رشتہ توڑ کر خالق ہی کی عبادت کے لئے اب جو وہ مختص نظر آرہی ہے ؟ کیا اس انقلاب میں جبر اور زبردستی سے کام لیا گیا ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ ایرانی علاقے کی عبادتگاہوں کے اس انقلاب کو نہ جاننے والوں نے ابتداے اسلام کے پرجوش مجاہدین کے تشدد اور زبردستی کی طرف منسوب کر رکھا ہے، سمجھا دیا گیا ہے کہ قبضہ کرنے کے ساتھ ہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں یہ کارروائی کی گئی، باور کرایا جاتا ہے، کہ ایران اسی زمانہ میں غیر مسلموں سے خالی ہوگیا تھا،

لیکن نہ جاننے والوں یا جان کر انجان بننے والوں کی ان باتوں کو میں کیسے مان لوں جب مشاہدہ کرنے والوں کی کتابوں میں اُن کے ان مشاہدات کو پڑھتا ہوں، ابن حوقل جس کے متعلق بھی لی، اسٹرینج کا تخمینہ یہ ہے کہ سنہ عیسوی کے حساب سے اُس نے اپنی کتاب ۹۷۸ء یعنی دسویں صدی عیسوی میں لکھی ہے، دوسرے الفاظ میں جس کا مطلب یہی ہوا، کہ ظہور اسلام سے چار سو سال بعد جیسا کہ اس کا خود بیان ہے، اسلامی ممالک میں گھوم گھوم کر خود اپنے چشم دید حالات قلمبند کئے ہیں، بہرحال اسی جغرافیائی سفرنامے میں ابن حوقل ایران کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے ترجمہ کے ساتھ میں بجنسہ اس کے عربی الفاظ کو نقل کردیتا ہوں، جو یہ ہیں :-

واما بیوت نیرانها فانها لا تخلوا ناحیة ولا مدینة بفارس الا القلیل من بیوت النیران والمجوس اکثر الملل بھا (ص ۱۰۰، المسالک والممالک لابن حوقل)

(ترجمہ) باقی ایران کے آتشکدے سو حال یہ ہے کہ بجز ایران کے چند مقامات کے کوئی علاقہ یا کوئی شہر ان آتشکدوں سے خالی نہیں ہے، اور ایران میں دوسرے ادیان و مذاہب والوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تعداد مجوسیوں کی ہے

یہ سنی سنائی نہیں بلکہ اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے، دوسرا سیاح مسعودی ہے فتح ایران کے تین سو سال بعد اس نے ایران کی سیر کی ہے، اس کی بھی شہادت یہی ہے کہ

"عراق، فارس، کرمان، سجستان، خراسان، آذربائیجان اور آران یعنی ایران کے تمام حصوں میں آتشکدے اور چشمے بنے ہوئے اس نے پائے، (المسعودی مطبوعہ یورپ جلد ۴ ص ۸۶)

آرنلڈ نے نکولا دے خانکوف کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

"اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں بارہ ہزار خاندان آتش پرستوں کے کرمان میں موجود تھے، (ترجمہ آرنلڈ ص ۲۳۲)

جب دسویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک کی یہ گواہیاں ہمارے پاس موجود ہیں، تو بتایا جائے کہ محض دعویٰ کرنے والوں کے صرف دعویٰ کی بنیاد پر ہم یہ کیسے تسلیم کر لیں کہ آگ جیسی مخلوق کی جگہ آج ایران کی ہر عبادت گاہ میں صرف خالق کردگار کی عبادت کا نظارہ جو دیکھا جا رہا ہے' اس انقلاب میں زر اور زبردستی سے کام لیا گیا، دسویں صدی عیسوی تک بھی ایران کی اکثریت پارسیوں ہی کی تھی، تو جبر و ظلم و زیادتی کا یہ افسانہ افسانہ کے سوا اور بھی کچھ رہجاتا ہے؟ بلکہ واقعہ کی صحیح تصویر وہی ہے، کہ آتشکدوں کو ڈھا کر نہیں بلکہ ڈھانے والوں کو دُرّے کی سزا دے کر ایران کی عبادتگاہوں کے تعلق کے بدلنے میں مسلمانوں نے کامیابی حاصل کی،

اس قسم کی باتیں مثلاً یہی کہ معتصم نے آتشکدے کے ڈھانے کے جرم میں موذن اور امام کی کوڑے سے خبر لی، لوگ جب اُن کو سنتے ہیں تو دل میں اُن کے خیال گذرتا ہے، کہ اسلامی حمیت و غیرت کا جوش جن اسلامی حکمرانوں میں شاید ٹھنڈا پڑ گیا تھا، یہ باتیں اُن کے زمانہ کی ہیں، بلکہ اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم طبقات کے درخور اور بڑے سے بڑے منصب تک اُن کی رسائی کے قصوں سے تاریخیں جو معمور ہیں تو ان سارے قصوں میں سمجھا جاتا ہے، کہ دخل اسلام اور اسلام کے قوانین و تعلیمات کو

نہ تھا،[1] بلکہ جیسے جیسے اسلامی احکام سے لاپروائی حکمرانوں میں بڑھتی چلی گئی، غیر قوموں کے ساتھ رواداری میں زیادہ فراخ چشمی سے وہ کام کرنے لگے،

اور اسی غلط مفروضہ کو بنیاد بنا کر ہر اسلامی ملک کی تاریخ خصوصاً ہندوستان کی کچھ اس طریقہ سے مرتب کی گئی ہے، جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے، کہ اسلامی زندگی سے جو زیادہ قریب تھے، ان بادشاہوں نے دینی تعصب کی وجہ سے غیر قوموں پر ہر قسم کے ظلم و ستم کو روا رکھا، اور طرح طرح سے ان کو پریشان کیا، البتہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کا وزن علماً یا عملاً جن کے قلوب میں باقی نہ رہا تھا، یا کم ہو گیا تھا، اگر غیر مسلموں کے ساتھ کچھ رواداریاں ہوتی ہیں، تو اُن ہی کی طرف سے ہوتی ہیں، مگر کہنے والوں کی زبانوں، اور لکھنے والوں کے قلم کو کون روک سکتا ہے،

ابھی ابھی معتصم عباسی نہیں، بلکہ حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ کی حکومت کے زمانہ کے چند واقعات کا ذکر میں نے ہی آپ کے سامنے کیا ہے، آپ سُن چکے کہ جس مسجد میں مسلمان اذانیں دے رہے تھے، نمازیں پڑھ رہے تھے، اس مسجد تک کو گرجا بنانے پر عمر بن عبد العزیز کی بے دینی نہیں بلکہ دینداری مجبور کر رہی تھی، بلکہ پورے شہر سمرقند اور اس کی مسجدوں، مدرسوں تک کے چھوڑ دینے کا حکم مسلمانوں کو ان ہی عمر بن عبد العزیز کی بے دینی نے نہیں بلکہ دین ہی نے دلایا تھا، میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسلامی دین کے احترام کرنے والے سلاطین اور سختی کے ساتھ اس کے ایک ایک جزئیہ پر اصرار کرنے والے حکمرانوں میں عمر بن عبد العزیز کے سامنے بجز خلفاء راشدین کے کیا کوئی ٹھہر سکتا ہے؟ پھر غیر مسلم اقوام کے ساتھ رواداریوں کی یہ توجیہ کتنی غلط ہے، کہ اسلام سے بُعد اور دوری نے اُن کو پیدا کیا تھا؟ میں نے پہلے یہی کہا ہے کہ تیرہ صدیوں کے اس طویل زمانے میں دنیا کے مختلف حصوں کے اندر حکومت کرنے والے مسلمان سلاطین اور بادشاہوں کی تعداد ہزار ہا ہزار سے متجاوز ہے، کوئی اس کا دعویٰ

---

[1] حالانکہ ان بے چاروں کو یہ معلوم نہیں کہ صحابہ تک کے عہد میں کاتب کا عہدہ غیر مسلموں کو دیا جاتا تھا، ابو موسیٰ اشعری،

نہین کرسکتا کہ ہمارے سارے سلاطینِ سلف معصوم اور غلطیون سے پاک تھے، ہمارا نہ یہ عقیدہ ہی ہے نہ یہ واقعہ ہے، نہ ہوسکتا ہے، بادشاہون کو قانون کی گرفت سے یہی وجہ تو ہے کہ اسلام نے کبھی مستثنیٰ نہین قرار دیا، یقیناً اچھون کے ساتھ اُن مین بڑی تعداد ایسون کی بھی تھی، جنھون نے غیر مسلمون ہی کو کیا خود مسلمانون کو اپنے حرص و ہوا کا تختہ مشق بنانے مین کوئی کمی نہین کی، لیکن ان کی ستم رانیان جو مسلمانون پر ہوئین، ان کو جیسے اس دین کی طرف منسوب کرنا غلط ہے، جس کی طرف اپنے آپ کو وہ منسوب کرتے تھے اسی طرح غیر مسلمون کے ساتھ جو زیادتیان ان کی طرف سے ہوئی ہین، یقیناً بہت بڑا ظلم ہوگا، اگر اس دین کا اثر یا نتیجہ اُن کو قرار دیا جائے، جس کا پیرو اپنے آپ کو وہ ظاہر کرتے تھے،

افسوس ہے کہ تفصیل مین بات بہت پھیل جائے گی، لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام کی اشاعت و تبلیغ مین ہمیشہ ان اسلامی حکمرانون سے نقصان ہی پہنچا ہے، جنھون نے ان ذمہ داریون کی طرف سے لاپروائی برتی، جن کا مطالبہ اسلامی حکومت سے اسلام اور پیغمبر اسلام اور ان کے سچے اور رشید جانشینون نے باربار کیا ہے، اور آخر آخر وقت تک ان ذمہ داریون کی تکمیل کی تاکید فرماتے رہے ہین، اگر ان ذمہ داریون کو وہ اسی طرح پوری کرتے، جیسے عمرؓ بن عبد العزیز اور ان جیسے دوسرے دیندار خلفاء اور سلاطین نے کی، تو اسلامی جغرافیہ کا دائرہ موجودہ دائرہ سے کہین زیادہ وسیع ہو جاتا،

یہی عمرؒ بن عبد العزیز ہین جو مسجد کو گرجا بنانے پر ایک اسلامی شہر کو بخوشی و رضا غیر مسلمون کے حوالہ کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے، حالانکہ کل ڈھائی سال حکمرانی کا موقع اُن کو ملا ہے، لیکن آپ تاریخون کو اٹھا کر

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷۷) کا کاتب سکریٹری عیسائی تھا، حضرت معاویہؓ کا سکریٹری بھی سرجون عیسائی ہی تھا، جیسا کہ ہی سے آپ سُن چکے کہ عبد الملک مروانی سے پہلے دفاتر کی زبان رومی و ایرانی تھی، ظاہر ہے کہ بجز عیسائیون اور پارسیون کے بے چارے عرب ان دفاتر مین کیسے کام کرسکتے تھے، اگر ملازمت سے ان کو روکا گیا، تو دین کی وجہ سے نہین بلکہ رشوت کی بدعادت کی وجہ سے،

پڑھیئے، مشرق و مغرب میں اسلامی دین کے حلقے میں داخل ہونے والوں کی تعداد ان کے زمانہ میں جتنی زیادہ بڑھی ہے، خلفاے راشدین کے بعد میں تو نہیں جانتا کہ دین کی اشاعت عام میں اپنی کامیابی کسی دوسرے مسلمان بادشاہ یا حکمران کے زمانہ میں حاصل ہوئی ہو، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ

اسلم عامة البربر فی ولایته، ان کی حکمرانی ہی کے زمانہ میں افریقہ کے عام بربری قوموں نے اسلام قبول کیا، (جلد ۳ ص ۲۷)

اشارہ اسماعیل بن عبید اللہ کی حکومت کی طرف ہے جنھیں، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے افریقہ کا حاکم وگورنر بنا کر بھیجا تھا، اسی طرح عمرؓ بن عبد العزیز کے حالات میں مشرق مثلاً خراسان، ایران، سندھ وغیرہ کے متعلق اس قسم کی چیزیں تاریخ کی کتابوں میں بکثرت ملتی چلی جائیں گی، مثلاً عمرؓ بن عبد العزیز کے خراسانی گورنر جراح بن عبد الحمید کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ

فاسلم علی یدہ نحو اربعة آلاف چار ہزار آدمی نے صرف جراح کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، (جلد ۵ ص ۲۸۵)

سوال یہی ہے کہ مغرب و مشرق کے ان دور دراز علاقوں میں اسلام کی اشاعت اس وسیع پیمانے پر عمرؓ بن عبد العزیز کی ڈھائی سال کی حکومت میں جو ہوئی، تو ایک آدھ واقعہ بھی تاریخ سے نکال کر دکھایا جا سکتا ہے جس سے معلوم ہو کہ غیر مسلموں کا بال بھی اس سلسلہ میں کہیں غلطی سے کھینچا گیا ؟ اب میں کیا کہوں، عمرؓ بن عبد العزیزؒ کے اس گشتی فرمان کی نقل کتابوں میں آج تک نقل ہوتی چلی جارہی ہے، ترجمہ جس کا یہ ہے، فرمان حکام اور سلطنت کے ولاۃ و گورنروں کے نام تھا،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے بندے عمر امیر المومنین کی طرف سے:- سلام علیکم

"اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، اس کی تعریف وثنا کے بعد میں تم کو خصوصیت کے ساتھ

حکومت کے ان غیر مسلم باشندوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں جن کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری کی گئی ہے، کہ ان لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے، اور یہ کہ ان لوگوں میں جو سن رسیدہ اور ضعیف ہو جائیں، اور غریب ہو کر اُن کے مصارف کی پابجائی حکومت کی طرف سے کیجائے، اور اُن کے رشتہ داروں کو بھی اُن کی کفالت کی طرف توجہ دلائی جائے۔"

(ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۰)

گویا بیمہ وغیرہ کے جھگڑوں سے مسلمانوں کو اسلامی بیت المال کے نظام نے سبکدوش کر رکھا تھا، یہی اطمینان ملک کے ہر باشندے کو دلایا گیا تھا،

صرف غربا، اور معذوروں ہی کو نہیں، بلکہ اسلامی بیت المال سے جیسے وظائف وغیرہ مسلمانوں کو عطا کئے جاتے تھے، ابن سعد ہی نے لکھا ہے کہ غیر مسلموں کو بھی عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شریک کر لیا تھا، اسلامی سلاطین کے حالات میں لوگ جب پڑھتے ہیں، کہ انعام و اکرام کے سلسلہ میں فلاں غیر مسلم کو انھوں نے اتنی بڑی رقم دیدی تو خیال کر لیا جاتا ہے کہ اُن کے دینی رجحانات کی سستی کا یہ نتیجہ تھا، لیکن عمرؓ بن عبدالعزیز کے متعلق یہی سوچنے والے کیا سوچیں گے، جب ابن سعد سناتے ہیں کہ دس بیس روپے نہیں بلکہ

انه اعطی بطریقا الف دینار	ایک عیسائی پادری کو عمرؓ بن عبدالعزیز
(جلد ۵ ص ۲۵۰)	نے ہزار اشرفیاں دیں،

ہزار طلائی سکہ کی قیمت نقرئی سکے سے کیا ہوئی؟ اس کی تفصیل کے لئے سکوں کی تاریخ پڑھیے، اور یہ کوئی انفرادی معاملہ نہ تھا، عمرؓ بن عبدالعزیز کی طرف سے مدینہ منورہ کے دفتر کا جو دیوان تھا، نام ان کا عیسیٰ بن ابی عطا ہے، ابن سعد نے اُن کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

" بسا اوقات وہ بیت المال سے (غیر مسلم) لوگوں کی امداد کرتے تھے" (ص ۲۵۰)

اور سچ تو یہ ہے کہ ان سے پہلے بنی امیہ کے حکمرانوں نے جن کسی سے خلاف قانون ایک پیسہ بھی وصول کیا تھا، باتفاق مورخین عمر بن عبد العزیز نے اپنی حکومت کے زمانہ میں حساب کرکے ہر ایک تک اس کے حق کو پہنچایا، حتی کہ

" عراق کا خزانہ جب بازگشت کے رقوم کے بندوبست کرنے سے معذور ہو گیا، تو مرکز (شام) کے خزانہ سے مزید رقم بھجوائی گئی" (ص ۲۵۲)

ایسی صورت میں ان کی طرف سے کسی تشدد یا سختی کا احتمال ہی کیا ہے، مشہور ہے، کہ دیر سمعان جہاں مرض الموت میں عمر بن عبد العزیز مبتلا ہوئے، اور یقین ہو گیا، کہ اس مرض سے جان بر نہ ہو سکیں گے، تو اسی صحرائی میدان میں قبر کے لئے چاہا کہ زمین خرید لی جائے، معلوم ہوا کہ اس نواح کی ساری آراضی غیرمسلموں کی ہے، آپ نے اُن ہی میں سے ایک شخص کو طلب کرکے کہا کہ میری قبر کے لئے تھوڑی سی زمین کیا تم فروخت کر سکتے ہو، بے چارے نے کہا کہ

" امیر المومنین اس سے بڑی خوش نصیبی میری کیا ہو گی، کہ آپ میری زمین میں دفن ہوں، میں خوشی دل سے اس زمین کو بغیر قیمت کے پیش کرتا ہوں"

مگر عمر بن عبد العزیز مفت لینے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ دو اور بعضوں کا بیان ہے کہ دس اشرفیاں دے کر خلیفہ نے اپنی قبر کیلئے یہ زمین اس غیرمسلم سے خریدی (ابن سعد ص ۲۹۹) ان ہی کے حالات میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے علاقے سے عدن کے قریب کچھ لوگوں کو گرفتار کرکے غیر اسلامی علاقے کے لوگ لے گئے اور کہلا بھیجا کہ بلا فدیہ کے بغیر ان قیدیوں کو ہم رہا نہیں کر سکتے، عمر بن عبد العزیز نے اسی وقت روپیہ روانہ کیا، چالان میں لکھا ہوا تھا کہ

" اس رقم سے مرد و عورت، غلام اور اسلامی علاقے کے ان غیرمسلم باشندوں کا فدیہ ادا کیا جائے جن کی ذمہ دار ہماری حکومت ہے" (ابن سعد ص ۲۶۰)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ دشمنوں سے چھڑانے اور رہائی دلانے تک میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں کسی قسم کی تفریق جائز نہیں رکھی جاتی تھی،

یہ اور حسن سلوک و مراعات کے دوسرے طریقے ملک کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے جو اختیار کئے گئے تھے، کیا ان کی کُرد دینی زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کو اس میں دخل تھا، اور جس دین کی طرف سے اور دین پر چلنے والوں کی طرف سے اس نوعیت کے تجربات انسانی فطرت کو ہونگے، کیا اُن کے لازمی نتائج و اثرات سے وہ بچ سکتی ہے،

حقیقت تو یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ابن سعد ہی نے جو یہ لکھا ہے کہ

کتب ان تعمل الخانات بطریق خراسان، (جلد ۵ ص ۲۶۴)	کہ انھوں نے یہ فرمان نافذ کیا کہ خراسان کے راستہ میں سرائیں بنوائی جائیں،

خود ان کے اس کام کا جو اثر خراسان کے غیر مسلم باشندوں پر مرتب ہوا تھا، اس کا اظہار ہرات کے دہقان (دیسکم) نے خراسان کے گورنر اسد بن عبداللہ کے دربار میں جن لفظوں میں کیا تھا آج تک تاریخوں میں محفوظ ہے، دیس کم تحفے تحائف کے ساتھ گورنر کے دربار میں آیا تھا، اس کو تقریر کا موقع بھی گورنر کے دربار میں دیا گیا، اسی میں اس نے دوسرے امور کے ساتھ یہ بھی کہا تھا،

"میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کی کتخدائیت (حکمرانی) سے بہتر حکومت میں نے نہیں دیکھی، آپ نے اپنے اشراف اور حاشیہ اور اپنے خاندان کے لوگوں کو ایسے دباؤ میں رکھا ہے، کہ کوئی بڑا کسی چھوٹے پر، یا کوئی امیر کسی غریب پر ظلم و زیادتی نہیں کر سکتا، میں تو[1]

---

[1] قرون وسطیٰ کی شخصی حکومت کے زمانہ میں ایک ایرانی دیسکم حکومت کے صحیح نصب العین کی تعبیر ان الفاظ میں کرتا ہے، اسی کو کتخدائیت کا کمال قرار دیتا ہے لیکن بیسویں صدی کی روشنی والے زمانے میں حکومت کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ پچاس آدمی جس جماعت میں شریک ہیں، اُن کے ساتھ (۵۱) افراد پر مشتمل جماعت جو کچھ چاہے کر سکتی ہے، اسی کا نام جمہوریت ہے،

کتخدائیت (حکمرانی) کا اسی کو کمال سمجھتا ہون اسی کے ساتھ مین یہ بھی کہنا چاہتا ہون، کہ بیابان اور صحرائی راستون مین جو ایوانات (یعنی سڑک کے مکانات) آپ کی حکومت کی طرف سے جو بنوائے گئے ہین، اور مشرق سے جو لوگ مغرب جاتے ہین، یا مغرب والے مشرق کی طرف سے جب آتے ہین، تو ان ایوانات کو دیکھ کہتے ہین، کہ بنانے والے نے کتنے اچھے مکانات (راستہ) مین یہ بنوا دیے ہین، (ابن عساکر جلد ۲ ص ۱۰۶)

تاریخ کی ان شہادتون کو پڑھنے کے بعد کیا اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے، کہ عمر بن عبد العزیز کے ایام حکومت مین لوگ دین اللہ یعنی اسلامی دائرے مین بکثرت کیون داخل ہوئے،

بداندیشیون کی برگندہ باد آنکھین ان اجڑے ہوئے مکانون اور جلائی ہوئی بستیون، ڈھائے ہوئے محل سراؤن مین اشاعت اسلام کے اسباب کو تلاش کرتی ہین جن کا وجود ان ہی غلط سوچنے والون کے دماغون کے سوا نہ پہلے دیکھا گیا، اور نہ بعد کو ان کا سراغ خدا کی زمین پر ملتا ہے، لیکن یہ تو غلط مفروضات سے نکالے ہوئے غلط نتائج ہین،

لیکن حقائق وواقعات کی ایسی گواہیان جنھین دوست ہی نہین دشمن بھی جھٹلا نہین سکتے، ان کو سن کر بتائیے کہ آدمی کس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے یہی اسد بن عبد اللہ جس کی کتخدائیت کا اعتراف ہرات کے دیہکھ (دہقان) نے مذکورہ بالا الفاظ مین کیا تھا، کیا وہ کوئی بناوٹی اور خوشامد کی بات تھی؟ اب مین کیا عرض کرون، ہرات کے دہقان نے تو صرف مسلمانون کی حکومت کی تعریف کی تھی، لیکن کچھ زیادہ دن گذرنے نہ پائے تھے، کہ اسی اسد کے دربار مین ہم خراسان کے صوبہ بلخ کے اس امیرزادے کو پاتے ہین جس کا نام سامان تھا، کہ کھڑا ہوا ہے، اور اسد کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر رہا ہے، یہی سامان تھا جس کی طرف منسوب ہو کر غزنویون سے پہلے سامانیون کی اسلامی حکومت خراسان مین صدیون بڑے جاہ و جلال کے ساتھ قائم رہی، آزملڈ نے لکھا ہے، کہ

سامان نے مسلمان ہو کر اپنا نام اپنے معاون (یعنی اسلام لانے میں جس نے مدد کی تھی اسی کے نام اسد پر) اپنا نام اسد رکھا، اور یہی نو مسلم امیر زادہ تھا جس سے دولت سامانیہ کا نام چلا (ص ۲۱۳ آرنلڈ)

خلاصہ یہ ہے کہ جن ممالک اور علاقوں میں صدہا سال تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی، اُن میں سو دو سو نہیں آج بھی کروڑہا کروڑ کی تعداد میں جو غیر مسلم طبقات کے افراد پائے جاتے ہیں، کیا یہ خود کھلی شہادت اس مفروضہ کی تردید کے لئے کافی نہیں کہ اسلام کی اشاعت میں جبر و ظلم سے کام لیا گیا، اور خود ہندوستان ہی کے متعلق مسٹر آرنلڈ کا یہ سوال یقیناً قابل غور ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کا انکار کون کرسکتا ہے، کہ

"دہلی اور آگرہ کے اضلاع میں جو اسلامی قوت و سطوت کے مرکز تھے، مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے، دہلی کے اضلاع میں دسویں حصہ سے زیادہ، اور آگرہ کے ضلع میں چوتھائی حصہ بھی کل آبادی کا مسلمان نہیں ہیں" (ص ۲۷۹)

بلکہ ہندوستان کے راجپوت مسلمانوں یا جاٹ مسلمانوں کے متعلق یہ مشہور کرنے کی کوشش جو کیجاتی ہے کہ فلاں بادشاہ کے عہد میں جبراً اُن کے باپ دادوں کو اسلام میں داخل کیا گیا، کسی نے ان ہی راجپوت مسلمانوں کی بستیوں میں پہنچکر دریافت کیا تھا کہ آپ کے گاؤں میں بنیوں اور شودروں وغیرہ کی جو آبادی ہے یہ بھی تو قدیم زمانہ ہی سے چلی آتی ہے، اگر جبر سے کام لیا گیا تو کیا یہ مان لینا چاہئے کہ بنیوں اور شودروں کے باپ دادا سے بھی زیادہ راجپوتوں کے بہادر اور جنگ جو آباؤ اجداد کمزور اور بودے تھے، کہ مسلمانوں کے تشدد کے مقابلہ میں انھوں نے بجائے مقابلہ کے گھٹنے ٹیک دیئے، اور بنیوں یا شودروں کے اسلاف باوجود سختیوں کے اپنے قدیم آبائی دین پر ڈٹے رہے[1]،

---

[1] اس سلسلہ میں بیچارہ اورنگ زیب عالمگیر کو زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جیسا کہ اب مستقل مقالات اور کتابوں کے ذریعہ سے لوگ دیکھ چکے ہیں، آرنلڈ نے بھی اپنی کتاب میں سلطان اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برہانہ کے متعلق ایک

یہی نہیں کہ ان ممالک میں غیر مسلموں کی اکثریت اب تک باقی ہے بلکہ یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی علاقوں سے ہر زمانہ میں بڑی تعداد ان ہی لوگوں کی جو مسلمان نہیں تھے، اسلامی حکومت کی رواداری، عدل و انصاف وغیرہ کا مشاہدہ کر کر کے اسلامی قلمرو میں مسلسل منتقل ہوتی رہی ہے، آرنلڈ نے مغربی مورخین کی کتابوں سے ایسی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں، مثلاً یہی کہ

"پندرھویں صدی کی اخیر میں اسپین کے بے شمار یہودی (مسلمانوں کی ترکی حکومت کے علاقہ میں) پناہ کے لئے آئے" (ص ۱۶۲)

خود عیسائیوں نے عیسائی حکومت کے مقابلہ میں ترک مسلمانوں کی حکومت کو بسا اوقات ترجیح دی، تفصیل کے لئے دیکھئے آرنلڈ کی کتاب، دراصل یہی واقعات ہیں جن کو پڑھنے کے بعد یہ اُلٹی تقریر اشاعتِ اسلام کے اسباب کے سلسلہ میں بعض جوشیلے پادریوں کو کرنی پڑی، آرنلڈ ہی نے نقل کیا ہے، ایک پادری سارے حالات کا صحیح جائزہ لینے کے بعد لکھتا ہے،

"یہ غلط قصہ کہ مسلمان غیر مذہب والوں سے کہتے تھے کہ یا تو قرآن کو مانو یا تلوار اٹھاؤ اگر سچ ہوتا تو بہت سے عیسائی ایسے تھے جو مسیحی دین کے لئے لڑکر اور مر کر شہادت کا رتبہ حاصل کرتے"

پھر یہی جوشیلا مشنری مبلغ عیسائیت کہتا ہے کہ درحقیقت مسلمانوں کی حکومت کی

"مہربانیوں نے ان عیسائیوں کو مسلمان کر ڈالا، جن پر ظلم کچھ اثر نہ کر سکتا تھا[۱] (آرنلڈ ص ۱۹۱)

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۴) واقعہ کا ذکر کیا ہے، کہ عالمگیر کے پاس کسی نے یہ عرض پیش کی کہ دفتر حسابات میں جو دو پارسی ملازم ہیں اُن کو برخاست کر دیا جائے، اس لئے کہ وہ آتش پرست ہیں، جواب میں عالمگیر نے سختی کے ساتھ لکھا کہ یہ درخواست بیہودہ ہے، اور آخر میں بادشاہ نے ارقام فرمایا تھا کہ

سلطنت کا یہی دستور العمل ہوتا تو چاہئے تھا کہ ملک کے سب راجاؤں اور انکی رعیت کو غارت کر دیا جاتا، (ص ۲۲۰ آرنلڈ ترجمہ)

[۱] اسی پادری کی ایک تقریر کا آرنلڈ نے حاشیہ میں بھی تذکرہ کیا ہو ترکوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ

گویا ؎ آدمی ظلم کا مارا تو تڑپ جاتا ہے　مہربانی سے مٹاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

عیسائیت کی طرف سے بھی شکایت اسلام کی کہانی ہے لیکن ہم اس کے جواب میں اردو کے اس مشہور شعر کے سوا اور کیا پڑھیں، ؎

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو　تم ہی بتلاؤ کہ آخر تمھیں چاہیں کیونکر

بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسلامی قلمرو میں غیر مسلم طبقات کو زیادہ ترحق وانصاف سے استفادہ کا موقع ان ہی حکمرانوں کے زمانہ میں ملا ہے، جو اسلام کی روح سے قریب تھے، مگر اب اس کا کیا علاج ہو کہ مسلمان بادشاہوں میں جو بیچارے نسبتاً اپنے دین کے زیادہ پابند تھے محض ان کی یہی دینی زندگی اور مذہبی پابندی بدگمانی کی وجہ بن گئی، اور واقعات سے ہٹ کر یہ شروع ہی میں فرض کر لیا گیا کہ اسلامی دین کی پابندی کے ساتھ بھلا دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ انصاف وعدل یا رحم و نرمی کا برتاؤ کوئی کیسے کر سکتا ہے؟ پھر اس غلط مفروضہ پر غلطیوں کی پوری عمارت کھڑی کرنے والوں نے کھڑی کر لی، عالمگیر یا ان جیسے دیندار سلاطین کی بدنامی اسی غلط خیال اور اسی قسم کے خود تراشیدہ اوہام پر مبنی ہے، ورنہ واقعہ وہی ہے، کہ دیندار بادشاہوں نے جس حد تک اسلام کے ان ضوابط کی پابندی کی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۵) "ترک جسم کو ایذا نہیں دیتے، بلکہ پرہیزگاری کے بھیس میں ظاہرا طریق پر اس کی خدمت کرتے ہیں، اور اپنے شیطانی فریب سے وہ روح کو جو جسم کے اندر ہے، اس کا ایمان لے کر ظلمت کر دیتے ہیں، (آزملہٰ حاشیہ ص ۱۹۱)

ایک انگریز سیاح سلیڈن نامی نے تو مسلمانوں کی حکومت پر بھی تنقید نما طعن کیا ہے کہ

"وہ حد سے زیادہ دوسرے مذاہب کو آزادی دیتی ہے، (النبی والاسلام ص ۱۰۰)

یہ بڑی دلچسپ بات ہو کہ زمانے تک اسلام کے جبر واکراہ کا ڈھنڈورا پیٹا گیا لیکن اب لہجہ بدل کر اسلام کی غیر معمولی نرمی کو تیر ملامت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، اسی یورپ کی طرف سے مطالبہ تھا، کہ مذہب کو عقلی معیار پر پورا اترنا چاہئے لیکن کچھ لوگ یورپ ہی میں اب کہنے لگے ہیں وہ مذہب ہی کیا ہوا جو عقل میں سما جائے ،

کوشش کی ہے جن کا مطالبہ اسلامی قلمرو کے باشندوں کے متعلق اسلام نے کیا ہے قدرۃً اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اسلام کی طرف لوگون کی رغبت بڑھ جاتی تھی، اسی کو دیکھ کر شور کر دیا جاتا ہے کہ دینی تعصب کے نشہ مین سرشار ہو کر بادشاہ نے جبر و ظلم سے کام لیا اور یون مجبوراً لوگ مسلمان ہو گئے،

حالانکہ کلیتہً اگر یہ صحیح نہ ہو تو عموماً یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم باشندون کو کبھی مسلمان بادشاہون کے عہد حکومت مین کچھ تکلیف اگر پہنچی بھی ہے، تو زیادہ تر یہ اسی قسم کے سلاطین تھے جن کا دین سے تعلق کمزور تھا، بجاے دینی ہدایات کے اپنی من مانی خواہشون یا مصلحتون کے ساتھ ان کی کارروائیان اتبعیت جیسا کہ مین نے عرض کیا کہ اس قسم کے سُست کردار شکست اعتقاد اور بدبخت بادشاہون سے غیر مسلم رعایا ہی کو نہین، بلکہ مسلم رعایا کو بھی کافی مصیبتین برداشت کرنی پڑی ہین، اور اسلام کی اشاعت کی راہ مین تو اس طرز کے حکمرانون کا وجود ہمیشہ بدترین رکاوٹ ثابت ہوا ہے، الجزیرہ یعنی دجلہ و فرات کے درمیانی علاقہ کی آبادیون کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن حوقل نے اپنی کتاب مین لکھا ہے، نقل کرتے ہوئے قلم کانپتا ہے، اس کے الفاظ یہ ہین، کہ

ان ساکنی ارض الجزیرۃ تنصروا	جزیرہ کے باشندون نے آلِ حمدان کے ظلم
بظلم آل حمدان (ص ۱۴۱، ابن حوقل)	سے تنگ آکر عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے

سلہ آل حمدان کی اصطلاح سے اسلامی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے ناواقف نہ ہون گے، خلافتِ بغداد کی مرکزیت جب ختم ہوئی تو اطراف و جوانب مین چھوٹے بڑے حکمرانون نے اپنی اپنی حکومتین قائم کرلین، اُن ہی مین ایک آل حمدان والے بھی تھے، سیف الدولہ جس کا نام ابوالحسن علی بن عبداللہ بن حمدان بن حمدون التغلبی الربعی تھا، اس خاندان کا پہلا بادشاہ تھا، حلب کو اس نے دار السلطنت قرار دیا تھا، مصر کی اخشیدی حکومت اور قسطنطنیہ کی رومی حکومت سے برسرپیکار رہتا تھا، مشہور شاعر متنبی نے اس کی بھی دربارداری ایک زمانہ تک کی تھی تفصیلات کے لئے عام تاریخی کتابین دیکھئے ۳۵۶ھ مین سیف الدولہ نے وفات پائی،

اس کے بعد اوس نے بیان کیا ہے، کہ عیسائی ہو ہو کر جوق کے جوق مسلمانون کی جماعتین ترکون کے ساتھ مل گئین، اور اب وہی رومیون کی معیت مین مسلمانون پر اور ان کی آبادیون پر حملے کر رہی ہین، ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد بے چارے کے قلم سے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ نکل گیا ہے،

آرنلڈ نے بھی پادری ڈن ٹن کے حوالہ سے ترکی سلطنت کے ذکر کے سلسلہ مین یہ لکھنے کے بعد کہ

"اٹھارہوین صدی مین جب کہ عیسائی ایسی سختیون مین مبتلا تھے، کہ کبھی ایسی سختیان کسی زمانہ مین اُن پر نہ بیتی تھین"

ڈن ٹن لکھتا ہے کہ اس زمانے مین :-

"عیسائیون کے مسلمان ہونے کا ذکر کہین دیکھنے مین نہین آتا، بلکہ اُس زمانہ کے ترکون کے متعلق یہی لکھا گیا ہے کہ وہ اپنے مذہب کی ترقی سے غافل اور مذہبی شکوک مین مبتلا ہو گئے ہین [1]،

بہرحال مین یہی کہنا چاہتا ہون کہ بجائے اسلام کے اسلامی حکمرانون پر اس کا الزام عائد کرنا کہ اُن کی

---

[1] اسی موقع پر آرنلڈ کی کتاب کے ان حواشی کا پڑھنا بھی مفید ہوگا، جن مین مختلف سیاحون اور مصنفین کی کتابون سے انہون نے نقل کیا ہے، کہ ترکون کی حکومت کا یہ وہ زمانہ تھا جس مین عیسائیون سے زیادہ ترکی سلطنت مین مسلمان بیچارے مصیبتون کے شکار تھے، لکھا ہے کہ مسلمانون کا افلاس عیسائیون کے افلاس سے اتنا بڑھا ہوا ہے، کہ ان مسلمانون کو دیکھ کر سیاحون کو رحم آتا ہے، اور اسی قسم کی باتون کا بے دینی کے عہد مین پیدا ہو جانا تعجب خیز نہین ہے لیکن بقول امیر شکیب ارسلان آج یورپ کی ذہنیت اسلامی حکومتون کے متعلق یہ جان کر کہ اسلام کی دینی حکومت مین عیسائیون کو ہر قسم کے حقوق سے استفادہ کا موقع بہ صورت بہتر آتا ہے لیکن باوجود اس کے پھر بھی مسلمانون کی لادینی حکومت ہی پسند بھی کیجاتی ہے اور کوشش کیجاتی ہے کہ جہانتک ممکن ہو لادینی حکومت کے قائم کرنے پر مسلمان حکمرانون کو آمادہ کیا جائے، اتنے بیان کے لکھنے کے بعد خوب لکھا ہے کہ اسلام کیساتھ تعصب اور تنگ نظری کی یہ بدترین مثال ہو سکتی ہے جسے انسانی عقل سوچ سکتی ہے، اسلام کو وہ ناپسند کرتے ہین خواہ اُنکا وہ محافظ ہی کیون نہ ہو، اور اسلام کے زوال کو وہ چاہتے ہین، خواہ اسلام کے زوال مین خود ان کا زوال بھی کیون نہ ہوتا ہو،" (ص ۱۱۹، مقدمہ ابن خلدون کی تنقید از امیر شکیب ارسلان)

غفلت یا وقت ناشناسی یا نا عاقبت اندیشی نے مسلمانوں کے مفتوحہ مقبوضہ ممالک میں غیر مسلموں کو باغی بنانے کا موقع دیدیا، صحیح نہیں ہے پہلے تو الزام سے اس طرز عمل کی تعبیر ہی غلط ہے اور کسی نکالزام ہی اگر وہ غلط آیا بھی ہو تو چاہیے کہ اس الزام کا نشانہ مسلمان حکمرانوں کو نہیں، بلکہ اسلام اور اسلام کے ان قوانین وضوابط کو بنائے جن کا اجمالا ذکر آپ سن چکے، خود قرآن میں جن کی پابندی کا سختی کے ساتھ مطالبہ کیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین نے برت برت کر جسے دکھایا تھا، فتح خیبر ہی کا قصہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند یہودی آئے کہ فوج کے بعض لوگ ہمارے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں، سننے کے ساتھ ہی عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر ہر سپاہی تک یہ پہنچا دو کہ

"جنت صرف مومن (یعنی اللہ اور اسکے رسول کی باتوں کے ماننے والے) کے لئے ہے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر لوگوں کو جمع کیا اور آگاہ کیا کہ معاہدہ کر لینے کے بعد کسی قسم کی غیر قانونی حرکت یہودیوں کے ساتھ قطعا حرام ہے،

بخاری ہی میں ہے کہ اسی موقع پر اس کی منادی بھی ہر طرف کی گئی کہ

"معاہدہ کرنے والوں کو جو قتل کرے گا جنت کی بو بھی وہ پا نہ سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے سونگھی جاتی ہے"

اسی موقع پر مسلمانوں کو خطاب کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا،

"لوگو! تم یہودیوں کے باڑوں میں گھس پڑے، حالانکہ جن سے معاہدہ طے پا چکا ان کا مال قطعا حرام ہے، مگر وہی جس کی قانون اجازت دے" (ابو داؤد)

یہ اور ایسی روایتوں کا ایک ذخیرہ صحابہ کے سینوں میں محفوظ تھا، انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ایک مصری عیسائی قریش کی طرف سے ایلچی بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، دو دو آنا تھا نہیں نے اسکی سلیم فطرت کو نور اکی نبوت کا گرویدہ بنا دیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے اور عرض کرنے لگا کہ اب میں پیغام کو لانے

مجھے سمجھا دیجئے، اس نے اراد ظاہر کیا کہ مسلمان ہونے کا قطعی فیصلہ کر چکا ہوں اور اب قریش کے پاس واپس نہ جاؤنگا، مگر سنئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیا جواب دیا، ابو داؤد کی سنن میں ہے،

"نہ میں عہد شکنی کرسکتا ہوں اور نہ کسی ایلچی (سفیر) اور برد (ڈاک والے) کو روک سکتا ہوں، تم کو چاہئے کہ جن لوگوں کی طرف سے سفیر بن کر آئے ہو، اُن کے پاس واپس جاؤ، اس کے بعد بھی تمھارے دل میں وہی خیال اگر باقی رہے جو اس وقت پیدا ہوا ہے، تو واپس آجانا"

یہ مصری عیسائی سفیر جن کا نام غالباً بعد مسلمان ہونے کے ابو رافع رکھا گیا، وہی بیان کرتے تھے کہ

"میں قریش کے پاس واپس گیا، اور پھر پلٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اسلام کی دولت سے سرفراز ہوا"

ان ہی تعلیمات اور عملی زندہ مثالوں کا نتیجہ تھا کہ نازک سے نازک ترین مواقع پر بھی مصالح اور عقلی عواقب سے قطعاً بے پروا ہو کر صحابہ معاہدہ کے احترام پر اصرار فرماتے رہے، ابھی مجھ ہی سے امیر معاویہؓ تک کے متعلق آپ نے سنا کہ عمرو بن عبسہ صحابیؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سننے کے ساتھ ہی اپنی ساری مصلحت اندیشیوں کو بالائے طاق رکھکر فوج سمیت رومی سرحد سے واپس لوٹ گئے، حالانکہ حریف کو زک پہنچانے کے مغتنم موقع کو کھو دینے کے سوا کافی مالی تاوان ان کو برداشت کرنا پڑا، شام سے رومی سرحد تک فوج کو لیجانا اور لے آنا، کیا معمولی مصارف سے ممکن ہو، مگر کچھ بھی ہو پیغمبر نے حکم دیا، مومن نے سر جھکا دیا، مشہور تابعی میمون بن مہران کے حوالہ سے سیوطی نے اپنی تفسیر در منثور میں یہ فتوی اُن کا نقل کیا ہے، خلاصہ جس کا یہ ہے کہ

"تین باتوں میں مسلم اور غیر مسلم کوئی ہو، سب برابر ہیں، ایک تو معاہدے کے معاملہ میں کہ اسکی پابندی ہر حال میں ضروری ہے، خواہ مسلمانوں سے کیا جائے یا غیر مسلمانوں سے، اسی طرح رشتہ داری (صلہ رحمی) کے حقوق میں مسلم و غیر مسلم کی خصوصیت نہیں، تیسرا مسئلہ امانت کا ہے کہ مسلم کی امانت ہو، یا غیر مسلم کی، خیانت حرام ہے" در منثور ج ۳ ص ۱۹۲)

(باقی)

ریڈیو کی ایجاد کا قدیم نظریہ

از

جناب مولوی ابو العلا نظر احمد صاحب سہسوانی

اس میں شک نہیں کہ ریڈیو یورپ والوں کی ایجاد ہے، ابتدا میں سائنس کا کرشمہ ہے، کس کو خبر تھی، کہ آئندہ زمانہ میں کوئی ایسا آلہ یا مشین ایجاد ہو سکتی ہے کہ بغیر کسی سلسلہ تار برقی کے کسی جگہ کی کوئی خبر یا آواز دوسرے مقام پر پہنچ سکتی ہے، یا سنائی جا سکتی ہے، اور لوگ گھر بیٹھے دور دور مقامات کی تقریریں، اسپیچیں، گانے بجانے غرضکہ مختلف قسم کی خبریں یا پروگرام بآسانی سن سکیں گے، مگر اس محیر العقول ایجاد نے بظاہر ایک ناممکن شے کو ممکن بنا کر دکھا دیا، اور وہ چیز قوت سے فعل میں آگئی، اور لوگ عام طور سے پہلے جس چیز کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے تھے، اب اس کو سرسری نظر سے دیکھنے کے خوگر بن گئے اگرچہ اس ایجاد کا سہرا یورپ کے عالم سائنس مارکونی کے سر ہے، مگر اہل علم یہ جانتے ہیں کہ ریڈیو کی ایجاد اس تھیوری پر موقوف ہے کہ تمام آوازیں اور الفاظ و حروف جو دنیا میں بشکل آواز پیدا ہوتے ہیں، وہ جو یعنی فضا یا ایتھر میں بجنسہٖ محفوظ ہو جاتے ہیں، اور ہمیشہ باقی و قائم رہتے ہیں ان کو جب کبھی کھینچا یعنی حاصل کیا جائے، تو حاصل کئے جا سکتے اور سنے جا سکتے ہیں چنانچہ بجلی کے ذریعہ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ کر ہمارے سامنے آگیا، لیکن یہ نظریہ کہ ایتھر میں آوازیں ہمیشہ محفوظ رہتی ہیں، جن کو کبھی فنا لاحق نہیں ہوتی، کوئی جدید نظریہ نہیں ہے، جو پہلے سے معلوم نہ رہا ہو، گو عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ پرانا اور قدیم نظریہ ہے، جس کو ہمارے اسلامی فلاسفہ و حکماء اب سے آٹھ صدی کا پیشتر ظاہر کر چکے ہیں، یہ بات دوسری ہے کہ ہم اپنی محدود

معلومات و قصورِ نظر کی وجہ سے اُن کے بیانات سے ناواقف ہیں اور اُن کے قائم کئے ہوئے نظریے ہماری آنکھوں سے اوجھل رہے، اس سلسلہ میں اس مختصر مضمون میں ایسی شخصیتوں کے اقوال پیش کئے جاتے ہیں جو اپنے علمی تبحر و قابلیت کی بنا پر یورپ و ایشیا دونوں میں مشہور و معروف ہیں، حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ سے کون واقف نہیں ہے، وہ اپنی کتاب فتوحاتِ مکیہ میں ارقام فرماتے ہیں

اما الحروف اللفظیۃ فانہا تتشکل	یعنی حروفِ لفظی ہوا میں متشکل ہو جاتے
فی الھواء ولھذا اتصل بالسمع	ہیں، یہی وجہ ہے کہ متکلم جو کچھ کہتا ہے تو
علیٰ صورۃ ما نطق بھا المتکلم و	بجنسہٖ اس کا کلام کان تک پہنچ جاتا ہے
اذ تشکلت فی الھواء قامت	اور جب الفاظ ہوا میں متشکل ہوتے ہیں تو
بھا ارواحھا وھٰذہ الحروف لا	ہوا ان کے اشکال کو بجنسہٖ ہمیشہ قائم رکھتی
یزال الھواء یمسک علیھا تشکلھا	ہے اگرچہ ان الفاظ کا عمل (سماعت) ختم
وان انقضی عملھا فان عملھا انما	ہو چکا ہو، کیونکہ ان کا عمل تو پہلی مرتبہ ہوا
یکون فی اوّل ما تتشکل فی الھواء	میں متشکل ہونے کی صورت میں ہوا کرتا ہے
ثم بعد ذٰلک تلحق بالاثر الامم	اس کے بعد وہ الفاظ دیگر کائنات میں مل

اس کے بعد علامہ موصوف ارقام فرماتے ہیں :-

وھٰذہ الحروف الھوائیۃ اللفظیۃ	یعنی یہ حروفِ لفظی جو ہوا میں مل چکے، ان کو
لا یلحقھا موت بعد وجودھا	کبھی موت لاحق نہیں ہوا کرتی بخلاف ان
بخلاف الحروف الرقمیہ وذٰلک	حروف کے جو تحریر میں آتے ہیں، یہ حروف
لان تشکل الحروف الرقمی والکلمۃ	و کلمات تغیر و زوال قبول کر لیتے ہیں،
الرقمیۃ تقبل التغیر والزوال لانہ	کیونکہ ان کا عمل زوال پذیر ہے، مگر

فی محل یقبل ذلک وان الاشکال اللفظیة فی محل لا یقبل ذلک ولهذا کان لها البقاء فالجو مملو من کلام العالم،

یا اشکال لفظیہ کا محل چونکہ زوال پذیر نہیں ہے اس لئے ان کے لئے دوام وبقا ہے، یہی تمام جو یعنی فضا یا ایتھر دنیا کی آوازوں سے بھرا پڑا ہے،

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا یہ نظریہ تھا کہ دنیا کی تمام آوازیں اور وہ الفاظ جو کسی زبان سے ادا ہوتے ہیں، ایتھر میں جا کر محفوظ ہو جاتے ہیں، اور ہمیشہ قائم رہتے ہیں، گو ان کا اثر سماعت جاتا رہتا ہے، آپ کے علاوہ ایک دوسرے مشہور فاضل فلسفی عبد الوہاب شعرانی اپنی کتاب الیواقیت والجواہر میں بطور اعتراض وجواب تحریر فرماتے ہیں،

فان قلت فهل تتشکل الحروف اللفظیة فی الهواء او تذهب هباءً منثوراً بعد خروجها فالجواب انها تتشکل فی الهواء اذا خرجت ولذلک تتصل بالمسموع علی صورة ما نطق بها المتکلم فاذا تشکلت فی الهواء تعلقت بها ادواحها ولا یزال الهواء یمسک علیها شکلها وان انقضی عملها فان عملها وتاثیرها انما یکون فی اول

یعنی اگر یہ سوال کیا جائے کہ حروف لفظی ہوا میں متشکل ہو جایا کرتے ہیں یا منتشر ذرات کی مانند مٹ جاتے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ادا ہونے کے بعد ہوا میں متشکل ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ الفاظ متکلم کے نطق کے مطابق دوسرے کے کان تک پہنچ جاتے ہیں، اور جب وہ ہوا میں متشکل ہو جاتے ہیں، تو ہوا ان کے اشکال کو بعینہٖ قائم رکھ لیتی ہے، اگرچہ ان کا وہ اثر وعمل ختم ہو جاتا ہے جو اول مرتبہ ہوا میں متشکل ہونے کے وقت تھا، اس کے بعد

ما تشكل فى الهواء ثم بعد ذلك	وہ الفاظ یا آوازیں کائنات میں منتقل ہوجاتی
تلحق بسائر الامر فيكون شغلها	ہیں جن کا کام اپنے رب کی تسبیح کرنا رہتا
تسبيح ربها،	ہے (یہ ایک مذہبی اعتقادی بات ہے جس
	پر بحث نہیں کیجا سکتی)

پھر آگے چل کر دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :-

فان قلت فان هذه الحروف اللفظية	یعنی اگر یہ دریافت کیا جائے کہ حروف لفظیہ
لا يدركها موت بعد وجودها	کے صدور کے بعد ان کو فنا و موت لاحق ہوتی
فالجواب نعم لا تلحقها موت بخلاف	ہے یا نہیں، تو اس کا جواب یہ ہو کہ اُن کو
الحروف الرقمية لانها تقبل التغير	موت لاحق نہیں ہوا کرتی، بخلاف مکتوبہ
والزوال اذ هى فى محل يقبل ذلك	الفاظ کے کہ وہ تغیر و زوال قبول کر لیتے ہیں،
واما الاشكال اللفظية فلها البقاء	کیونکہ ان کا محل اس کے قابل ہے، اور
لكونها فى محل لا يقبل التغير	اشکال لفظیہ کا محل چونکہ نا قابلِ تغیر ہے
	اسلئے ان کو کبھی زوال و تغیر لاحق نہیں ہوا کرتا،

ان دونوں بزرگوں کے مذکورۂ بالا بیانات سے صاف معلوم ہوگیا کہ یہ نظریہ کہ ایتھر میں تمام عالم کی آوازیں بھری ہوئی ہیں جو بجنسہ اپنی اصلی حالت کے ساتھ محفوظ ہیں اور قابلِ تغیر و زوال نہیں، کیونکہ ان کا محل [illegible] قابلِ تغیر نہیں، اور اس کو موت و فنا لاحق نہیں ہوتی، اُس زمانہ میں سائنس کو ترقی نہیں ہوئی تھی کہ یہ نظریہ کوئی شکل اختیار کرتا، اس لئے نظریہ ہی کی شکل میں رہ گیا لیکن اس سے اتنا تو بہرحال ثابت ہوگیا کہ ایتھر میں آوازوں کے محفوظ رہنے کا نظریہ بہت قدیم ہے، جو مسلمان فلاسفہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

ہندو مسلم میل ملاپ کا ایک سندیس

از

سید سلیمان ندوی

کئی سال ہوئے رمضان کے دن تھے، میں دار المصنفین کی مسجد میں ایک کھڑکی کے پاس بیٹھا قرآن پاک کا درس دے رہا تھا، کہ ایک ہندو نوجوان اس کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہوا، دونوں ہاتھ جوڑکر سلام کیا، وضع اتنی سادی تھی کہ میں نہ سمجھ سکا کہ یہ کون ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟ پاس بلا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ بنارس یونیورسٹی کے ایم اے کے طالب علم ہیں اور اب ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے مسلمان صوفیوں کے ہندی کلام پر کام کرنا چاہتے ہیں، اور اسی سلسلہ میں مجھ سے مدد مانگنے آئے ہیں، چنانچہ وہ آتے رہے، اور مجھ سے جو بنا میں انھیں دکھاتا اور بتاتا رہا،

ایک دفعہ بنارس یونیورسٹی کے ایک پروفیسر آئے، اور دار المصنفین میں کئی دن ٹھہرے رہے، ان کا مضمون کوئی تاریخی تھا، مجھ سے اور میرے رفیقوں سے بہت سے معلومات حاصل کئے، اور بہت خوش خوش ہمارے یہاں سے واپس گئے، بعد کو ان کے خط بھی آتے رہے،

شبلی منزل اور دار المصنفین ایک ایسا مقام ہے جہاں ہندو اور مسلمان لیڈر ہمیشہ آتے رہے ہیں، ہندوؤں میں گاندھی جی، مالویہ جی، سروجنی نائیڈو، موتی لال جی، جواہر لال جی سے لیکر مقامی لیڈر تک برابر یہاں آتے رہتے، پنڈت موتی لال نہرو اضلاع کے دورے کے سلسلہ میں جب اعظم گڑھ آتے تو ہمیشہ دار المصنفین ہی میں ٹھہرتے تھے، ان کی زندگی میں شبلی منزل ان کا بے تکلف مہمان خانہ تھا، اور ان کو اپنے سیاسی کاموں میں دار المصنفین کے کارکنوں پر جو بھروسہ تھا [illegible] کبھی [illegible] کر وہ [illegible] شہر [illegible] اور شبلی منزل [illegible]

لئے یہان آکر ٹھہرے، بس اسی طرح کانگریسی دور کے وزیرون مین سے بھی کوئی ایسا نہین جو ادھر آیا ہو اور شبلی منزل مین قدم رنجہ فرمایا ہو، تاہم ہم نے آج تک ان باتون کا معارف کے صفحون مین ذکر نہین کیا، کیونکہ ہمارے نزدیک کوئی اہمیت کی بات نہ تھی، لیکن آج جب کہ ہوا کا رُخ بدل گیا ہی اور لوگ ہندو مسلم میل ملاپ کی باتون کو سننے کو ترس گئے ہین، ہم اس کے ذکر پر مجبور ہوئے ہین،

ہم کو خوب یاد ہی کہ گاندھی جی جب پہلے دورہ مین اعظم گڈھ آئے تو اُن کے ٹھہرنے کا انتظام تو اور جگہ تھا، مگر وہ خود شبلی منزل آئے، اور ایسے وقت آئے کہ مغرب کا وقت تھا، میدان مین جانماز بچھا کر ہم لوگ نماز مین تھے، یہ دیکھ کر وہ نہایت ادب سے آہستگی سے کنارہ بیٹھ گئے، اور ساتھ والون کو اشارہ سے چپ چاپ رہنے کو کہا، لالٹین کی روشنی مین کتب خانہ دیکھا، لوگ روشنی تیز کرنے کے لئے لالٹین کی روشنی بڑھاتے تھے، وہ دھوان دینے لگتی، تو گاندھی جی اپنے ہاتھ سے اس کو کم کر دیتے، پھر یہین ہمارے ایک رفیق نے اُن کے سامنے اُن کے دستخط کے لئے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی، اور اس پر گاندھی جی نے اردو مین دستخط کیے،

گاندھی جی دار المصنفین اور مولانا شبلی سے اس طرح واقف تھے، کہ جب وہ ایک دفعہ جیل مین اردو پڑھ رہے تھے، تو حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے حکم سے دار المصنفین نے گاندھی جی کی خدمت مین سیرت نبوی کی جلدین بھیجی تھین جنکو گاندھی جی نے پڑھا تھا، اور جب جیل سے باہر آئے تو اس واقعہ کا ذکر اپنے مضمون مین کیا، اور اس مین مولانا شبلی اور اُن کی اس کتاب کا خاص طور سے نام لیا، اور اس کے لئے حکیم صاحب مرحوم کا شکریہ ادا کیا،

آج یہ باتین اتفاقاً قلم سے اس لئے نکل آئین کہ گذشتہ عید کے موقع پر بنارس یونیورسٹی کے ایک ہندو دوست نے جو ریاضی کے پروفیسر ہین، مجھے مبارکباد کا اردو مین خط لکھا، اوس کو پڑھکر مجھے بڑا اچنبھا ہوا کہ کیا اس کشت وخون اور قتل و غارت کے بعد بھی ایک ہندوستانی ہندو، ایک ہندوستانی مسلمان کو یہ خط لکھ سکتا ہی؟ کیا اس سے یہ واقعہ نہین ثابت ہوتا کہ کبھی کبھی کے گناہ سے دل کا چراغ حقیقت مین گل نہین ہو جاتا، یہ وقت کی آندھیان ہین جو آتی اور گذر جاتی ہین، لیکن دل کی بستی اور نیکیون کی آبادی پھر

جگہ رہتی ہے، ہم ذیل میں اس خط کو نقل کرتے ہیں، افسوس ہے کہ مین نے اپنے جواب کی نقل نہیں رکھی ورنہ اس کو بھی ساتھ ہی شائع کر دیتا، "س" ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء

عظمت گڈہ پیلس بنارس

۱۰ اگست ۱۹۴۸ء

"محترمی و مکرمی بندہ جناب استاد سید صاحب کی خدمت مین بندے کا نہایت عجز و انکساری سے آداب عرض قبول ہو، مین نے دریافت کیا تھا معلوم ہوا کہ آپ بھوپال تشریف فرما[1] ہین، عید مبارک کے موقع پر آپ کی بہت یاد آئی، اگر آپ ہوتے تو اعظم گڈہ بھی چلا آتا،[1] اسی قوم سے کچھ روز ہوے دریافت کیا تھا، بعد عجز و نیاز عید کی مبارکباد عرض کرتا ہون قبول ہو، خدا آپ کو مع اہل و عیال کے خوشی اور صحت سے رکھو اور آپ کو ہمارے سرون پر اسی طرح دائم و قائم رکھے، ایسے عالم اور علم دوست آج کل ہمارے ملک مین بہت کم ہین، اس لئے مین آپ کی قدر کو اچھی طرح جانتا ہون، مین کئی مرتبہ جناب کی خدمت مین اعظم گڈہ حاضر ہوا تھا،

آپ کا نیاز مند:- "رام کمار چوبے"

پروفیسر ریاضی ہندو یونیورسٹی بنارس

---

[1] پروفیسر صاحب ابھی گذشتہ اکتوبر کے آخری ہفتہ میں دار المصنفین تشریف لائے تھے، کئی دن ٹھہرے کتب خانہ سے استفادہ اور رفقا سے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا، "م"

مطبوعات جدیدہ

صحیفۂ ٹیپو سلطان حصۂ اوّل و دوم مرتبہ جناب محمود خانصاحب بنگلوری تقطیع چھوٹی ضخامت علی الترتیب ۳۰۴ و ۲۹۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد آٹھ روپیے، پتہ گوشۂ ادب لاہور

ٹیپو سلطان ہندوستان کا وہ آخری جانباز مجاہد اور مصلح و مدبر فرمانبردار تھا جس نے ہندوستان کو غیر قوموں کی غلامی سے بچانے اور اسلام اور مسلمانوں کی تجدید و احیاء کی سرفروشانہ جد و جہد کی اور اس راہ مین جان تک دیدی لیکن انگریزون نے اپنے مصالح کی بنا پر مختلف تدبیرون سے ہندوستانیون کے دلون سے اس کی یاد کو بھلانے کی کوشش کی، اس لئے ایک عرصہ تک اس کے کارنامے عام نگاہون سے پوشیدہ رہے لیکن جب ہندوستانیون مین آزادی کی روح پیدا ہوئی تھی، سلطان شہید کی جانب بھی اُن کی توجہ ہو چلی تھی، اور ادھر چند برسون کے اندر مختلف طریقون سے اوس کی یاد کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی اس سلسلہ مین سلطان کے ایک اہم وطن جناب محمود خان صاحب نے کئی سال ہوئے، سلطنت خداداد کے نام سے سلطنت میسور کی تاریخ لکھی تھی، صحیفۂ ٹیپو سلطان اس موضوع پر ان کی دوسری اہم کتاب ہے، اس کا بڑا ماخذ جیسا کہ مؤلف کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے، کرنل ولیم کرک پیٹرک کی کتاب ہے، کرنل مذکور میسور کی چوتھی جنگ مین شریک تھا، اور سلطان کی شہادت کے بعد اس کے مکتوبات و احکام و فرامین اور دوسرے سرکاری کاغذات کی حفاظت و نگرانی، اور اُن کے ترجمہ کی خدمت پر مامور کیا گیا تھا، اُن کی مدد سے اس نے اسی زمانہ مین انگریزی مین ایک کتاب لکھی تھی، جو ۱۸۱۱ء مین لندن سے شائع ہوئی تھی گو یہ کتاب انگریزون کے مفاد و مصالح سے خالی نہین ہے لیکن اس پہلو سے قطع نظر سلطان کے حالات مین

معتبر و مستند کتاب ہے، مؤلف نے زیادہ تر اسی کو ماخذ بنایا ہے، اس کے علاوہ سلطان کے بعض دوسرے احکام و فرامین اور تحریروں سے بھی جو ان کو دستیاب ہو سکی ہیں، استفادہ کیا ہے، اس میں مختلف حکام عہدہ داروں اور دوسرے عمائد و امراء وغیرہ کے نام، سیاسی انتظامی، جنگی، اور حکومت کے دوسرے امور و معاملات کے متعلق سلطان کے ۲۴۴ خطوط اور دوسرے مختلف احکام و فرامین اور تحریریں ہیں جن سے سلطان کے تدبر، عالی دماغی، اس کی سیاسی انتظامی اور جنگی قابلیت و مہارت کے ساتھ نظام حکومت اس کے اہم شعبوں، ہندوستان کی آزادی اور اسلام و مسلمانوں کی تجدید و اصلاح کے لئے سلطان کی جد وجہد اور ملک کی صنعتی تجارتی اور زرعی ترقی کے لئے اس کی کوششوں اور دوسرے کارناموں کا بھی اندازہ ہوتا ہے، کتاب کے آخر میں متعدد ضمیمے ہیں، جن سے سلطنت میسور اور سلطان کے متعلق متفرق مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، آخر میں سلطان کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں، ان کی تردید ہے، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب سلطان کے حالات میں نہایت معتبر اور مفید معلومات پر مشتمل ہے،

ملفوظات بزرگانِ دین، از جناب محبوب سید ایم اے تقطیع اوسط ضخامت ۱۹۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عارستے :۔ اردو بک اسٹال بیرون لاہوری دروازہ لاہور و میکون کمپنی انور روڈ کراچی،

انبیاء علیہم السّلام کی تعلیمات اور صلحاء و اخیار اُمت کے ملفوظات و حکیمانہ اقوال نہ صرف اخلاقی و روحانی اصلاح و تزکیہ کا نسخہ ہیں، بلکہ اُن پر عمل سے دین و دنیا دونوں میں فلاح و سعادت قلبی سکینت اور تعلق مع اللہ کی دولت ہاتھ آتی ہے، ہونہار اور صالح نوجوان مؤلف نے جن کو اسی نسخۂ شفا سے ہدایت کی راہ ملی ہے، مختلف بزرگانِ دین کے ملفوظات و حکیمانہ اقوال کو کتابوں سے چن کر جمع کر دیا ہے، ان میں سے بعض احادیث نبوی ہیں جو کسی بزرگ کی زبان سے ادا ہوئی ہیں، خود اُن کے ملفوظات نہیں ہیں، یہ کتاب دینی و دنیوی اور اخلاقی و روحانی فوائد کے لحاظ سے ہر مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے، کتاب کے شروع میں

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے مختصر دیباچہ ہے، جس میں بزرگان دین کے ملفوظات کے مقصد کی پوری روح آگئی ہے،

ہم آپ از جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۳ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت تحریر نہیں، پتہ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد، یوپی،

فن نفسیات (سائیکالوجی) میں مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی شہرت محتاج بیان نہیں اس فن پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اُن کی متعدد تالیفات شائع ہو چکی ہیں، مذکورۂ بالا کتاب ہندستانی اکیڈمی الہ آباد نے اُن سے لکھوائی تھی، یہ چودہ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں فن کا تعارف اور اس کی تشریح، دوسرے میں اس کی مختصر تاریخ اور باقی ابواب میں نفسیات کے مسائل و مباحث ہیں، کتاب کے آخر میں اشخاص کے ناموں کا انڈکس اور مصطلحات کی فہرست ہے، کتاب کی خوبی اور خامیوں کا صحیح فیصلہ تو اس فن کے واقف کار ہی کر سکتے ہیں، لیکن اس کے مطالعہ سے اتنا اندازہ تو ہر شخص کو ہو جاتا ہے کہ نفسیات کے علمی مباحث کو روزانہ کی زندگی کے واقعات سے اتنے آسان دلچسپ اور سلجھے ہوئے انداز میں سمجھایا گیا ہے، کہ معمولی اردو خوان بھی انکو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے،

معروضہ از جناب مولوی محمد الیاس برنی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ:- بیت السلام سیف آباد حیدرآباد

فاضل مصنف کو دوسرے علوم و فنون کے ساتھ شعر و سخن سے بھی ذوق ہے، وہ سخنور بھی ہیں اور سخن سنج بھی، معروضہ ان کے کلام کا مجموعہ ہے، اس میں مختلف مذہبی و اخلاقی موضوعوں پر نوے نظمیں ہیں، مصنف کو قدرت نے باطنی دولت سے بھی نوازا ہے، اس لئے اُن کی شاعری محض رسمی نہیں بلکہ اُن کے قلبی تاثرات اور حقیقی جذبات کا آئینہ ہے، اس مجموعہ کی تمام نظموں میں یہ اثر نمایاں ہے، خصوصاً حمد، نعت اور منقبت کی نظمیں نہایت گرم، مؤثر اور اصحاب وجد کے مطالعہ کے لائق ہیں، کتاب کا مقدمہ بھی مفید مذہبی و روحانی فوائد و نکات پر مشتمل ہے،

"م"

مرتبہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعینِ کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمرؓ بن عبد العزیز، حضرت حسن بصری، حضرت اویس قرنیؓ، حضرت امام زین العابدینؓ، حضرت امام باقرؓ، حضرت امام جعفر صادقؓ، حضرت محمدؒ حنفیہ، حضرت سعیدؓ بن مسیب، حضرت سعیدؓ بن جبیر، حضرت محمد بن سیرین، حضرت ابنؓ شہاب زہری، امام ربیعۃؓ رائی، امام مکحول شامی، قاضی شریحؒ، وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح، اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے۔

ضخامت:- ۵۰۰ صفحے،

قیمت:- پانچ روپے،

منیجر

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: چھ روپے سالانہ

مطبع دارالمصنفین

دارالمصنفین کی نئی کتاب

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ

ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سندھ میں اترا تھا، اور ان کی پہلی حکومت یہیں قائم ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہاں حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے ان کے آثار نمایاں ہیں، لیکن اس کے باوجود اردو میں اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ موجود نہیں تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ میں یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس میں سندھ کا جغرافیہ مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا، ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت میں شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب مکمل ہو رہا ہے، اور وہاں ایک نئی حکومت کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں،

ضخامت:- [illegible] صفحے

قیمت:- [illegible] روپیہ

جلد ۶۲ ماہ صفر المظفر ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۸ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

انڈین یونین ایک جمہوری اور غیر مذہبی حکومت ہے لیکن اسکے مختلف فرقوں کے مخصوص مذہبی و معاشرتی رسوم نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ میں وحدت ویکرنگی پیدا کرنے کے لئے دستور میں جو دفعات شامل کی گئی ہیں وہ جمہوریت کے سراسر خلاف ہیں کسی فرقہ کے پرسنل لا میں تو شخصی اور مذہبی حکومتیں بھی مداخلت نہیں کرتیں، اور یہ مسئلہ کسی ایک فرقہ کا نہیں، بلکہ ہندو مسلمان، سکھ عیسائی، یہودی، پارسی وغیرہ ہندوستان میں بسنے والے تمام فرقوں کا ہے، اس لئے کہ ان سب کے رسوم کے طریقے جدا ہیں، جو ان کے مذہبی قوانین و روایات کے مطابق انجام پاتے ہیں، خصوصاً مسلمانوں کے نکاح، طلاق، خلع اور وراثت وغیرہ کے قوانین تو قرآنی ہیں جن میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا، اور اُن کے مطابق انجام پائے بغیر یہ امور صحیح نہیں ہو سکتے، اس لئے یہ مسئلہ تمام فرقوں کے جائز حقوق کا ہے، اور وحدت ویکرنگی پیدا کرنے کی دلیل نہایت لغو ہے، اس سے تو مذہب میں بھی یکسانی پیدا کرنے کا قانون بنایا جا سکتا ہے جسے کوئی فرقہ بھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا، نکاح و طلاق و وراثت وغیرہ کا تعلق بھی محض معاشرت سے نہیں بلکہ مذہب سے ہے، اس لئے ان کے قوانین میں کوئی حکومت بھی خواہ وہ شخصی ہو یا جمہوری، مذہبی ہو یا غیر مذہبی مداخلت نہیں کرتی، اور ہر فرقہ کو اُن پر عمل کرنے میں آزاد رکھتی ہے، اس میں دست اندازی کا سہرا ہماری جمہوری اور غیر مذہبی حکومت کے سر ہے گا، اس کو چاہئے تو یہ تھا کہ مذہبی حقوق میں مداخلت کے شبہات کو دور کرتی، الٹے اپنے عمل سے ان کو تقویت پہنچا رہی ہے، اس لئے ان دفعات پر نظر ثانی کرنا ضروری ہے،

یہی حال مویشی کے ذبیحہ کی ممانعت کی دفعات کا ہے، مویشی اور زراعت کی ترقی اور اقتصادی و معاشی مسائل کو آڑ بنانے سے اصل حقیقت نہیں چھپ سکتی، اقتصادی اور زراعی فوائد کا حال تو اس وقت معلوم ہوگا جب ذبیحہ ...

مویشیون کی کثرت ہوجائیگی، اور جہان انسانون کو پیٹ بھر کھانا میسر نہین وہان بیکار جانورون کے لئے چارہ مہیا کرنا پڑے گا، اور چمڑے کی کرورون روپیہ کی تجارت کا علٰحدہ نقصان ہوگا، اس وقت خود گورنمنٹ اس قانون کے توڑنے پر مجبور ہون گے، قانون جذبات کی رو مین نہین بنا کرتے، ان کے تمام پہلوؤن پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، اور اگر درحقیقت مویشی اور زراعت کی ترقی مقصود ہے تو اس کے لئے وہ تدبیرین اختیار کرنی چاہئین جو ترقی یافتہ ملکون مین اختیار کیجاتی ہین، اس کا طریقہ ذبیحہ کی بندش نہین ہے، البتہ اگر اس کی بندش اس لئے ضروری ہے کہ گائے ہندوؤن مین محترم ہے تو اس کا صاف اعتراف کرنا چاہئے، محض زبان سے جمہوریت کا اشتہار دینے سے کچھ حاصل نہین جب تک عمل اس کے مطابق نہ ہو،

ہندوستان کی آزادی کے معنی کسی خاص فرقہ اور جماعت کی آزادی کے نہین بلکہ ہر فرقہ اور ہر فرد کے جائز حقوق کی آزادی کے ہین، اور اگر کوئی فرقہ آزاد اور جمہوری ہندوستان مین بھی اپنے کو محکوم اور بےبس محسوس کرتا ہے تو وہ اس کے لئے باعث فخر نہین ہوسکتا، اگر گائے کا ذبیحہ ہی بند کرنا مقصود ہو تو اس کا صحیح طریقہ قانونی بندش نہین، بلکہ دوسرے بہتر طریقے ہوسکتے ہین، اس تنقید سے مقصود تخریب نہین بلکہ اصلاح ہے، اس لئے حکومت کو ان مسائل پر غور کرنا ضروری ہے،

افسوس ہے کہ پچھلے پرچہ مین ہندوستانی کنونشن کا جو ۳۰، ۳۱ اکتوبر کو لکھنؤ مین ہوا تھا تذکرہ نہ ہوسکا، یہ اجتماع اپنی نوعیت مین اس حیثیت سے نہایت اہم تھا کہ اس مین بلا اختلاف مذہب و ملت ہندوستانی زبان کے تمام حامیون نے شرکت کی اور اس کی حمایت مین تقریرین کین، اور حکومت کے رویہ پر بے اطمینانی کا اظہار کیا، جو اس کی دلیل ہے کہ تعصب اور فرقہ پرستی کے اس تاریک دور مین بھی حقیقت کا چراغ گل نہین ہوا ہے، خود کنونشن اور اسکی مجلس استقبالیہ کے محترم صدر پنڈت سندر لال، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ اور پنڈت کشن پرشاد کول کے خطبے اور تقریرین اس کی شاہد ہین، خصوصاً ہندو حلقون اور حق پسند ہندؤن نے جس صفائی، جرأت و ہمت سچائی کا ثبوت دے اعلان کیا ہے، وہ ہمارے لیے قابل تقلید ہے، زبان کے بارہ مین ان کے خیالات اور مشورے ہندی اور ہندوستانی دونون کے حامیون اور مخالفون کے لئے لائق غور ہین، اس جھگڑے کا صحیح حل ان مین سے کسی ایک زبان کے ساتھ تعصب یا اس کی بیجا حمایت، یا سرکاری یا حکومت کی قوت سے نہین بلکہ

دونوں زبانوں کے حقوق ماننے اور ان کے ادا کرنے ہی سے ہوسکتا ہے،

کنونشن کی قرارداد کے مطابق ہندوستانی زبان کے حامیوں کا ایک وفد بھی جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے، مرکزی حکومت کے ارکان سے ملا، اور اس کو سرکاری زبان بنانے کی عرضداشت پیش کی، اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت اس مشترک مطالبہ پر کیا طرزِ عمل اختیار کرتی ہے، یہ اس کی جمہوریت پسندی کا امتحان ہے، اس سے توقع ہے کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کریگی،

گذشتہ فرقہ وارانہ اثرات سے مسلم یونیورسٹی بھی محفوظ نہیں تھی، اور اس کی آیندہ پالیسی اور نظام کے بارہ میں عرصہ سے یونیورسٹی کے مختلف الخیال اربابِ حل و عقد میں کشمکش چلی آرہی تھی، حکومت بھی یونیورسٹی سے بدگمان تھی، جس سے اس کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ تھا، خوشی کا مقام ہے کہ سابق وائس چانسلر نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب نے خود ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کے لئے جگہ خالی کرکے بڑے خوشگوار طریقہ سے اس کشمکش کا خاتمہ کر دیا، اور یونیورسٹی کو ایک بڑے خطرہ سے بچا لیا،

مدرسۃ العلوم جن حالات میں اور جن مقاصد کیلئے قائم ہوا تھا، اور جن پر یونیورسٹی چل رہی تھی وہ نئے بدلے ہوئے حالات سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے، اور ان پر چل کر یونیورسٹی زندہ نہیں رہ سکتی تھی، ان کو بدلنا بہرحال ضروری تھا، اس تبدیلی کے لئے ڈاکٹر صاحب سے بہتر شخصیت نہیں ہوسکتی، وہ اسی درسگاہ کے ایک نامور فرزند ہیں، اس سے ہمیشہ ان کو لگاؤ رہا، اور وہ اپنے علمی کمالات، وسیع تعلیمی و انتظامی تجربہ اور ذاتی خوبیوں کے سبب سے اس منصب کیلئے سب سے زیادہ اہل و مستحق تھے، ان خصوصیات کے ساتھ وہ قوم و ملک و ملت سب کے حق شناس ہیں، اور ہر فرقہ اور ہر جماعت کو ان پر اعتماد ہے، اس لئے ان کے انتخاب سے یونیورسٹی خطرات سے بھی محفوظ ہو گئی، اور یقین ہے کہ وہ نئے حالات سے ہم آہنگی کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کو رہتے ہوئے علمی و تعلیمی حیثیت سے بھی ترقی کرے گی،

مقالات

تصوف و سلوک کی تجدیدات

از

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی،

(۴)

بیعت و ارادت

اب اس کے ساتھ بیعت و ارادت کی حقیقت و ضرورت بھی سن لیں، جس میں افراط و تفریط یہ ہے، کہ ایک طرف اس کو سرے سے بعضوں نے بدعت سمجھ رکھا ہے، اور دوسری طرف لوگوں نے صرف ایک رسم بنا رکھا ہے، کہ بس دست بوسی و پا بوسی کر لی، باقی خود کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں، حالانکہ:-

"نری پیری و مریدی میں کچھ نہیں رکھا اصل کام خود چلنا ہے، اور کسی رہبر کا ہاتھ کا پکڑنا، اگرچہ (رسمی) مرید کسی سے بھی نہ ہو، یہ مطلب نہیں کہ سلسلہ میں داخل ہونے سے برکات کچھ نہیں لیکن اس کو اصل الاصول سمجھنا بڑی غلطی ہے آج کل پیری و مریدی کے متعلق وہ جہل پھیلا ہوا ہے کما الامان والحفیظ[1]

بیعت کی اصل حقیقت خود لفظ بیعت و ارادت اور مرید کی اصطلاح بلکہ لفظی معنی ہی سے واضح ہو جاتی ہے

---

[1] الرفیق فی سواء الطریق ص ۴۰۶

جیسا کہ اوپر ارادہ کی ماہیت میں حضرت نے واضح فرمادیا کہ ارادہ محض آرزو و تمنا کا نام نہیں، بلکہ مراد کو پورا کرنے کے لئے ضروری اسباب و وسائل کی بہم آوری میں لگ جانا، یا منزل مقصود کی طرف چل پڑنا ہے، بس مرید بھی اصطلاحاً وہ ہے، جو اپنی دینی خصوصاً باطنی و قلبی اصلاح و درستی کو مراد و منزل بنا کر اس کے ضروری وسائل اختیار کرتا، اور اس کی طرف چل پڑتا ہے، اور بیعت کے معنی ہیں اس منزل مقصود کے لئے کسی زیادہ واقف کار کو رہبر و رفیق بنا لینا، اور اس کے پیچھے یا ساتھ ساتھ چلنا، تاکہ نہ صرف گمراہی کے خطرات سے حفاظت ہو بلکہ راستہ سہولت و راحت سے قطع ہو، با لفاظ دیگر اپنے سے زیادہ واقف و ماہر مصلح کے ہاتھ میں اپنے کو اس طرح سونپ دینا جس طرح بائع مشتری کے ہاتھ اپنی چیز سونپ دیتا ہے، یا جیسے مریض کسی حاذق و ماہر طبیب کے حوالہ اپنے کو کر دیتا اور دوا و پرہیز میں کاملاً اس کی تجاویز و ہدایات پر عمل کرتا ہے، اور خالی اس گھمنڈ میں کہ خود کوئی شخص لکھا پڑھا بلکہ عالم و فاضل ہے، اور طب کی کتابوں کو پڑھ لیتا ہے، یا باقاعدہ کسی استاد ہی سے پڑھ لیا ہے، مگر مطب نہیں کیا، اگر وہ خود اپنی بیماریوں کا علاج محض کتابوں یا کتابی نسخوں سے کرنے لگے، تو ہلاکت کے خطرات کو دعوت دینے کے سوا کیا ہے، باقاعدہ علاج و نسخہ نویسی کی لیاقت تو باقاعدہ کسی طبیب کے مطب میں دو چار سال بیٹھکر اور نسخہ نویسی کی مشق ہی سے حاصل ہو گی، حکیم کبیر الدین صاحب نے طب کی کتابوں کو باقاعدہ پڑھا ہی نہیں، بلکہ طب کے مشہور مستند مصنف ہیں، لیکن خود فرماتے تھے، کہ علاج کھانسی زکام کا بھی نہیں کر سکتا، اور بھی ایسے معلمین طب گذرے ہیں، (جیسے حکیم عبدالعزیز مرحوم دریابادی) جو عمر بھر طب پڑھایا کئے اور استاذ الاساتذہ رہے، مگر معالجہ کی مشق نہ تھی، نہ علاج کرتے تھے، ایک طب و طبیب پر کیا موقوف ہر عملی فن کا یہی حال ہے، کیا کوئی لوہار اور بڑھئی کا کام محض کتابیں پڑھ کر سکتا ہے، یا کھانا محض طباخی کی کوئی کتاب پڑھ کر پکا لیگا، بس وہی کچا پکا، الٹا سیدھا، وہ بھی بہت کچھ وقت اور سامان برباد کرنے کے بعد، پھر بھی خود رو ہونے کی خامی ہمیشہ باقی رہے گی۔

۱؎ کتب طب سے کوئی مریض اپنا معالجہ نہیں کر سکتا، حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے۔

طبیب ان ہی سے واقف ہو سکتا ہے، مگر متعین نہیں کر سکتے اگر محض وصف کی علامت کو دیکھ کر نسخہ دیں امراض کا علاج تو کبھی نہیں کر سکتے، مجھے ہر سال برسات کے موسم میں بخار آیا کرتا تھا، اور حکیم صاحب ہر سال قریب قریب ایک ہی نسخہ لکھتے تھے، میں نے کہا لاؤ اس کو رکھ لیں جب بخار آیا کرے گا اس کو استعمال کر لیا کریں گے، چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا، مگر خاک نفع نہ ہوا، آخرکار حکیم صاحب کو بلایا، انہوں نے نسخہ لکھا اس کے پینے سے آرام ہوا، پھر تحقیق ہوا کہ اس سال صفرا کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں، اب اگر میں نے یہ نسخہ بھی نقل کر لیا، کہ چلو اس میں صفرا و بلغم دونوں کی رعایت ہے، تو یقیناً اس سے بھی اگلے سال نفع نہ ہوتا، کیونکہ اس کا مجھے اندازہ کیسے ہوتا کہ اس سال بلغم صفرا سے زیادہ ہے، یا مساوی ہے یا کم، اس کا اندازہ تو طبیب ہی کر سکتا ہے جو نبض کی حالت پہچانتا ہے، اس لئے کتب طب سے معالجہ کرنا طبیب ہی کا کام ہے۔

(اشرف الجواب حصہ دوم ص ۱۰۶)

یہ بات دراصل بالکل موٹی اور معمولی ہے پھر بھی اتنی تفہیم و تمثیل کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ پہلے تو پرانوں میں خشک ترتیب اور تہذیب (یا رسمی) تصوف کی بدولت یہ افراط و تفریط ہوئی کہ ایک نے بیعت و ارادت کو سرے سے حرام و بدعت قرار دیدیا، اور دوسرے نے بیعت کو وہ بھی خالص اس کی رسموں کو لازم و واجب سمجھ لیا، اور آج کل تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے، کہ دینی اصلاح و درستی یا باطنی علاج و معالجہ الگ رہا، اس کا تصور ہی سرے سے مفقود ہے، ظاہری دین اور دینی مسائل تک کے لئے باقاعدہ کسی تعلیم حتیٰ کہ براہ راست ماخذ (کتاب و سنت) سے واقفیت تک کو ضروری نہیں جانتے، بس اردو انگریزی میں قرآن و حدیث کے کچھ ترجمے یا ادھر ادھر کے اخباری مضامین پڑھ کر ہی دین کے متعلق ہر چیز جاننے والا سب کچھ بن جاتے ہیں، [illegible]

[illegible] سمجھ لیا کہ [illegible] بننے کے لئے تو گویا [illegible] کتب [illegible] پڑھ [illegible]

باقاعدہ لکچروں کی تکمیل، امتحان کے بعد بھی کسی سینئر مشاق وکیل کے ساتھ کام کرنا اور تجربہ حاصل کرنا ضروری ہے، اور وہ بڑا احمق ہوگا، جو قانون کے کسی ایسے مشہور سے مشہور پروفیسر کے ہاتھ میں اپنا مقدمہ دیدے جس نے عدالت کی صورت کبھی دیکھی ہو، نہ عدالتی کام کا عملی تجربہ رکھتا ہو، سائنس کی کتابوں کو خود پڑھ کر یا استاد کے محض لکچر سن کر کوئی سائنسدان نہیں بن جاتا جب تک معمل (لیبوریٹری) میں اختبارات ومشاہدات نہ کرے،

حالانکہ ان معاملات ومقدمات، تجربات ومشاہدات کا تعلق اس دنیا اور عالم شہادت سے ہے لیکن دینی مسائل جن کا رشتہ عالم غیب وآخرت کے مابعد الطبیعاتی مسائل سے جڑا ہوا ہے، اُن کو ہر لیڈر، ہر اڈیٹر اور ہر ایڈیٹر تختۂ مشق بنانے کا حق رکھتا اور ان پر مجتہدانہ اظہار خیال فرماتا ہے!

انتہا یہ کہ خود تصوف اور اسلامی تصوف پر ایسے ہی حضرات تنقید وتحقیق فرمانے لگے ہیں، اور ہمہ شما پارسے اس تحقیق (ریسرچ) کی اسناد لاتے ہیں، ایک بڑے مشہور عالم ومصنف نے محض کتابی معلومات کے زور پر کسی جگہ تصوف پر ایسا ہی عالمانہ لکچر دیا، تو مجمع نے کسی کیا خوب داد دی کہ حضرت اگر تصوف خالی کتابوں سے حاصل ہو جاتا، تو میں آپ سے بڑا کسی کو صوفی نہ جانتا،

غرض ارادت وبیعت کا مطلب کمال دین یا دین کے مرتبۂ احسان کی طلب میں نکل پڑنا، اور اپنے سے زیادہ کسی واقف کار رہبر کے پیچھے ہو لینا ہے، یا یوں کہو کہ اس مرتبہ دین کا تعلق چونکہ خصوصیت کیسا تھ قلب وباطن کی اصلاح اور اس کے امراض کے ازالہ سے ہے، اس نے کسی شفیق وحاذق طبیب کے زیر علاج اپنے کو دیدینا،

حضرت علیہ الرحمہ نے اس کو پیر ومرید یا شیخ وطالب کے مابین ایک ایسے معاہدہ سے تعبیر فرمایا ہے جس میں شیخ کی طرف سے اصلاح کا وعدہ ہوتا ہے، اور طالب کی طرف سے اتباع کا، بیعت کی اس ماہیت کو جان لینے کے بعد ظاہر ہے کہ رسمی بیعت فرض وواجب بالکل نہیں، اس کا نفع صرف سلسلہ کی برکت کا حصول ہے، یا ایک نفسیاتی فائدہ، جیسا کہ ایک حیدرآبادی جامع حال وقال بزرگ (حضرت

مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے، کہ مرید کا ان دیدتیا ہے تعلق پیر کی بات کو قدرۃً زیادہ توجہ سے سنتا اور مانتا ہے،

ورنہ حضرت مجذوب علیہ الرحمہ کے ہاں تو نفس اس رسمی بیعت کی جو حیثیت تھی اس کا اندازہ حضرت والا کے واقعہ سے فرمایا جا سکتا ہے، کہ ایک صاحب کو سالہا سال کی تعلیم و تربیت کے بعد جب اجازت عطا فرمانا چاہا، تو انھوں نے عرض کیا حضرت ابھی تو احقر کو مرید بھی نہیں فرمایا گیا! فرمایا اچھا آؤ مرید بھی ہو جاؤ! اکثر فرمایا کرتے تھے، کہ مجھکو یاد بھی نہیں رہتا کہ کون مرید ہے کون نہیں بس میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ کام میں کون لگا ہے، بیعت کی درخواست کرنے والوں میں سے بالعموم ابتدا میں ایسے ہی جرحی سوالات فرماتے جن سے بیعت کی اصل غرض و غایت ان پر کھل جائے، ورنہ معمولاً لوگوں کے ذہن میں بیعت کی جو اغراض ہوتی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

"بعض صاحب کشف و کرامات بننا چاہتے ہیں، تو اس کا خود شیخ میں ہونا ضروری نہیں، تو مرید اس کی کیا ہوس کرے، بعض یہ کہتے ہیں، کہ پیر بخشش کے ذمہ دار ہو جائیں گے، حالانکہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ تک کو فرمایا تھا،

یا فاطمۃ انقذی نفسک من النار فاطمہ اپنے کو دوزخ سے بچاؤ،

تو بھلا اور کون پیر کسی مرید کو بچا سکتا ہے، جب تک خود مرید ہی اس کی کوشش نہ کرے۔

بعض جانتے ہیں کہ پیر صاحب ایک ہی نظر میں کامل کر دیں گے، اگر اس طرح کام بنجاتے تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو کچھ بھی نہ کرنا پڑتا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل النظر ہوگا کہیں بطور خرق عادت ایسا ہو بھی گیا، تو خوارق میں دوام و لزوم نہیں، اس بھروسہ پہ رہنا بڑی غلطی ہے،

بعض چاہتے ہیں کہ خوب جوش و خروش، شورش و مستی پیدا ہو جائے تو آپ سے باہر

چھوٹ جائیں خواہش ہی مٹ جائے، نیک کاموں میں ارادہ ہی نہ کرنا پڑے، آپ سے آپ ہوجایا کریں، وساوس وخطرات سب فنا ہوجائیں، بس ایک محویت کا عالم رہا کرے، یہ خیال پہلے خیال سے پاکیزہ سمجھا جاتا ہے لیکن منشاء اس کا بھی نا واقفی ہے، یہ امور منجملہ کیفیات واحوال کے ہیں جو اختیار سے خارج ہیں، اور گو محمود ہوں، مقصود نہیں، بلکہ ایسی خواہشوں میں نفس کا ایک خفی کید ہوتا ہے، کہ وہ طالب ہے راحت ولذت وشہرت کا اور ان کیفیات میں یہ سب امور حاصل ہیں ورنہ طالب رضا کو جو اصل مقصود ہے، ان خواہشوں سے کیا علاقہ،

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ۔۔۔ کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

پھر ایسا شخص دو قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہوتا ہے، اگر یہ کیفیات حاصل ہوگئیں تب تو بوجہ اس کے کہ یہ شخص اسی کو غایت سمجھتا تھا، اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگتا ہے، اور انہی پر قناعت کرکے تقویٰ وطاعات سے بےفکر ہوجاتا ہے، یا کم از کم طاعات کو حقیر ضرور سمجھنے لگتا ہے، اور اگر حاصل نہ ہوئیں تو اُن کے غم میں مرنے لگتا ہے، اور جو غیر اختیاری امور کا طالب ہوگا، ہمیشہ مبتلائے غم وپریشانی رہے گا،

بعضے سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب کے عملیات بڑے مجرب ہیں، ضرورت کے وقت اُن سے تعویذ گنڈے لیا کریں گے، یا پیر صاحب بڑے مقبول الدعوات ہیں، معاملات ومقدمات وغیرہ میں اُن سے دعا کرایا کریں گے، سب کام ہوجایا کریں گے، گویا ساری خدائی پیر صاحب کے قبضہ میں ہے یا خود ہم ایسی ہی چیزیں سیکھ لیں گے، بلکہ ایسے لوگ تمامتر بزرگی کا خلاصہ انہی عملیات اور اُن کے آثار کو سمجھتے ہیں، جو محض دنیا کی طلب ہے اس لئے فاسد در فاسد ہے[1]

حیدرآباد میں ایک بڑے عہدہ دار خاصے پڑھے لکھے نماز روزہ کے پابند ایک دن فرمانے لگے کہ اب

---

[1] قصد السبیل ہدایت چہارم،

کوئی بزرگ نہیں رہا، کیونکہ اس لئے کہ دکن و ہندوستان سب جگہ کوشش کی کوئی میرا تبادلہ فلاں جگہ سے بلدہ نہیں کراتا،

"بعضے یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر و شغل کرنے سے کچھ انوار نظر آیا کریں گے یا کچھ آوازیں سنائی دیں گی یہ محض ہوس و نافہمی ہے، اوّل تو ذکر و شغل پر نہ ان آثار کا مرتب ہونا ضروری ہے، اور نہ ذکر و شغل سے یہ مقصود ہے، دوسرے یہ انوار و اصوات وغیرہ بعض اوقات خود اس کے دماغ کا تصرف ہوتا ہے، عالم غیب کی اشیاء میں سے نہیں ہوتیں، تیسرے بالفرض اسی عالم کی چیزیں منکشف ہوگئیں، تو فائدہ کیا، کسی عالم کے منکشف ہو جانے سے قرب نہیں بڑھتا، قرب کے لئے تو طاعات بنائی گئی ہیں، بعض اوقات شیاطین کو ملائکہ نظر آنے لگتے ہیں، مگر وہ شیطان کے شیطان ہی رہتے ہیں، پھر مرنے کے بعد تو مومن کا فرسب ہی کو اس عالم کے بہت سے حقائق کا انکشاف ہو جائے گا، تو کیا اسی سے قرب مقصود سب کو حاصل ہو جائے گا،

غرض یہ چیزیں بیعت کی صحیح غرض کوئی بھی نہیں، اس لئے سب کو دل سے نکال کر سلوک کی اصلی غرض و مقصود رضائے حق کو سمجھے، جس کا طریق احکام شرعیہ کو بجا لانا، اور ذکر کی مداومت کرنا (یعنی غفلت کو رفع کرنا ہے) اور پیری مریدی کا حاصل یہ ہے کہ

"شیخ اسی کی تعلیم کرتا ہے اور مرید کاربند ہوتا ہے، اگرچہ کوئی کیفیت معلوم نہ ہو، نہ اس کے زعم کے مطابق کوئی کمال حاصل ہو، تب بھی آخرت میں اس کا ثمرہ جو کہ رضا ہے، ظاہر ہوگا، اس رضا سے دخول جنت و لقائے حق اور دوزخ سے نجات میسر ہوگی، تو شیخ کی طرف سے اسی کی تلقین کا وعدہ اور مرید کی طرف سے اس کے اتباع کا عہد یہی حقیقت ہے پیری و مریدی کی اور گو یہ تعلیم اصلاحی پر عمل بدون بیعت متعارفہ کے بھی ممکن ہے، لیکن بیعت میں طبعاً یہ خاصہ ہے کہ شیخ کو توجہ زیادہ ہو جاتی ہے، اور مرید کو فرمانبرداری کا پاس زیادہ ہو جاتا ہے، اور یہی حکمت ہے

شیخ کی تعیین اور صورت ہیں کہ جانبین کو خصوصیت بڑھ جاتی ہے، باقی ہاتھ میں ہاتھ لینا یا عورت کو کوئی کپڑا وغیرہ پکڑا دینا محض ایک مستحسن عادت ہو، اس معاہدہ کی تاکید کے لئے، نہ کہ نفس معاہدہ یا بیعت کا جزء، اسی وجہ سے غائب کے لئے اس کی رسم نہیں، اور استحسان سُنّت میں بھی وارد ہے، چنانچہ مردوں کے لئے ہاتھ میں ہاتھ دینا منقول ہے، اور کپڑا وغیرہ ہاتھ میں دینا یہ اخذ ید کے قائم مقام ہے[1]

باقی محض رسمی "اخذ ید" یا کسی پیر خصوصاً نام کے پیر کا نام کے لئے ہاتھ پکڑ لینا، اس کی نسبت ایک موقع پر نہایت جوش و قوت کے ساتھ ارشاد ہوا کہ

"اجی کس کی پیری و مریدی بنے پھرتے ہو، یہ تو کھینچ تان ہیں، بیعت کی صورت ضروری نہیں، اصل چیز بیعت کی روح یعنی اتباع ہے، غرض مرید ہونے کی ضرورت نہیں، پیر کے کہنے کے مطابق کام شروع کر دو، بس ہو گیا تعلق، واللہ وہی نفع ہوگا جو پیری مریدی میں ہوتا ہے، آج کل لوگوں کا عجب حال ہے، کہ کام بتاؤ تو نہ کریں، بس بیعت کا نام چاہتے ہیں، بیعت کی محض رسم ہی رسم رہ گئی ہے، چنانچہ جو پیر ایسے ہیں، کہ مرید کرتے ہیں لیکن کام کچھ نہیں بتلاتے، اُن سے لوگ بہت خوش ہیں، اور میں مرید تو کرتا نہیں کام بتلاتا ہوں، تو مجھ سے ناراض ہیں،

یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ جو بھید ہیں فقیری کے، وہ جو اچھر ہیں پریم ہیں کے وہ مریدوں ہی کو بتائے جاتے ہیں، مرید کرتے ہی بس پریم کے وہ اچھر بتا دے گا اور ہم اللہ والے ہو جائیں گے، میاں خدا رسول کا نام لو اور احکام بجا لاؤ، بس یہی اچھر ہیں، اصلاح نفس کا طریقہ پیر سے پوچھو، یہی بھید ہیں، اگر کوئی کہے کیا باطنی طریق بس یہی ہے، تو ہم بآواز دہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے، اور بس طریق میں کبھی بڑے بڑے حالات بھی پیش آئیں گے، بڑی بڑی کیفیات ہوں گی،

---

[1] قصد السبیل ہدایت چہارم،

طاری ہوں گی، مگر یہ مقصود نہیں،

بعض حالات تو سڑک کے بیچ لمبا درخت ہیں، نظر آسے تو کیا، نہ نظر آئے تو کیا، سڑک تو بہر حال قطع ہو گی، بس چلتے رہنا شرط ہے، اور بعضوں کو یہ درخت اور پھول عمر بھر نظر نہیں آتے، واللہ جن حالات کو آپ بڑا کمال سمجھتے ہیں، طریق میں بس ایسے ہیں، جیسے سڑک پر دو طرفہ گلاب کے بیلے کے درخت لگے ہوں، اگر کبھی ہم نیچی نظر کر کے چلتے ہیں تو کیا راستہ قطع نہیں ہوتا، راستہ تو برابر قطع ہوتا ہے، چاہے درخت نظر پڑیں یا نہ پڑیں۔[۱]

"غرض نہ بغیر چلے کام چلتا ہے نہ بغیر رفیق سیدھا راستہ ملتا ہے، اگر ایک نابینا کسی جگہ پہنچنا چاہے تو اوّل اس کو خود چلنے کی ضرورت ہے، اگر چلے ہی نہیں تو ہزار رفیق بننے پر بھی رستہ قطع نہ ہو گا، چلنے کے بعد پیر اور رفیق کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ اگر رہبر نہ ہو تو ناآشنا راستہ میں ضرور کسی جگہ ٹھوکر کھا کر گرے گا، بے خطر منزل پر پہنچنے کی صورت یہی ہے، کہ اپنے پیروں چلے اور رہبر کا ہاتھ پکڑے" بالکل ویسی ہی حالت اس رستہ کی بھی ہے، کہ ارادہ کرنا اور کام شروع کر دینا اپنے پیروں چلنا ہے، اور کسی بزرگ کا دامن پکڑ لینا رہبر کا ہاتھ پکڑ لینا ہے۔

<u>صحبت و تعلق</u> بیعت کی اصلی اور بڑی ضرورت یہی رفاقت یا پیر کی صحبت و تعلق ہے، تاکہ راستہ کے خطرات یا اس کی ٹھوکروں سے حفاظت ہو، اور یہ ایسی موٹی بات ہے کہ دنیا کے کسی موٹے سے موٹے کام میں بھی اس کام کے ماہر و تجربہ کار کی صحبت و اعانت کے بغیر بصیرت پیدا نہیں ہوتی، کسی علم و فن کے معلومات اور چیز ہیں، اور بصیرت اور چیز، معلومات تو باغبانی اور کاشتکاری کی کتابیں پڑھ کر بھی ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں، لیکن خالی ان کتابی معلومات کی بنا پر اگر ہم باغ لگانا اور کھیتی کرنا شروع کر دیں تو کیا قدم قدم پر ٹھوکریں نہ کھائیں گے، بخلاف اس کے اگر کچھ دن کسی تجربہ کار باغبان و کاشتکار کے ساتھ

---

[۱] حضرت التواصیٰ حصہ دوم ص ۱۹۵ [illegible]

یا اس کی صحبت میں اس کام کو کریں تو اس کے نشیب و فراز کی ایسی بصیرت یا مذوقی بینائی حاصل ہوجاتی ہے کہ اگر کوئی بالکل ہی نئی زمین دیدی جائے، تو اس سے کام لینے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی،

لیکن اس زمانہ میں لوگوں کو دین کے معاملات میں خصوصاً یہ بیماری وبا کی طرح لگ گئی ہے، کہ رہبری ہی کے لئے نہیں، بلکہ جہالت کی انتہا ہے، کہ رہبری اور تجدید و اجتہاد تک کے لئے محض کتابی معلومات کی بنا پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی صحبت سے محروم اچھے اچھے دینی علوم و معلومات والے ضال و مضل دونوں ہو رہے ہیں، احقر کی سمجھ میں ان حضرات کی حالت ایسے نومسلم کی سی ہوتی ہے جس کا اسلام تمامتر کتابی معلومات سے ماخوذ ہو، وہ نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ سب کے فرائض و سنن ارکان و شرائط محض کتابیں دیکھ دیکھ کر پورا کرتا ہو، جس کے مقابلہ میں ایک پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان گھرانے کا ان پڑھ بچہ گھر والوں کو دیکھ دیکھ کر زیادہ صحیح طور پر وضو نماز وغیرہ کے واجبات و مستحبات ادا کر سکے گا، غرض کوئی علم و فن ہو، اس کے عملی ماہر کی صحبت کے بغیر اناڑی پن مشکل ہی سے نکلتا ہے،

"بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل و مکمل ہوا ہے، ارے بھائی موٹی بات ہے، کہ بلا بڑھئی کے پاس بیٹھے کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا، حتیٰ کہ بسولا بھی بطور خود ہاتھ میں لے کر اٹھاوے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جا سکے گا، بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا انداز بھی نہیں آتا، بلا خوش نویس کے پاس بیٹھے اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہرگز خوشنویس نہیں ہو سکتا، غرض بدون کامل کی صحبت کے کوئی کامل نہیں بن سکتا، لہٰذا پیر کامل کی صحبت لازم ہے"[1]

اور ہمارے لئے تو صحبت کی حاجت و اہمیت کی سب سے بڑی دلیل صحابیت ہے، کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی فضیلت بھی اعلیٰ سے اعلیٰ محدثین و فقہاء اور بڑے بڑے اولیاء و اقطاب پر مسلم ہے، ظاہر ہے، کہ اس فضیلت کا مدار نہ کتابوں پر ہے کہ اکثر صحابہ بے پڑھے امی تھے، نہ کثرت معلومات پر کہ ان کے مقابلہ میں بعد کے معمولی علما کی بھی معلومات زیادہ ہوتی ہیں، اس فضیلت کا مدار محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پر ہے جو اعلیٰ ہی نہیں کہ مساوی کی صحبت بھی بعد کے

[1] [illegible] ۱۵

بڑے بڑے علماء و اولیاء کو اب نصیب نہیں ہو سکتی، اور جن کو کچھ تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک دن کی صحبت سے جو کچھ نصیب ہوتا ہے، وہ سالہا سال کی کتاب خوانی سے نصیب نہیں ہوتا، اور اس میں کچھ زیادہ مبالغہ نہیں کہ

یک زمانے صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

غرض صحبت کی اس ناگزیر ضرورت کی بنا پر قصد السبیل تعلیم الدین وغیرہ میں جہاں جہاں بیعت و سلوک سے بحث و گفتگو فرمائی گئی ہے، صحبت کی خاص طور سے تاکید ہے کہ بیعت کے بعد اگر وقت و مہلت میسر ہو تو چند روز پیر کی خدمت میں رہے، یا کبھی کبھی اپنے پیر کے پاس یا اور کوئی خوش عقیدہ و متقی بزرگ موجود ہو تو اس کے پاس بیٹھا کرے، اور اگر ذرا طویل صحبت میسر ہو جائے تو یہ بصیرت ایسی بڑھ جاتی ہے، کہ واقعی اس کے قبل کی اپنی حالت بالکل احمقانہ معلوم ہونے لگتی ہے، اس احمق راقم پر تو بالکل یہی گذری کہ تھوڑی بہت کتابیں پڑھی تھیں، خالی کتاب خوانوں کی صحبت بھی اٹھائی تھی، فراغت کی سند بھی حاصل تھی، تصنیف و تالیف کا بھی کچھ دعویٰ تھا، عقل و فہم میں بھی ہم چشموں میں ہونہار خیال کیا جاتا تھا، لیکن حضرت علیہ الرحمہ کی خدمت میں چند ہی حاضریوں کے بعد معلوم ہو گیا کہ جس کو دین کی فہم و بصیرت کہنا چاہئے اس کے اعتبار سے خدا گواہ ہے کہ نرا احمق اور گنوار ہی تھا!

"کتنا ہی بڑا عاقل ہو، مگر عالم نہ ہو اور نہ کسی محقق عالم کی صحبت میں رہا ہو، اس کو کسی محقق کی صحبت میں چھ مہینے کے لئے بھیج دو، خدا کی قسم اس چھ مہینے میں وہ محقق ثابت کر دے گا، اور اس عاقل کی زبان سے اقرار کرا دے گا، کہ میں احمق ہوں، اور اس وقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا، اگر اس سے زیادہ دلیل کی ضرورت ہے تجربہ کر لو، کہ چھ مہینے کی رخصت لو، پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھ لو، اس وقت دیکھ لو گے کہ جو شخص آتے گا تو اپنے کو عاقل

---

[1] اشرفیہ تمام وعظ ص ۳۴۹،

کہتا ہوا، مگر جانے کیا یہ کہتا ہوا، کہ میں احمق ہوں نہیں، بلکہ بہت احمق تھا، کیونکہ اب تو اس حمق کی برکت سے عقل آجائے گی،

علمی دینی یا باطنی تحقیق و بصیرت کا تو ذکر ہی کیا، روزمرہ کی ظاہری و معمولی باتوں میں جن چیزوں کو ہم تہذیب و کمال سمجھتے ہیں، حضرت علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے متعلق بھی قدم قدم پر اپنی حماقتوں کا ادراک ہوتا تھا، جو نپور کے ایک شاعر حاضر ہوئے جو عرفی تہذیب سے آراستہ تھے،

"چند روز رہنے کے بعد جب واپس گئے، تو ایک رسالہ لکھا، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ عمر بھر جسے ہم تہذیب سمجھا کئے، وہاں (تھانہ بھون) جا کر معلوم ہوا کہ وہ تہذیب ہی نہ تھی، ایک اور دہلی کے طبیب چند روز رہ کر کہنے لگے، کہ جن کو ہم اب تک کمالات سمجھتے تھے سارے نقائص نکلے، اور جنھیں ہم ہنر سمجھتے تھے، وہ سب عیوب تھے"[۱]

وحدت شیخ | اسی سلسلہ میں ایک اور بڑی ضروری یاد رکھنے والی بات یہ فرمائی جس سے وحدت شیخ اور وحدت صحبت کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، خصوصاً ابتدا اور خامی کی حالت میں اگر ہمارا تعلق کئی شیوخ سے ہو یا مختلف رنگ و مذاق کے اہل اللہ کی صحبتوں میں حاضر ہوں، تو اس آزادی و بےقیدی کی بدولت حصول اطمینان کے بجائے انتشار میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے،

"امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں اور اطلاق مضر ہے کیونکہ اطمینان اور چین بدون تقیید کے نہیں ہوتا، مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہوں گے فلاں طبیب کا علاج کریں گے تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے، بیماری کا خوف نہیں ہوگا، نہ بیماری کے وقت متوحش ہوں گے، کہ کس کا علاج کریں، اور اگر مقید نہیں ہیں مثلاً ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں ہیں، آج ذرا سا تغیر پیش آیا ایک طبیب سے رجوع کیا، دوسرا تغیر پیش آیا تو دوسر

---

[۱] الشریعۃ نام وعظ ص ۳۰،

علاج کیا تیسرا پیش آیا تیسرے سے رجوع کیا، تو اس میں دل کو چین نہ ہوگا، ہر وقت فکر رہے گی کہ اب کی تغیر میں کس سے رجوع کریں،

یہ ایسی مثال حضرت نے دی کہ ظاہری علاج میں اس کا روزانہ ہی تجربہ ہوتا رہتا ہے خصوصاً آجکل تو طرح طرح کے طبیبوں اور علاج کے نت نئے طریقوں اور طبائع کی عدم تقیید و آزادی کی بدولت یہ حال ہے کہ مریض تختۂ مشق بن کر رہ جاتا ہے، کبھی یونانی علاج کبھی ڈاکٹری علاج، پھر کبھی اس ڈاکٹر کا کبھی اس ڈاکٹر کا، کبھی یونانی ہے، تو اس میں بھی کبھی یہ حکیم کبھی وہ پھر کبھی ہومیو پیتھک ہوا کبھی قدرتی علاج ہوا اس میں نہ صرف بیمار و تیمار دار سب کا اطمینان قلب رخصت ہو جاتا ہے، بلکہ بارہا مال کی اضاعت کے ساتھ مریض کی ہلاکت کا ظاہری سبب بھی اس طرح تختۂ مشق بن جانا ہی ہوتا ہے، بس ایک دفعہ سوچ سمجھ کر معالج کو تجویز کر لیا، جو مہارت و حذاقت میں چاہے اوسط درجہ ہی کا ہو، مگر آج کل کے عام معالجین کی طرح نظر مریض کے مرض سے زیادہ اس کی جیب پر نہ ہو، پھر اگر کسی بیماری میں معتدبہ مدت تک اس کے علاج سے نفع نہ ہو، تو اسی سے دوسرا معالج بھی تجویز کرا کے اس کے ساتھ شریک کرے،

راقم ہذا کا تجربہ ہے کہ اپنے اور اپنے گھر بھر کے لئے یہی طریقہ اختیار کر رکھا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ایک بڑے مخلص معالج[1] نصیب ہوگئے ہیں، جن کی نظر مریض کے مرض اور عند اللہ اجر کے سوا قطعاً کسی چیز پر نہیں، بس جو بیمار ہوا ان کے حوالہ، اور الحمد للہ کہ اس کم و بیش پچیس سال کی مدت میں لکھنؤ کے قیام میں کبھی کسی دوسرے سے براہ راست رجوع کی نوبت نہیں آئی، اور کبھی ضرورت محسوس ہوئی جو بھی بہت ہی کم تو انہی سے درخواست کرکے انہی کی تجویز سے اور انہی کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کر لیا گیا، اور اللہ تعالیٰ نے دو چار کے سوا جن کا وقت پورا ہو چکا تھا، باقی سب کو دیر سویر شفا ہی عطا فرمائی، اور قلب کو اس سے جو اطمینان رہتا ہے وہ اس کا حال تو راقم ہی اس تجربہ کی بنا پر خوب جانتا ہے کہ بیماری سے قبل ہی

---

[1] یعنی جناب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب مد ظلہ،

بیماری کے دوران دونوں میں کتنی بے فکری رہتی ہے، اللہ تعالیٰ سراپا ایمان واخلاص معالج کو ہم سب کی طرف سے ہزاروں ہزار درجات عطا فرمائے!

اور اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی رحمت نے باطنی امراض کے باب میں حضرت علیہ الرحمۃ سے تعلق تربیت کے بعد دستگیری فرمائی، کہ پھر کسی طرح کی بے قیدی کی ضرورت و نوبت نہیں پیش آئی، حالانکہ تعلیم و تربیت تمامتر ایک ایسی درسگاہ میں ہوئی تھی جس کا طرۂ امتیاز ہی بے قیدی و آزادی ہے، پھر باطن کا یہ مریض باطنی دق کے بالکل آخری درجہ میں تھا، اس لئے اس کی زندگی کا جو رمق بھی رہ گیا، اور جسم ظاہر کی گوناگوں بیماریوں اور پریشانیوں کے باوجود قلب و باطن میں جو کچھ بھی نام چار کو سکون و اطمینان میسّر ہے، وہ حضرت ہی کی ذات اور تحریرات کے ساتھ تعلق کا طفیل ہے، بلکہ ظاہر اسباب اس جسم ناتوان کے ساتھ جان کا رشتہ اب اسی سے قائم ہے، ورنہ جسم کی بیماریوں اور حالات کی ناسازگاریوں نے اجل مسمّٰی کے انتظار کے سوا کچھ چھوڑا نہیں ہے،

جن کو حضرت کی ذات سے تعلق کی سعادت نصیب نہیں ہو سکی، اُن کی خدمت میں اپنے ہی نہیں، دوسروں کے بھی کثیر تجربات کی بنا پر عرض ہے کہ حضرت کی تحریرات کا درجہ بس حضرت کی ذات کے بعد دوسرا ہی ہے، ابتدا خصوصاً مواعظ و ملفوظات سے فرمائی جائے، اور مقدم ملفوظات کو کرنا چاہئے، جن سے بالواسطہ صحبت کا نفع ہوگا، خود حضرت نے بھی براہ راست صحبت میسّر نہ آنے کی صورت میں بزرگوں کے ملفوظات ہی کے مطالعہ کی ہدایت فرمائی ہے، بشرطیکہ نیت دینی و باطنی اصلاح و استفاضہ کی ہو، نہ کہ آج کل کی طرح علمی و ادبی تحقیق و تنقید کی، تقوی پر ایک وعظ میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا اور قائم رہنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ

"اس محبت کے قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کیجئے زیادہ نہ ہو تو کم از کم ہفتہ میں ایک ہی بار یا مہینہ میں ایک بار، اس میں [illegible]

جو چیز ہے وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آوے گی، اور ان میں آپ سے دنیا کے کام نہیں چھڑاتا،
اپنی فرصت کے وقت اُن کے پاس جا کر رہئے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو، تو ان کے ملفوظات
ہی پڑھئے، لیکن محض تذکرہ، اور فن کی کتابوں کی طرح نہ دیکھئے" (ص ۱۹)

ان میں مجدد وقت کے ملفوظات کو بالخصوص اس لئے پڑھنا چاہئے کہ وہ قدرۃً وقت کے حالات وتجددات کے مناسب ہیں، بلکہ ابتدا میں قدیم بزرگوں کے ملفوظات پڑھنے سے طرح طرح کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا اندیشہ ہے، خصوصاً جدیدوں اور کم علموں کو، احقر کا واسطہ عمر بھر زیادہ تر اس زمانہ کے حالات وخیالات سے متاثر اور انگریزی دانوں ہی سے رہا، اور ان کو ہمیشہ پہلے حضرت کے ملفوظات پڑھنے کو دیئے، تو نہ صرف دین کے متعلق اُن کی طرح طرح کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا، بلکہ تصوف کے ساتھ نفس دین سے بھی بڑھ کر جو عجیب عجیب بدگمانیاں تھیں وہ دور ہو کر طالبانہ ذوق و شوق پیدا ہو گیا،

صحبت سے دین دل میں رچ جاتا ہے لہٰذا اہل اللہ کی صحبت سے محض فہم دین کی بصیرت ہی نہیں پیدا ہوتی، بلکہ صحبت کی بالکل قدرتی ونفسیاتی خاصیت یہ بھی ہے، کہ مصاحب کے اندر جو چیز ہے، وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آوے گی، مزید برآں آدمی بتکلف وتبود عمل بھی اختیار کر لے سکتا ہے، مگر بلا صحبت کے دین قلب وروح میں رچنا یا سرایت بمشکل ہی کرتا ہے، اور اس عمل کی نوعیت بس زیادہ سے زیادہ ایسے مزدور یا تنخواہ دار نوکر کے کام کی ہوتی ہے، جس کو آجر یا آقا سے کوئی قلبی تعلق نہیں ہوتا، اسی کو مذکورۂ بالا وعظ (تقویٰ) میں فرمایا کہ "صورت عمل تو دوسری چیز ہے لیکن اصل دین وہ ہے جو قلب میں رچ جائے، یہ صحبت پر موقوف ہے"؛

غرض تحقیق اہل اللہ کی صحبت یا یہ نہ میسر ہو تو کم از کم ان کے ملفوظات وغیرہ کا مسلسل بنظر اصلاح استفادہ ومطالعہ نہ صرف دین کی صحیح فہم وبصیرت کے لئے ضروری ہے، (جو نام ہے باطنی روشنی کا جیسے

بعد ظاہری نگاہ کا، بلکہ اس سے اہل اللہ کا ایمان و عمل ہمارے اندر منتقل ہوتا اور قالب سے تجاوز کرکے قلب و روح میں اترتا، یا رچ جاتا ہو،

لیکن کیا عرض کیا جائے کہ اس بالکل عقلی بلکہ موٹی بات سے اچھے اچھے اہل علم کو ایسی بے پروائی ہے، کہ محض اپنی علمی، بلکہ دراصل محض معلوماتی و تصنیفی قوت اور نرے معلومات کی وسعت کو نہ صرف اپنی اصلاح کے لئے کافی سمجھ لیا ہے، بلکہ اسی بھروسہ پر اصلاح کی مستقل تحریکون کے امام و علمبردار بن جاتے ہیں، جس کی بدولت اپنی اعلیٰ ذہانت و قابلیت کے باوجود اپنے اور دوسرون کے حق مین ویسے ہی طبیب معالج بن جاتے ہین، جس نے کسی طبیب کے پاس باقاعدہ مطب کے بغیر محض کتابی معلومات اور قدرتی ذہانت کے زور پر اپنا اور دوسرون کا علاج شروع کردیا ہو، بلکہ امامت کا جھنڈا ہاتھ مین لینے کے بعد کسی کی اقتدار و اتباع کا امکان اور بھی دور تر ہو جاتا ہے، تاہم طلب و تشنگی کے لئے راستہ کبھی بند نہیں، نہ پانی کا قحط ہے،

آب کم جو تشنگی آور بدست تاکہ آبت جوشد از بالا و پست

عشق و محبت | نہ صرف مسلمان صوفیہ کے عالم و جاہل عوام و خواص تمام طبقون مین عشق و محبت کا لازمہ تصوف یا عین تصوف ہونا مسلّم ہے، (حتی کہ نام ہی اس کا طریق عشق ہے)، بلکہ تمام دیگر مذاہب بلکہ فلسفہ تک مین جہان کہین تصوف کے ہم معنی یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز ایسی ملتی ہے، جس کو مغربی ادبیات مین سرّیت (مسٹزم) کہا جاتا ہے، اس مین بھی بڑا خاص عنصر عشق و محبت ہی ہے، حتی کہ ہمارے مغربی محققین نے تو وادی تحقیق یہان تک دی کہ مسلمان صوفیہ مین عشق و محبت کی تعلیم کو ان بیرونی اثرات سے ماخوذ قرار دیدیا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نفس تصوف ہی کو اسلام مین بہت بعد کی اور بیرونی اثرات کی پیداوار کہدیا، حالانکہ اسلامی تصوف کی تو محققین صوفیہ کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ وہ نام ہے عین اسلام و شریعت، بلکہ کمال اسلام و شریعت کا، حتی کہ حضرات صوفیہ مین سب سے بڑا صوفی حضرات صحابہ

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں، اور یہی نظام اس ! ب ہیں حضرت مجدد وعلیہ الرحمۃ کی تجدید کا جو عکسا

اوپر پوری طرح معلوم ہو چکا،

اتنا ہی نہیں حضرت نے تو قرآن و حدیث سے تقریباً دو ہزار مسئلے صاف صاف دلالت سے ثابت

کر دیئے ہیں[1] اور فرمایا کہ عمر کرتا تو تصے ہی اور ثابت کر دیتا اس کی کچھ مثالیں انشا اللہ آگے اپنے موقع پر

آئیں گی، یہاں اس ذکر کا مدعا صرف یہ ہو کہ جس اسلامی تصوف کے دو ہزار اصولی و فروعی مسائل خود

قرآن و حدیث سے ثابت و مستنبط ہوں، اس میں اب آخر کون سی اہم اور انوکھی بات رہ گئی ہوگی، جس

کے لئے اسلامی تصوف اسلام کو چھوڑ کر غیروں کا دست نگر ہو سکتا ! بات یہ ہو کہ افہام و تفہیم کیلئے

بعض رائج الوقت بیرونی تعبیرات و اصطلاحات سے کام لیا گیا، یا غیروں کی بعض محض تدبیری چیزیں تدبیر

ہی کے درجہ میں اختیار کر لی گئیں، جیسے کہ پاس انفاس وغیرہ جس کی مثال بقول حضرت مجدد وقت

کے ایسی ہی ہے، جیسے غزوۂ خندق میں فارسیوں کی خندق کی تدبیر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

کے بتلانے سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی تھی، اب اگر اس پر کوئی عقلمند محقق یہ داد

تحقیق دینے لگے، کہ اسلامی جہاد ایرانیوں یا فارسیوں کے اثرات سے ماخوذ ہے، تو اس کے سوا کیا

کہا جا سکتا ہے کہ ع

برین عقل و دانش بباید گریست

اس باب میں ان محققین نے غیر اسلامی اصطلاحات سے بہت دھوکا کھایا ہے، تو ان کی نسبت

یاد رکھنا چاہئے، کہ اصطلاحات دو قسم کی ہیں، ایک جو مقاصد سے متعلق ہیں، (جیسے رضا و قرب وغیرہ)

وہ تو شریعت سے الگ نہیں، بلکہ مقاصد میں اصطلاحات تصوف کی حقیقت وہی ہے، جو شریعت

میں مذکور ہے، دوسری وہ اصطلاحات ہیں جو امور زائدہ کے متعلق ہیں، وہ شریعت سے جدا ہو سکتی ہیں،

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم، ص ۲۰۰،

جیسے تجدید امثال توحید وجودی شغل رابطہ وغیرہ (اشرف المسائل ص ۴۳)

باقی نفس عشق و محبت کی تعلیم تو اگر ان محققین نے قرآن مجید ہی کو کھول کر دیکھ لیا ہوتا تو نظر آجاتا کہ صوفی ہونا تو درکنار، قرآن کی رو سے تو مسلمان اور مومن ہونے ہی کے لئے اللہ تعالیٰ کا عشق و محبت لازم ہے، اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ، اور عشق اشد حب کے سوا نام ہی کس کا ہے، اسی طرح حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی نسبت ارشاد ہے، کہ کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو اس کے ماں باپ سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں"

"عشق لوازم ایمان سے ہے، جب تم نے آمنّا کہا تو عشقنا کا التزام بھی کرلیا، جیسے کوئی کہے کہ مجھ پر نان نفقہ بی بی کا کیسے واجب ہوگا، میں نے تو اس کا التزام نہیں کیا تھا، صرف قبلت النکاح کہا تھا، تو ہر شخص یہی کہے گا کہ قبلت کہنے ہی سے تو شوہری کے حقوق لازم ہوگئے، اسی طرح جب لا الٰہ الا اللہ کہا بس عاشق ہوگئے، کیونکہ اس کلمہ سے مومن ہوگئے اور مومن کے بارے میں ارشاد ہے کہ

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ، یعنی جو خدا پر ایمان لائے وہ خدا کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں،

تو تصدیق ایمانی کے ساتھ ہی سارے کے سارے عاشق ہوگئے، تو اب عشق کے حقوق ادا کرو، بس کان مت ہلاؤ، سیدھے محبوب کے حکم پر چلتے رہو"

(الشریفہ صفحہ ۲۳ و ۲۴)

حُب عقلی البتہ اسلامی تعلیمات جس طرح ہر امر میں افراط و تفریط کی ناہمواریوں اور نشیب و فراز سے پاک ہیں، اسی طرح عشق و محبت کے معاملہ میں بھی طبعی یا نفسانی جوش و خروش بخودی و جامہ دری مامور و مطلوب بالکل نہیں، یوں کسی ضعیف القلب یا مغلوب کمال کا حال ہی یہ ہوجائے

تو وہ معذور ہے، مطلوب و ماموربہ والذین آمنوا اشد حبا للہ والی حب ایمانی ہے، جس کو حب عقلی بھی کہا جاتا ہے،
نہ کہ حب طبعی یا نفسانی جس کو عرف عام میں عشق کہا جاتا ہے، کسی نے ان دونوں کے فرق و فضیلت کی
بابت سوال کیا تھا کہ

"صراط مستقیم میں مولانا اسماعیل صاحب شہید نے حب ایمانی یا عقلی کو حب نفسانی یا عشق
پر بہت ترجیح دی ہے، اور طریق عشق کو ایک حد تک مذموم ثابت کیا ہے، حالانکہ بڑے
بڑے صوفیائے کرام مولانا رومی مولانا جامی وغیرہ نے عشق کی مدح سرائی کی ہے، اس باب میں
حضرت کی جو تحقیق و رائے ہو، اس سے مفصل مطلع فرمائیے (التکشف عن مہمات التصوف حصہ سوم از امداد الفتاوی)
اب حضرت کا عالمانہ و محققانہ جواب سنیئے، پہلے چند مقدمات ہیں،

"اول فضیلت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک باعتبار ذات شے کے، دوسری باعتبار اس
کی حالت خاصہ کے، پہلی کو فضیلت ذاتیہ کہتے ہیں اور دوسری کو اضافیہ کہنا مناسب ہے
دوم کمالات ولایت مستفاد ہوتے ہیں کمالات نبوت سے، اس لئے جو کمال ولایت کا
جس قدر کمال نبوت سے مشابہ ہو وہ دوسرے کمال سے جو مشابہت میں کم ہے، افضل
ہوگا، سوم عشق ایک خاص درجہ ہے، محبت کا جس میں ہیجان و غلیان (یا جوش و
خروش) ہوتا ہے،

"ان مقدمات کے بعد جاننا چاہیے، کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں جو صفت محبت
الٰہی کی ہوتی ہے، اس میں ہیجان نفسانی غالب نہیں ہوتا، اس لیے بالیقین محبت کی یہی نوع فی نفسہ
افضل ہوگی، مگر کسی خاص استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے تربیت باطن میں دوسری
نوع کا زیادہ نافع و موافق ہو جانا ممکن ہے، جیسے کہ حالت کی نفسہ مفضول اور غیرہ ہے، لیکن
کسی خاص طبیعت کے لئے اس کو صحیح کہا جاتا ہے،

"پس مولانا شہید رحمہ اللہ فضیلتِ ذاتیہ کے مرتبہ میں حُبِّ ایمانی کو ترجیح دے رہے ہیں، اور بعض آثارِ مغلوبیت کے اعتبار سے حبِ نفسانی کو مضر بتلا رہے ہیں، اور دوسرے حضرات صوفیہ رحمہم اللہ فضیلتِ اضافیہ کے مرتبہ میں عشق کی مدح کر رہے ہیں، کیونکہ ایسے مضامین اکثر اہلِ حال کے کلام میں وارد ہیں، جن کو تحقیقاتِ عامہ مقصود نہیں، یا عشق سے مراد ان حضرات کی اصطلاحاً مطلق کمال محبت ہو، جو شامل ہے محبتِ ایمانی کو بھی، اور مقصود مذمت کرنا اُس شخص کی ہو جس میں یہ کمال نہیں، جیسے حدیث میں ہے، لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ پس دونوں توجیہ پر مولانا اور صوفیہ کے کلام میں تعارض نہیں رہا، واللہ اعلم[1]

عقلی محبت اختیاری ہے | نیز طبعی اور عقلی یا ایمانی محبت میں ایک اور خاص وعظیم فرق یہ ہے کہ طبعی محبت غیر اختیاری ہوتی ہے، اور اسلام غیر اختیاری چیزوں کی تکلیف نہیں دیتا، بخلاف عقلی و ایمانی محبت کے کہ وہ ہمارے اختیار کی شے ہے، اس کا بڑا مدار عمل پر ہے، مثلاً جس عمل کو ہم ایک مرتبہ عقلاً پسند کر کے اس کو بار بار کرتے رہیں، تو پھر اُس سے محبت وانس قدرۃً پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر وہ عمل کسی کے حکم یا اتباع کی بنا پر اختیار کیا گیا ہے، تو کرتے کرتے اس حاکم یا متبوع سے بھی محبت ہو جانا لازم ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اختیاری محبت کا سید ھا نسخہ تجویز فرما دیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا محب و محبوب ہے، زندگی کو اس کے رنگ میں رنگ لو تو آپ آپ اللہ کے سچے اور آپکے محب و عاشق ہی نہیں بلکہ محبوب بھی بن جاؤگے، اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔

"عمل میں خاصیت ہے محبت پیدا کرنے کی، تجربہ کر لو، روزانہ کسی کے پاس جایا کرو دیکھو محبت ہو جائے گی، پہلے تکلف ہی ہوگا، پھر طبیعت نے اپنا تعلق پیدا کیا ...

---

[1] الکشف عن مہمات التصوف حصہ سوم ... اصلاح ... [illegible]

زیادہ ہو جائے گی وہ جو کہتے ہیں، کہ پالنے کی محبت اس کو بھی تو اصل ہو، غرض نیک عمل میں یہ برکت ہے کہ اس سے محبت حق پیدا ہوتی ہے،

"یہاں ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم تو مدت سے نیک عمل کر رہے ہیں، مگر محبت پیدا نہیں ہوئی، جواب یہ ہو کہ نیک عمل کے مفہوم میں ایک ہی چیز تو نہیں کہ بس عمل کر لیا، بلکہ وہ مرکب ہے اور اجزاء سے ایک جزء تو عمل کرنا ہے اور دوسرا جزء یہ ہے کہ عمل کو اس کے طریق کے مطابق کیا جائے، مثلاً صرف ٹکریں مارنے کو نماز نہیں کہتے، نیک عمل کا جو ماموربہ طریق ہے، اس طریق سے کرو، پھر دیکھو، محبت کیسے نہیں پیدا ہوتی، تیسری وجہ اثر نہ ہونے کی یہ ہو کہ تم نے عمل کو صرف عادت سمجھ کر کیا، اس نیت سے نہیں کیا کہ اللہ کی محبت بڑھ جائے، ہو اس نیت سے عمل کرو پھر دیکھو انشاء اللہ کیسا اثر ہوتا ہے،

"بہر حال ایک جزء تو اس نسخہ کا یہ ہے کہ نیک عمل میں بہ نیت ازدیاد محبت استقامت کے ساتھ مشغول رہو، دوسری بات ضروری یہ ہو کہ اللہ کا نام لو جی لگا کر یعنی تھوڑا اللہ اللہ بھی کرو ذکر دل کبھی لگا کر تا کہ محض صورت ذکر نہ ہو تیسری بات یہ ہے اور یہ بہت ضروری ہے کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کرو، اس سے لوگ بھاگتے ہیں، اول تو اس طرف توجہ ہی نہیں، کہ کسی بزرگ کی خدمت میں جا کر رہیں، بس تھوڑی سی کتابیں پڑھ لیں، اور سمجھ لیا کہ ہم کامل و اکمل ہو گئے، بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل و اکمل ہوا ہے؟[1]

[1] تربیت السالک (۱)

اسی نسخہ کو بعض اور اجزاء کی اعانت سے آثار المحبت (ص ۱۹) میں یوں تجویز فرمایا ہو کہ

"جن چیزوں سے کوئی محبوب ہوتا ہو یعنی انعام و نوال، حسن و جمال، اور فضل و کمال ہر عزّ ہے عقلاً و نقلاً علیٰ وجہ الکمال اللہ ہی میں ہیں پس وہی مستحق محبت ہیں، تدبیر یہ ہے کہ چند باتوں کا التزام کر لو، ایک تو تھوڑی دیر تنہائی میں اللہ اللہ کیا کرو، اگرچہ پندرہ بیس منٹ ہی ہو

لیکن اس نیت سے کہ خدا تعالیٰ کی محبت ہو، دوسرے کسی وقت تنہائی مین خدا کی نعمتون کو سوچا کرو، پھر اپنے برتاؤ کو غور کیا کرو کہ ان انعامات پر خدا تعالیٰ کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہین اور اس کے باوجود خدا تعالیٰ ہم سے کس طرح پیش آرہے ہین، تیسرے محبان خدا سے علاقہ پیدا کرو، آنا جانا دشوار ہو تو خط وکتابت ہی رکھو، چوتھے خدا تعالیٰ کے احکام کی پوری اطاعت کیا کرو، کیونکہ جس کا کہنا مانا جاتا ہے، اس سے ضرور محبت بڑھ جاتی ہے، پانچوین خدا تعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ اپنی محبت عطا فرمائین"،

غرض جو عشق ومحبت مامور ومطلوب ہے، وہ طبعی و نفسانی نہین، بلکہ عقلی وایمانی ہے جو بالکل اپنے اختیار مین ہے، اور اس کے حصول کا جو نسخہ تجویز فرمایا گیا ہے اس کے بھی تینون اجزا بالکل اختیاری ہین، یعنی (۱) اعمال صالحہ بہ نیت محبت (۲) ذکر اللہ مع التحقیقت (۳) اہل اللہ سے تعلق یا صحبت، جس کی ضرورت پر اوپر مفصل گفتگو گذر چکی،

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق ۔۔۔ عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

نیز یہ اعمالِ صالحہ یا اتباعِ سنت والی عقلی وایمانی محبت کا راستہ وصول الی اللہ کا نہ صرف یقینی واقرب راستہ ہے، بلکہ اسہل بھی اتنا ہے کہ زیادہ مجاہدات وریاضات کی ضرورت نہین ہوتی اور اصطلاح مین اس کو طریق جذب بھی کہتے ہین، کیونکہ اس مین چونکہ سب سے بڑے محب ومحبوب الٰہی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نقل واتباع ہوتی ہے، اس لئے قدرۃً اپنے کامل ترین محب ومحبوب کے متبع یا نقل اُتارنے والے کی خود حق تعالیٰ کی طرف سے کشش یا انجذاب ہوتا ہے، کسی موقع پر فرمایا کہ

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے سلسلہ مین جو اس قدر جلد وصول الی اللہ ہوتا ہے، حالانکہ نہ یہان کچھ زیادہ ریاضات ہین، نہ مجاہدات، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ مین وصول بطریق جذب ہوتا ہے، بطریق سلوک نہین، اور یہ جذب برکت ہے اتباعِ سنت

کی، کیونکہ اتباعِ سُنّت کا ثمرہ یہ تشبّہ بالمحبوب کے محبوبیت عنداللہ ہے، اور محبوبیت کے لئے

جذب لازم ہے[۱]،

محبوب سے ظاہری شباہت بھی کسی کو ہو تو اس کی طرف کشش قدرتی بات ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ

کی بھی توجہ کی جلد اُمید ہے، حضرت خواجہ (عزیز الحسن صاحب) نے خوب فرمایا ہے،

ترے محبوب کی یا رب شباہت لے کے آیا ہوں　　حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لے کے آیا ہوں

اللہ تعالیٰ ہم کو اتباعِ سُنّت کی توفیق بخشیں اور خواجہ صاحب کی اس دعا کو اپنے تمام متبعِ سُنّت بندوں

کے حق میں قبول فرمائیں،

محبت کا مدار مناسبت پر | اسی عشق و محبت کے سلسلہ میں شریعت و طریقت کے جامع مجدد علیہ الرحمہ

نے ایک اور بڑی لطیف بحث فرمائی ہے، جو صوفیہ اور اہلِ محبت سے بھی زیادہ ہمارے خشک علماء

کے سُننے اور سمجھنے کی ہے، خلاصہ یہ ہو کہ محبت کا مدار مناسبت پر ہے، اور یہ مناسبت انسان کو اللہ

تعالیٰ کے ساتھ تمام مخلوقات سے زیادہ حاصل ہے جس کو حضراتِ صوفیہ مظہرِ اتم ہونے سے تعبیر فرماتے

ہیں، اور جس پر احقر کے نزدیک خود اللہ تعالیٰ ہی نے سندِ خلافت اور نفخت فیہ من روحی سے سرفراز

فرماکر قرآنی شہادت کی مہر لگا دی ہے، کیونکہ کسی کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جس کو ظاہراً و باطناً مستخلف

سے زیادہ سے زیادہ مناسبت و مشابہت ہو، اگر خلافتی تصرفات سے ظاہری مناسبت عیاں ہے تو

من روحی سے باطنی، اس لئے اگر یہ احسنِ تقویم کی بلندی سے اسفل سافلین کی پستی میں پھینک دیئے جانے کا

راستہ خود ہی نہ اختیار کرلے، تو اس کا مطلوب و محبوب اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہی کون سکتا ہے،

خلق اللہ آدم علیٰ صورتہٖ کا مطلب | اور محبوب کون ہوتا ہے، وہی جس سے مناسبت ہو تو قلب کو جس سے

مناسبت ہوگی وہی محبوب ہوگا، میں نے ایک باپ سے سُنا ہے کہ مجھ کو فلاں بڑے بیٹے سے محبت زیادہ ہے،

---

[۱] اشرف السوانح ص ۳۰۲ حصہ دوم

وجہ یہ ہے کہ وہ میرا سا ہے، یعنی مجھے اس سے مناسبت ہے، سو بُرہان و وجدان سے ثابت ہو چکا ہے کہ قلب کو پوری مناسبت صرف حضرت حق سبحانہ سے ہے، اور اسی مناسبت کی نسبت شہادت دی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے خلق اللہ آدم علی صورتہٖ یعنی اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا"

"یہاں صورت کے معنی شکل کے نہیں، بلکہ وہی مناسبت ہے، جس کو صوفیہ نے ایک خاص عنوان سے کہا ہے، جسے علماے خشک قبول نہیں کرتے، کہ انسان مظہر ہے حق تعالیٰ کا' اس لفظ مظہر سے چونکتے ہیں، جو حقیقت میں اس حدیث کی تفسیر کا عنوان ہے، اور بدون اس تفسیر کے سخت اشکال پڑتا ہے، جس سے بچنے کے لئے بعضوں نے ضمیر کا مرجع آدم کو بنایا ہے، مگر بعض روایات میں بجاے صورتہٖ کے صورۃ الرحمٰن آیا ہے، اس کو کیا کریں گے، اسکے جواب میں یہ کہدیا کہ راوی نے اپنے اجتہاد سے روایت بالمعنی کر دی ہے، میں کہتا ہوں کیوں تکلف کرتے ہو جو تفسیر صوفیاے کرام نے کی وہ نہایت بے تکلف وسہل ہے"،

کیونکہ صورت اصل میں اسی کو کہتے ہیں، جس کے واسطہ سے کوئی شے ظاہر ہوتی ہے، اور چونکہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا سب سے بڑا اتم ظہور انسان ہی کی ذات وصفات سے ہوا ہے، اس لئے اس کو تمام دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے گویا اپنی ہی صورت پر پیدا فرمایا ہے،

"یہ دیکھئے کہ صورت کسے کہتے ہیں، اگر کہو کسی چیز کی شکل کو کہتے ہیں، مانا، مگر اس کو کیوں کہتے ہیں، اصل میں صورت کی حقیقت ظہور ہے، چنانچہ یہ بھی محاورہ کہ صورۃ المسئلۃ کذا، یعنی فلاں مسئلہ کی صورت یہ ہے، اور یوں بھی کہتے ہیں، کہ اس کام کے بننے کی کیا صورت ہے، تو یہاں صورت کے معنی ظہور کے ہیں، اور چہرہ کو بھی صورت ظہور ہی کے معنی میں کہتے ہیں، کہ اس سے حقیقتِ انسانیہ کا ظہور ہوتا ہے،

آگے اس حقیقت با مذکور کو بالکل ظاہر فرما دیا ہے کہ وہی ہمت روحی تو اللہ سے ج یا انا سے جب ان کا ارشاد ہے کہ

"یہ حقیقت وہ ہے جس کو انا سے تعبیر کرتے ہیں، اور وہ روح ہے، اور وہ ایک مخفی چیز تھی، چونکہ روح ایک مخفی چیز تھی، جسے کالبد سے ظاہر فرمایا، اس نے کالبد کو اس کی صورت کہدیا تو اصل معنی صورت کے ظہور کے ہوئے،

"اب سمجھئے کہ خلق آدم علیٰ صورتہ کے معنی ہیں علیٰ ظہورہٖ یعنی خدا نے آدم کو اپنے ظہور پر پیدا کیا، یعنی آدم کو پیدا کرکے اپنے صفات کو ظاہر کر دیا، گو اور مخلوقات سے بھی صفات کا ظہور ہوتا ہے، مگر انسان چونکہ سب سے زیادہ جامع کمالات ہے، اس لئے اس سے زیادہ ظہور ہوتا ہے، اسی واسطے اس کو مظہر اتم کہتے ہیں،

"صوفیہ نے کیا کہا، وہی انھوں نے بھی کہا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، صرف اصطلاح بدل دی، یہ اُن کا لطیفہ ہے کہ اپنے اسرار کو عوام سے بچانے کے لئے اصطلاحیں مقرر کرلی ہیں، علماء خشک جو اُن کی اصطلاح نہیں سمجھتے، اعتراض کر دیتے ہیں، جو واقع میں خود اپنی فہم پر ہوتا ہے، اور محققین کی عادت ہوتی ہے، کہ طالب کے سامنے تو نکات کو ظاہر کر دیتے ہیں لیکن معاند کے اعتراض سُن کر بھی خاموش رہتے ہیں، بلکہ اپنے متوسلین کو بھی الجھنے سے منع کرتے ہیں،

با مدعی مگوئید اسرارِ عشق و مستی　　بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی[1]

حمل امانت کی لطیف توجیہ | غرض تمام مخلوقات میں چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناسبت و مشابہت زیادہ حاصل ہے، اس کی بنا پر اس کو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا عاشق بھی ہونا چاہئے

---

[1] از شریعت با ذص ۱۴ تا ص ۱۶

اثنائے طالب علمی میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ انسان کی حقیقت میں عاشق ہے، اس کی فصل عاشق ہو کیونکہ ناطق تو جنات و ملائکہ بھی ہیں[۵۱]، بلکہ حضرت تو اس کے قائل ہیں، کہ تمام مخلوقات حیوانات و نباتات حتیٰ کہ جمادات بھی عاقل ہیں، ہاں یہ مسلم ہے کہ اُن میں اتنی عقل نہیں، جو تکلیف کے لئے کافی ہو[۵۲]، حمل امانت کی بھی ایک دلچسپ توجیہ حضرت نے انسان میں غلبۂ عشق سے فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ سے غایت مشابہت کی بنا پر عشق تو تھا ہی، اور معشوق کے حکم و خوشی کے پورا کرنے میں چون و چرا شانِ عشق نہیں بس اس دیوانگی میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنے کو پیش کر دیا۔

"بہرحال انسان کے حمل امانت کا منشا عشق تھا، اور اس کو میں نے حافظ شیرازی کے کلام سے سمجھا ہے، فرماتے ہیں،

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید ۔۔۔ قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

اس میں لفظِ دیوانہ سے منشا رحملِ امانت پر اشارہ ہے، اور اسی کلام سے معلوم ہو گیا کہ عشق دیوانگی کا نام ہے، جو محبت کے علاوہ درجہ ہے[۵۳]،

"البتہ حق تعالیٰ کی محبت میں شانِ عقلیت غالب ہوتی ہے، اور اپنے ہم جنس کی محبت میں شانِ طبیعت غالب ہوتی ہے، اور سرسری نظر میں محبتِ عقلی محبتِ طبعی کے سامنے مضمحل معلوم ہوتی ہے، حالانکہ امر بالعکس ہے، چنانچہ اسی محبوبِ طبعی سے نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی شان کے خلاف کوئی معاملہ قولی یا فعلی صادر ہو تو وہی محبوب فوراً مبغوض ہو جاتے[۵۴]،

یہ ایک طالب کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا تھا، جن کو یہ شبہہ ہو گیا تھا، کہ وہ حضرت علیہ الرحمہ کے ساتھ محبت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کم محسوس کرتے ہیں،

---

۵۱ وعظ التحصیل والتسہیل ص ۲۶ ۵۲ ایضاً ص ۲۴ ۵۳ ایضاً ص ۲۶ ۵۴ اشرف السوانح حصہ دوم ص ۱۲۰،

حق تعالیٰ میں اسباب محبوبیت بدرجۂ کمال جمع ہیں

پھر کسی سے محبت کے عقلاً جو اسباب ہو سکتے ہیں، وہ بالذات اور بدرجۂ اتم واکمل اللہ تعالیٰ ہی میں موجود ہیں،

"کسی سے جو محبت ہوتی ہے، اس کی وجہ یا کمال ہے، یا جمال یا نوال (یعنی داد و دہش)
تو معلوم ہوا کہ محض ذات سے محبت نہیں ہوتی، کسی صفت کی وجہ سے ہوتی ہے، اب دیکھو یہ صفتیں
بالذات کس کی ہیں، جس میں یہ اوصاف بدرجۂ اکمل ہوں گے، وہ زیادہ محبوب ہوگا، تو اس
میں مسلمان کو تو شبہ نہیں ہو سکتا، کہ سب سے زیادہ کمال کے ساتھ یہ اوصاف خدا ہی میں پائے جاتے ہیں
غرض مسلمان یا مومن کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عقلی محبت میں اشد ہونا بالکل لازمۂ ایمان ہے
یہی نہیں بلکہ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ اس کو جس شے سے محبت ہوتی ہے، وہ در اصل محبتِ حق ہی کا ظل
و پرتو ہوتی ہے، کیونکہ جہاں کہیں جو بھی جمال و کمال پایا جاتا ہے، وہ کمال حق ہی کا پرتو ہے،
"ہر کمال کمالِ خداوندی ہی کا ظل ہے تو ہر شخص اگرچہ وہ کسی کا عاشق ہو، واقع میں وہ
کمالِ خداوندی کا عاشق ہے، اور اس کی ایسی مثال ہے، جیسے ایک شخص نے دیوار پر دھوپ
دیکھی، اور اس کی وجہ سے وہ دیوار کا عاشق ہو گیا، حالانکہ یہ واقع میں دیوار کا نہیں آفتاب
کا عاشق ہے، کیونکہ دیوار کا عشق ایک کمال کی وجہ سے پیدا ہوا، یعنی نور جو واقع میں آفتاب
کا کمال ہے نہ کہ دیوار کا، یہی وجہ ہے کہ جب آفتاب چھپ جاتا ہے، اور وہ نور زائل ہو جاتا ہے تو
عشق بھی زائل ہو جاتا ہے،

عشق با مردہ نباشد پائدار — عشق را باحی و با قیوم دار
عشقہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

عقلی محبت کا لازمہ

لیکن سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس عقلی
عشق و محبت کا لازمہ یہ ہونا چاہئے کہ اس دنیا میں بھی محبت کے ذمہ محبوب کے جو حقوق ہوتے ہیں اسی طرح

کا تعلق ہم کو حق تعالیٰ سے رکھنا چاہیے،

دیکھیے کہ عاشق کو معشوق سے کس قسم کا تعلق ہوتا ہے، اور اس کے دل میں معشوق کی کتنی عظمت و وقعت ہوتی ہے، کیا اگر معشوق یہ حکم دے کہ تم میرے پاس آؤ یا گرمی کے وقت جلچلاتی ہوئی دوپہر میں چار کوس تک برہنہ پا چلے آؤ، تو کیا عاشق انکار کرے گا، یا اس سے اس حکم کے مصالح پوچھے گا، اگر اس کو سچا عشق ہے، تو بلانے سے دوڑا ہوا آئے گا اگر کوئی روکنا بھی چاہے تو ہرگز نہ رکے گا، غرض کسی قسم کے امر و نہی میں اس کو ذرا بھی پس و پیش نہ ہوگا، لوگ اس کی حرکات پر اس کو دیوانہ بتلائیں گے، پاگل کہیں گے، مگر اس کو اس سے ذرا عار نہ ہوگا اور کہے گا۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

"سب جانتے ہیں، کہ انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے، تو اس کی یاد کسی وقت دل سے نہیں اترتی، اور دوسرے اس کے ہر حکم کو گوشِ قبول سے سنتا ہے، کبھی ایسا نہیں ہوتا، کہ عاشق سے محبوب کے کسی حکم میں بھول چوک یا نافرمانی کا ظہور ہو، کیونکہ بھول ہمیشہ اس کام میں ہوا کرتی ہے، جس کی جانب پوری توجہ نہ ہو، اور جو چیز ہر وقت قلب پر مستولی ہو، اس میں بھول کا ہونا عادۃً ممکن نہیں"،

بس حضراتِ صوفیہ کے ہاں جس عشق پر اتنا زور ہے، کہ ان کا سارا دین و مذہب ہی عشق معلوم ہوتا ہے، وہ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی تجدید و اصلاح کے مطابق طبعی و نفسانی جوش و خروش کا نہیں بلکہ ایمانی و عقلی محبت کے اسی استیلائی درجہ کا نام ہے، جس میں محبوب کی طرف توجہ اور اس کی یاد و اطاعت کے سوا دل و دماغ میں ماسوا کی قطعاً گنجائش ہی نہیں رہتی، اسی کو سرتاجِ صوفیہ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں کہ

عشق آن شعلہ است چوں بر فروخت　　　ہر کہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

عشق و تفویض | اس ایمانی عشق کا منصوص و معروف نام تفویض ہے، ارشاد الحق نام وعظ میں ارشاد ہے کہ

"عشق کی حقیقت تفویض ہے کہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے، جس طرح چاہیں ہم میں تصرف کریں تشریعاً بھی تکویناً بھی اور ہم ہر حال میں راضی رہیں، یہی حقیقت ہو تفویض کی" (اشرف المسائل ص ۹۴) ایک عجیب نکتہ کسی ملفوظ میں یہ بیان فرمایا کہ شیطان جو مردود ہوا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سالک محض تھا، جذب و محبت کا مادہ بالکل نہ تھا، ورنہ ایسی ادبی سے اعتراض نہ کرتا، اس لئے سالک محض (خشک اہل عمل) کی حالت خطرہ سے خالی نہیں چاہئے کہ جذب کا مادہ بھی پیدا کریں، جس کا طریقہ کثرتِ ذکر اور صحبتِ اہلِ محبت ہے"

(اشرف المسائل ص ۱۰)

اور یہ ایمانی عشق لا الہ الا اللہ پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ غیر اللہ سے جتنے تعلقات ہیں وہ اُن کے الٰہ و معبود یا نافع و ضار ہونے ہی کی غلطی و غلط فہمی ہی سے ہیں، جس کی خود قرآن مجید نے شدت سے نفی فرمائی ہے، افتعبدون من دون اللہ ما لا ینفعکم شیئاً ولا یضرکم خود مولانا اسی شعر کے بعد فرماتے ہیں کہ

تیغ لا در قتل غیر حق براند　　　در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت　　　مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

دنیوی عشق یا استیلائی محبت کا لازمہ بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ غیر پر نظر نہ پڑے مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت بیان فرمائی ہے کہ

"ایک شخص ایک عورت کے پیچھے چلا، اُس نے پوچھا کہ تو میرے پیچھے کیوں آتا ہے، کہنے لگا میں تجھ پر عاشق ہو گیا ہوں، اُس نے کہا کہ میرے پیچھے میری بہن آ رہی ہے وہ

مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے، ہوسناک تو تھا ہی فوراً پیچھے لوٹا، جب لوٹنے لگا تو اس عورت نے ایک دھول رسید کیا، اور

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی
در بیان دعوے خود صادقی

پس چرا بر غیر افگندی نظر
نیست این دعوائے عشق اے بے ہنر

کہ مردود اگر تو عاشق تھا تو غیر پر کیوں نگاہ کی، یہ کیسی محبت کہ دعویٰ خدا کی محبت کا اور دوسروں سے تعلق،

عشق مجازی کی حقیقت | اس حکایت کے سلسلہ میں عشق مجازی کی حقیقت [بھی] کان کھول کر سُن لینی چاہئے، کیونکہ تصوف کو بدنام کرنے والے بہت سے جاہل ہوسناکوں نے اس کو اپنی ہوس رانی کا پردہ بنانا چاہا ہے، حدیث میں ہے کہ

مَنْ عَشِقَ فَعَفَّ وَکَتَمَ فَمَاتَ
مَاتَ شَهِيْدًا

یعنی جو شخص کسی پر بلا اختیار عاشق ہو جائے پھر عفیف رہے، اور پوشیدہ رکھے پھر مر جائے تو وہ شہید مرے گا،

اس حدیث میں دو مسئلے ہیں، پہلا یہ کہ عشق غیر اختیاری مطلق مذموم نہیں، (جیسا کہ بعض خشک مزاج اس کو عیوب میں شمار کرتے اور عاشق کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں) اور مذموم کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ شہادت تک پہنچاتا ہے، اور اسی وجہ سے بعض اہلِ طریق اس کی مدح کرتے، اور وصول الی المقصود کے اسباب میں گنتے ہیں، عارف جامی فرماتے ہیں،

متاب از عشق او گرچہ مجازی است
کہ آن بہر حقیقت کارسازی ست

اور عارف رومی فرماتے ہیں:-

عاشقی گر زین سر و گر زان سر ست
عاقبت ما را بدان شہ رہبر ست

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس عشق کے محمود و موصل الی المقصود ہونے کی شرط ہے، کہ معشوق مجازی کی طرف قطعاً التفات نہ ہو، نہ اس کی طرف نظر کرے، نہ اس کا کلام سُنے حتیٰ کہ اس کی طرف قلب سے بھی توجہ نہ کرے، (یعنی دل میں بھی تصور نہ لائے) اور یہی مراد ہے جامی کے قول سے جو شعر بالا سے متصل ہی ہے،

ولے باید کہ بر صورت نمانی — وزین پل زود خود را بگذرانی

اسی طرح عارف رومی کا قول شعر بالا کے تھوڑی دور بعد ہے

عشقہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

اور علاوہ اس میں یہ ہے کہ مقصود حقیقی تک پہنچنے کی بڑی شرط ما سوا سے قطع تعلق کرنا ہے، اور عشق بجز محبوب کے سب سے تعلقات کو قوت کے ساتھ قطع کر دیتا ہے، جیسا کہ عارف رومی فرماتے ہیں،

عشق آن شعلہ ست چون بر فروخت — ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

تو محبوب مجازی کا ما سوا تو اس عشق مجازی سے فنا ہو گیا، پھر جب اپنے نفس کو اس محبوب مجازی سے بالکل الگ کر کے مراقبات و اذکار سے ہمہ تن محبوب حقیقی کی طرف توجہ کر کے اس کے قریب کر دیا، پس سب تعلقات رخصت ہو گئے اور صرف واحد محبوب حقیقی باقی رہ گیا جیسا کہ شعر بالا کے بعد ہی مولانا رومی فرماتے ہیں :-

تیغ لا در قتل غیر حق براند — در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ سوخت — مرحبا اے عشق شرکت سوز سوخت

عشق مجازی کو حقیقی میں مبدل کرنے یا اس کو عشق حقیقی کا ذریعہ بنانے کے لئے جو شرائط ہیں، اُن کی تفصیل التکشف میں فرمائی ہے، کہ اگر اتفاقاً و بلا قصد عشق مجازی میں مبتلا ہو جائے،

"تو اوّل عفت و پارسائی اختیار کرے کہ کوئی امر خلاف شرع نہ کرے، نہ قصداً اسکو دیکھے، نہ اس سے باتیں کرے، نہ اس کی باتیں کرے، نہ دل میں قصداً اس کا خیال کرے، کیونکہ مخالفتِ شرع عشقِ حقیقی کے منافی ہے، اور منافی کے ہوتے کب امید ہے کہ عشقِ حقیقی حاصل ہو (۲) دوسرے اس سے ایسی دوری اختیار کرے، کہ اتفاقاً بھی اس پر نظر نہ پڑے، نہ آواز کان میں پہونچے، تاکہ قلب میں سوز وگداز پیدا ہو، (۳) تیسرے خلوت و جلوت میں یہ سوچا کرے کہ اس شخص کا کمال یا حسن و جمال کہاں سے آیا، اور کس نے عطا کیا، جب موصوف مجازی کی یہ دلربائی ہے تو موصوف حقیقی کی کیا شان ہوگی،

چہ باشد آن نگار پرخود کہ بہ بندد این نگار ہا،

"اس سے اس کا عشق مجازی مخلوق سے خالق کی طرف مائل ہو جائے گا، یہی معنی ہیں اس قول کے کہ شیخ کامل عشق مجازی کا ازالہ (یعنی اس کو فنا) نہیں کرتا، بلکہ امالہ (یعنی معشوق حقیقی کی طرف مائل) کر دیتا ہے، جس طرح انجن گرم ہو مگر اُلٹا چلتا ہو، تو قطع مسافت کرنے والے کو مناسب نہیں کہ اس کو بجھا دے، بلکہ اس کی کل پھیر کر سیدھا چلا دے، اور بعض مشائخ نے جو بعض طالبین کو قصداً عشق مجازی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے اس سے حلال عشق مراد ہے، (مثلاً بی بی سے) نہ کہ حرام، کیونکہ معصیت تو موصل الی اللہ ہو ہی نہیں سکتی، اور جو اس مشورہ سے غرض ہے، وہ عشق حلال سے بھی حاصل ہے، کیونکہ عشق میں گو وہ مجازی ہو، یہ خاصیت ضرور ہے، کہ اس سے قلب میں سوز وگداز پیدا ہو جاتا ہے، دوسروں کے تعلقات قلب سے دفع ہو جاتے ہیں، اور خیال میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے، اب صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے کہ اس تعلق کو حق تعالیٰ کی طرف پھیر دیا جائے تو بہت آسانی سے قلب خالی ہو جاتا ہے،

"جیسے گھر میں جھاڑو دے کر سب خس و خاشاک ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں، پھر کسی ٹوکرے میں اٹھا کر باہر ایک دم پھینک دیتے ہیں، اگر ایک ایک تنکا اٹھا اٹھا کر پھینکا جائے طویل مدت صرف ہو، پھر بھی اس قدر صفائی نہ ہو، غرض مقصود اصل ترک تعلقات یا قلب میں رقت و سوز و گداز پیدا کرنا ہے، جو اگر اور طریقہ سے حاصل ہو جائے، تو بھی کافی ہے،

اور آج کل خصوصاً اور طریقے ہی مناسب ہیں،

"چونکہ اس زمانہ میں اس طریق کے اندر خطرہ شدید ہے، کیونکہ نفوس میں شہوت پرستی و لذت جوئی زیادہ ہے، اس لئے قصداً ایسے طریق کا بتلانا جائز نہیں، ہاں اگر اتفاقاً مبتلا ہو جائے تو بطریق مذکورہ اس کا امالہ عشق حقیقی کی طرف کر دینا چاہئے، (تکشف جلد سوم صفحہ ۹۵)

لیکن یہ پھر ایک مرتبہ سن لینا اور خوب یاد رکھنا چاہیے کہ اس استیلائی محبت یا جملہ سوز اور شرکت سوزش عشق کی گرمی، ۔

"حاصل اس طرح ہوتی ہے کہ کسی گرمی والے کے پاس رہے، اور اس کی ہدایت کے موجب عمل کرے، اور یہی وہ چیز ہے، جو سینہ بسینہ چلی آتی ہے، نہ مولوی بن کر حاصل ہوتی ہے، نہ صوفی بن کر، اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، اس کے سوا بھی اکثر ایسے کام ہیں، جو سینہ بسینہ چلے آتے ہیں، اگر کوئی ساری خوانِ نعمت حفظ کر لے، مگر جب تک کسی کامل استاد کے پاس نہ رہے، باورچی گری نہیں آسکتی، اسی طرح اگر کوئی کتاب دیکھ کر کرتا اچکن وغیرہ کی کاٹ اذبر کرلے، تو اس کو درزی کا کام نہیں آسکتا، تصوف کے سینہ بسینہ ہونے کے یہی معنی ہیں، نہ یہ کہ مسئلے سینہ بسینہ ہیں، کیونکہ مسائل تو تمام کتابوں میں موجود ہیں، بلکہ وہی ایک نسبت ہے، جس کو گرمی سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ سینہ بسینہ چلی آتی ہے۔[۱]   (باقی)

---

[۱] الرفیق صفحہ ۹

اسلامی حکمرانوں سے مسلمانوں کی ایک بیجا شکایت

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی،

(۵)

خلاصہ یہ کہ اسلامی حکمرانوں اور سلاطین کا عام حال بھی یہی ہے، کہ جس حد تک اسلام اور اس دین کے اصول و ضوابط سے ان کی زندگیاں قریب رہی ہیں، اسلامی قلمرو کے غیر مسلم طبقات کو بھی اُن ہی کے زمانہ میں امن و امان، عافیت و راحت کی زندگی میسر آتی رہی ہے، اور ان ہی دیندار سلاطین اور اُن کے دیندار حکام و ولاۃ کے عہد میں اسلام کی اشاعت کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے،

اور مسلمانوں کی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کو کسی قسم کی تکلیف اگر اٹھانی پڑی، یا اُن کے انسانی حقوق میں دست اندازی کے واقعات پیش بھی آئے ہیں، تو میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہوا ہے، بے دین، اور ان ہی حکمرانوں کے زمانہ میں ہوا ہے، اور اُن ہی کے زمانہ میں ہو بھی سکتا تھا جن کے دلوں میں اسلامی قوانین کا وزن جیسا کہ چاہئے باقی نہ رہا تھا، گویا کہنا چاہئے کہ اسلام نہیں بلکہ ترکِ اسلام کے یہ لازمی نتائج تھے، اور یہی بات وہی ہے جس کا اعتراف بہت سے انصاف پسند مغربی سیاحوں اور مصنفین نے بھی کیا ہے، کہ ان بختیوں کے قصوں میں مسلم و غیر مسلم کی خصوصیت نہ تھی عام طور پر اس قسم کے بادشاہوں کے عہد میں مسلمانوں پر بھی وہی سب کچھ گذر رہا تھا جس سے ملک کے دوسرے

طبقات متاثر تھے، اور اسلام کی تاریخ اس کی شہادت ادا کرتی ہے، کہ اسی قوم کے کوتاہ و غضب، بدبخت بادشاہون کا زمانہ ایسا زمانہ ہمیشہ رہا ہے، جس مین اسلام کی روشنی دنیا کی دوسری قومون تک پہنچ نہ سکی،

اور یہ کیفیت کچھ بادشاہون اور سلاطین ہی کی حد تک محدود نہین ہے، بلکہ عام مسلمانون کی حالت بھی اس مسئلہ مین یہی نظر آتی ہے،

میرا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانون کی زندگی جس زمانہ مین جہان کہین دین اور مذہب سے آراستہ و پیراستہ رہی ہے، تو مسلمانون کے ساتھ اُن کے پڑوس مین رہنے والی غیر مسلم قومون کو بھی ہمیشہ آرام ہی پہنچا ہے، سخت اور کڑی گھڑیون مین مدد ملتی رہی ہے، اور اسی کے ساتھ اسلام کو بھی ہر قسم دوسرون کے قلوب مین اُترنے کا اسی قسم کے مسلمانون کے ذریعہ ملتا رہا ہے، لیکن برعکس اس کے عام مسلمانون نے جب کبھی اور جہان کہین دین سے لاپروائی اختیار کی، اور محض ایک خاص قسم کے نام رکھنے والی یا چند رسوم یا شعار سے تعلق رکھنے والی قوم کی حیثیت سے دوسری قومون کے درمیان مسلمان پائے گئے ہین تو کسی ایک جگہ یا کسی خاص زمانہ ہی مین نہین، بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانہ مین اس قسم کے مسلمانون سے مسلمانون کو بھی، اور مسلمانون کے ساتھ دوسری غیر مسلم قومون کو بھی شکایتین پیدا ہوئی ہین، باہم خود بھی دست و گریبان رہے، اور دوسری قومون کی نفرت و عداوت بھی اُن سے بڑھتی چلی گئی، تا اینکہ بالآخر اُسی نے جنگ و قتال کے حدود تک نفرت و عداوت کو پہنچا دیا، غیر قومون کی مسلمانون کے ساتھ اسی نفرت و عداوت کا نتیجہ یہ ہوتا رہا ہے، کہ خود اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی کتاب (القرآن) اُس کی تعلیمات سے لوگ بجائے قریب ہونے کے دور، بہت دور، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بسا اوقات دشمن بن گئے ان نام نہاد مسلمانون کی بے دینی کی زندگی کو دیکھ کر قومون نے یہ سمجھ لیا کہ یہی مسلمانون کی دینی زندگی ہے، نہ جاننے والے مسلمانون کے پیغمبر یا اُن کی آسمانی کتاب پر اُن کی اس زندگی کی ذمہ داری کو عائد کرنے

گئے ہیں، مگر یہی بات بھی ہے کہ اسلام کی اشاعت و توسیع ان بے دین بادشاہوں کے طرز عمل سے زیادہ
بہت زیادہ دخل ان ہی عام مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی کو ہے، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ سلف کے سلاطین
کی شکایت عموماً اسی قسم کے مسلمان کرتے ہیں، جن کے قلوب میں خود اسلام کا اثر جیسا کہ چاہئے باقی نہیں
رہا ہے، مسلمانوں کا یہ طبقہ سمجھتا ہے کہ موقع جب مل گیا تھا تو خواہ دین کا مطالبہ کچھ بھی ہوتا، ہمارے
بادشاہوں کو اس سنہرے موقع سے نفع اُٹھاتے ہوئے اپنی قلمرو کے غیر مسلم باشندوں کا یا صفایا
کر دینا چاہئے تھا، یا ذرا دھمکا کر مجبور کر کے چاہئے تھا کہ اُن کو مسلمانوں کی جماعت میں شریک کر لیتے،
مگر میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ اسلام اور اسلامی قوانین وضوابط کی جن لوگوں کی نگاہوں میں کوئی قیمت
ہی نہیں ہے، اُن کے دل میں اسلام کا یہ درد آخر کس بنیاد پر اٹھ اٹھ کر اُن کو بے چین کئے رہتا ہے، جب
اسلام ہی کچھ نہیں ہے، تو مسلمانوں کے باقی رہنے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے؟ اسلام تو نام ہی ایک
خاص قسم کی زندگی کا ہے، جس کی بنیاد صرف چند غیر فانی صداقتوں کے یقین پر قائم ہے، اس یقین
کی چول ہی جس کے اندر ڈھیلی ہو چکی ہے، اس کو مسلمانوں کی کیا پروا؟ وہ اُن کے فنا و بقا کے مسئلہ
کو آخر کیوں سوچتا ہے؟[1]

ممکن ہے کہ میری یہ حق گوئی بعضوں کے لئے تلخ ثابت ہو، لیکن ہر مسلمان کو اپنے گریبان میں منہ
ڈال کر دیکھنا چاہئے، ضمیر اس کا اگر بالکل مردہ اور بے جان ہو کر نہیں رہ گیا ہے، تو یقیناً یہی تلخ نوائی
خود اپنے قلب سے بھی وہ پائے گا،

---

[1] بجز اس ایک توجیہ کے جس کا ذکر مخدوم و محترم مولانا عبد الباری الندوی سابق استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ سے فقیر
کیا کرتے تھے، کہ میں کشمیر میں تھا، مشہور منکر خدا مسٹر ظریف بھی کشمیر آئے ہوئے تھے، کانپور کی مسجد کا قصہ اسی عرصہ میں
چھڑا، مسلمان شہید ہوئے، مسٹر ظریف کو اس واقعہ سے میں نے متاثر پایا، پوچھا کہ جب خدا ہی کے آپ منکر ہیں، تو مسلمانوں
سے ہمدردی کے کیا معنی؟ مسٹر ظریف جھنجھلا کر بولے کہ وہ کیا میری قومیت بھی مسلمانوں کی چھین لو گے؟

بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرہ ، (القیامہ)

بلکہ آدمی اپنے جی کے حال سے خوب واقف ہے، خواہ اس پر عذر کے پردے ہی کیوں نہ ڈالتا جائے،

دور کیوں جائیے، یہی ترک ہیں، اُن کے سلاطین کو چھوڑئیے، عام ترکوں کا ایک زمانہ میں یہ حال تھا، پادری شیفلر جو ترکی علاقے کے عیسائیوں کے متعلق یہ خبریں سُن سُن کر کہ بہ تعداد کثیر وہ اسلامی دائرے میں مسلسل داخل ہوتے چلے جا رہے ہیں، ترکی علاقے میں پہنچا، گھومتے پھرتے اور عیسائیوں کے مسلمان ہونے کے اسباب کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد وہ جس نتیجہ تک پہنچا تھا، اسی کے الفاظ میں سنئے شیفلر نے لکھا تھا،

"جب تم ترکوں سے اُن کی روزمرّہ زندگی میں ملوگے، اور دیکھوگے کہ وہ خدا کی عبادت کرتے ہیں، غریبوں کو خیرات دیتے ہیں، مسیح علیہ السلام کی نسبت اعلیٰ درجہ کے خیالات ان میں موجود ہیں، اور انجیل کا حد سے زیادہ ادب کرتے ہیں، اور ایسی نیک باتیں ان سے معلوم ہوتی رہتی ہیں،

یہ لکھنے کے بعد وہی آگے رقمطراز ہے،

"تو ان باتوں کو دیکھ کر تم کو خیال پیدا ہوگا کہ ترک اچھے لوگ ہیں، اور غالباً نجات کے مستحق ہیں، پھر یہ سوچوگے کہ تم بھی ترک ہو جاؤ؛ تو تم کو بھی نجات مل جائے گی"

اُس نے لکھا ہے کہ یہی نازک نقطہ ہے، جہاں ہر عیسائی روح پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہوا

"مقدس ثالوث، خدا کا مصلوب فرزند اور مذہب کے اور راز جو سوائے نورانی عقلوں کے کوئی نہیں جانتا، ہمارے دل سے محو ہو جائیں گے، اور مسیحی دین بغیر معلوم ہوئے ہمارے دل سے غارت ہو جائے گا، اور تم سمجھوگے کہ عیسائی ہونا اور مسلمان ہونا تو ایک ہی سی

باعث ہے (اشپنگلر فقرہ ۵۵ بحوالہ آرنلڈ ص ۱۰۳)

قدیم ترک مسلمانوں کی زندگی کے متعلق اپنے تاثرات کو نقل کرتے ہوئے ایک دوسرا عیسائی سیاح مصنف لکھتا ہے، کہ

"مسلمان عبادت اور پرہیز گاری اور خیرات دینے کے کیسے پابند ہیں، جس وقت وہ مسجدوں میں ہوتے ہیں، تو کس محویت سے خدا کی بندگی میں مصروف ہوتے ہیں، پاکیزگی اور تقدس اُن میں کس درجہ ہوتا ہے، اپنے علمائے دین کے کیسے مطیع ہوتے ہیں، سلطان بھی سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا کہ مفتی سے فتوی لے لے[1] پنج وقتہ نماز کے خواہ کہیں ہو کسی کام میں ہوں، مسلمان کیسے پابند ہیں، کس طرح صبح سے رات تک روزے مہینہ بھر تک رکھتے ہیں، ان میں آپس میں کس قدر محبت اور سلوک ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ کیسا مخیر ہے، اُن[2] کے شفاخانوں سے جو غریبوں اور مسکینوں کے لئے انھوں نے بنائے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ غیروں کے ساتھ بھی ان کو کس قدر ہمدردی ہے،

---

[1] مگر جو نہیں جانتے ہیں انھوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ گذشتہ اسلامی سلاطین کی حکومت کا قانون اسلامی قانون نہ تھا، یہ عجیب و غریب مغالطہ ہے جس میں اچھے پڑھے لکھے لوگ اس وقت تک مبتلا ہیں، واقعہ یہ ہے کہ جب تک اسلامی حکومتیں مغربی دول کے سیاسی اثر سے آزاد تھیں، عموماً اسلامی فقہ سارے اسلامی ممالک کا قانون تھا، مشرق کی حکومتوں میں زیادہ حسن قبول اسلامی قوانین کی اس تشریح نے حاصل کیا، جو امام ابو حنیفہ اور اُن کے مکتب خیال کی طرف منسوب ہے اور مغرب، اندلس و افریقہ وغیرہ میں امام مالک کی فقہ عموماً مروج تھی، انشاء اللہ اسکی پوری تفصیل کتاب تدوین فقہ میں کیجائے گی، اگر اسکی تکمیل کا موقع ملا، امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی کے نام سے خاکسار نے جو کتاب لکھی ہے، ابتدائی حالات اس میں بھی مل سکتے ہیں، مجلہ عثمانیہ میں ایک مقالہ بھی میرا شائع ہوا ہے، یہی ایک فقرہ کہ سلطان بھی اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ مفتی سے فتوی لے لے، لوگوں کی آنکھوں کے کھولنے کے لئے کافی ہے، کہ یہی حال سارے اسلامی سلاطین کا تھا،

[2] یہ اور اسی قسم کی دوسری تصریحات سے میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ ہسپتالوں کا موجودہ مغربی نظام

یہی مصنف آگے لکھتا ہے،

"اگر ان کے (مسلمانوں) کے انصاف اور اُن کی پرہیزگاری اور نیکیوں کا ہم خیال کرتے تو ہم کو اپنے اوپر شرم آتی ہے کہ خدا کی بندگی اور آپس کے سلوک میں ہم کیسے سست قدم ہیں"

آخر میں مصنف کا قلم قابو سے نکل گیا ہے لکھتا ہے :-

"ہم کو (یعنی یورپ و ایشیا کے عیسائیوں کو) اپنی بے انصافیوں پر اپنے ظالم ہونے اور پرہیزگار نہ ہونے پر شرم آنی چاہئے، بیشک انصاف کے دن مسلمانوں کا پلہ ہم سے بھاری رہے گا، بیشک ان کا ایمان، ان کی نیکیاں اُن کی رحم دلی، وہ چیزیں ہیں جن سے اسلام کو فروغ ہوا، (آرنلڈ ص ۱۰۵)

اسی سلسلے میں شہنشاہ لیوپولڈ کے ایک ترکی سفیر کی یادداشت یا اس رپورٹ سے جو قسطنطنیہ پہونچنے اور کچھ دن رہنے کے بعد اسی سفیر نے اپنی حکومت کو بھیجی تھی، آرنلڈ نے ان ہی نیک نہاد ایمانی ترکوں کے متعلق یہ الفاظ نقل کئے ہیں،

" ترک اپنے مذہب کے نہایت پابند ہیں، اور اُن کی یہ بات عیسائیوں سے کہیں بڑھکر ہے، کہ نماز کے وقت کسی ترک کا دھیان دوسری چیز کی طرف نہیں بٹتا، کوئی مسلمان ایسا نظر نہ آئے گا، جو عبادت کے وقت، ہمہ تن مصروف نہ ہو، اور ادب و تعظیم کی وہ کل علامتیں اس کی صورت سے ظاہر نہ ہوتی ہوں، جن علامتوں کا اپنے خالق کے لئے ظاہر کرنا اسکی مخلوق کا فرض ہے، (بحوالہ لزلی ص ۱۰۰ و ۱۰۲)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷۱) مسلمانوں سے یورپ نے سیکھا ہے، ہم نے چھوڑ دیا اور انھوں نے اس نظام کو ترقی دی " آخر اگر یورپ میں شفاخانوں کا نظام پہلے سے موجود ہوتا، تو مسلمانوں کے شفاخانوں کا ذکر کرکے اپنی قوم کو یہ مصنف عبرت کیوں دلاتا،

یہی نہیں، بلکہ مغربی ممالک کی ان ہی سفارتون کے متعلق یہ عجیب و غریب رپورٹ خود یورپ کے مصنفین کی کتابون مین پائی جاتی ہے کہ،

"قسطنطنیہ میں عیسائی سفیرون کو ہر وقت اس کا اندیشہ رہتا تھا، کہ اُن کے وطن کا کوئی عیسائی جو نوکری کر کے ان کے ساتھ آیا ہے، کہین وہ مسلمان نہ ہو جائے" (آرنلڈ ص ۱۵۷)

حاشیہ مین آرنلڈ ہی نے گلمن کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے،

"عیسائی سفیرون کو کسی دن اس بات کا یقین نہین ہوتا تھا، کہ ان کے ملازم ان کو چھوڑ کر نہ چلدین گے، اور جب تک شام نہ ہوئی وہ نہین کہتے تھے، کہ دن خیریت سے گذرا (گلمن ص ۲۲)

اور قسطنطنیہ یا ترکی کے متعلق تو ممکن ہے کہ اسلامی حکومت کی شان وشوکت ترکون کے غیر معمولی فتوحات وغیرہ کا بھی اضافہ عام مسلمانون کی دینی زندگی کے ساتھ کر دیا جائے، لیکن ایسے ممالک جہان مسلمان فاتح ہونے کی حیثیت سے داخل نہین ہوئے تھے، وہان مسلمانون کی عام دینی زندگی جن نتائج کو پیدا کرتی رہی ہے، چند نمونے اُن کے بھی دیکھ لیجئے، مثلاً چین ہی کے مسلمانون کو لیجئے، یورپ کے پادریون کو جب خبر ملی کہ مشرق کے اس دور دراز گوشے مین بھی اسلام آگے بڑھتا چلا جارہا ہے، تو کچھ لوگ وہان بھی اس کے لوہ مین پہونچے، بڑی بڑی کتابین چین مین اشاعتِ اسلام کے خطرے پر لکھی گئین، ان رپورٹون سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہین، آرنلڈ نے اینڈرسن کے حوالہ سے ایک جگہ نقل کیا ہے،

"اسلام کو خاص چین مین بہت استحکام ہو گیا ہے، اس کا باعث یہ ہو کہ جب کسی صوبہ کی آبادی وبا یا قحط کی بلاؤن سے جن کا گند اکثر اس ملک مین رہتا ہے، غارت ہو جاتی ہو، تو مسلمان بہت خوشی سے اور مستعدی سے ان برباد مقامون کو آباد کر دیتے ہین، قحط کے

زمانہ مین مفلسون سے اُن کے بچے خرید لیتے ہین، اور اُن کو مسلمان کرکے پرورش کرتے ہین،
جب وہ جوان ہو جاتے ہین، تو ان کا نکاح کرکے ان کو سکونت کے لیے علٰحدہ
مکان دیے جاتے ہین، اس طریقہ سے گاؤن کے گاؤن نومسلمون سے آباد
کردیئے جاتے ہین"[1]

ایک دوسرا مصنف ڈبلوجے سمتھ چین مین اسلام کی اشاعت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ
"مسلمانون مین پابندی مذہب کے لئے ہر طرح کوشش کی جاتی ہے یہان تک کہ غریب
سے غریب آدمی کو بھی ابتدائی کتابون کی مدد سے اسلام کے ضروری احکام اور ارکان سکھائے
جاتے ہین (ڈبلوجے سمتھ ص ۱۷۵) از آرنلڈ)

الغرض ایک طرف مصیبت زدون کی دستگیری، کڑے وقتون مین مشکلات سے مقابلہ کی
چینی مسلمانون مین جو صلاحیت پائی جاتی تھی، اور اسی کے ساتھ غریب بھائی بندون کی دل کھول کر
امداد، اُن کی مذہبی تعلیم کی طرف اُن کی غیر معمولی توجہ ان عیسائی سیاحون کو اسلام کی اشاعت کی ایک
وجہ اگر نظر آئی، تو دوسری طرف چینی مسلمانون نے ہمیشہ حکومت کے امن پسند شہری اپنے آپ کو ثابت کرنے
کی عموماً ہر زمانہ مین جو کوشش کی ہے، اس کا ذکر بھی مختلف طریقون سے ان ہی لوگون نے کیا ہے، اسی
سلسلہ مین ایک شاہی فرمان کی نقل بھی چین کے شاہی دفتر سے اُن لوگون کو ملی تھی، ہوا یہ تھا کہ بعض تنگ نظر
حکام نے بادشاہ وقت سے چینی مسلمانون کی شکایت کی، اسی شکایت کے بعد ۱۷۳۱ء مین چین کے خاقان
نے یہ فرمان شائع کیا تھا،

---

[1] اسباب کچھ بھی ہون لیکن ہندوستان خصوصاً مشرقی پنجاب سے مسلمانون کا جو سیلاب بے خانمان ہوکر مغربی پنجاب
پہنچا لوگون کو حیرت ہے کہ اتنے بڑے طوفان کو مسلمانون نے کیسے سنبھال لیا، لیکن مسلمانون مین موروثی طور پر احساسات دمیدہ جو کچھ عناصر
جنہیے جاتے ہین اُن کا مقابلہ اُن لوگون کے جذبات سے کرنا صحیح نہ ہوگا جن مین باہم ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو نجس و ناپاک سمجھتا ہے،

"ہماری سلطنت کے ہر صوبہ میں صدہا سال سے مسلمان موجود ہیں، جو ہماری رعایا کا ایک حصہ ہیں، اور جس طرح اور ہماری رعایا مثل ہماری اولاد کے ہے، اسی طرح یہ مسلمان بھی ہماری اولاد ہیں، ہم مسلمانوں میں اور ان لوگوں میں جو مسلمان نہیں ہیں کوئی فرق نہیں سمجھتا"

پھر جس حاکم نے مسلمانوں کی شکایت کی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے بادشاہ نے لکھا تھا کہ

"بعض حاکموں نے مسلمانوں کی خفیہ شکایتیں ہم سے کی ہیں، جن کی بنا صرف یہ ہے، کہ مسلمانوں کا مذہب چینیوں کے مذہب سے مختلف ہے، مسلمان وہ زبان نہیں بولتے، جو اور چینی بولتے ہیں اور لباس بھی اور چینیوں سے مختلف وضع کا ہے"

آگے اسی کے بعد ہے:-

"مسلمانوں پر نافرمانی، گستاخی، اور باغیانہ خیالات رکھنے کا الزام لگایا گیا ہے، اور ہم سے درخواست کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف سخت طریقے اختیار کئے جائیں"

بادشاہ نے ان الفاظ کے بعد لکھا تھا کہ

"لیکن تحقیق و تفتیش کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ ان شکایتوں اور الزاموں کی کوئی بنیاد نہیں ہے"

پھر مسلمانوں کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے اسی فرمان میں لکھا گیا تھا کہ

"مسلمان جس مذہب کے پابند ہیں، وہ فی الحقیقت اُن کے بزرگوں کا مذہب ہے، پھر یہ ہے کہ اُن کی زبان وہ نہیں ہے جو اور چینیوں کی زبان ہے، لیکن چین کے ملک میں بہت سی مختلف قوموں کی زبانیں بولی جاتی ہیں"

زبان کے اختلاف کا یہ واقعی منصفانہ جواب دیتے ہوئے بادشاہ نے مسلمانوں کی دوسری خصوصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا،

"اُن کی عبادتگاہوں کی نسبت اور لباس وطرزِ تحریر کے بارے مین جو چینیون کی وضع وطرز سے مختلف ہین، جس قدر شکایتین کی گئی ہین، وہ ہرگز لحاظ کے قابل نہین یہ سب رواج اور دستور کی باتین ہین؛"

آخر مین بادشاہ نے لکھا تھا کہ مسلمان ہمیشہ ہماری حکومت کے بڑے بڑے عہدون تک پہنچتے رہے ہین، اور سرکاری امتحانون مین اور لوگون کی طرح کامیاب ہوتے ہین، پس مسلمانون اور غیر مسلمانون مین میری حکومت کسی تفریق اور امتیاز کو جائز قرار نہین دیتی؛ (آرنلڈ ص ۳۰۳)

اسی فرانسیسی مصنف دے تیرسان کے حوالہ سے آرنلڈ نے چینی مسلمانون کے اس خاص طرزِ عمل کا بھی تذکرہ کیا ہے، کہ

"مسلمان اپنے مذہب اور کنفوشس کے مذہب مین جو باتین مشابہ ہین، اُن کو جتلاتے ہین (دے تیرسان ص ۳۰۶)

گویا جیسے عیسائی مسلمانون سے اس لئے متأثر ہوتے تھے، کہ مسیح علیہ السلام اور اُن کی کتاب انجیل کے احترام مین مسلمان کوئی کمی نہین کرتے، یہی طریقہ چین کے عام مذہب کے پیشوا کے ساتھ انھون نے اختیار کر رکھا تھا، اور میرا خیال ہے کہ مسلمانون کے دین کا بھی اقتضا یہی ہے، اُن کو دنیا کے تمام ادیان وملل سے تکذیب وتحقیر کا نہین، بلکہ تصدیق وتکمیل وتصحیح کا تعلق ہے، خصوصاً چین کے عام باشندون، اس ملک کی حکومت، اس ملک کے باشندون کے مذہب کے ساتھ ایک خاص قسم کا رواداراانہ برتاؤ

سلہ یہ چین کی شخصی حکومت یا قرونِ وسطیٰ کے تاریک عہد کی ایک تاریخی یادگار ہے، کیا جمہوریت کے اس طلائی آج روشن عہد مین لوگ قرونِ وسطیٰ کی شخصی حکومت کے اس فرمان سے کوئی عبرت حاصل کر سکتے ہین، کتنا بہت آسان ہے لیکن کر دکھانا واقعات ہی کی روشنی مین ممکن ہے؛ اس فرمان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانون کے متعلق شکایتون کے اسباب بھی پُرانے ہین اور شکایت کرنیوالے بھی نئے نہین ہین، لیکن باوجود ان تہمتون کے چین مین مسلمان بحمد اللہ اس وقت تک موجود ہین،

اور اسی کے ساتھ اس زمانہ میں اُن کی پختہ دینی زندگی ان ہی باتوں میں اسلام کے فروغ کا راز ان عیسائی سیاحوں کو نظر آیا تھا،

افریقہ کے دور دست علاقوں یا جزیروں میں بھی یورپ والوں کو اسلام کی ترقی کی تیز رفتار کے اسباب جو ملے ہیں، اُن ہی کی کتابوں سے بعض چیزیں جنھیں آرنلڈ نے نقل کیا ہے، پیش کی جاتی ہیں، مثلاً افریقہ کے نیگرو اقوام کو مسلمانوں نے کس طرح متأثر کیا، اس کی تفصیل کرتے ہوئے ایک مغربی مصنف بیان کرتا ہے،

"انتہا درجہ کی ظالمانہ رسمیں جو ایک زمانہ سے تمام افریقہ میں پھیلی ہوئی تھیں، اور اب بھی براعظم افریقہ کے بعض حصوں میں گولڈ کوسٹ اور انگریزی نوآبادیوں کے قریب جاری ہیں، یعنی مردم خواری اور انسان کی قربانی، اور بچوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج اسلام قبول کرتے ہی فوراً ہمیشہ کے لئے موقوف ہو جاتا ہے،

آگے اسی کا بیان ہے کہ

"اب تک جو برہنہ یا نیم برہنگی کی حالت میں رہتے تھے، کپڑے پہننے شروع کرتے ہیں، اور کپڑے ایسے جو پاک اور ستھرے ہوں، اور وہ لوگ جو کبھی نہانا اور منھ دھونا نہیں جانتے تھے، بار بار نہاتے ہیں، منھ دھوتے ہیں، کیونکہ نفاست اور پاکیزگی کے قواعد ان کو بتائے گئے ہیں"

اسی نے بیان کیا ہے

"اس خوفناک مکان کی جگہ جسے جوجو کا گھر کہتے تھے، اور جس میں بدشکل چیزیں پوجنے کے لئے رکھی ہوئی ہیں"

جوجو کے اس گھر کی جگہ

"اب خوبصورت بنی ہوئی پاک اور ستھری مسجد جس کی محراب مکہ کی طرف اشارہ کرتی ہے"

جس مین مؤذن پانچ وقت اذان دے کر نمازیون کو بلاتا ہے، اور جس مین امام ہر جمعہ

کو نماز پڑھاتا ہے، گاؤن کے مسلمانون کا عام مرجع بن جاتی ہے،

وہی لکھتا ہے کہ پھران ہی مسجدون مین

سب لوگ جمع ہوتے ہین اور اس خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرتے ہین، جو حاضر

وناظر علیم وبصیر ورحیم ہے" (آرنلڈ ص ۳۷۹)

بوسورتھ سمتھ کے حوالہ سے آرنلڈ نے ان ہی افریقی مسلمانون کے متعلق نقل کیا ہو،

"یہ بات سب نے تسلیم کی ہے، کہ افریقہ کے نومسلمون مین مذہب اسلام ایسی ہمت اور جرأت اور

قدرت اپنے اوپر آپ بھروسہ کرنے کی قابلیت پیدا کر دیتا ہے، جن کا نشان ان ہی افریقی مسلمانون کے

ہم قوم ہم وطن بُت پرستون یا عیسائیون مین مشکل سے ملتا ہے"[۱]

ذرا خیال کیجئے، مغربی افریقہ کا اور اس کے دریائے گامبیا جو سنگھالی قومون کے وطن سے گذرنے والے

دریائے سنگھال کے قریب ہے، اور دونون بحراوقیانوس مین جا کر گرتے ہین، ۱۸۳۱ء مین ایک مغربی سیاح

اس علاقہ مین داخل ہوتا ہے، اور دنیا کے آخری حصہ کے اس علاقہ مین دوسری وحشی اور بت پرست قومون

کے ساتھ مسلمانون کو بھی اُن ہی ملی جلی شکلون مین پاتا ہے، اس نے اس علاقہ کے مسلمانون کی دوسری خصوصیت

کے ساتھ چند باتین یہ بھی بیان کی ہین، کہ

"ان مسلمانون کو مین نے بہت جفاکش اور سیدھا سادہ پایا، اپنے صرف سے زیادہ اناج

وہ پیدا کر لیتے ہین"،

اس کے بعد وہی لکھتا ہے کہ

"ان مسلمانون کی مہمان نوازی بہت مشہور ہے"،

---

[۱] آرنلڈ ص ۳۰۰ بحوالہ بوسورتھ اسمتھ ص ۹۰، ۱۰۰،

اور یہ کہ

"اس دیس کی دوسری قومین ان مسلمانون کی آبادیون کے قریب آباد ہونا اپنے لئے نعمت تصور کرتی ہین (آزمنگو بحوالہ فرانسس مورس ۷۵، ۷۶،)

اسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ باوجود اس قدر امن پسند اور حلیم و بردبار ہونے کے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس علاقے کے مسلمان بزدل ہین، بلکہ

"افریقہ کی اور قومین جس قدر دلیر اور بہادر ہین، اسی قدر بہادر یہ لوگ بھی ہین، اور ہتھیار چلانے مین بڑے مشاق ہین،

اور یہی ہے بھی درحقیقت دیندار مسلمانون کی زندگی کی خصوصیت،

اسی سیاح نے یہ بھی لکھا ہے،

"یہ قوم بڑی متشرع مسلمان ہے، اس کا کوئی آدمی برانڈی یا پانی سے زیادہ تیز پینے کی چیز نہین پیتا، (ص ۲۲۱)

ابن بطوطہ نے بھی اسی نیگرو قوم کے علاقے مین چودہوین صدی مین سفر کیا تھا، تو اس وقت بھی اس نے یہی کہا کہ

"یہان کے مسلمان پابند صوم و صلوٰۃ ہین، قرآن پڑھتے ہین، جمعہ کے روز کوئی شخص بہت پہلے مسجد مین نہ پہونچے تو پھر جگہ ملنی ناممکن ہے، کیونکہ جمعہ کے روز نمازیون کی بڑی کثرت ہوتی ہے" (ابن بطوطہ جلد ۴ ص ۴۲۱ و ۴۲۲)

چودہوین صدی سے اٹھارہوین صدی تک کے سیاحون کا بالاتفاق بیان ہے کہ نیگرو علاقے کے مسلمانون کی زندگی پر دینی رنگ چڑھا ہوا تھا، اور اُن کی یہی زندگی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دوسری قومین ان کے پڑوس مین آباد ہونے کو نعمت تصور کرتی تھین، اور مسلمانون کی دینی و اخلاقی زندگی

سے متاثر ہو کر اُن کے دین کو اختیار کرتی چلی جاتی تھیں، بلکہ انیسوین صدی کے آخر تک اس علاقے کے سیاحون کی رپورٹون سے ثابت ہوتا ہے کہ

"ساحل اور اطراف نیز اندرونی علاقون مین اشاعتِ اسلام کا کام ترقی پر نظر آرہا ہے[1]"

ان ہی سیاحون نے یہ بھی لکھا ہے کہ زیادہ تر اشاعتِ اسلام کا یہ کام مسلمان تاجرون کے ذریعہ انجام پا رہا ہے، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ

"ان تاجرون کی طرف سے اس ملک کے دیسی باشندون کے قلوب مین کسی قسم کی بدگمانی نہین پائی جاتی"

اسی لئے

جب کوئی مسلمان سوداگر بُت پرستون کے گاؤن مین پہنچتا ہے، اور بار بار وضو کرکے رکوع اور سجدے سے نماز پڑھتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ نماز مین وہ خدا سے طالب ہے، تو گاؤن کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہین"

اور یہی نظارہ، نیز

"مسلمانون کی عقلی و اخلاقی برتری کی وجہ سے وہان کے لوگ اُن کی توقیر کرتے ہین، اُن پر بھروسہ کرتے ہین"

یہ حال تو ان قومون کے تاثرات کا ہوتا ہے، اور دوسری طرف جیسا کہ اس سیاح کا بیان ہے[2]

یہ مسلمان تاجر ہر وقت تیار رہتا ہے کہ جو خوبیان خود اس مین موجود ہین، وہی دوسرون مین پیدا کر دے"

---

[1] آرنلڈ نے ڈی ایچ ایسٹ، اور ڈبلو واس وغیرہ کی کتابون کا حوالہ دیا ہے، دیکھو آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام کا ترجمہ ص ۳۰۱، [2] بشپ کراوتھر ص ۲۵-۳۴ آرنلڈ ۔

دیکھا آپ نے مسلمان اپنی دینداری کے زور سے قوموں میں اعتماد اور بھروسے کے پیدا کرنے اور پھر اُن کو اپنے دین میں داخل کرلینے میں کس طرح کامیاب ہوتے ہیں، اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ حاکم ہوں، یا محکوم، ہر حال میں اُن ہی مسلمانوں نے غیر قوموں کے ساتھ اچھا سلوک بھی کیا ہے، جو دین پر قائم تھے، اور ان ہی لوگوں کو دینی دائرے کی توسیع کا موقع بھی غیر قوموں میں ملا ہے، ورنہ جن مسلمانوں نے قوموں کے آگے اپنے آپ کو غنڈوں اُٹھائی گیروں، بدمعاشوں، جھگڑالو آدمیوں کے قالب میں پیش کیا ہے، سچ پوچھئے تو اُن سے اسلام دوسروں تک تو کیا پہونچے گا، آج اسلام اُمہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جیسا کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے لکھا تھا ع

امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں

آرنلڈ نے سر بارٹل فریری کے حوالے سے افریقہ میں اسلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ افریقہ میں تبلیغ اسلام میں جو بہت تیز ترقی ہو رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام لانے کے ساتھ ہی ہر نومسلم افریقی یہ یقین کرلیتا ہے کہ مسلمانوں کا گھر اس کا گھر ہے، جہاں اس کو ٹھہرنے اور کھانے پینے کا سامان جس وقت بھی وہاں پہنچے گا، میسر آسکتا ہے، اور یہ کہ

"اسلام قبول کرنے کے ساتھ اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی ملک میں ایک ایسی قوم کا رکن ہو گیا ہے، جو حکمران تو نہیں ہے لیکن ملکی رسوخ کے اعتبار سے ترقی یافتہ ہے"

سر بارٹل نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان ہونے کے ساتھ اس نومسلم کو اخوت اور آپس میں برابر سمجھے جانے کا عملی برتاؤ اس کے سامنے آجاتا ہے، انھوں نے اس پر افسوس کیا ہے کہ گو عیسائی بھی اس دینی اخوت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن

گورے رنگ کا عیسائی کالے رنگ کے کافر اور غلام افریقی کا مدت سے آقا سمجھا جاتا ہے"

آرنلڈ نے اسلام اور عیسائیت کے اس فرق کو تفصیل کے ساتھ مختلف شہادتوں کی روشنی میں واضح کیا ہے، آخر میں ایک مشنری رپورٹ سے یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے کہ عیسائیوں کے اسی امتیازی سلوک کا نتیجہ ہو کہ

"افریقیوں میں یہ عام خیال پھیلا ہوا ہے، کہ اسلام کالے آدمیوں کے لئے، اور عیسوی مذہب گورے آدمیوں کے لئے مختص ہے، وہ جانتے ہیں کہ عیسوی مذہب ان کو نجات کے لئے بلاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ان کو مذہب عیسوی ایسا ذلیل درجہ دیتا ہے، کہ وہ ہمت ہار کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ ہماری قسمت میں اس مذہب کا حصہ نہیں ہے، بخلاف اس کے اسلام ان کو یقین دلاتا ہے کہ یہ تم پر منحصر ہے کہ جس قدر بلندی تک پہنچنا ممکن ہو پہنچ جاؤ"[۵۱]

پس سچی بات یہی ہے کہ مشرق ہو یا مغرب، آج ہو یا کل، اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں کے سامنے اپنے اسی تجربہ کو پیش کیا ہے، کہ حاکم ہوں یا محکوم، کسی حال میں بھی ہوں، دین سے جس قدر قریب رہیں گے! خدا بھی اُن سے قریب رہے گا، اس کی امداد بھی ان کے قریب رہے گی، دنیا کی قوموں کے قلوب بھی اُن سے نزدیک رہیں گے، یہاں تک کہ یہی نزدیکی بالآخر اُن کو اسلام میں داخل کر کے رہتی ہے، مذکورۂ بالا اقتباسات تو افریقہ کے متعلق آپ نے سنے مشرق کے مجمع الجزائر، ملایا جاوہ، سوماترہ وغیرہ میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے آرنلڈ ہی نے (مکیتر) کی کتاب سے یہ فقرے نقل کئے ہیں

"ملایا کے یہ مسلمان ...... مذہب کے نہایت پابند ہیں، مجمع الجزائر کے کل مسلمانوں میں نکی پرہیزگاری کی ایسی شہرت ہے، کہ بطور مثال کے اُن کا ذکر کیا جاتا ہے"[؟]

مگر اس شدید قسم کی مذہبیت کے ساتھ یہ مصنف یہ بھی لکھتا ہو کہ

"ملک کے ہندو عیسائی، بدھ اور بُت پرستوں سے صاف دل اُن کا میل جول بھی رہتا ہے"

اور یہ کہ

"مذہبی پابندی در رواداری، صلح کل کا اصول یہی اُن کا دستور العمل رہا ہے"

یہ لوگ

[۵۱] پریچنگ آف اسلام ص ۳۰۵

"دنیا کی باتوں میں لوگوں کو نفع پہنچانے کے ساتھ ان کی مذہبی بہبودی کا خیال بھی ان کو تھا اور ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس علاقہ کے باشندوں میں

اسلام کا اثر بہت پایا جاتا ہے، افریقہ میں جو لوگ مسلمان ہوگئے ہیں ان کو مسلم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ لوگ ایسی زبان بولتے ہیں جو ملایا اور سامی زبانوں سے مرکب ہے، جزیرہ کی وحشی قوموں میں بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے ہیں" (آرنلڈ ص ۳۹۵)

بہرحال بجائے اپنوں کے غیروں کی ان شہادتوں کو پیش کرنے کی غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی زندگی اور ان کی اس زندگی کے نتائج کو غیروں کی آنکھوں نے کس نظر سے دیکھا ہے، خود مسلمانوں کو اپنی دینی زندگی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو یا نہ ہو، لیکن مسلمانوں کو اپنے دین سے جہاں کہیں بھی پانے والوں نے قریب تر پایا ہے، وہ ہمیشہ اسی اعتراف پر مجبور رہے ہیں، جس کی کچھ مثالیں آپ کے سامنے گذریں، قرآن میں اصحاب کہف کی ایمانی خصوصیتوں کو بیان کرتے ہوئے منجملہ اور باتوں کے آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

لو اطلعت علیھم لولیت منھم رعبا — ان کو جھانک کر اگر تم دیکھو گے تو رعب سے تم بھر جاؤ گے

میں تو غار میں ان پناہ لینے والے نوجوانوں کے ایمان اور ان کی قوت ہی کو اس رعب کا سبب قرار دیتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کو گناتے ہوئے جن سے حق تعالیٰ نے خصوصی طور پر آپ کو سرفراز فرمایا ہے ایک خصوصیت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ

نصرت بالرعب علی مسیرۃ شھر (بخاری) — رعب سے میری مدد ایک مہینہ کی مسافت کی گئی ہے،

یعنی جن مقامات تک ایک مہینہ چل کر لوگ اس زمانہ میں پہنچتے تھے، ان تمام مقامات کے باشندوں کے قلوب میں آپ کا رعب ڈال دیا گیا ہے، اس میں شک نہیں کہ عام طور پر اس رعب کو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہی کے ساتھ مختص سمجھا جاتا ہے، لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں دوسری چیزیں مثلاً جعلت لی الارض مسجدًا وطھورًا (زمین کا پورا کرہ میرے لئے مسجد بنا دی گئی ہے، اور

یہ کہ اسی زمین کی مٹی طہارت (تیمم) کا ذریعہ بنائی گئی ہے (۳) یہ اسلامی طاقت کی حالت اتنی بڑی جنگ کا مال غنیمت میرے لئے حلال کیا گیا ۔) ظاہر ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان چیزوں میں امت کو بھی جب حصہ ملا ہے تو رعب سے نصرت و امداد کے متعلق آخر یہ کیوں سمجھا جائے کہ پیغمبر کی امت اس نعمت سے محروم ہے ، اور صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تک رعب والی یہ امداد محدود تھی ،

بورنیو کے مجمع الجزائر میں جزیرہ زدلو میں ڈل ریپل نامی ایک مغربی سیاح ۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۴ء تک مقیم رہا ، اور وہاں کے حالات پر اس نے ایک مضمون لکھا تھا ، مسٹر آرنلڈ نے اسی مضمون سے نقل کیا ہے کہ

"یہاں ایدان نامی ایک قوم ہے جس نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا ہے لیکن اپنی جہالت پر انکو میں دیکھتا تھا کہ نادم اور حسرت و افسوس میں مبتلا ہیں اور دل ہی دل میں خفیف ہوتے ہیں"

ڈل ریپل نے اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

جس وقت ایدان قوم کے لوگ مسلمانوں کے گھروں میں یا مسلمانوں کے جہازوں پر آتے ہیں ، تو مسلمانوں کی بے حد تعظیم کرتے ہیں ۔ اور سمجھتے ہیں کہ مسلمان وہ ہیں جن کو اپنے پروردگار کا علم حاصل ہے ؛

اسی کا بیان ہے کہ اس نے یہ بھی دیکھا کہ

جس جگہ مسلمان سوتے ہیں وہاں یہ ایدان بیٹھتے نہیں ، اور مسلمان جس ڈبے سے چونا نکال کر کھاتے ہیں ، اس میں یہ لوگ خود انگلیاں ڈال کر چونا نہیں نکالتے ، بلکہ مسلمان جب ان کو خود پان یا چونا دیتے ہیں ، تو بہت ادب سے لیتے ہیں ،

اور آخر میں اس نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ

" جس خدا کو ایدان کے لوگ خود نہیں مانتے ، اس کی الوہیت کے اقرار میں وہ اپنے [illegible]

تی؟ آپ ہی بتائیے کہ ایمانی رعب کے سوا قوم ایران کے ان نفسیاتی تاثرات کی اور کیا توجیہ کی جائے غیروں کی ان شہادتوں کو پڑھ کر کوئی وجہ نظر نہیں آتی، کہ اسلامی مورخین کی کتابوں میں اس قسم کی باتیں عموماً جو پائی جاتی ہیں، ان کا انکار کیا جائے مثلاً ذہبی نے منصور بن زاذان محدث کے ذکر میں لکھا ہے کہ عباد بن العوام جب کمسن تھے، منصور کے جنازے میں شریک ہونے کا موقع ان کو ملا تھا، یہی عباد کہتے تھے کہ

"میں نے دیکھا کہ منصور کے جنازے میں مسلمانوں کے سوا یہود الگ شریک ہیں اور نصاریٰ الگ شریک ہیں، (ج ۱ ص ۱۳۲)

یا ابن عساکر نے ابن ابی خیثمہ کے حالات میں لکھا ہے کہ

"مصیصہ (شامی علاقہ کی چھاؤنی جو رومیوں کے حدود کے قریب تھی) اسی مقام پر ان کی وفات ۱۸۰ھ میں ہوئی، یہ ہارون الرشید کی خلافت کا زمانہ تھا جس دن ان کا انتقال ہوا دیکھا گیا، کہ (مسلمانوں کے سوا) اپنے اپنے سروں پر یہود و نصاریٰ بھی خاک ڈال رہے ہیں اور اُن کی موت کے غم میں مسلمانوں کے برابر کے شریک ہیں" (تاریخ دمشق از ابن عساکر جلد ۳ ص ۲۵۵)

ایسی صورت میں اس مشہور واقعہ پر کیوں تعجب کیا جائے جس کا تذکرہ امام احمد بن حنبل کے عام سوانح نگاروں نے کیا ہے یعنی حضرت امام احمد کی جب وفات ہوئی تو،

اسلم یوم مات عشرون   جس دن امام کی وفات ہوئی تو عیسائیوں
الفا من النصاریٰ والیہود   یہودیوں پارسیوں میں سے بیس ہزار آدمی
والمجوس (مقدمہ مسند احمد جلد ۱ ص ۲)   مسلمان ہوگئے،

سچا اسلامی و دینی زندگی گزار کر جانے والوں نے اپنی موت سے بھی ایمانی زندگی مختلف زمانوں میں جو بانٹی ہے اس کا افسانہ تو اتنا طویل ہے کہ چاہیئے تو یہ ہے کوئی مستقل کتاب ہی اس موضوع پر لکھنا چاہیئے

زکو سکتے ہیں، اور اس میں جرأت ہے، ہاں زندہ مسلمانوں کے نہ جی کی بیدینی یا دین سے دوری زندگی خود مسلمانوں کی ایمانی موت کا بسا اوقات سبب ہو جاتی ہے، اپنی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں، کہ ان ہی مسلمانوں کی بدولت کتنوں کو آج دین سے مرتد ہونے تک مجبور ہونا پڑا ہے،

وما اصابك من مصيبة فمن — اور مصیبت جو کچھ بھی تمہیں پہنچتی ہے، اس کا

نفسك · (آل عمران) — منشا خود تم ہو، تمہاری ذات ہو،

بہرحال ہم غیروں کے شکوے شکایت اور ان کے جور و ظلم کی حکایت کے عادی ہو گئے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے، کہ غیروں کے رحم و کرم کے سوا اپنی پناہ گاہ اب ہمیں کہیں نظر نہیں آتی، حالانکہ آسان بات کو خود اپنے ہاتھوں ہم نے دشوار بنا لیا ہے، زندگی کے وہی اوقات جو دوسروں کے شکوے شکایت میں ہم گذارتے ہیں، ان سے تھوڑا بہت تھوڑا وقت بھی اپنے آپ سے شکایت کرنے میں ہر شخص ہم میں دینا اگر شروع کر دے، تو اس کو نظر آئے گا، کہ جن چیزوں کو ہم دوسروں کے اقتدار و اختیار میں پاتے ہیں، درحقیقت وہ خود ہماری اختیاری چیزیں ہیں،

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جن شکایتوں کا ازالہ خود ہمارے زیر اقتدار ہے جب ان کے ازالہ کی ہمت خود ہم میں باقی نہیں رہی ہے، تو غیروں سے ہمیں جو شکایتیں ہیں، اُن کے ازالہ کی ہم توقع کس بنیاد پر کر سکتے ہیں، ہمیں خود اپنے آپ پر جب رحم نہیں آتا، تو دوسروں سے رحم کی امید تک باندھا جاتا ہے کہ کہاں تک درست ہو سکتی ہے، خدا کے جس رسول علیہ السلام کے دست حق پرست پر ہمارے آباء و اجداد نے بھی بیعت کی، اور خود ہم بھی اس بیعت پر بحمد اللہ آج تک قائم ہیں، اسی بیعت پر اصرار کرتے ہوئے جینا بھی چاہتے ہیں، اور اسی پر طے کئے ہوئے ہیں کہ مریں گے بھی، کیا ہمارے لئے جائز تھا کہ اسی پیغمبر (صلواۃ علیہ سلامہ) کی ان باتوں کو جن کا ذکر حدیث کی صحیح کتابوں میں بار بار اعادہ کیا گیا ہے، مثلاً قریش کے جاہلی عرب کو آپ خطاب کر کے فرماتے کہ

"ہم ان سے کچھ نہیں چاہتے بجز ایک بات کے جس کا اقرار وہ کر لیں، ایسی بات جو عرب کو بھی ان کے سامنے جھکا دے گی، اور عجم سے بھی اُن کو جزیہ دلا دے گی"

قریش کے صناوید پوچھتے کہ ایک بات کیا اگر واقعی یہ کوئی ہے جو تم کہتے ہو تو ہم ایسی دس باتیں تمھاری ماننے کے لئے تیار ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تب فرماتے کہ

"لا الٰہ الا اللہ (کوئی الٰہ اللہ کے سوا نہیں ہے) بس اسی کو مان لو"

اسی کے بعد ارشاد ہوتا ہو کہ جن باتوں کی ضمانت لی گئی ہے، خود دیکھو کہ تمھارے سامنے آتی ہیں یا نہیں، قریش کی جب تک جاہلیت کا دورہ پڑا ہوا تھا، وہ اس سے انکار کرتے ۔۔۔ یہی کہتے رہے۔

ما سمعنا بھذا فی الملۃ الآخرۃ	کسی دوسری قوم کی قومی زندگی (اللہ
ان ھذا الا اختلاق [۱]	کو اللہ اسد بنانے پر مبنی ہو) ہم نے آج تک
	یہ نہیں سنا، یہ تمھارا ایک خود تراشیدہ منفرد ہے

بکر بن وائل کا قبیلہ جو ایرانیوں کے حدود میں رہتا تھا، حج کے لئے مکہ معظمہ اسی قبیلہ کے بعض سردار آئے ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سامنے بھی اسی ضمانت کو پیش کیا، کسریٰ ایران جس کے نام سے وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ تم میری بات مان لو،

---

[۱] یہ سورہ ص کی شروع آیت ہے، اس سورہ کی ابتدا اس مضمون سے کی گئی ہے، کہ بل الذین کفروا فی عزۃ و شقاق (اسلام کے نہ ماننے والے دراصل عزت اور جیر بیار کے عارضہ میں گرفتار ہیں) موجودہ قومیت کا بھوت قوموں پر جو سوار ہے، حاصل اس کا اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہر قوم اپنی عزت و سربلندی و برتری کی مدعی ہے، اسی دن بنی آدم کی ایک ہی نسل کو قوموں، منتشر ٹکڑوں میں جیر بیار کر رکھا گیا ہے، اسلام جب توحید کی دعوت پیش کر رہا تھا، کہتے تھے کہ کسی دوسری قوم میں یہ بات نہیں سنی گئی،

ان لم تلبث قلیلاً حتی یورثکم — تو نہ ٹھہرو گے تم زیادہ دن کہ مالک

اللہ ارضھم و اموالھم؛ — بنا دے گا اللہ تعالیٰ تمہیں ایرانیوں کی زمین

کا بھی، اور اُن کے اموال کا بھی،

اسی عرصہ میں ابو لہب آگیا، اور بولا یہ دیوانہ ہے، اس کی بات کا خیال نہ کرو لکھا ہے کہ بکر کے

سرداروں نے تب ابو لہب سے کہا، کہ

"ہاں فارس (ایران) کے متعلق جو باتیں اس شخص نے کہیں، ان کو سُن کر تو ہم نے بھی اس کو

مجنون ہی خیال کیا تھا۔[1]

مگر دنیا نے کل پندرہ بیس سال کے عرصہ میں دیکھ لیا کہ دیوانہ کون تھا، اور کون قوانینِ عالم

کے سلسلہ کے کلیدی قانون کے پانے میں کامیاب ہوا تھا،

سچی بات تو یہ ہے کہ قریش کے جاہلوں نے تو دیکھنے اور تجربہ سے پہلے انکار کیا تھا لیکن اس

امت کے متعلق اب میں کیا کہوں جن کے سامنے وہ سب کچھ گذر چکا ہے، جو کہا گیا تھا، اس نسخہ کا بار

بار تجربہ کر کے نتائج کا مشاہدہ کر چکی ہے، جس کے پینے کی ابتدائی دعوت قریش کو دی گئی تھی،

لیکن بجائے خطّائین ہونے کے ہوتا کہ ہم میں کل نہیں تو بعض ہی لوگ اوّابین ہونے کی زندگی

اختیار کرتے، اور دیگران سے ہٹ کر اپنی نصیحتوں کا رُخ کچھ دن کے لئے خود اپنی طرف پھیر دیتے،

---

[1] سیرۃ محمدیہ للدہلوی [2] تقریر کرنے والا [3] مجاہد امام المفسرین سے اوّاب کے قرآنی لفظ کی تشریح میں یہ روایت نقل کی گئی ہے، کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اوّاب کے معنی مجاہد نے پوچھا ابن عمرؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ

"اوّاب وہ ہے جو تنہائی میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے حق تعالیٰ سے اُن کی مغفرت کی درخواست کرتا ہے"

(فتح القدیر شوکانی ج ۵ ص ۲۱۰)

پھر کہف (غار) کے نوجوانوں نے جیسے کہا تھا،

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ ہمارا مالک وہی ہے جو آسمانوں اور زمین

لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ ۔ کا مالک ہے، نہیں پکارتے ہم اس کے سوا

قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا، ۔ کسی دوسرے الٰہ کو یقیناً اس وقت کہیں گے

یہ کہتا ہوا آج بھی مسلمانوں میں نوجوانوں کا کوئی گروہ کھڑا ہو جاتا، تو یقین ماننے کہ اسی کہفی زندگی سے وہ اپنے لئے بھی اور اپنی قوم کے لئے بھی مرافق حیات اور معاشی سہولتوں کے سرچشمہ کے پانے میں کامیاب ہو جاتے۔ اور آج زندگی کی صحیح راہ کے ڈھونڈنے میں انسانیت جو بھٹک رہی ہے اُن کو اپنی اس جستجو میں "ولی مرشد" بھی مل جائے گا، وہی قومیں جو آج دنیا کے مردار پر کتوں کی شکل میں ٹوٹی پڑتی ہیں وہ اُن کی محافظت پر دیکھیں گے کہ آمادہ ہو گئی ہیں، ہر دیکھنے والا اُن سے مرعوب ہونے لگے گا اور مجال کسی کی نہ رہے گی جو اُن کے سامنے ٹھہر سکے،[1]

---

[1] اس موقع پر مناسب ہوگا کہ سورۂ کہف کی ان آیتوں کو پیشِ نظر رکھ لیا جائے جن کے مضامین کی طرف ان فقروں میں اشارہ کیا گیا ہے تشریحی ترجمہ ان آیتوں کا یہ ہے یعنی کہف والوں کے قصہ کو بتاتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ

"وہ چند نوجوان تھے جنھوں نے اپنے رب (مالک) کو مان لیا تھا اور ہم نے راہ نمائی میں ان کو ترقی عطا کی اُن کے دلوں کو ہم نے باندھ دیا (مخلوقات کا خوف اسی لئے نکل گیا، کہ خالق جو بندہ جاننے کے بعد مخلوق کا ڈر قدرۃً انسانی قلوب میں باقی نہیں رہتا) اور دیکھو جب نوجوانوں کی یہ ٹولی کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی ہمارا مالک وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے ہم اس کے سوا کسی کو نہ پکاریں گے ایسا اگر ہم نے کیا تو راہِ حق سے ہٹ جائیں گے، ہماری قوم نے خالق کے سوا مخلوقات کو اپنا معبود اور الٰہ بنا رکھا ہے کیوں نہیں اپنے اس فعل کے جواز میں کوئی ایسی کھلی دلیل پیش کرتے جو عقل پر چھا جائے، اس سے بڑا ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ باندھے، جب قوم کے ان لوگوں کو، اور جن کو خدا کے سوا یہ پوجتے ہیں تم نے چھوڑ دیا تو آؤ چلو اس غار میں ہم پناہ لیں اپنی رحمت کو خدا وہاں پھیلائے گا، اور مرفق (زندگی کی

کتب خانہ حبیب گنج

از

جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈہ

اگرچہ اس کتب خانہ کی شہرت نزدیک و دور بہت کافی ہے اور متعدد مضامین اس کے متعلق جابجا نکل چکے ہین، مگر میرے خیال مین ابھی تک یہ کتب خانہ پبلک کی نگاہ مین اس قدر نہین آیا جس قدر انکی ضرورت ہے، اس لئے اس سلسلے مین کچھ لکھنا تکرار کی حد مین داخل نہین،

مجھے کئی بار حبیب گنج کی حاضری کا اتفاق ہوا، لیکن مستعجلانہ، اسی وجہ سے مین کسی بار بھی کتب خانے کی سیر نہ کرسکا تھا، اس لئے عرصہ سے شوق تھا، کہ اس کی سیر سے بہرہ اندوز ہون، عالیجناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا شروانی جامع کتب خانہ خود بھی ازراہ ذرہ نوازی مجھے حبیب گنج آنے کی دعوت دیا کرتے تھے، یونیورسٹی کی تعطیل کلان کا زمانہ داعی و مدعو دونون کے خیال مین اس کے لئے موزون تھا، چنانچہ ہر سال تعطیل کے آغاز مین اُدھر سے دعوت کی اور ادھر سے قبول کی تجدید ہوجایا کرتی تھی، مگر علائق و انکا رفتہ ہی کو عمل مین آنے کی نوبت نہین آنے دیتی تھی، امسال آغاز تعطیل پر مین نے عزم کیا، کہ تمام موانع کو پست کرکے اس ارادے کو ضرور پورا کرون گا، اور مولانا شروانی کو بھی اس سے آگاہ کردیا، موصوف نے جواب مین پُرخلوص تپاک کا اظہار فرمایا، چنانچہ اخیر جون مین ایک روز مستعد ہوکر لاری کے اڈے پر پہنچا، معلوم ہوا کہ لاری اب تک نہین آئی، دو موٹر ٹھیلے اس طرف جارہے تھے، ان پر جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی وہ بھی ناکام رہی، پہلا آخر چار گھنٹے انتظار [illegible] واپس آگیا، دوسرے دن پھر

لاری کو دریافت کیا یا معلوم ہوا کہ علی گڈھ اور ان کی آمد و رفت کا سلسلہ دن سے ہی بند ہو گئی تھا اسی دن نواب صاحب ممدوح علی گڈھ تشریف لے آئے، ناکامی کامیابی سے مبدل ہو گئی، لعل الخیر فی ما وقع کا ثبوت مل گیا، نواب صاحب موصوف نے فرمایا کہ میرے ساتھ چلنا، چنانچہ شروع جولائی میں یعنی چار پانچ روز بعد مجھے اپنے ساتھ کار میں لے گئے، اس موقع پر ایک واقعہ کا بیان خالی از لطف نہ ہو گا، وہ یہ کہ جس دن میں نواب صاحب کے ساتھ حبیب گنج جا رہا تھا اس سے چار روز قبل میرے ایک قدیم شاگرد مولوی عبدالرؤف صاحب سنبھلی آئے ہوئے تھے، انھوں نے میری معیت کی خواہش ظاہر کی، اور بذریعہ لاری وہ بھی حبیب گنج پہنچ گئے، وہاں اُن کی طب و حکمت کا مظاہرہ شروع ہوا، ناظم کتب خانہ کے یہاں کوئی علیل تھا، انھوں نے رجوع کیا، پھر اور لوگوں نے اور لوگوں سے تو مجھ کو کچھ مطلب نہیں، مگر ناظم کتب خانہ بلا لحاظ وقت و نا وقت حکیم صاحب کی وجہ سے پورے زمانہ قیام تک جو تقریباً ایک ہفتہ تھا، کتب خانہ کھولے میری ضیافت کے لئے تیار رہے جس کی وجہ سے تھوڑے وقت میں زیادہ استفادہ کر سکا،

یہ کتب خانہ انفرادی کوشش کا ثمرہ ہے، اور نواب صاحب ممدوح نے اپنی عمر کے پورے ستر برس اس پر خرچ کئے ہیں، موصوف کو شوق ہے تو کتاب کا، شغف ہے تو نوادر کا، جب حبیب گنج میں قیام فرما ہوتے ہیں، تو لازمی طور پر روزانہ صبح سے دوپہر تک کا وقت کتب خانہ میں گذرتا ہے، ممکن نہیں کہ اس میں فرق آئے، جہاں کتب خانہ میں داخل ہوئے علائق سیاست باہر چھوڑ دیے، فرماتے ہیں، کتب خانہ میں داخل ہوتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن مصنفین کی کتابیں یہاں ہیں، میں اُن کی مجلس میں آگیا، پھر اس مجلس میں اسی کے حسب حال مطالعہ یا مذاکرہ مشغلہ ہوتا ہے،

نواب صاحب نے اس کتب خانہ میں یہ التزام رکھا ہے کہ کوئی چیز بھی بیکار نہ آنے پائے، صرف قدامت و ندرت وہاں جگہ پانے کی مستحق ہے، چنانچہ اس میں موصوف کو بہت اچھی کامیابی حاصل ہوئی، مختلف اقسام کے نوادر اُن کے یہاں بہت کافی ہیں، جو نادر ایسے مقامات پر ... حاصل کئے

ین لوگ جائز و ناجائز کا خیال نہین رکھتے، مگر یہ حکایت سننے کے قابل ہے، کہ کوئی چیز آپ کے یہان ناجائز ذریعہ سے نہین آئی، ایک کتاب ناجائز طریقہ پر آگئی تھی، جس کو داخل کتب خانہ نہین کیا تھا، خلش لگی ہوئی تھی، مگر خدا نے اُن کے تقوی کی لاج رکھی، اور جب انھون نے مالک کو واپس کی تو مالک نے خود وہ کتاب کتب خانے کو وقف کر دی، یہ کتاب دیوان قاسم انوار کا نادر الوجود نسخہ ہے، اس دیانت کے باعث بعض اوقات نوادر ہاتھ مین آکر نکل بھی گئے، مثلاً یاقوت مستعصمی کے قلم کا کلام اللہ،

نواب صاحب نے اپنے یہان کی ہر کتاب کا مطالعہ کرکے اس کی خصوصیات نوٹ کین، اور متعدد اقسام کی فہرستین خود اپنے ہاتھ سے مہینون محنت شاقہ کر کے ترتیب دی ہین، فہرست کی ترتیب کے زمانے مین ڈیڑھ بجے دن تک تیز لُو کی حالت مین برآمدے مین بیٹھے رہتے تھے، کتابون کے حصول کا شوق اس واقعہ سے ملاحظہ کیجئے، کپڑا خریدنے کے ارادے سے دہلی گئے ہوے ہین، ایک بزاز کی دوکان پر بیٹھے ہین، بزاز کپڑے پیش کر رہا ہے، ایک اجنبی شخص ایک کتاب لے کر دوکان کے پاس آتا ہے، اس سے پوچھتے ہین، کیا کتاب ہے، وہ بجائے جواب کے کتاب ہاتھ مین دے دیتا ہے، دیکھتے ہین تو دیوان فغانی ہے، فوراً اس کو خرید لیتے ہین، بزاز متحیر ہے کہ کپڑے چھوڑ کر کدھر لگ گئے، بالآخر دیوان فغانی ہاتھ لگنے کی خوشی مین کپڑے کی خرید اس وقت ملتوی کر دیجاتی ہے، یہ سارا واقعہ جلد کے سادہ کاغذ پر نوٹ ہے،

کتب خانے کی فہرستین جن کا ابھی ذکر ہوا، دو طریقے کی تیار فرمائی ہین، ایک تو یہی معمولی طریقہ پر جس مین کتابون کو باعتبار علوم و فنون اور باعتبار زبان لکھا جاتا ہے، دوسرا طریقہ باعتبار اہمیت و خصوصیت ہے، چونکہ آخر الذکر میرے ذوق کی چیز ہے، اس لئے مضمون مین اسی پر روشنی ڈالونگا،

اس فہرست مین ۱۹ عنوانات ہین، ہر عنوان ایسا ہے کہ اس پر مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے،

(۱) اس مین وہ کتابین ہین جو طلائی کام کے لحاظ سے ممتاز ہین، مختلف زمانون مین اور مختلف

ممالک مین کس کس طرح طلائی کام ہوتا تھا، اس سلسلے کی کتابون پر نظر ڈالنے سے سب بیک وقت سامنے آجاتا ہے، مین صرف چند چیزون کے ذکر پر اکتفا کرتا ہون، ایک نسخہ کلام اللہ کا تقطیع کلان اس قدر اعلیٰ کام کا ہے، کہ اس کی خوبی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، دوسری چیز مثنوی گوے وچوگان ہے، اس کا کام بھی قابلِ دید ہے، علاوہ برین یہ کتاب میر علی کاتب مشہور خطاط کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے تاریخ کتابت ۹۲۶ھ، تیسری چیز ایک اور قرآن مجید کا نسخہ ہے، جس مین ہر پارہ پورے ایک ورق پر لکھا ہے، اس اہتمامات اور خوشخطی ہے، کہ تعریف نہین ہوسکتی، چوتھی چیز کریما کا نسخہ ہے، طلائی کام کے ساتھ ساتھ خط نہایت پاکیزہ، اور پورا نسخہ مطلا ہے،

(۲) اس مین اعلیٰ درجہ کے خطاطون کی لکھی ہوئی کتابین ہین جن مین میر عماد اور امیر علی کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہین،

(۳) اس مین وہ کتابین ہین، جو بڑے لوگون کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہین، مثلاً شاہ جہان کے وزیر آصف خان اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی وغیرہما،

(۴) اس مین قدیم جلد سازی کے نمونون کے اعتبار سے کتابین لکھی گئی ہین، گل کاری ایرانی جلد کا ایک نسخہ کلام اللہ کا خاص اہمیت رکھتا ہے، اور یون تو سب ہی نمونے قابلِ دید ہین،

(۵) اس مین وہ کتابین لکھی ہین جن کا تعلق بادشاہون سے رہ چکا ہے، مثلاً ایک نسخہ صحیح بخاری کا جو سلطان ابراہیم عادل شاہ کے کتب خانہ مین رہ چکا ہے، یہ نسخہ دیگر خصوصیات کا بھی حامل ہے، محمد شاہ گاندونی کا خط اور معاینہ ۸۸۴ھ اس پر تحریر ہے، دوسری تفسیر جلالین بقلم رضی الدین محمد تفرشی کتابت بمقام حیدرآباد ۱۰۸۲ھ، کاتب سلطان ابو الحسن تاناشاہ سے استفسار کرتا ہے، اور بادشاہ کے جواب بھی لکھتا ہے،

(۶) اس مین وہ کتابین ہین جو بادشاہون کو مالِ غنیمت مین ملی ہین،

(۷) جن کتابون پر مقام تحریر درج ہے، وہ اس مین آتی ہین، مثلاً حرمین شریفین، بغداد، تبریز، بخارا، دمشق، سمرقند، مراغہ، مشہد وغیرہ، غرض کوئی ایسا اسلامی ملک نہین ہے، جہان کی لکھی ہوئی کتاب اس مین موجود نہ ہو، ایک کتاب کعبہ شریف کے سامنے سنہ ۹۰۲ھ مین لکھی گئی ہے، جس کا نام ہے ایجاد القلم شرح لامیۃ العجم، اس کتاب پر میر غلام علی آزاد بلگرامی کے ہاتھ کی بھی تحریر ہے، جس کی تاریخ شوال سنہ ۱۱۷۱ھ ہے، دوسری کتاب شرح عقائد جلالی ہے جو بخارا مین لکھی گئی، تیسری کتاب مطول ہے، جو بمقام ہرات سنہ ۸۴۹ھ مین لکھی گئی، مین نے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند نام لئے ہین،

(۸) اس مین مہرون کے مختلف نمونے دکھلائے گئے ہین، جو ایسے عجیب وغریب ہین، کہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے،

(۹) اس مین کتابون کو باعتبار اقسام خطوط دکھلایا ہے، جملہ اقسام خطوط مثلاً نسخ، نستعلیق، شکستہ، خط ایرانی، وغیرہ وغیرہ کی کتابین موجود ہین، ان مین سے صرف ایک دیوان حافظ کا ذکر کرتا ہون جو قوام شیرازی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے،

(۱۰) مین کاغذ کے اقسام کے اعتبار سے کتابون کو تقسیم کیا ہے، زرافشانی گجراتی کاغذ پر ایک نسخہ کلام اللہ کا ہے، جو فرخ سیر بادشاہ دہلی کے کتب خانے مین رہ چکا ہے، عربی کاغذ پر ایک کتاب شراح القاری ہے، جو خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، نام علی بن عثمان القاصح متوفی سنہ ۸۰۱ھ، حریری کاغذ پر شفاے قاضی عیاض بہت خوشخط لکھی ہوئی ہے، سنہ کتابت سنہ ۱۱۲۲ھ ہے، خلاصہ یہ کہ استنبولی، سمرقندی وغیرہ جملہ اقسام کے کاغذون پر لکھی ہوئی کتابین موجود ہین،

(۱۱) اس سلسلہ مین وہ کتابین ہین جو خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہین، مثلاً امام صوفیہ ابوالقاسم قشیری کا متوفی سنہ ۴۶۵ھ کا ایک رسالہ عیون الاجوبہ فی فنون الاسولہ خود ان کے قلم کا لکھا ہوا ہے، اس سلسلہ مین حسب ذیل کتابین قابل تذکرہ ہین،

ارتیاح الاکباد بارباح فقد الاولاد مصنفہ علامہ حافظ شمس الدین سخاوی متوفی سنہ ۹۰۲ھ اس کتاب پر خود مصنف کے قلم کے حواشی ہیں،

کلمات طیبات، تعلیم جہان آرا، دختر شاہ جہان بادشاہ سنہ ۱۰۵۱ھ،

ایک کتاب ملا شوستری کی خود ان کے قلم کی لکھی ہوئی ہے، متعدد کتابیں خود مصنف کے نسخوں سے نقل شدہ ہیں، مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول کی شرح حکمت الاشراق، میر باقر داماد کی ایماضات، شارح نفیسی کی شرح ملخص، سعدی شیرازی کی کتاب الخواتیم سنہ ۱۰۰۶ھ، شیخ فیضی کی کلیات سنہ ۱۰۹۵ھ شاہ عبد العزیز صاحب کی تحفہ اثنا عشریہ وغیرہ،

(۱۲) وہ کتابیں جو اساتذہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، یا ان کے تحشیہ، تصنیف یا کسی اور حیثیت سے ان سے تعلق رکھتی ہیں، مولانا بزرگ علی صاحب مفتی عنایت احمد صاحب، قاری عبد الرحمٰن صاحب پانی پتی مولانا مفتی لطف اللہ صاحب اور مولوی عبد الغنی خان صاحب رحمہم اللہ اس عنوان کا سرمایہ ہیں، یہ عنوان ثابت کرتا ہے کہ نواب صاحب کو اپنے اساتذہ سے خاص شغف ہے، اس سلسلہ میں ایک نسخہ ترمذی کا قابل ذکر ہے، جو قاری عبد الرحمٰن صاحب پانی پتی کی ملک رہ چکا ہے، اس نسخہ پر سنہ ۱۰۱۹ھ کی تحریر ہے، باقی عنوانات حسب ذیل ہیں،

(۱۳) اس میں وہ کتابیں ہیں، جو بلحاظ خط نادر ہیں، مثلاً کلام اللہ بخط کوفی، اس کے صرف پانچ ورق حبیب گنج کے کتب خانہ میں ہیں، نواب صاحب نے ان ورقوں کے فوٹو بھی لے لئے ہیں اس نسخے کے متعلق شاہ جہان بادشاہ کے قلم کی شہادت ہے، کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک سے لکھا ہوا ہے،

(۱۴) نویں صدی ہجری کے قبل کی لکھی ہوئی کتابیں اس عنوان کے تحت میں ہیں، مثلاً اختیار رواۃ دیوان تنبی و بحتری و ابو تمام از عبد القادر جرجانی سنہ کتابت سنہ ۵۶۸ھ، المستجاد من فعلات الاجواد

پلیٹ ڈاکٹر کرنیکو مشہور مستشرق کی ستایش اور تحسین حاصل کرچکا ہے،

(۱۵) اس مین وہ کتابین ہین جو نواب صاحب کے رشتہ دارون سے تعلق رکھتی ہین،

(۱۶) اس مین وہ کتابین ہین، جن کا تعلق سلاطین کے وزرا سے ہے،

کتابون کے علاوہ قدیم زمانہ کے مشہور خطاطون کی لکھی ہوئی بکثرت وصلیان اور قطعات ہین جن کا تفصیلی تذکرہ مشکل بھی ہے اور طویل بھی، اُن کی خوبی قابلِ دید ہے،

ان کے علاوہ ایک بڑا ذخیرہ ان قدیم قلمی تصویرون کا ہے، جو اپنے بنانے والون کے کمال کا ثبوت دے رہی ہین، ان تصویرون کی خوبی محوِ حیرت بنا دیتی ہے، ہم لائیل رائٹ کلمہ لائبریری جلد کے بموجب تین چیزون کا ذکر کیا جاتا ہے،

(۱) شاہ عباس صفوی کی لڑکی کی تصویر، کاغذ پر تصویر اور فارسی عبارت ہے، حاشیے پر بیل بوٹے ہین، جو کپڑے پر ہین، لیکن کاغذ اور کپڑے کو ایسا وصل کیا ہے، کہ امتیاز کرنا سخت دشوار ہے،

(۲) ایک پھول کی تصویر اس خوبی سے کھینچی ہے، کہ ہم جیسے غیر مبصر اس کی داد دینے سے قطعاً قاصر ہین، لیکن یورپ کے مبصرین نے اس کی پوری قدر شناسی کی، چنانچہ انگلستان کے ایک بڑے شخص نے کسی طریقہ پر اس کا حبیب گنج مین ہونا معلوم کرکے پچھلے سال اس کا فوٹو منگا اور اپنی راے کا اظہار کیا،

(۳) نوابانِ اودھ کے زمانہ کا ہندوستان کا ایک نقشہ ہاتھ کا کھینچا ہوا جو ہر اعتبار سے اس زمانے کے جغرافیہ کے نقشون کا ہم پلہ ہے، یعنی ایک نقشہ مین جتنی چیزین دکھلائی جاتی ہین وہ سب اس مین موجود ہین، اور ایک چیز مستزاد ہے جس سے نقشہ بنانے والے کی مصوری کا کمال معلوم ہوتا ہے، اور جس نے اس نقشے کو اودھ کی صحت مین لاکر کھڑا کر دیا ہو وہ یہ ہے کہ ہمالیہ پہاڑ کے نقشہ مین مختلف اقسام کے جانور جو ہمالیہ کے مختلف حصون مین پائے جاتے ہین، اپنے اپنے مقام پر اپنی اصلی شکل مین بنائے ہین،

سر ہارکورٹ بٹلر یو پی کے گورنر کو کسی طریقے پر اس نقشے کا علم ہوا، تو گرویدہ ہو کر اس کی نقل مانگی، دہلی میں ایک ماہر فن نے دو سو روپیہ میں نقل تیار کرنے پر آمادگی ظاہر کی، مگر ظاہر ہے کہ نقل اصل سے کہیں کمتر ہوتی، اس لئے اتنا خرچ اس پر غیر ضروری سمجھ کر معمولی نقل جو بیس روپیہ میں تیار ہوئی، نواب صاحب نے گورنر صاحب کو بھیج دی،

الغرض یہ کتب خانہ ایسی جگہ ہے جہاں ہر علم و فن کے دلدادہ کو اپنے مذاق کی چیزیں بکثرت ملتی ہیں، اور جہاں ایک صحیح ذوق کا آدمی مدت دراز تک بہت دلچسپی کے ساتھ وقت گذار سکتا ہے'

شادی آباد

از

نواب محمد صابر قلی خان بالقابہ والی ریاست محمدی گڈھ مالوہ

ذیل کا مضمون ایک ہونہار نوجوان تعلیم یافتہ رئیس کے قلم کا نتیجہ ہے، ڈھائی سو برس ہوئے جب انکے مورث ہندوستان کی سرحد سے مالوہ پہنچے اور ملک کی طوائف الملوکی میں مرہٹون کے عروج کے زمانہ میں اپنی تلوار کے زور سے ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی، جو اب محمدی گڈھ کے نام سے مشہور ہے، اور اس وقت اس کے فرمانروا نواب محمد صابر قلی خان بہادر دلیر جنگ ہیں جو اسی سال اندور کالج سے فارغ ہوکر مسند آرائے ریاست ہوئے ہیں، اور اب انڈین یونین میں داخل ہوکر ان کی ریاست مدھ بھارت (ممالک متوسطہ) میں گوالیار اور اندور کا ضمیمہ بن گئی،

موصوف نہایت سعید متین سنجیدہ اور تاریخ اسلام اور ادب سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں، اور اسی لئے وہ دار المصنفین اور اس کے رفقا سے بہت محبت رکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اب بزرگون کی تلوار کو نیام میں رکھ کر صاحب قلم کی زندگی اختیار کریں اور نامور ان اسلام کے نام سے ایک مجموعہ بھی تالیف کیا ہے، اللہ تعالیٰ قدیم خاندان کی اس یادگار کو ہمت و سعادت بخشے،

موصوف کی ہمت افزائی کی غرض سے ان کا طالب علمی کا ایک چھوٹا سا مضمون شائع کیا جاتا ہے، گو [illegible] کی عمارتون اور کتبون پر انگریزی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، لیکن یہ مضمون ایک مسلمان نوجوان [illegible] کے قلم سے [illegible]

"یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ شادی آباد کے سلاطین گزر گئے، مگر اس شہر کے اہل قلم کا نام زندہ بجا
جن میں سے ایک محمد بن داود بن محمد علوی مشہور فارسی شاعر انوری کے دیوان کا شارح ہے جو شادی آبادی
نام سے مشہور ہے، اس کے علاوہ اور خدا جانے کتنے فضلاء اس سرزمین سے نسبت رکھتے ہونگے۔" س"

ہندوستان میں پرانے شہروں کی کمی نہیں، سب سے پرانی جگہ دلی ہے، لاہور ہے، اور نئے بسے ہوئے پرانے
شہروں میں آگرہ اور لکھنؤ ہے، اور یہ سب شہر بھی کسی زمانہ میں بادشاہوں کے دارالحکومت تھے، یہ پہلے بھی آباد
تھے، اور اب بھی آباد ہیں، فرق اتنا ہے کہ اب قلعوں اور محلوں کے بجائے وہاں نئی کوٹھیاں اور بنگلے تعمیر
ہو رہے ہیں، فانوسوں کی جگہ بلب جھلملا رہے ہیں ہاتھیوں اور سواروں کے بجائے موٹریں چل رہی ہیں پرانے
استادوں نے بھی اپنی اپنی استادی دکھائی تھی، اور اب نئے انجینیر بھی اپنی صناعیاں ظاہر کر رہے ہیں، غرض تہذیب
وتمدن نے جس طرح ان شہروں کو پہلے دلہن بنا رکھا تھا، اب بھی سجا رکھا ہے،

آئیے اب ایک شہر میں آپ کو دکھاؤں جو کبھی آباد تھا، اور اب برباد ہے، یہ مالوہ کا دارالحکومت مانڈو
ہے جس کا نام بادشاہوں نے شادی آباد رکھا تھا، یہ مالوہ کے خلجی بادشاہوں کا دارالحکومت تھا، اس شہر کی
خوبصورتی اور آبادی کی تعریف ہر مورخ نے کی ہے، یہاں لاکھوں انسانوں کی آبادی تھی، اور سیکڑوں محلات
اور حویلیاں تھیں، یہاں کے بادشاہوں میں محمود خلجی جیسے فاتح، غیاث الدین جیسے باشوکت، اور باز بہادر
جیسے عیش پسند حسن پرست اور آرٹسٹ گذرے ہیں، جن کے نام تاریخ ہند میں اب بھی روشن ہیں، یہ شہر کبھی
سلطنت مالوہ کا پایہ تخت خلجی پٹھانوں کا صدر مقام اور اُن کی تہذیب وتمدن کا نگار خانہ تھا، لیکن آج
اس شہر کی حالت دیکھ کر عبرت کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، سیکڑوں حویلیاں کھنڈر اور پتھروں کے ڈھیر
بن کر رہ گئی ہیں، اور لاکھوں پٹھانوں اور ترکوں کی جگہ چند غیر مہذب بھیل جھونپڑوں میں رہتے ہیں، اُ
ہر طرف سناٹے کا عالم ہے،

اس کھنڈر میں اب بھی جو کچھ رہ گیا ہے وہ شاہکار اور گویا پتھروں میں ڈھلا ہے، ۱۹۲۵ء میں

جب میں سینیر کیمبرج کی تعلیم پا رہا تھا، مانڈو گیا اور ایک پرانے محل میں جس کی حالت دوسروں سے کچھ بہتر ہے، اور جسے گورنمنٹ نے ڈاک بنگلہ بنا دیا ہے ایک ہفتہ تک ٹھہرا، وہاں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا آج وہ دوسروں کو سناتا ہوں،

سب سے پہلے میں نے یہاں کی جامع مسجد دیکھی، خوبصورت مسجدیں تو بہت دیکھی ہیں، لیکن خوبصورتی کے ساتھ ایسی پختگی اور کسی میں نہ پائی، پوری عمارت سنگِ سرخ کی بنی ہوئی ہے کہیں کہیں محرابوں وغیرہ میں سنگِ مرمر اور سنگِ موسٰی سے سجاوٹ کا کام لیا گیا ہے، جیسے پٹھان خود جسیم اور طاقتور تھے، ویسے ہی بڑے بڑے اور مضبوط پتھروں کی پرعظمت عمارتیں بنائی تھیں اور پتھر کے جوڑوں کو لوہے سے کسا ہوا محرابیں اور گنبد خالص پٹھانی وضع کے ہیں، اس کی تعمیر ہوشنگ شاہ غوری نے شروع کی تھی، اور محمود خلجی نے تکمیل کی، سنہ ۱۴۳۰ء اور سنہ ۱۴۴۰ء کے درمیان میں تعمیر ہوئی . . . تین صدیوں سے اس شہر میں مسلمانوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے لیکن زمانے کے بڑے بڑے انقلابات کے بعد بھی جس حالت میں یہ عمارت قائم ہے، اُسے دیکھکر پٹھانوں کی صنعت گری اور عمارت کی مضبوطی واستحکام کا اندازہ ہوتا ہے،

مانڈو کے بھیل محمود شاہ خلجی کے مقبرہ کو اشرفی محل کہتے ہیں، مقبرہ کیا اب تو صرف ایک کھنڈر باقی رہ گیا ہے، اگر اس کی پہلی عظمت معلوم کرنا ہو تو تاریخ فرشتہ پڑھئے، کہا جاتا ہے، کہ تاج محل کے بننے سے پہلے اگر کوئی عمارت ہندوستان کا تاج کہلانے کی مستحق تھی تو وہ یہی تھی،

یہ عمارت پہلے ملتی مدرسہ تھی محمود خلجی نے اس کے صحن کو پر کرکے دوسری منزل پر اپنا شاندار مقبرہ بنوایا اور ایک کونے میں اپنی فتوحات کی یادگار میں ایک بڑا بلند مینار تعمیر کرایا جو ہفت منزل مینار کہلاتا تھا، مقبرہ سر سے پیر تک سفید سنگِ مرمر کا تھا اور اس کے اندر باہر ہر طرف کلام مجید کی آیتیں اُبھرے ہوئے خط میں کھدی ہوئی تھیں، اب تو صرف دو ایک جگہ قدِ آدم دیواریں باقی ہیں، ورنہ چھت اور گنبد سب ٹوٹ پھوٹ گئے، ہفت منزل مینار بھی تباہ ہو گیا ہے، دیواروں کے سنگِ مرمر میں کلام مجید کی

جو آتشین کندہ تھین، اس کے کچھ ٹکڑے باقی ہین، جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پٹھان صرف تلوار ہی کے دھنی نہین تھے، بلکہ وہ آرٹسٹ بھی تھے، اور پتھرون مین صناعیان دکھاتے تھے، جن کو دیکھ کر آنے والی نسلین عش عش کرین،

اس کھنڈر کو دیکھ کر کون ہو جو دنیا کی بے ثباتی کا ماتم نہ کریگا، عبرت کا مقام ہے کہ یہان تین باجبروت بادشاہ پتھرون کے تلے دبے پڑے ہین، اور اپنی شان و شوکت قائم رکھنے کے لئے انھون نے جو جو تیاریان کی تھین، وہ سب خاک مین مل گئین، اور وہی خاک کا ڈھیر اور دو گز زمین جو ہر انسان کو ملتی ہے، اُن کے حصہ مین بھی آئی،

ہوشنگ شاہ کا مقبرہ جامع مسجد کے پیچھے ہے، اور محمود شاہ کا اس کے سامنے تھا، دونون مقبرے سنگِ مرمر کے ہین، اور بیچ مین سنگ سرخ کی جامع مسجد کی عمارت ہے، محمود شاہ کا مقبرہ تو تباہ و برباد ہوگیا، ہوشنگ شاہ کا اب بھی قائم ہے، اور مانڈو کی کل عمارتون مین سب سے اچھی اسی کی حالت ہے، گنبد کی گولائی اور خوبصورتی کی اس زمانے کے انجینیر بھی تعریف کرتے ہین، پورے پانسو برس ہوئے جب یہ عمارت تعمیر ہوئی تھی، اور تین سو برس سے تو مرمت کا کیا ذکر کسی نے آس پاس کی گھاس پھونس اور خودرو درخت بھی نہین کاٹے، اب کچھ صفائی ہوئی ہے لیکن عمارت جیسی تھی، ویسی ہی ہے، البتہ رنگ مین فرق آگیا ہے، کائی جمتے جمتے سنگِ مرمر کی سفیدی غائب ہوگئی ہو،

جامع مسجد اور ان دونون مقبرون سے تقریباً آدھے میل کے فاصلے پر جہاز محل ہے، خیال ہو کہ اس کو غیاث الدین خلجی نے تعمیر کیا تھا، اس کے دو جانب تالاب اور بیچ مین محل جہاز کی طرح نظر آتا ہے، یہ محل پٹھانون کی صنعت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، اس کی دوسری منزل پر بیچ مین چاندنی (چھت) اور آس پاس سہ دریان ہین جن پر نہایت خوبصورت گنبد بنے ہوئے ہین، نیچے اور اوپر بھی نہرین اور تیرنے کے لئے کنول اور دوسری شکلون کے حوض بنے ہوئے ہین، اس زمانہ کے انجینیر الجھون اور حوضون مین نیچے سے پانی

چڑھاتے تھے، اور بادشاہ لطف و عشرت کی تقریبوں اور بہار کے موسم مین یہان بزم عیش آراستہ کرتے تھے، یہ بڑا دلکش مقام تھا، اب بھی دلفریب ہے، لیکن افسوس سنسان پڑا ہے۔

تالاب کے اُس پار جہاز محل کے سامنے ایک اور محل ہے، جو آدھے سے زیادہ تباہ ہو چکا ہو لیکن جو باقی رہ گیا ہے، اس کو دیکھ کر اس کی خوبصورتی کا اندازہ ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی اور اسلامی طرز کو بڑی نفاست کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے، لیکن پورے ساڑھے چار سو برس گذرے کہ یہ عمارت بنی تھی، اس وقت ہندوستان کیا ایشیا مین بھی کوئی انگریزون کا نام نہ جانتا تھا، اس محل کی کھڑکیان اور روشندان نہایت خوبصورت اور بالکل انوکھے طرز کے ہین، اگر کسی انگریزی کوٹھی مین اُن کو لگا دیا جائے، تو اُن کی خوبصورتی دوچند ہو جائے اور فیشن کے دلدادہ یہ تصور کرین کہ یہ کوئی نئی طرز ایجاد کی گئی ہے، یہ مقام بھی نہایت فرحت افزا ہے، سیڑھیان نیچے تالاب مین چلی گئی ہین، چارون طرف خوبصورت نہرین ہین، اور سامنے جہاز محل کا دلکش منظر ہے، لیکن افسوس کہ اس محل کے سامنے کا حصہ بالکل تباہ و برباد ہو گیا ہے،

ان دونون محلون سے تھوڑے فاصلہ پر ہنڈولا محل ہے، یہ نام جیسا عجیب و غریب ہے، عمارت بھی ویسی ہی انوکھی ہے اور لال پتھر کا پہاڑ معلوم ہوتی ہے، دیوارین ڈھلوان ہین، اور ان کی موٹائی پندرہ فٹ سے کسی طرح کم نہین ہو گی، ایک جانب ہاتھی دروازہ[1] اور باقی تین طرف بڑی خوبصورت[2] اونچی محرابین ہین، چھت گر چکی ہے، لیکن دیوارین اتنی مضبوط ہین کہ شاید دو ہزار برس تک بھی نہ گرین، قیاس کیا جاتا ہے، کہ یہان بادشاہ دربار کرتے تھے،

مانڈو کی سب سے انوکھی اور عجیب جگہ چمپا باولی ہے، جو بالکل زمین کے اندر ہے، زمین مین گھسنے کا ایک راستہ ہے، اندر جا کر دیکھو تو عجیب سمان نظر آتا ہے، اور ایک نئی دنیا معلوم ہوتی ہے، مضبوط ستونون پر سیکڑون محرابین اور بیچ مین ایک جگہ نہایت خوبصورت باؤلی ہے، صرف یہی حصہ اوپر سے کھلا ہے، جہان سے آسمان

---

[1] ایسا دروازہ جس مین سے ہاتھی داخل ہو سکے،

نظر آتا ہے، باؤلی گویا اس انگشتری کا نگینہ ہے کہ محرابین اور ستون زمین کے اندر ہر سمت پھیلے ہوئے ہیں، اندھیرے کی وجہ سے ہاتھون مین روشنی لے کر ہم نے آگے بڑھنے کی کوشش کی، جہان تک نظر کام کرتی تھی، محرابین ہی محرابین نظر آتی تھین، جب صاف ہوا کی کمی سے دم گھٹنے لگا، تو ہم لوگ باہر نکل آئے اس کے اطراف مین بھی دو دو تین تین فرلانگ تک زمین دوز کھوہ نظر آئے، جن مین باؤلی کی طرح کے ستون اور محرابین تھیں، لیکن اندر جانے کی ہمت نہین ہوئی، خدا جانے یہ جال زمین کے اندر اندر کہان تک پھیلا ہوا ہے،

شہر مانڈو (شادی آباد) ایک پہاڑ کی چوٹی پر آباد اور ہر طرف سے فصیلون سے گھرا ہوا ہے، اور فصیل کے اندر کا رقبہ بائیس مربع میل ہے،

اس سارے رقبہ مین یہ شہر آباد تھا، جو اب بالکل ویران و برباد ہو چکا ہے، اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے اس کی بھی کوئی خاص دیکھ بھال نہین ہے، ان عمارتون کے علاوہ اور بھی متعدد عمارتین یہان ہین، جو سب کی سب قابلِ دید ہین، ان مین سے باز بہادر کا محل، روپ متی کا محل، ملک مغیث کی مسجد، ہاتھی دروازہ، مینار، برج، زنانہ مسجد، دہلی دروازہ، نیل کنٹھ، حمام اور نانک گھر خصوصیت سے قابلِ ذکر اور دیکھنے کے لائق ہین،

دار المصنفین کی نئی کتاب

بزمِ تیموریہ

یعنی ہندوستان کے تیموری بادشاہون، شہزادون اور شہزادیون کی علم دوستی، علما نوازی اور ان کے درباری شعراء و فضلاء، اور دوسرے اربابِ کمال کا تذکرہ اور خصوصیت کے ساتھ آخری تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفر کے دیوان اور ان کے اردو کلام پر سیر حاصل تبصرہ ضخامت ۴۶۴ صفحے قیمت مجلد

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے رفیق دار المصنفین،

منیجر

ادبیات

حدیثِ پاستان

از جناب یحییٰ اعظمی

نہ ہوگی کل اگر اس دیس مین اردو زبان باقی
رہے گی پھر نہ سرشار و شرر کی داستان باقی

ہے رفتہ رفتہ اب دستِ حوادث اسکے درپے بھی
وطن مین رہ گیا تھا اک جو وحدت کا نشان باقی

رہین گے کل بھی یہ حرف و حکایت کیا زبانون پر
ابھی محفل مین ہے کچھ کچھ "حدیثِ پاستان" باقی

تمھاری کم نگاہی نے اُسے بھی قطع کر ڈالا
وہ اک رشتہ جو مدت سے رہا تھا درمیان باقی

وسیلہ جب نہ ہوگا اتحاد و ربطِ قومی کا
رہے گی جسمِ قومیت مین پھر کس طرح جان باقی

بھلا ہم اس چمن کو کس طرح اپنا وطن سمجھین
نہ ہو جس مین کوئی بھی ہم صفیر و ہم زبان باقی

بلا شبہہ رہین گے اس کے تہذیب و تمدن بھی
ہے خاکِ ہند پر جب تک ہمارا کاروان باقی

کئے تھے آپنے وعدے جو کل خود بر ملا ہم سے
ذرا ارشاد ہو یہ بھی کہ ہین وہ اب کہان باقی

گوارا ہو ہمین کیون اس مین بن کر اجنبی رہنا
نہ ہو جب ملک مین خود اپنی تہذیب و زبان باقی

سُنا مین بھی تو کیونکر داستانِ دردِ دل اپنی
وہ اندازِ سخن ہے اور نہ وہ طرزِ بیان باقی

غلط ہے یہ کہ گلزارِ وطن مین اب نہین کوئی
امیر و داغ و چکبست و رتن کا نغمہ خوان باقی

فضائے دشت و در سے آج بھی آتی ہے آواز
کہ ہر وادی مین اردو کی ہے گلبانگِ اذان باقی

دبا سکتا نہین ہرگز کوئی آہنگ فطرت کو
زبانِ شبلی و غالب رہے گی جاودان باقی

غزل

از

جناب شفیق جونپوری

ہوا کا رُخ کہاں تک کارگر ہو
مسافر کا قدم بھی تیز تر ہو

ہمارا مستقل اک مستقر ہو
مگر پروازِ تا حدِّ نظر ہو

مرے دامن پہ کیا ہنستا ہے اے گل
ذرا اپنے گریباں پر نظر ہو

گمانِ خلد ہو جاتا تھا جس پر
وہی گلزار خونریزی کا گھر ہو

کبوتر اپنے بازو بھی قوی کر
ترے پنجے میں بھی شاہیں کا پر ہو

اسے زیبا نہیں ہے کاروانی
جو پابندِ مقاماتِ سفر ہو

قلندر کے لئے ہے شرطِ اوّل
مقامِ زندگی سے باخبر ہو

بنا لے آج اپنا آشیانہ
نہ جانے کل ہوا کا رُخ کدھر ہو

سہولت دشمنِ ذوقِ عمل ہے
تو منزل اور بھی دشوار تر ہو

امیرِ کارواں کوئی نہیں ہے
تو خود اپنی بصیرت راہبر ہو

ادھر چمکے فلک پر ماہِ کامل
ادھر داغِ جبیں تابندہ تر ہو

گھٹا آ جائے تو ایک ایک جگنو
چراغِ امتِ خیر البشر ہو

صدائیں دے رہی ہو روحِ اقبال
مرا نائب شفیق نامور ہو

مطبوعات جدیدہ

مسلمانون کا عروج وزوال از جناب مولانا سعید احمد صاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۳۴۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت غیر مجلد للعہ مجلد عہ رتبہ:- ندوۃ المصنفین دہلی،

مسلمانون کا عروج وزوال تاریخ کے حیرت انگیز واقعات مین سے ہے، اپنے دور عروج مین وہ ایک صدی کے اندر ایشیا و افریقہ کے بڑے حصہ پر چھاگئے، اور یورپ کے ایک حصہ کو بھی زیرنگین کرلیا اور تینون براعظمون مین اُن کی بڑی بڑی حکومتین قائم ہوگئین جو صدیون تک بڑے جاہ و جلال سے چلتی رہین اور دنیا کو تہذیب و اخلاق اور علم و فن کا سبق سکھاتی رہین، اور جہان مسلمانون کے قدم فاتحانہ نہ پہنچ سکے، وہان انھون نے تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی روشنی پھیلائی، غرض اس زمانہ کی معلوم دنیا کا کوئی حصہ اسلام کی برکتون سے محروم نہیں رہا، اور صدیون تک دنیا کی سیاسی قیادت مسلمانون کے ہاتھون مین رہی، لیکن عروج وزوال کے طبعی اسباب کے ماتحت اُن پر بھی زوال طاری ہوا، لیکن اُن کا عروج اس زور و قوت کا تھا، کہ اُن پر زوال آنے مین صدیان لگ گئین، فاضل مصنف نے اس کتاب مین اسی عروج وزوال کی داستان کو دہرایا ہے، اور خلافت راشدہ، بنی اُمیہ، بنی عباس، آل عثمان اور اندلس و ہندوستان کی اسلامی حکومتون کے قیام، اُن کے عروج و ترقی، اُن کے کارنامون اور انحطاط و زوال پر تبصرہ کیا ہے، یہ ظاہر ہے کہ تیرہ صدیون کی پوری تاریخ اور کل حکومتون کے عروج وزوال کی تفصیل اور اس کے اسباب و نتائج کی تحقیق و تنقید ایک کتاب مین ممکن نہ تھی، تاہم بڑی بڑی حکومتون کے مختصر حالات اور ان سے متعلق اہم واقعات و حوادث اور ان کے عروج وزوال پر اجمالی تبصرہ آگیا ہے جس سے اسلامی تاریخ کے مجموعی خاکہ کا اندازہ ہوجاتا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب اس سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے

مراقبات از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ تقطیع بڑی ضخامت ۸۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ ایجوکیشنل کانفرنس حیدرآباد دکن،

فن نفسیات کا یہ مسلم مسئلہ ہے کہ نفس غیر شعوری یا تحت الشعور اس حیثیت سے نفس شعوری سے زیادہ اہم ہے کہ وہ تمام خارجی اثرات سے متاثر ہوتا ہے، شعوری نفس کے احکام کو قبول کرتا ہے، اور انسان پر جس قسم کے خیالات کا غلبہ ہوتا ہے، اسی قسم کے اثرات اس کے خارجی اور باطنی وجود مین لازمی طور پر ظاہر ہوتے ہین، اور اسی کے مطابق اس کی تعمیر ہوتی ہے، اس اصول کے مطابق دینی تعلیمات کی حقانیت و صداقت پر یقین واثق، مثلاً اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اس کی ربوبیت، کارسازی اور دستگیری پر اذعان ویقین، اور اس پر توکل و اعتماد اور اس قبیل کے دوسرے ایمانی و اعتقادی امور پر ایمان کامل نہ صرف مذہبی عقیدت اور خوش عقیدگی کے لحاظ سے بلکہ نفسیاتی اصول سے بھی انسان کی اُخروی فلاح کے ساتھ دنیاوی اور مادی کامرانیون کا بھی ضامن ہے، صوفیہ کی تعلیمات مین جابجا اس کے اشارے ملتے ہین، لیکن جدید نفسیات کی روشنی مین اس حقیقت کو سب سے پہلے ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے پیش کیا ہے، اور اس موضوع پر اُن کے بہت سے مضامین نکل چکے ہین، مراقبات بھی اسی سلسلہ کی کتاب ہے، اس مین توحید، توکل، صبر، شکر، معیت حق، وفور رزق، صحت، رفع خوف وحزن، کامیابی، توبہ، تجدید ایمان وغیرہ کے حصول کے دینی طریقے بتائے ہین، اور دکھایا ہے، کہ یہ طریقے اور ان کی دعاؤن اور اُن کے الفاظ پر یقین نہ صرف مذہبی عقیدہ کے مطابق، بلکہ نفسیاتی اصول سے بھی ان مقاصد کے حصول کا سب سے کامیاب ذریعہ ہے، اس لئے کہ جب اُن پر اذعان ویقین سے نفس شعوری اور غیر شعوری دونون متاثر ہون گے، تو اس کے اثرات انسان کے ظاہر اور باطن دونون پر ظاہر ہون گے، اس وقت یہ یقین حقیقت بن جائے گا، ڈاکٹر صاحب کی یہ خدمت قدیم علم کلام سے کم نہین، بلکہ اُن کی فلسفیانہ موشگافیون کا اثر تو زیادہ تر ذہن و دماغ تک محدود رہتا تھا، اور اس نفسیاتی تدبیر سے دلی احساس کے ساتھ پورا وجود متاثر ہوجاتا ہے، جو دین کا اصل مقصد ہے، یہ کتاب ہندوستانی مسلمانون کے

زیادہ اُن جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے مطالعہ کے لائق ہے جن کو فلسفہ اور نفسیات میں درک ہی،

کلیات اکبر حصۂ چہارم سید اکبر حسین الہ آبادی مرحوم تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت تحریر نہیں، کتابستان کلائیو روڈ الہ آباد،

حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کے کلام کے تین حصے اُن کی زندگی میں اور اُن کے بعد متعدد بار شائع ہو چکے ہیں، یہ چوتھا حصہ ہے اُس کے متفرق اشعار مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں، لیکن مجموعے کی شکل میں یہ پہلی اشاعت ہے، مصنف مرحوم کی فنی استادی اور خیالات کی پختگی اور گہرائی ہر زمانہ میں مسلّم تھی، لیکن عمر اور تجربہ کی زیادتی کے ساتھ قدرۃً کلام میں بھی حکمت و بصیرت بڑھتی گئی، اس لحاظ سے یہ حصہ گویا اُن کی مشق سخن کا نچوڑ ہے، اس میں اُن کے مخصوص مطائبات حکیمانہ طنز و ظرافت ہندوستان کے دماغی، ذہنی رجحانات اور مذہبی و معاشرتی تغیرات کے خاکے اُن پر بصیرانہ تنقیدیں اُس زمانہ کے سیاسی حالات کی صحیح نباضی اور اس کے اثرات و نتائج کی پیشینگوئیاں، اور وہ تمام خصوصیات موجود ہیں، جو مصنف کا خاص حصہ ہیں لیکن یہ بڑا نقص ہے، کہ مرتب کو جو اشعار بھی مل سکے ہیں، ان کو انھوں نے انتخاب کے بغیر شائع کر دیا ہے، اس لئے بہت سے ایسے اشعار اس مجموعہ میں نظر آتے ہیں، جن کی اشاعت مصنف مرحوم اپنی زندگی میں گوارا نہ کرتے، کسی شاعر کا بھی کلام رطب و یابس سے پاک نہیں ہوتا، اس لئے ہمیشہ انتخاب شائع کیا جاتا ہے، دوسرے کتابت وطباعت کی غلطیاں بکثرت ہیں، ان دونوں نقائص کی بنا پر ناقدین کو خوردہ گیری کا موقع مل سکتا ہے،

سیاسیات کے اصول از جناب میر نثار علی صاحب بی اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۱۲؍ حالی ۱۲؍ کلدار، پتہ اردو محل حیدر آباد دکن،

یہ سیاسیات پر ایک مختصر کتاب ہے اس میں مملکت کی حقیقت اس کے ارتقاء کی تاریخ اس کے تمام اجزاء و عناصر اور اس کے مختلف نظریوں اور قسموں اور یورپ کی حکومتوں کے مختلف و متعدد

نظاموں کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، جس سے اس فن کے ضروری معلومات کا علم ہو جاتا ہے، سیاسیات کے طلبہ اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں،

نکہتِ گل از جناب وفا براہی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ:۔ پستک بھنڈار لہریا سرائے اور پٹنہ،

مصنف بہار کے ممتاز نوجوان شعراء میں ہیں، نکہتِ گل اُن کی غزلیات کا مجموعہ ہے، کلام قدیم وجدید رنگ کے معتدل امتزاج کا نمونہ ہے، خیالات میں رنگینی کے ساتھ پاکیزگی اور زبان صاف و سلیس ہے، امید ہے کہ اصحاب ذوق میں یہ مجموعہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا،

تعمیر مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی و مولانا عبد السلام قدوائی ندوی تقطیع متوسط اخباری، ضخامت ۱۰ صفحے کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ چھ روپے ششماہی تین روپے، فی پرچہ ۲ر، پتہ:۔ مکتبہ تعلیمات اسلامی نمبر ۴۳، امین آباد پارک لکھنؤ،

یہ پندرہ روزہ اخبار لکھنؤ کے مشہور دینی ادارہ تعلیمات اسلامی کے لائق کارکنوں نے نکالا ہے، اس کا مقصد صحیح اسلامی اصولوں پر مسلمانوں کی اصلاح و تعمیر ہے، اس کے کئی نمبر نکل چکے ہیں، ہر نمبر اپنے مقصد کا ترجمان اور مفید دینی و اصلاحی مضامین پر مشتمل ہے، اخبار کے لائق اڈیٹروں کے مقالات خصوصیت کے ساتھ بہت مفید اور مسلمانوں کے پڑھنے کے لائق ہیں، عام لوگوں کی دلچسپی کے لئے مفید اور صالح ادبیات کی بھی چاشنی رہتی ہے، اس وقت ہندوستان کے مسلمان جس نازک دور سے گذر رہے ہیں، اُن سے ان کو بچانے اور سدھارنے کے لئے اسی قسم کی دینی تدبیروں کی ضرورت ہے، مذہب و ملت کا درد رکھنے والے مسلمانوں سے امید ہے کہ وہ اس اخبار کی پوری امداد اور قدردانی کریں گے، کہ وہ سکون و یکسوئی کے ساتھ اس اہم خدمت کو انجام دے سکے،

"م"

تابعینؒ

مرتبہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز، حضرت حسن بصری، حضرت اویس قرنیؓ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمدؒ حنفیہ، حضرت سعید بنؒ مسیب، حضرت سعید بنؒ جبیر، حضرت محمد بنؒ سیرین، حضرت ابنؒ شہاب زہری، امام ربیعہؒ رائی، امام مکحول شامی، قاضی شریحؒ، وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح، اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

ضخامت:- [illegible] صفحے،

قیمت:- [illegible] روپے،